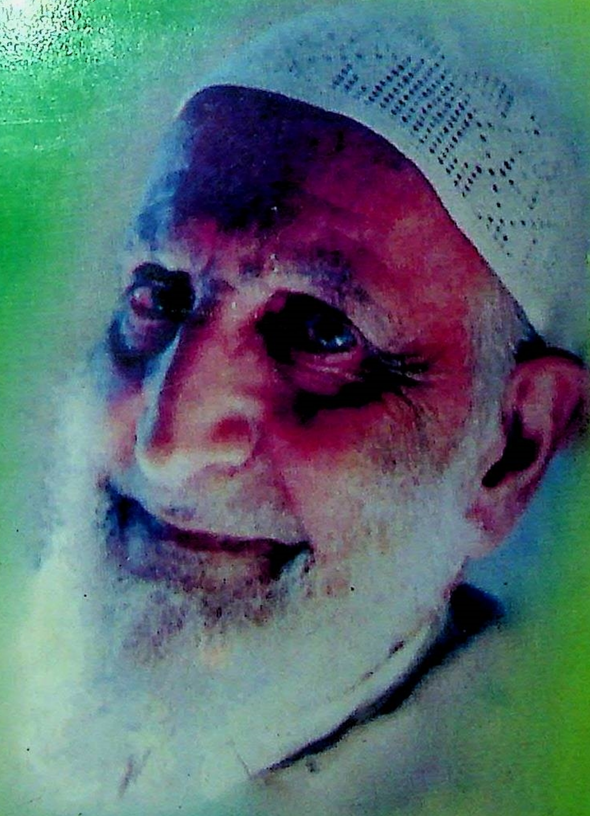
اشاعتِ خصوصی بیا[illegible] رسول نازکی

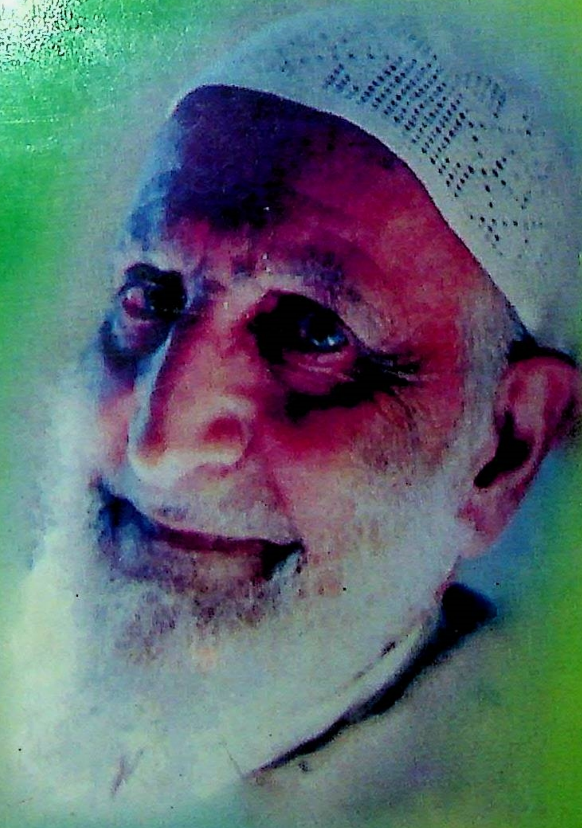
شیرازہ



جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

اشاعتِ خصوصی بیا[illegible] رسول نازکی

شیرازہ



جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگوجز

ماہنامہ

شیرازہ

سرینگر، کشمیر

جلد: ۴۷ | میر غلام رسول نازکی نمبر | شمارہ: ۱ تا ۵

نِگران:

ظفر اقبال منہاس

مُدیر:

محمد اشرف ٹاک

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

ناشر : سیکریٹری، جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگوئجز۔

کمپیوٹر کمپوزنگ: بشارت احمد بابا / عرفی غنی

مطبع: جے، کے، آفسیٹ پرنٹرس، نئی دہلی

شیرازہ میں جو مضامیں شائع ہوتے ہیں اُن میں ظاہر کی گئی آراء سے اکیڈیمی یا ادارے کا کُلّاً یا جُزواً اتفاق ضروری نہیں۔

قیمت : ۶۰ روپے

مجلّد : ۷۵ روپے

سرِورق

فوٹوگراف: مظفر علی

ڈیزائننگ: بشیر احمد

☆......خط و کتابت کا پتہ:

محمّد اَشرف ٹاک

ایڈیٹر ''شیرازہ'' اردو

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگوئجز

سرینگر / جموں

فہرست

شخصیّت

شاعری

نقوش

خراجِ عقیدت

سفر نامہ / مکتوبات / اوراق





مێٚیہ پَتہٕ تنقید گژھہ میأنِس کلامَس
دَپَن یہِ چھُ کأشریک روٗمی تہٕ رأزی
سِیہَ کارَس دَپَن دِل چھُس پُر اَنوار
سخن سأزی چھہ بڈٕہش جعلسأزی



متعین میرا رُتبہ جب کریں گے
کہیں گے ہے یہ کشمیری کا رومؔی
سیاہ کاری نظراَنداز کرکے
مِرے ہی دل میں ڈھونڈیں گے تجلّی
غُلو سے شان ہے شعر و سخن کی
سخن سازی ہے بے شک جعلسازی



My Verse will be assessed when I am gone,
and Placed at par with *Rumi* and *Razi's* art
the wicked me will be eulogized a saint;
poetry in effect is a deceptive craft

(Mir Gh.Rasool Nazki)

(16th March 1910 to 16th April 1998)

پیشِ لفظ

علمی وادبی شخصیات قوموں کا سرمایہ ہوتی ہیں، جس کا تحفظ، وضاحت اور تشہیر علمی، ادبی اور ثقافتی اداروں کا فرض ہے۔ ریاستی کلچرل اکادمی نامساعد حالات اور گوناگوں مشکلات کے باوجود اپنا یہ فریضہ پورا کرنے کی کوشش جاری رکھے ہوئے ہے۔ "شیرازہ" کے درجنوں خصوصی شمارے، مشاہیر نمبر اور شخصیات کے بارے میں لکھے گئے مونوگراف اس دعویٰ کا مُنہ بولتا ثبوت ہیں۔ میر غلام رسول نازکی مرحوم کے بارے میں شیرازہ اُردو کا موجودہ خصوصی شمارہ، جو اَب آپ کے ہاتھوں میں ہے، اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

میر غلام رسول نازکی بیسویں صدی کے کشمیر کے علمی، ادبی اور سماجی منظر نامے کا ایک درخشاں ستارہ ہیں۔ آپ کی ہمہ جہت شخصیت کا ہر گوشہ اور پہلو سنجیدہ علمی اور فکری مطالعے کا متقاضی ہے۔ وہ بیک وقت ایک اعلیٰ پایہ کے اُستاد، مقرر، محرر اور عالم وفاضل شخصیت تھے، انہیں کئی زبانوں پر دسترس ہی نہیں، مکمل عبور حاصل تھا۔ آپ ایک ادیب وانشاء پرداز ہونے کے ساتھ جیّد عالم دین اور مفکر بھی تھے۔ وسیع مطالعے اور سنجیدہ غور وفکر نے آپ کی سوچ اور اپروچ میں سمندر کی سی گہرائی اور گیرائی پیدا کردی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کی آخری سانس تک آپ نے اپنی مخصوص وضع داری اور باہمی رواداری پر مبنی روّیے کو سینے سے لگائے رکھا اور ایک متاعِ بے بہا کی طرح دودو ہاتھوں سے اس کی پاسداری اور پاسبانی کی۔ راقم کے لئے یہ بات باعثِ فخر وسعادت ہے کہ نازکی صاحب کی وفات سے کچھ برس پہلے مجھے رعناواری میں واقع اُن کے فرزند کے دولت کدے پر مرحوم کے نیاز حاصل کرنے اور لگ بھگ ایک ڈیڑھ گھنٹہ گذارنے کا موقع ملا۔ یہ وہ دور تھا جب کشمیر ایک طوفان سے گذر رہا تھا، تیز وتند آندھی نے بڑے بڑے پیڑوں کو جڑوں سمیت اُکھاڑ پھینکا تھا اور علم ودانشوری کے بڑے بڑے دعویدار تنگ نظری کے چھوٹے چھوٹے جوہڑوں میں غوطہ زن تھے۔ میں نے نازکی مرحوم کی ہمالیائی استقامت کے ساتھ اپنے اُن اعلیٰ اصولوں اور اقدار کو گلے لگائے ہوئے پایا، جو

انہیں زندگی بھر عزیز رہے تھے اور جن پر اُنہوں نے کبھی بھی مفاہمت نہیں کی۔ نازکی مرحوم اعلیٰ روایات اور قدروں کے امین تھے اور پاسدار بھی۔ لیکن وہ کسی بھی طور پر روایت پرست نہ تھے نہ ہی وہ اُن لوگوں کی برادری سے تعلق رکھتے تھے جو ہر نئی چیز کو دیکھتے ہی بنا جانچے اور پرکھے ناک سکوڑ لیتے ہیں۔ تنگ نظری، تنگ دِلی اور دقیانوسیت کے لئے اُن کی وسیع و عریض دُنیا میں کوئی جگہ نہ تھی۔ وہ خود بین تھے اور خدا بین بھی، لیکن اُن کے بدترین مخالفین نے بھی ان پر کبھی بد بین ہونے کا الزام نہیں لگایا۔ دوسرے معنوں میں میر غلام رسول نازکی شریف النفس انسان ہی نہ تھے بلکہ اُن کی دانشواری اور اُن کا سارا علم و فضل اُن کی شرافت، وضع داری اور اُن کے بنیادی معتقدات کے ہمیشہ تابع رہا۔ اُن کی شاعری اور دوسری تحریریات پر کشمیر کی تہذیبی و تمدنی روایات کے شانہ بشانہ اعلیٰ انسانی قدروں اور مثبت فکر و نظر کی گہری چھاپ ہر جگہ نظر آتی ہے۔ آپ کے شعری لب و لہجے اور رنگ و آہنگ میں ایک فطری روانی ہے اور زندگی اپنے تمام رنگوں کے ساتھ جھلکتی دکھائی دیتی ہے۔ جہاں ایک طرف حُسن فطرت کی عکاسی ہے وہاں دوسری جانب تلخ و شیریں تجربات اور مشاہدات کا بھی بھرپور ذکر ہے۔ اُن کے علمی اور ادبی کارنامے کلاسیکی اقدار اور ادبی حسیّت کا ایک حسین امتزاج ہیں۔ اُن کے ہاں اعلیٰ درجے کا عقیدتی ادب ہے اور حُسن و عشق کی ناز برداریاں بھی، غمِ ذات بھی ہے اور کائنات کا رونا بھی۔

کلچرل اکادمی کے ساتھ مرحوم کا دیرینہ رشتہ تھا، ہمارے لئے یہ بات موجبِ فخر و مسّرت ہے کہ اکادمی مرحوم کی گراں قدر علمی اور ادبی خدمات کے پیش نظر شیرازہ کا یہ خصوصی نمبر شائع کر رہی ہے جو بہر حال ''برگِ سبز است تحفہ درویش'' کے مصداق ہماری ایک مخلصانہ کوشش ہے۔ مجھے امید ہے کہ اکادمی خاص کر شیرازہ کے ایڈیٹر، محمد اشرف ٹاک کی مساعی جمیلہ کو ستائش کی نظروں سے دیکھا جائے گا۔

ظفر اقبال منہاس

سیکریٹری

سرینگر۔ ۱۸ر فروری ۲۰۰۹ء

حرفِ آغاز

ہماری یہ سرزمین رنگ آمیزیوں اور جلوہ سامانیوں سے عبارت ہے۔ یہ وصف یہاں کے قدرتی نظاروں ہی میں نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ کتنے ہی عالم اور فاضل اِس دھرتی سے اُٹھے اور علم وفن کے آبِ زُلال کے کتنے ہی سُوتے جاری کیے جن سے تشنگانِ علم ٹیگوں ٹیگوں سے اپنی پیاس بجھا رہے ہیں۔ اِن ہی عالموں اور فاضلوں کی کہکشاں میں میر غلام رسول ناز کی اپنی تابانی اور کمالات کی بناء پر نمایاں انداز میں جلوہ گرنظر آتے ہیں۔ اُنھوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے نہ صرف مادری زبان کشمیری کا دامن مالا مال کیا بلکہ وہ اُردو دُنیا میں کشمیر کے حوالے سے ایک قابلِ احترام ہستی ہیں اور یہ معتبر نام گزشتہ نصف صدی سے بھی زائد عرصے سے اہلِ ادب اور قارئین کے ذہن ودِل پر لگاتار دستکیں دے رہا ہے۔

کشمیر کا رہنے والا ہوں، اُردوئے معلّٰی لکھتا ہوں
اِس دیس میں سب مجھ سا کوئی بھی اُردو کا سخنور ہو نہ سکا

اردو کے مسلّم الثبوت اساتذہ کا ماننا ہے کہ میر غلام رسول ناز کی بے حد

موزون طبع تھے۔ اُنہوں نے شاعری کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی۔ نظمیں بھی کہیں اور غزلیں بھی۔ رُباعی کے میدان کے تو وہ شہسوار تھے۔ غزلیں، نظمیں، رباعیات اور نثر میں منفرد اسلوب اُن کی تخلیقی قوّتوں اور فنّی بصیرت کا ثبوت ہے۔ اُن کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ زبان و بیان کی پیچیدگیوں اور بحر و اوزان کی نزاکتوں پر کمال قدرت رکھتے تھے۔ اُن کے تخلیقی تجربات کی بنیادیں بہت ہی وسیع اور کشادہ تھیں وہ زندگی کی پیچیدگیوں، الجھنوں اور افتادوں سے واقف تھے۔ اُن کی فکر میں تازگی، وسعت، تنوع، تہہ داری اور حقیقت پسندی ملتی ہے۔

زندگانی ہے قصیدہ یا رجز یا مرثیہ
دوستو! اِس میں غزل کا بانکپن کب آئے گا

میر غلام رسول نازکی نے خونِ جگر سے فنِ شعر کے چراغ کو روشن کیا اور اُن کے اظہار میں اپنی طرف متوجہ کرنے والا انوکھا پن ملتا ہے۔ اُن کے روایت ساز اسلوب میں جو لہجہ، تازگی، شادابی بے تکلفی، برجستگی، سلاست اور سادگی ہے وہ روشن، واضح فکر اور خلوص سے پیدا ہوئی ہے:

خواب تھا یا طلسم کا عالم
تیرے آنے سے تیرے جانے تک
سو مراحل سے دل گزرتا ہے
شعر کہنے سے گنگنانے تک
میکدے میں مجھے نظر آیا
راستہ تیرے آستانے تک

میر غلام رسول نازکی کا ایک بہت بڑا وصف فنِ تاریخ گوئی پر اُن کی کمال دَست رَسی تھی۔ عربی، فارسی، اردو اور کشمیری زبان میں ان کے تخلیق کیئے ہوئے سینکڑوں مادۂ تاریخ اُن کا چھوڑا ہوا عظیم سرمایہ ہے۔ اب دُور دُور تک کوئی ایسی شخصیّت نظر نہیں آتی جو ہماری اس تہذیبی طرحداری پر اسقدر کمال رکھتی ہو۔ فنِ تاریخ پر بھی اُن کی گہری نظر تھی۔ کشمیر کی تمدّنی تاریخ کے حوالے سے وہ ایک چلتا پھرتا انسائیکلوپیڈیا تھے۔ زندگی کے بارے میں اُن کا واضح نکتہ نظر تھا اور ہمیشہ استقامت، ایقان، راست بازی، عملِ پیہم اور عبادتِ الٰہی کی تلقین کیا کرتے تھے:

موت کا جب نام سنتے ہیں تو ڈر جاتے ہیں لوگ
تم نے دیکھا، ہم نے دیکھا، پھر بھی مرجاتے ہیں لوگ

زیرِ نظر اشاعت اِس عظیم فرزندِ کشمیر اور اردو کے ایک جری سپاہی کو خراجِ تحسین پیش کرنے کی ایک مخلصانہ کوشش ہے جس نے مختلف زبانوں میں اپنی سخنوری کی انمٹ تاریخ رقم کی۔ ہمیں اعتراف ہے کہ یہ صفحات میر غلام رسول نازکی کی شخصیّت، اُن کے فن اور عظمت کو پوری طرح سمیٹنے سے قاصر ہیں کیوں کہ اُن کی شخصیّت کی اتنی جہات ہیں کہ ہر جہت کا احاطہ تو درکنار صحیح خاکہ کھینچنے کے لئے الگ الگ کتابوں کی ضرورت ہے۔ حق تو یہ ہے کہ نازکی مرحوم کی حیات کے کئی اور گوشے اجاگر کرنے کے لئے ہم نے بہت سے اصحاب سے رجوع بھی کیا تھا لیکن ہمارے ہاتھ نہ ختم ہونے والے اِنتظار کے سوا کچھ اور نہیں آیا۔

ادارہ اُن تمام کرم فرماؤں کا بے حد مشکور ہے جنہوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود ہمیں مضامین ارسال کیئے۔ خانوادۂ نازکی، خصوصاً ڈاکٹر

ایاز رسول نازکی صاحب کا شکریہ اِس لحاظ سے واجب ہے کہ اُن کی شفقت اور انکا عملی تعاون قدم قدم ہمیں آگے بڑھنے کا حوصلہ بڑھاتا رہا۔ جناب پران کشور، جناب فاروق نازکی، ڈاکٹر اقبال نازکی، جسٹس بلال نازکی، جناب وقار نازکی، جناب نعیم اختر، پروفیسر غلام رسول ملک اور ڈاکٹر رفیق مسعودی نے قلمی تعاون کے ساتھ ساتھ ذاتی کلیکشن سے بعض نوادرات مرحمت فرمائے جو کہ زیرِ نظر شمارے کے معنوی اور صوری حُسن میں اضافہ کرتے ہیں۔ زیرِ نظر خصوصی شمارے میں سیاق وسباق کے لحاظ کئی انگریزی مضامین بھی شامل کئے گئے ہیں جن سے نازکی مرحوم کی شخصیت کے کئی رنگارنگ پہلو سامنے آتے ہیں۔

سیکریٹری اکیڈیمی جناب ظفر اقبال منہاس کی مدبرانہ رہنمائی ہمارا بہت بڑا اثاثہ ہے۔ آرٹسٹ، جی احمد، پبلی کیشن آفیسر ناظم الدّین اُن کے معاون محمد امین شیخ اور کمپیوٹر آپریٹر بشارت احمد بابا کی لگن سے یہ عظیم پروجیکٹ کامیابی سے ہمکنار ہوا۔ اِن سبھی حضرات کے احسانات کا شکریہ ادا کرنا میرا خوشگوار فریضہ ہے۔

بعض کمیوں اور کوتاہیوں کے ہوتے ہوئے بھی ہمیں اُمید ہے کہ قارئین حضرات ہمیں زیرِ نظر خصوصی شمارے کے بارے میں اپنی آراء سے نوازیں گے تاکہ آگے بڑھنے کے لئے ہمیں راہیں روشن ہوسکیں!

خودی سے مردِ خود آگاہ کا جلال و جمال
کہ یہ کتاب ہے باقی تمام تفسیریں

............☆ محمد اشرف ٹاک

حامدی کاشمیری

میر غلام رسول نازکی

میر غلام رسول نازکی بدھوار ۴ ربیع الاوّل ۱۳۲۸ھ کو تولّد ہوئے۔ اُن کے والدِ بزرگوار میر غلام مصطفٰے نازکی ۱۳۳۰ھ میں سرینگر سے ہجرت کر کے بانڈی پورہ گئے اور وہاں ماڈر کے گاؤں میں مقیم ہوئے۔ میر غلام رسول نازکی کا بچپن اور جوانی کا زمانہ اسی گاؤں میں گزرا۔ چوں کہ اُن کے والدِ ماجد عربی اور فارسی کے جیدّ عالم تھے اس لئے نازکی صاحب کو علمی ماحول میسّر آیا۔ اُنھوں نے باپ سے فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم گھر ہی میں حاصل کی تھی۔ ۱۹۷۶ بکرمی میں اُن کو لوئر مڈل سکول بانڈی پورہ میں داخل کیا گیا۔ ۱۹۸۰ بکرمی میں اُنہوں نے چھٹی جماعت کا اِمتحان پاس کیا، تعلیم کو جاری رکھنے کے لئے اُنہوں نے سوپور کا رخ کیا لیکن وہاں رہائش کا کوئی معقول انتظام نہ ہونے کی وجہ سے وہ سرینگر چلے گئے اور کادی کدل سرینگر میں اپنے خاندان کے لوگوں کے ساتھ رہنے لگے۔ ۱۹۸۲ بکرمی میں اُنہوں نے اسلامیہ ہائیر سکول سرینگر سے مڈل کا امتحان اور پنجاب یونیورسٹی سے

منشی کا امتحان پاس کیا۔ چوں کہ گھر میں آمدن کا کوئی ذریعہ نہ تھا اسی لئے سرینگر میں حصولِ تعلیم کے دوران اور بعد میں اُن کوئی کام کرنا پڑے۔ آخر میں ان کو بانڈی پورہ سے ۴۰ میل دُور وڈی پورہ، ہندواڑہ میں آٹھ روپے ماہوار پر عربی فارسی کی مدرسی ملی اور مالی مشکلات پر کسی حد تک قابو پانے میں کامیاب ہوئے۔

۱۹۳۱ء میں اُنہوں نے منشی عالم اور ۱۹۳۲ء میں میٹرک کے امتحانات پاس کئے اور اُن کی تنخواہ ۲۰ روپے ماہوار ہوگئی۔ ۱۹۳۵ء میں اُنہوں نے منشی فاضل اور ۱۹۳۷ء میں ادیب فاضل کے امتحانات پاس کئے۔ ادیب فاضل میں پنجاب بھر میں اُن کا دوسرا درجہ تھا۔ ۱۹۳۹ء میں انہوں نے ایف اے کا امتحان پاس کیا لیکن محکمہ تعلیم میں اُن کی کوئی قدر افزائی نہ ہوئی۔ لکھتے ہیں ''اس سے مجھ میں شکست خوردگی کے آثار ظاہر ہوئے اور میں نے مزید امتحانات پاس کرنا بے کار سمجھا۔ ۱۹۳۹ سے ۱۹۴۳ تک کا زمانہ اِسی پریشان حالی میں گذرا''

۱۹۴۳ء ہی میں مشہور ماہر تعلیم خواجہ غلام السیّدین ناظمِ تعلیمات نے اُن کو بطور لٹریری اسسٹنٹ اپنے ساتھ رکھ لیا اور ۳۵۔۱۔۲۰ کے گریڈ سے نکال کر ۶۰۔۲۔۴۰ کے گریڈ میں ترقی دی۔ اس کے بعد اُن کو ٹیچرس سکول میں استادِ زبان بنا کر تبدیل کیا گیا۔ پھر کچھ عرصہ تک اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز رہے۔ ۱۹۴۷ء تک یہی سلسلہ رہا۔ ۱۹۴۸ء میں اُن کا تبادلہ ریڈیو کشمیر جموں میں ہوا جہاں سے وہ ملازمت سے سبکدوش ہو کر وظیفہ یاب ہوئے۔

نازکی صاحب کی طبیعت بچپن ہی سے شعر وادب کی طرف مائل تھی۔ گھر کا ماحول علمی وادبی تھا۔ والد صاحب عربی وفارسی کے عالم ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجے کے سخن شناس تھے۔ نظامی کا خمسہ پڑھاتے ہوئے اُنہوں نے نازکی صاحب کو اَدب کی نزاکتوں اور نفاستوں کے روشناس کرایا۔ بعد میں اُردو شعر وادب کی طرف پورے ذوق وشوق سے متوجہ ہوئے۔ بعد میں محمد حسین آزاد کی ''آبِ حیات'' نے جادو کا کام کیا۔ لکھتے ہیں''

''میں نے اِسے پڑھا، اور آج تک مجھے یاد ہے کہ میں اِسے پڑھ کر دیوانہ سا ہوگیا۔ بیسویں مرتبہ اس کتاب کو پڑھا۔ اس سے پہلے میں فارسی ادب وشعر کا دلدادہ تھا اور اُردو کی چاشنی سے واقف نہ تھا۔ آبِ حیات پڑھ چکنے کے بعد میں نے اپنی رائے بدل دی اور اُردو کا عاشق ہوا۔''

اس کے بعد اُردو شاعری اور خاص کر کلاسیکی شاعری سے اُن کا دلی لگاؤ قائم ہوا۔ اُنہوں نے ابتدا میں اساتذہ قدیم کی پیروی میں غزلیں لکھیں لیکن ساتھ ساتھ وہ جدید شاعری کا مطالعہ بھی کرتے رہے۔ اس مطالعے کے زیرِ اثر اُنہوں نے قدیم رنگ کی غزلیں بعد میں ضائع کیں۔

مشقِ سخن کے ساتھ ساتھ وہ شاعری کا برابر مطالعہ کرتے رہے اور خاص کر بدلتے رجحانات پر اُن کی نظر رہی۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

''اردو کے رجحانات بدلتے گئے اور مسلسل میں مطالعہ کے ذریعے اس کے بدلتے ہوئے رجحانات سے متاثر ہوتا گیا اور میرے کلام میں اس طرح تبدیلیاں آتی گئیں''

وہ اس زمانے کے مشہور اور معیاری ادبی جرائد مثلاً ادبی دُنیا، ہمایوں اور ساقی کا برابر مطالعہ کرتے رہے اور ان رسائل میں اُن کی منظومات چھپتی رہیں اُن کی ایک نظم "ایک اندھی لڑکی کی دُعا" رسالہ کلیم، جو جوش ملیح آبادی کی اِدارت میں نکلتا تھا، میں شائع ہوئی نظم بہت مقبول ہوئی۔ اس میں ایک اندھی لڑکی کے معصوم جذبات کی مؤثر ترجمانی کی گئی ہے۔ یہ نظم لاہور کے کئی پرچوں میں نقل کی گئی اور نازکی صاحب ریاست کے باہر ہندوستان کے ادبی حلقوں میں متعارف ہوئے۔

نازکی صاحب کی شاعری میں اُن کی زندگی کے واردات ومشاہدات کی جلوہ گری ملتی ہے۔ وہ تخیّل آرائی، خیال طرازی یا لسانی تزئین کاری سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے۔ اُردو کے اکثر وبیشتر شعرا اِسی کے شکار رہے ہیں۔ نازکی صاحب کی شخصیّت میں جذبات کی کارفرمائی ہے مگر جذبات کا وفور نہیں وہ عقلی قوتوں سے کام لے کر اپنے جذبات کو قابو میں رکھتے ہیں۔ اس سے اُن کی شاعری جذباتیت سے آلودہ نہیں ہوتی ہے۔ وہ زندگی کے نشیب وفراز سے گذرتے ہوئے مختلف حقائق سے متصادم ہو کر اپنے داخلی ردِ عمل کو لفظوں کا جامہ پہناتے ہیں۔

اس طرح سے اُن کی شاعری زندگی کے دُکھ درد کا احساس پیدا کرتی ہے۔ نازکی صاحب کی نجی زندگی جدوجہد کی ایک طویل اور کرب انگیز داستان ہے وہ اپنے عہد اور ماحول کی سختیاں برداشت کرتے رہے اور اپنی شخصیّت کو منتشر ہونے سے محفوظ رکھنے کے لئے شعر گوئی میں منہمک رہے۔ چنانچہ ان کے یہاں غمِ روزگار، عشق، حُسن، درد، تزکیہ نفس، درد وحسرت،

میر غلام رسول نازکیؔ کے والد بزرگوار میر مصطفےٰ نازکی کا ایک مکتوب۔

میر غلام رسول نازکی کا شمیم احمد شمیم کے نام ایک خط۔



عبدالحق برق، محمد امین بٹھ اور میر غلام رسول نازکیؔ ۔

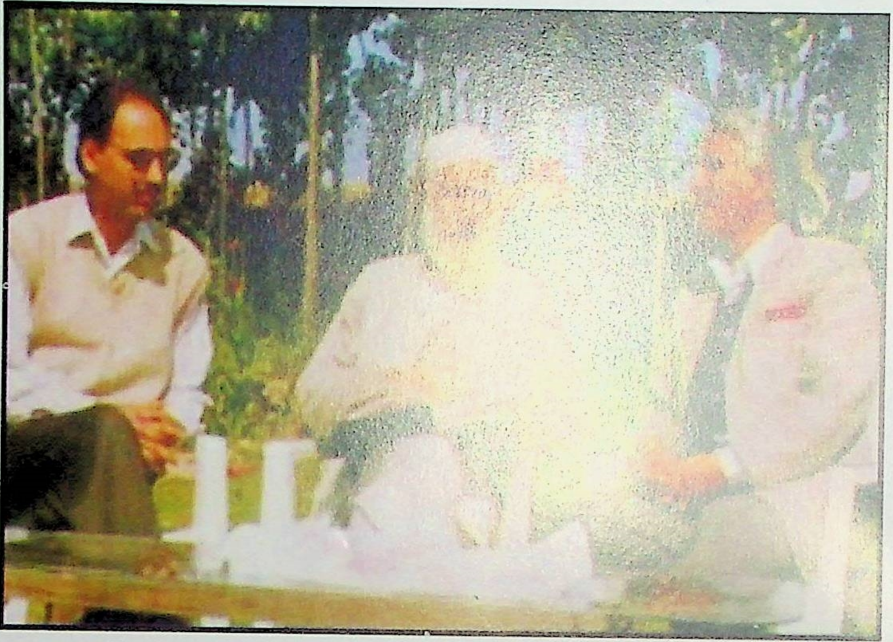
سرینگر

الغفران

ہفت روزہ

دلوں کو مرکز مہر و وفا کر
حریم کبریا سے آشنا کر
جسے نان جویں بخشی ہے تو نے
اسے بازوئے حیدر بھی عطا کر
(اقبال)

میر غلام رسول نازکی کی ادارت میں شائع ہونے والے اخبار الغفران کے ایک صفحے کا عکس۔



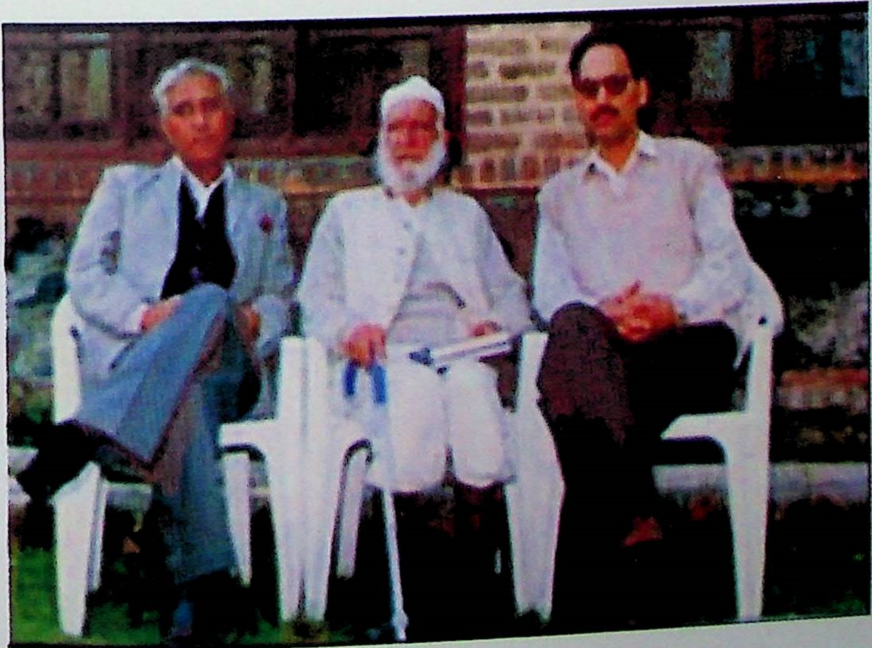
معراج الدین سابق ایڈیشنل سیکریٹری کلچرل اکیڈیمی، میر غلام رسول نازکیؔ اور ظفر مظفر، ایڈیٹر (کشمیری)۔



میر غلام رسول نازکیؔ اکیڈیمی کے زیر اہتمام کل ہند اردو مشاعرے میں۔



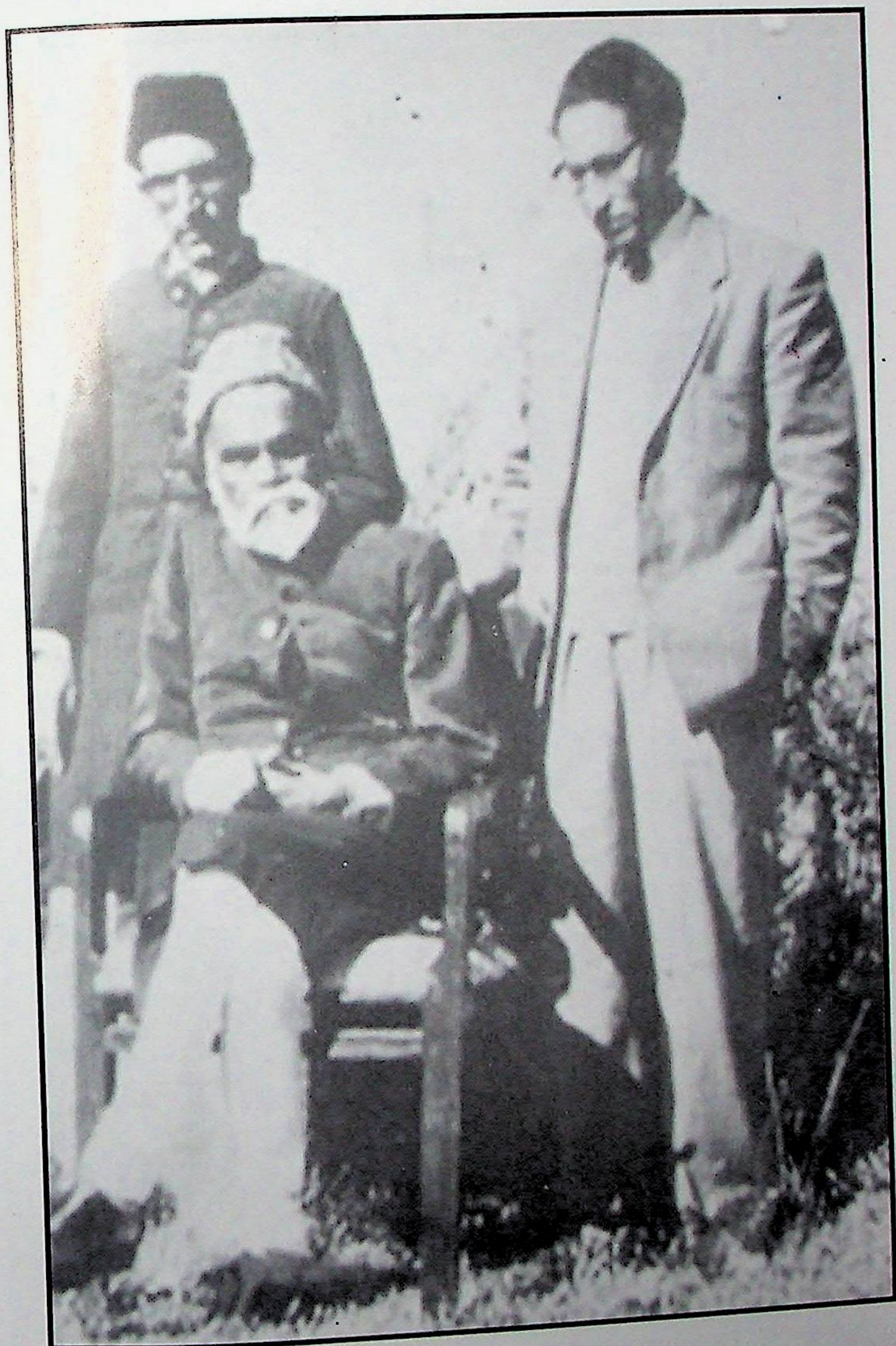
میر غلام رسول نازکیؔ ،محمد امین اندرابی ، فاروق نازکیؔ ۔



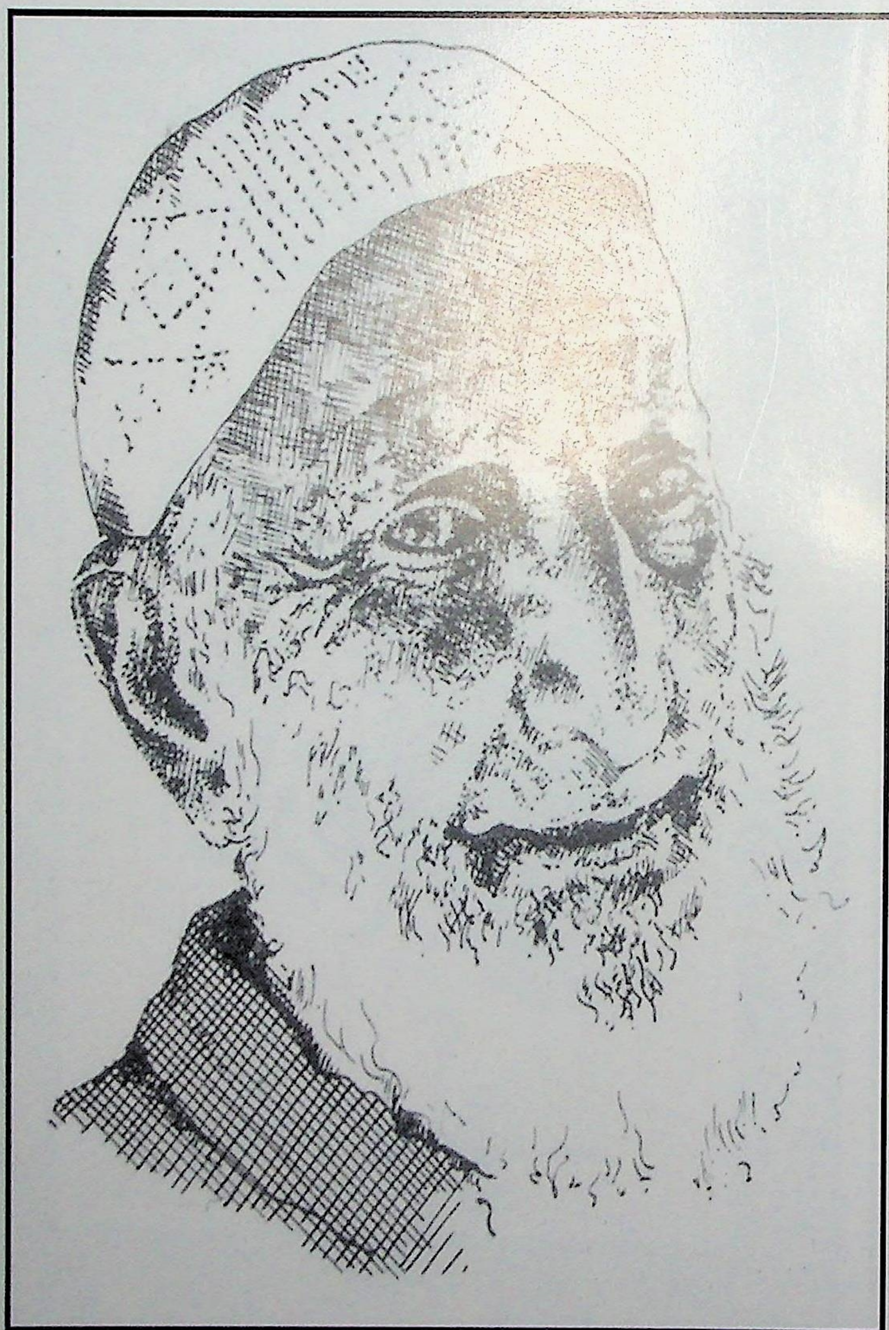
ظفر مظفر، میر غلام رسول نازکیؔ اور معراج الدین۔



میرے غلام رسول نازکیؔ۔ سرکردہ فلمسار مظفر کی نظر میں۔



عبدالحق برقؔ، جگر مرادآبادی اور میر غلام رسول نازکیؔ۔



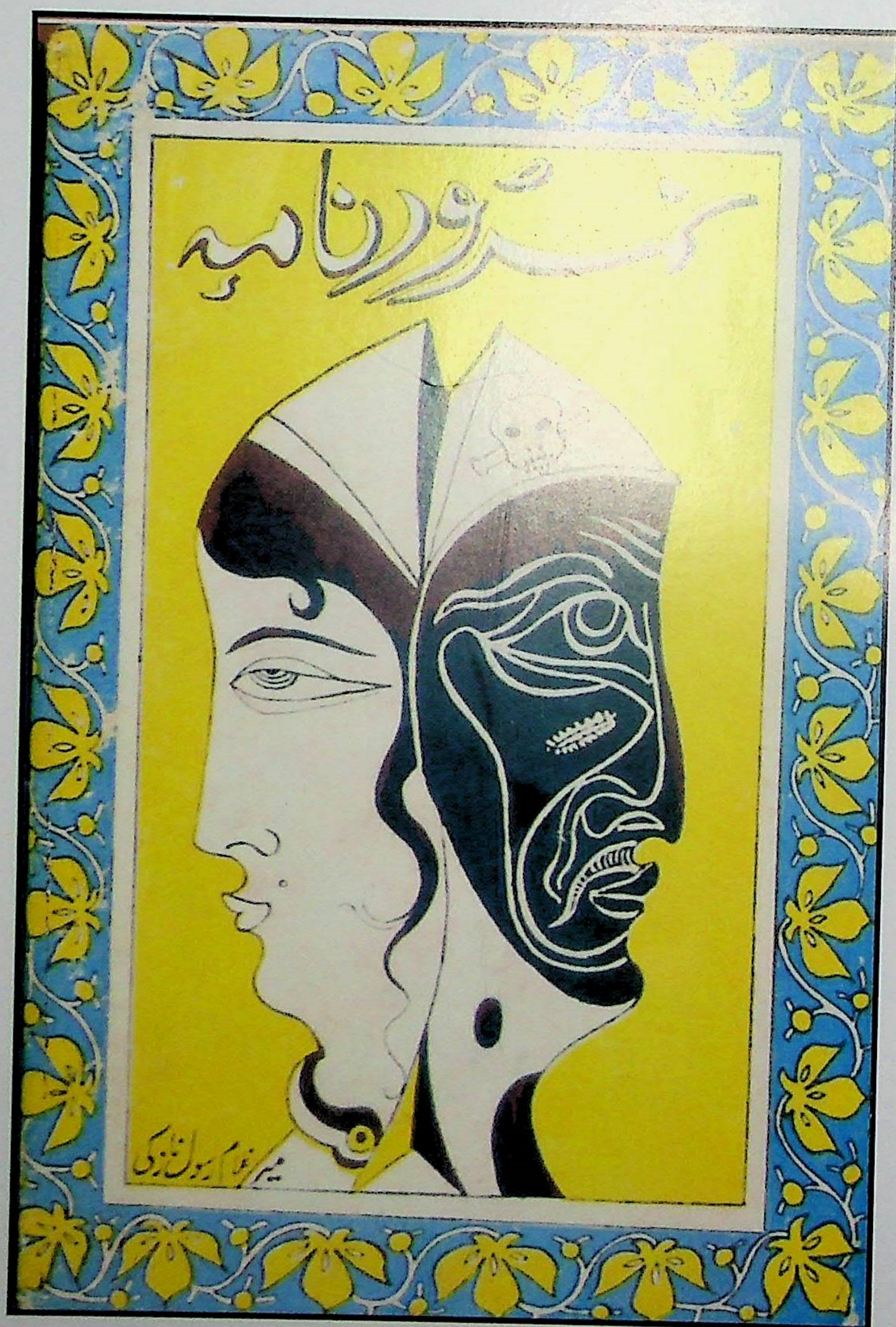
میر غلام رسول نازکیؔ

خشک تار و خشک چوب و خشک پوست
از کجا می آید این آوازِ دوست
(رومی اعلی اللہ مقامہٗ)

آوازِ دوست

میر غلام رسول نازکی

آوازِ دوست کا سرورق



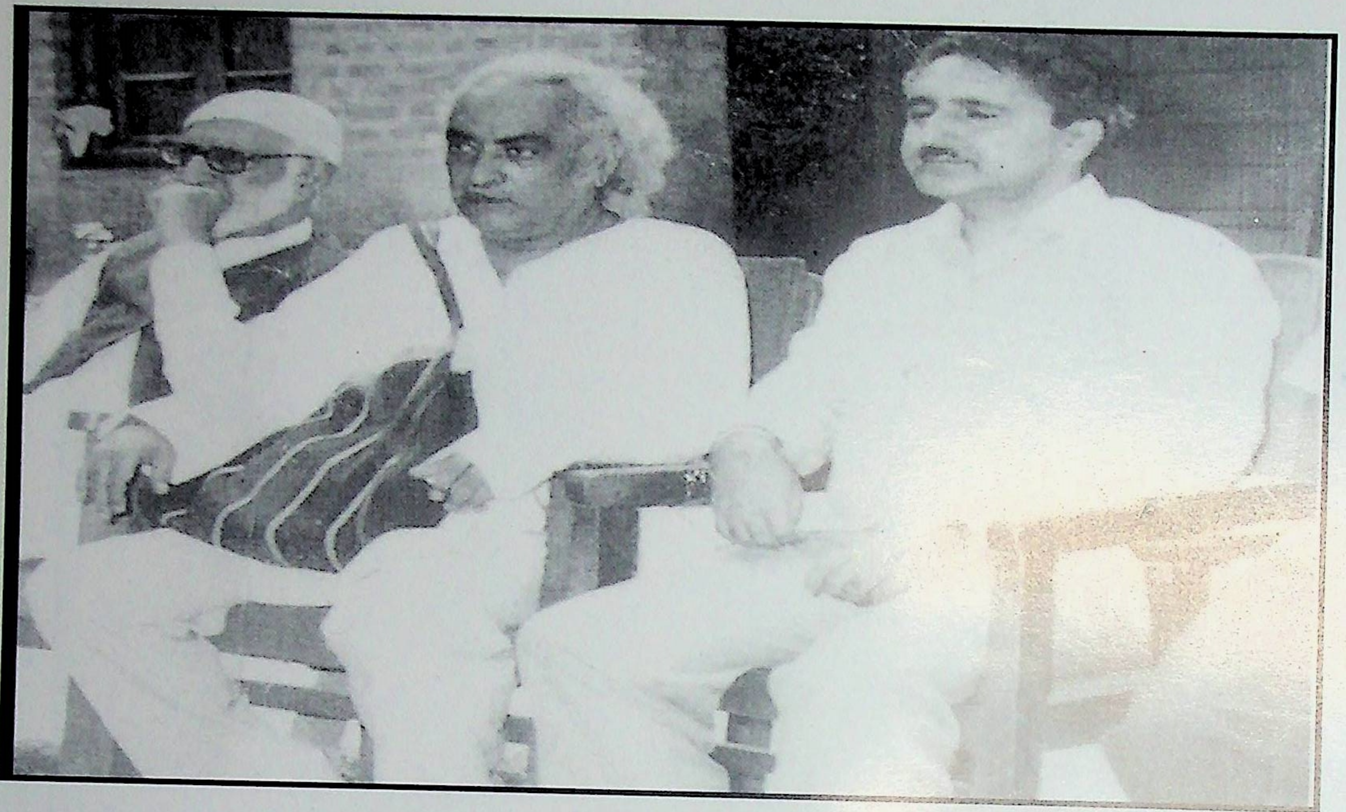
نمرود نامہ کا سرورق

ECHO

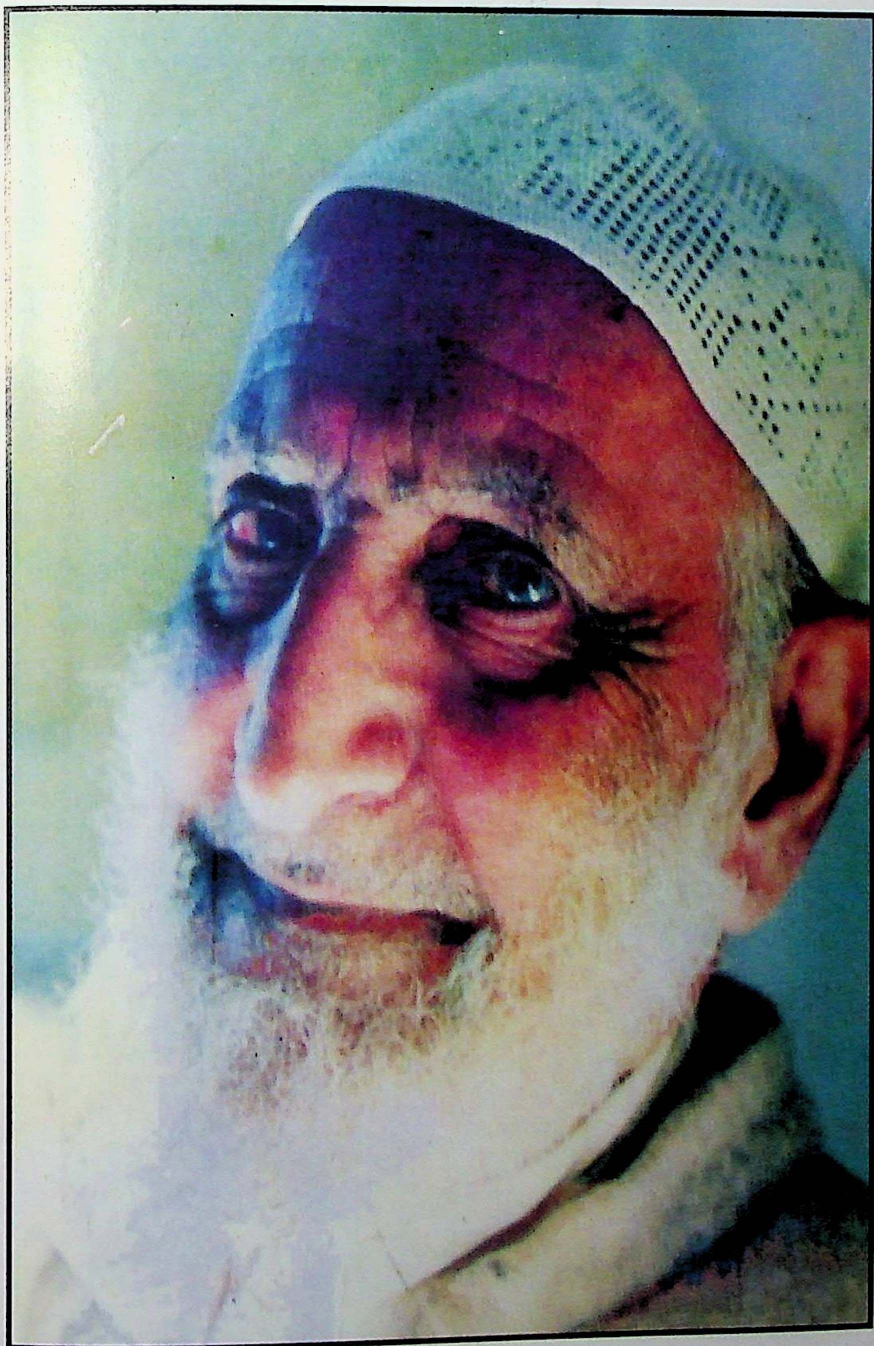


TRANSLATION OF
A SELECTION OF KASHMIRI
RUBAIYAT - E - NAZKI

AYAZ RASOOL NAZKI



محمد یوسف ٹینگ، غلام رسول سنتوشؔ، میر غلام رسول نازکیؔ



میر غلام رسول نازکیؔ ۔

عکس خط............میر غلام رسول نازکیؔ ۔

Gulzar

متاعِ فقیر

فلمساز گلزار کا میر غلام رسول نازکیؔ کے نام ایک مکتوب۔

بے ثباتیٔ دنیا، طولِ امل، استغنا اور عدیم الفرصتی کے مضامین لفظ و پیکر میں مجسم ہوئے ہیں۔

ان سارے خیالات وتصوّرات میں ان کے یہاں احساسِ غم سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ ابتدائی دَور کی شاعری میں اس کا خاصا حاوی اثر نظر آتا ہے۔ غ۔م طاؤس کا خیال ہے کہ شروع سے آخر تک اُن کے یہاں غم کا عنصر موجود ہے۔ لکھتے ہیں:۔

''شروع سے آخر تک آپ کے کلام کا تجزیہ کیا جائے تو ظاہر ہوگا کہ آپ کی شاعری ایک دکھی دل کی پکار ہے۔ ایک غم انگیز پکار۔ آپکے یہاں غمِ زندگی کی حقیقت اہم ترین حقیقت سے عبادت ہے''

چند اشعار یہ ہیں۔

محبت زندگی اور زندگی غم ہوتی جاتی ہے
خوشی تحلیل ہو کر غم میں مدغم ہوتی جاتی ہے



آگ کی حدّت، خلش کانٹے کی، پارے کی تڑپ
یہ مرکب جب ہوا، پہلو نشین دل ہوگیا



دل عموماً اداس رہتا ہے
وقف حرماں و یاس رہتا ہے
چھوڑ جاتے ہیں ساتھ سب ساتھی
ایک غم ہے جو پاس رہتا ہے

نازکی صاحب کے یہاں دو نمایاں شعری رجحانات ملتے ہیں۔

(۱) فطرت نگاری (۲) خیالی دنیا بسانے کی آرزو۔ چونکہ نازکی صاحب کشمیر کی حسین و جمیل وادیوں میں سانس لیتے ہیں اس لئے کشمیر کے خوبصورت مناظر اُن کی شخصیت کا حصہ بن چکے ہیں اور انہیں محبوب میں بھی "کشمیر کی رعنائی" نظر آتی ہے۔ منظر نگاری کا رجحان انیسویں صدی میں حالیؔ اور آزادؔ کے بعد کئی شعرا کے یہاں ملتا ہے یہاں تک کہ چکبستؔ، اقبالؔ، سیمابؔ اکبر آبادی، جوشؔ ملیح آبادی اور حفیظؔ جالندھری کے یہاں بھی فطرت سے قلبی وابستگی کا احساس ہوتا ہے اور اُنہوں نے فطرت کے حسین مظاہر کی فنکارانہ تصویر کشی کی ہے۔ نازکی صاحب نے اس رجحان سے بھی اکتساب فیض کیا ہے۔ مثلاً

چاندنی کرنوں سے دُنیا حُسن کا گہوارہ ہے
یہ تو مہتاب ہے یا نور کا فوارہ ہے
جلوہ گاہِ طور ہے پست و بلندِ کائنات
رات کا سنسان منظر ہے، نظر آوارہ ہے



اک سہانی چاندنی رات اور مانسبل کی جھیل
حُسن کی چپ چاپ دنیا، خلد کا عکسِ جمیل
دُور تا حدِ نظر سرسوں کے کھیتوں کی قطار
آرزو کا سلسلہ لا انتہا، فرصت قلیل

فطرت نگاری کے ساتھ ساتھ کے زیر اثر ان کے یہاں کشمیر پرستی ملتی ہے۔ کہتے ہیں ؎

مرے کشمیر کی ہر شے حسیں ہے
یہاں کی ہر پہاڑی مہ جبین ہے
فلک پر اِس زمین کی سرزمین ہے
فلک خود ڈل کے اندر تہہ نشیں ہے

دوسرے اُن کے یہاں تخیّلات کی دنیا میں مراجعت کرنے کا رویّہ ملتا ہے یہ ایک رومانی رویّہ ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ نازکی صاحب حقیقی دنیا سے سارے رشتوں کی تنسیخ کرتے ہیں، ایسی بات نہیں، وہ حقیقت کے طمانچے سہتے ہیں اُن کا وجود مجروح ہوتا ہے، اُن کے خواب بِکھر جاتے ہیں، وہ پیکرِ حسرت ویاس بن جاتے ہیں لیکن وہ اِسی پر بس نہیں کرتے بلکہ اپنی حقیقتی پناہ گاہ یعنی تخیّلات کی دنیا میں دم لیتے ہیں اور پھر حادثاتِ دنیا کا جائزہ لیتے ہیں:۔

جو میرے دل میں تلاطم ہے کہہ نہیں سکتا
حقیقتوں کے طمانچے میں سہہ نہیں سکتا
تخیّلات کی دنیا میں میری جنّت ہے
میں واقعات کی دنیا میں رہ نہیں سکتا



خیالِ یار میں قدرت ہے تخلیق دوعالم کی
اکیلا رہ کے لاکھوں خلوتیں آباد کرتا ہوں
بھلاتا ہوں مگر پھر خود فراموشی کے عالم میں
خدا جانے میں کیوں اس بے وفا کو یاد کرتا ہوں

نازکی صاحب معاشرتی اور فکری دونوں سطحوں پر زندگی، مرگ، آرزو اور حسرت وغم کے مسائل پر غور وفکر کرتے ہیں۔ اُن کے دل ودماغ میں متنوع خیالات گونجتے ہیں۔ وہ ان ہی خیالات سے نبرد آزما رہتے ہیں اوران کو چابک دستی، صفائی اور ہنر مندی سے نظم کرتے ہیں۔

نہ قسمت میں حیاتِ جاوداں ہے
نہ اَپنے بس میں مرگِ ناگہاں ہے
مری مجبور دُنیا پر مسلّط
اندھیرا ہے، سیاہی ہے، دھواں ہے
نہ میری شمع بن کر جل سکوگے
نہ خواب آلودہ آنکھیں مَل سکوگے
مری تاریک دنیا کے مسافر
اندھیرے میں کہاں تک چل سکوگے؟

میر غلام رسول نازکی اقبالؔ کے افکار وخیالات سے بھی متاثر ہیں۔ مثلاً:

کون کہتا ہے شبِ غم کی سحر ہونے لگی
امن وآسائش کی صورت جلوہ گر ہونے لگی
جب سے پھینکی فکرِ انساں نے ستاروں پر کمند
زندگی دشوار تھی، دشوار تر ہونے لگی



ترا مقام مقامِ رضا سے آگے ہے
خودی نہ بیچ، طفیلی نہ بن، سوال نہ کر

کاش یہ نکتہ سمجھ جائیں جوانانِ عزیز
جب نہیں عزت تو پھر بے جان ہے جانِ عزیز



نازکی صاحب کا مزاج عاشقانہ ہے۔ اُن کے جذبۂ عشق کی سطح بلند ہے وہ حسن و عشق کے امتزاج سے ایک جمالیاتی فضا کی تخلیق کرتے ہیں۔ یہ فضا جذبات کی قوس قزح سے دمکتی ہے۔

مرے نغموں کی موسیقار تم ہو
مرا دیپک، مرا ملہار تم ہو
میں فواروں میں کرلوں گا چراغاں
کہ میری شامِ شالامار تم ہو



خواب تھا یا طلسم کا عالم
تیرے آنے سے تیرے جانے تک



ساقی کی مست آنکھیں خم خانہ زندگی کا
چشم سیہ کی گردش پیمانہ زندگی کا



مچل نہ جائے کہیں یہ دل فراقِ پسند
خدا کے واسطے آرائشِ جمال نہ کر



دنیائے محبت کی ہر چیز نرالی ہے
خاموش اِشاروں پر بنیادِ تکلّم ہے



اس دہکتے عذار پر آنسو
شفقِ شام میں ستارا ہے

نازکی صاحب نے غزلیں بھی لکھی ہیں اور قطعات بھی اور گاہے گاہے نظمیں بھی لکھتے رہے۔ اُن کے الفاظ کلاسیکی اور روائیتی ہیں لیکن کبھی کبھی ضرورتاً وہ روزمرہ زندگی کے الفاظ کو بھی بڑی مہارت سے برتتے ہیں۔ زبان پر اُنہیں قدرتِ کاملہ حاصل ہے یہی وجہ ہے کہ اُن کے یہاں روانی، بے تکلفی اور شگفتگی ملتی ہے۔ وہ الفاظ کا کفایت اور نفاست سے استعمال کرتے ہیں اور گاہے گاہے تشبیہہ واستعارے سے کلام کی فضا کو رنگین بناتے ہیں۔ قطعہ نگاری میں ان کو یدِطولیٰ حاصل ہے۔ اسی صنف میں وہ علامہ اقبالؒ سے بے حد متاثر ہیں۔ بعد میں انہوں نے اخترؔ انصاری اور احمد ندیم قاسمی سے بھی اکتسابِ فیض کیا۔ اُنہوں نے اپنے قطعات میں خیالات وتجربات کی ایک فکرانگیز دنیا بسائی ہے۔ اُن کے قطعات اُن کے شعورِ عصر کے غماز ہیں۔ ان میں جذبات کا ارتعاش بھی ہے، مشاہدے کی رنگینی بھی اور فکر کی گہرائی بھی۔

نازکی صاحب کی غزلوں میں زبان وبیان کا رچاؤ، فکر وخیال کی بلندی اور عصری حالات کی آگہی کے پَرتَو ملتے ہیں۔ اُن کا مجموعہ کلام دیدۂ تر ۱۹۹۴ء میں شائع ہو چکا ہے۔ وہ برابر تذکرۂ سخن کرتے رہے ہیں اور ان کا تخلیقی ذہن نئے برگ وبار لا رہا ہے۔

یہ نہ سمجھو کہ بات ختم ہوئی
باتوں باتوں میں رات ختم ہوئی
روزوشب کا طلسم ٹوٹ گیا
یورشِ حادثات ختم ہوئی



محبت میں ایسے بھی لمحات آئے
نہ میں نے صدادی' نہ تم نے پکارا
یہ مایوسیاں ہیں کہ مجبوریاں ہیں
نہ جینے کی خواہش نہ مرنا گوارا



پروفیسر ظہور الدین

غلام رسول نازکی......میری نظر میں

کشمیر اُپنے فطری و زمینی حُسن کے لیے ہی سارے عالم میں بے نظیر ہے۔فنی و فکری حُسن کے لیے بھی وہ اگر لا مثال و بے مثال نہیں تو کم مثال و کم یاب ضرور ہے۔ایک طرف اگر پہلگام، گلمرگ، سونامرگ، شیتل جھیلیں، جھرنے، سرسبز چراگاہیں اور چرند پرند لہلہاتے اور اٹکھیلیاں کرتے نظر آتے ہیں تو دوسری طرف کشپ ریشی، شیخ نورالدین ریشی، شاہ ہمدان۔لل دید، ابھینو گپت، سدرشن، اشوگھوش لولٹ، سنگرک، بھٹ جگدھر، ممٹ، کشمیندر، کیدار بھٹ، غنی کشمیری اور متعدد دوسرے صوفیا، فلسفی اور اُدبأ و شعرا فکر و فن کی اَن دیکھی وادیوں کی سیر کرنے اور زندگی کے گوناگوں مظاہر اور سربستہ رازوں سے نقاب اٹھاتے نظر آتے ہیں۔کیسے کیسے خونین انقلابات سے یہ زمین نہیں گزری، کیسے کیسے روح فرسا مرحلے اس کے سامنے نہیں آئے۔پر نہ تو فطری حُسن میں کوئی کمی آئی اور نہ فکر و فن کی دولت بے بہا میں، ہی انقطاع کی کوئی صورت پیدا ہوئی۔فطری و زمینی حسن کی طرح علمی و ادبی، فکری و فنی

روائتیں بھی جاری وساری رہیں۔ میر غلام رسول نازکیؔ جن کا ذکر کرنے کے لیے آج ہم یہاں جمع ہوئے ہیں اُن کا تعلق بھی اُسی علمی ادبی وفنی روایت سے ہے جس کا ذکر میں نے ابھی ابھی کیا ہے۔

قدرت کا کارخانہ بھی ایک بڑی عجیب دنیا ہے جس کے کام کرنے کے طور طریقے اوروں سے قطعاً مختلف منفرد ہیں۔ وہاں کوئی رُور عایت، کوئی سفارش نہیں چلتی۔ آپ اُس سے کچھ حاصل کرنے کے خواہاں ہیں تو پہلے آپ کو اپنی محنت وریاضت سے یہ ثابت کرنا پڑے گا کہ آپ واقعی اُس مطلوبہ شیئے کو پانے کے حق دار ہیں۔ پھر اِتنا ہی نہیں وہ آپ کو انتخاب کا حق دیتی ہے۔ آپ یہ نہیں چاہ سکتے کہ وہ سب کچھ آپ کی جھولی میں ڈال دے۔ آپ کو اُس کے خزانے میں موجود اشیائیں سے کسی ایک شئے کو منتخب کرنے کی اجازت ملتی ہے۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ اپنے لیے آرٹ کی دنیا کا انتخاب کرتے ہیں یا مادّی دنیا کا۔ دنیاوی و مادی دولت چاہو گے تو وہ مل تو جائے گی، پر علم وفضل ادب وآرٹ کی دنیا کی شہرت جاتی رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ جنہیں ہم آج عظیم اُدباوشعرا، مصور وموسیقار، رقاص ومعمار کے طور پر جانتے ہیں، جن کی اُدبی وفنی کاوشیں آج کروڑوں میں بکتی ہیں یا جن کے نام پر ہم نے بڑے بڑے ادارے قائم کر رکھے ہیں، اپنے وقت میں پریشان حالی کے ہاتھوں لہولہان ہوتے رہے۔ غالبؔ مرتے مر گئے، پر سات سو روپے کا قرض جسے وہ مرنے سے پہلے ادا کر دینا چاہتے تھے کسی سے ادا نہ ہوا۔ سر سیّد کی آخری رسومات کے لیے دوستوں کو چندہ کرنا پڑا۔ میر غلام رسول نازکی نے بھی سرسوتی کا دامن تھاما، ظاہر ہے لکشمی اُن سے کیوں خوش ہوتی۔

آخری عمر میں کچھ آسودہ حالی نصیب تو ہوئی پر تب تک بہت کچھ کھو چکے تھے۔

یہاں میں روایتی مقالے کی طرح اُن کی تاریخِ پیدائش ، وطن، خاندان، تعلیم تربیت ملازمت، شادی بیاہ اور اولا دوغیرہ کا ذکر کر کے آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ پھر یہ بھی کہ اِن اُمور سے متعلق بہت کچھ پہلے ہی لکھا جا چکا ہے۔ میں براہِ راست اُن کی ادبی وشعری شخصیت کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں اور وہ بھی اپنی زبان میں تاکہ میں جو کچھ اُن کے بارے میں کہوں وہ میرا ہو۔ چبے چبائے نوالوں پر منہ مارنے سے منہ بھی بگڑتا ہے اور ذائقہ بھی۔

غلام رسول ناز کی وادی کے اُن معدودے چند شاعروں میں سے تھے جنہیں ایک طرف اگر فنِ شاعری کے جملہ لوازم کا بھر پور شعور تھا تو دوسری طرف اُردو زبان کے اسرار ورموز سے بھی وہ کماحقہ آشنا تھے۔ زبان وبیان پر اس قدرت کی وجہ سے وہ اساتذہ میں شمار کیئے جاتے رہے۔ ابتداً اُردو شاعری کی کلاسیکی روایت کی پیروی کرتے ہوئے انھوں نے بھی غزل کو ہی وسیلہ اظہار بنایا لیکن اس کا خیال ضرور رکھا کہ اُن کی آواز کہیں کسی استاد کی آواز کی بازگشت بن کر نہ رہ جائے کیوں کہ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ صلاحیت رکھنے کے باوجود روایت کی پیروی کرتے کرتے شاعر کی اپنی آواز کہیں گم ہو جاتی ہے۔ نازکی نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ اُنھوں نے اس کا اہتمام شعوری طور پر کیا کہ اپنی شاعری کو عصری آگہی کا پَرتو بنائے ہوئے اپنے دور کی صرف عکاسی ہی نہ کریں، اُس سے ہم کلام ہونے کی بھی کوشش کریں۔ کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ وہ فوٹو گرافر نہیں مصوّر ہیں، انہیں فوٹو گرافی نہیں مصوری کرنا

ہے فوٹو گرافی تو محض خارج کو پیش کرتی ہے جب کہ مصوری روح میں اتر کے گہرے پانیوں میں چھپے موتیوں کو نکال لاتی ہے۔ غلام رسول نازکی تو موتی لٹانا چاہتے تھے۔ سطحِ آب پر تیرتی ہوئی جھاگ کو نہیں سمیٹنا چاہتے تھے۔ یہ اِسی کوشش کا نتیجہ ہے کہ اُن کے ہاں ہمیں موضوعات کی بوقلمونی ہی نہیں، سمندر ایسی گہرائی بھی ملتی ہے۔ یہ بھی ایک عجیب صداقت ہے کہ انسان جب ہر شے اور ہر تجربے کی گہرائی میں اترنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کوشش کے نتیجے میں جب وہ اُن صداقتوں سے آشنا ہوتا ہے جو ہر شے کی تہہ میں خوابیدہ ہوتی ہیں، تو اُس کے وجود پر سنجیدگی کی ایسی دُھند مسلّط ہو جاتی ہے جو اُس سے سارے قہقہے، ساری مسکراہٹیں چھین لیتی ہے۔ زندگی کی انھیں کڑوی سچائیوں کے ادراک نے غلام رسول نازکی کی فکر اور اُن کے فن پر غم واندوہ کی ایسی دُھند طاری کر دی جس سے پھر وہ تاحیات چھٹکارہ حاصل نہ کر سکے۔ انھیں تجربات نے اُن کی شاعری کو غمِ زندگی کا ترجمان بنایا جس میں شدّت بھی ہے اور لطافت بھی۔ آگے بڑھنے سے پیشتر اُن کے کچھ شعر سنیئے:۔

محبت زندگی اور زندگی غم ہوتی جاتی ہے
خوشی تحلیل ہو کر، غم میں مدغم ہوتی جاتی ہے



مجھے بے طلب زندگی دینے والے
یہ احسان تیرا نہیں، دشمنی ہے



دل عموماً اداس رہتا ہے
وقف حرماں ویاس رہتا ہے
چھوڑ جاتے ہیں ساتھ جب ساتھی
ایک غم ہے جو پاس رہتا ہے

غلام رسول نازکی نے اُردو، فارسی اور کشمیری تینوں زبانوں میں شعر کہے ہیں۔ اُردو میں دو مجموعے دیدۂ تر ۱۹۴۹ء اور ''متاعِ فقیر'' کے نام سے چھپ کر داد وتحسین پا چکے ہیں جب کہ کشمیری میں ''نمرودنامہ'' ''آوازِ دوست'' اور کاوِینہِ وول'' خاصے مشہور ہوئے ہیں۔ ان سبھی مجموعوں میں زیادہ تر کلام غزلیات، قطعات، رباعیات اور نظموں پر مشتمل ہے۔ لیکن مجموعی فضا وہی ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے اور جس کی تائید کرتے ہوئے طاؔوس لکھتے ہیں:۔

> ''غم کا یہ خوشگوار تصوّر، جس کو اُردو شاعری میں فاؔنی مرحوم نے مستقل موضوع کے طور پر روشناس کیا، قنوطیت اور یاسیات کے اُس قدیم تصوّر سے بالکل جداگانہ ہے۔ یہ غم انسان کو فرار پر مجبور نہیں کرتا، نہ تو بے عملی کی طرف مائل کرتا ہے۔ نازکؔی کے یہاں غم کا یہ تصوّر اس حد تک کارفرما ہے کہ آپ کے نزدیک غم ہی بندہ و مولا کے مابین وجہِ ارتباط ہے اور روح کی بالیدگی کے لیے صرف دل اندوہ گین کی ضرورت ہے۔''

اوپر اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ نازکی کے ہاں غم واندوہ کی یہ دبیز تہہ اُن نتائج کی دین ہے جو وہ تجربات کے بحرِ زخّار میں غوطہ لگانے کے بعد حاصل کرتے ہیں۔ پھر اُن صداقتوں کے بیان میں آپ ہی آپ ایسی خنکی

پیدا ہو جاتی ہے کہ جو بھی پڑھتا ہے اُسے محسوس کیے بنا نہیں رہتا۔ چند شعر ملاحظہ کیجئے جن میں ان ہی صداقتوں کی ٹھٹھرن موجود ہے:۔

کوئی کہتا ہے اِس کو جاودانی کوئی کہتا ہے فانی ہے جوانی
نہ آگا اِس کا ملتا ہے نہ پیچھا بڑی الجھی ہوئی ہے یہ کہانی

اب کس کو یقین آئے جو چیز ہے فانی ہے
پیغام محبت ہے، اور اُن کی زبانی ہے

اب تو دن ڈھلنے لگا سائے بھی لمبے ہو گئے
ہم بھی گھر جائیں گے اپنے، اپنے گھر جاتے ہیں لوگ

لیکن صداقتوں سے ملنے والی یہ ٹھٹھرن جمود نہیں وہ بہاؤ پیدا کرتی ہے جو نئی صداقتوں پر کمند ڈالنے کا حوصلہ شاعر کو ہی نہیں قاری کو بھی عطا کرتی ہے۔ غم اگر زندگی کے تقدس میں اضافہ کرے تو خیر ہے ورنہ شر۔ ناز کی اس حقیقت سے آشنا ہیں اِسی لیے زندگی کا ہر تجربہ چاہے وہ کتنا ہی ہولناک کیوں نہ ہو اُن کی نظر میں زندگی کی وقعت کو اور بڑھا دیتا ہے۔ اُس کی تقدس میں عرفان کے چراغ روشن کرتا ہے۔ دیکھئے اسی بات کو کس خوبی سے بیان کرتے ہیں:۔

غم کو تم نے کیا سمجھ رکھا ہے میرے ہم نشین
روح کو شاداب کرتا ہے دلِ اندوہگیں



غم یہاں بندہ و مولا میں ہے وجہ ارتباط
باعث قرب خدا ہم پایہ روح الامیں



مرے خیال میں غم لازوال دولت ہے
میں غم نصیب کو کس منہ سے کم نصیب کہوں

نازکی صاحب کے پورے کلام کے مطالعے سے ہمیں اُن کے ہاں پائے جانے والے غم کی دو سطحیں نظر آتی ہے۔ایک سطح وہ ہے جس میں صرف روز مرّہ زندگی میں پیش آنے والی دِقتوں کا بیان ہے ۔ یہ بیان ہمیں زیادہ متاثر نہیں کرتا کیوں کہ یہاں وہ ایک عام انسان کی طرح بات کرتے نظر آتے ہیں۔ یہاں زندگی کی مشکلات اور پریشانیوں کو سیدھے سادے انداز میں پیش کیا جاتا ہے جب کہ دوسری سطح پر وہ ایک فلسفی کی طرح اُن سطحی دِقتوں اور پریشانیوں کی تہہ میں اتر کر ایسے فلسفیانہ نتائج اخذ کرتے ہیں جو قاری کے لیے بھی بصیرت افروز ہوتے ہیں۔ان بصیرت افروز نتائج کی ایک جھلک آپ دیکھ چکے ہیں۔اوپری سطح کی بھی چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:۔

ایک جانِ ناتواں اُس پر ہزاروں آفتیں
درد بھی، رنج والم بھی، زخم بھی، ناسور بھی
چار دن کی زندگی رنج والم آٹھوں پہر
زندگی دی تھی، دیا ہوتا دلِ مسرور بھی



پہلوؤں میں برف کی ٹھنڈی سی قاشیں دیکھئے
دفن اِن اُجلی سی پوشاکوں میں لاشیں دیکھئے
زندگی کا غم، جوانی کا اَلم، فکرِ مَعَاش
غم کے ہاتھوں دل کے چہرے کی خراشیں دیکھئے

مرے خیال کو افکار نے ڈبو چاہے
مرے دماغ کے چہرے کو غم نے نوچا ہے
جو ایک لمحہ بھی افکار سے نجات ملی
مرے خیال کو تابانئ حیات ملی

غلام رسول نازکی نے غم کے علاوہ زندگی کے دوسرے تجربات پر بھی قلم اٹھایا ہے لیکن اُن میں بھی شاعر بالآخر اُسی نکتے پر آ کر تان توڑتا نظر آتا ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ یہ دنیا ہے میدانِ عمل
زندگی سعئ پیہم کے سوا کچھ بھی نہیں
یہ غلط ہے، وہم ہے، دھوکا ہے یکسر جھوٹ ہے
میرا ایماں ہے، یہاں غم کے سوا کچھ بھی نہیں

غزل کے علاوہ جیسا کہ اوپر بھی کہا گیا ہے، نازکی نے قطعات ورباعیات بھی کہے ہیں اور نعتیہ کلام بھی۔ غزلوں کی طرح قطعات ورباعیات میں بھی زندگی کے حقائق کے ساتھ ہی ساتھ اخلاقی وفلسفیانہ مضامین پیش کیے ہیں جب کہ نعتیہ کلام میں رسولِ اکرمؐ کے تئیں اپنے پُرخلوص جذبات کو پوری شدت کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ عشقِ رسولؐ کو وہ زندگی کی ساری پریشانیوں کا مُداوا تصور کرتے ہیں:۔

آپؐ کی ذات فخرِ موجودات
آپؐ کا نام جامع الخیرات

آپؐ کی یاد رافع الدرجات

آپؐ کا ذکر رنج و غم سے نجات

اُن کے نعتیہ کلام کا مجموعہ ''چراغِ راہ'' اُن کے ایسے ہی عقیدت مندانہ جذبات کا عکاس ہے۔

اب آخر میں کچھ باتیں اُن کے کلام کے لسانی پہلوؤں سے متعلق بھی کرنا ضروری ہیں۔ سب سے پہلے یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ نازکی صاحب اُردو شاعری کے فنّی پہلوؤں سے پوری طرح آشنا ہیں اور انھوں نے انھیں بخوبی برتا بھی ہے۔ غزل ہو یا نظم، رباعی ہو یا قطعہ، نعت ہو یا کوئی اور صنفِ سخن وہ اُن کے کلاسیکی محاسن کا پورا پورا احترام کرتے ہوئے انھیں فنّی چابکدستی کے ساتھ برتتے ہیں۔ استعاروں اور تشبیہوں کا استعمال برمحل اور معنی خیز ہوتا ہے تاہم سادگی کو ہر قیمت پر برقرار رکھتے ہیں۔ وہ اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ جذبے کے خلوص کو اِظہار کے لیے کسی بناوٹ یا تصنع کی ضرورت نہیں ہوتی اسی لیے اُن کا ہر شعر آمد کی روانی لئے ہوئے ہوتا ہے۔ اس بہاؤ میں کہیں کوئی کمی پیدا نہیں ہوتی۔ اُن کے فن کی یہ ندرت انہیں ریاستی اُردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رکھے گی۔

..................☆☆☆..................

(یہ مقالہ ۱۶ / مارچ ۲۰۰۷ء کو یومِ نازکی کے موقعے پر پڑھا گیا تھا)

نشاط انصاری

میر غلام رسول نازکی......حیات اور شاعری

اس مینوسواد وادی کے سخن وروں میں مشکل سے دو تین ہی طالع مند صاحبِ قلم ایسے نکل آئیں گے جن کے شب و روز ماضی میں نہ سہی، پر، آج کل آسودہ حالی کی اپسراؤں کے درمیان ضرور گذر رہے ہیں۔ اُس مختصر سی جماعت میں میرے ایک کرم فرما اور بزرگ دوست سرِفہرست ہیں، جو ایک نام ہی نہیں بلکہ ایک مکتبِ فکر، ایک دَور، اور فکر و فن کا دبستان ہے۔ چمنستانِ کشمیر کا یہ سبدِ گل یہاں کا کہنہ مشق شاعر، براڈ کاسٹر، منجھا ہوا مقرّر، زبان و بیان کی خوبیوں و خامیوں اور فنی باریکیوں کا صحیح پارکھ میر غلام رسول نازکی ہے۔ میر صاحب کا مورثِ اعلیٰ میر نازک قادری سرینگر کے کادی کدل محلّہ میں بود و باش رکھتا تھا۔ مذہبی اور فقہی امورات سے باخبر یہ سیّد خانوادہ عزت واحترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ اِسی سیّد خاندان کی پشت سے مذہبی و دینی معاملات سے آشنا، شرعی امورات سے متوصف، عربی و فارسی تعلیم

سے آراستہ، فارسی شعر وشاعری سے مزین ایک شب زندہ دار اور متقی بزرگ میر مصطفیٰ گزرے ہیں جن کے تئیں وقت کا دھارا اُلٹی چال چل رہا تھا۔اسی اُلٹ پھیر اور زمانے کی ناموافقت سے میر مصطفیٰ آج سے ۱۰۰ رسال قبل ۱۳۲۰ھ مطابق ۱۹۰۸ء سرینگر سے بانڈی پورہ کے مردم خیز خطے سے ملحق ایک چھوٹی سی خوبصورت بستی ماڈر ہجرت کر گئے۔میر نازک قادری کی اولاد کی ایک شاخ اس سے برس ہا برس قبل مقام شہید میر وٹلب (زینہ گیر) میں قیام پذیر ہو چکی تھی اور میر سکندر اِسی شاخ سے متعلق تھے اور اُن کی اولاد اَب بھی وہاں موجود ہے۔کادی کدل سے ماڈر (بانڈی پورہ) کی طرف ہجرت کرنے سے پہلے ہی میر مصطفیٰ کی شادی وٹلب کے اِسی میر سکندر کی بیٹی ساجدہ بانو سے ہوئی تھی جو اُپنے والدین کی چھٹی اور سب سے چھوٹی اولاد تھی۔ اِسی خوش بخت خاتون نے ۱۳۲۸ھ مطابق ۱۹۰۶ء کے آس پاس نازکی صاحب کو جنم دیا جو آگے چل کر اپنی وہبی ذہانت وفطانت اور فطری صلاحیتوں سے یہاں کی ادبی دنیا پر محیط ہوئے۔اس نو وارد کو اپنے گھر کی چار دیواری میں لکشمی کی چھتر چھایا کے بدلے مذہبی تقدس اور اخلاقی ماحول ہی میسّر تھا۔اسی ماحول سے نازکی صاحب کو ایسی صالح قدریں ملیں جن سے علوم ومعارف کا بیش بہا سرمایہ اُن کے حصے میں آیا اور اسی دولتِ بے بہا نے اُن کو ماورائی بنا دیا۔

نازکی صاحب نے ابتدائی مذہبی تعلیم اُس زمانے کے رواج کے مطابق اپنے ہی والد میر مصطفیٰ صاحب سے حاصل کی۔بعد میں آٹھویں

جماعت کا امتحان پاس کر اور پھر ۱۹۲۵ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے مُنشی کا امتحان دے دیا۔ یوں مڈل اور مُنشی ہو کر سر رشتہ تعلیم میں بحیثیت اُستاد برسرِ روزگار ہوئے۔ سرکاری ملازمت کے دوسرے سال ۱۹۲۶ء میں ان کا ازدواجی بندھن عائشہ بانو کے ساتھ ہوا جو مورخ حسن کھویہامی کے چھوٹے بھائی پیر غلام محمد کے بیٹے پیر غلام محمود کی صاحب زادی تھی۔ دوسری طرف سے عائشہ بانو کا نزدیکی رشتہ مشہور نعت نگار پیر عبدالاحد نادم کے ساتھ تھا، جن کی بیٹی عائشہ کی نانی ہوا کرتی تھی۔ نازکی اور عائشہ کا ازدواجی رشتہ چھپن ۵۶ سال کی خاصی مدت پر محیط رہا۔ اس دوران یہ ہمت کوش جوڑا آشوبِ زمانہ کے ساتھ متصادم ہوا۔ زندگی کے کرب انگیز حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرتا رہا، سلسلہ روز وشب کی نیرنگیوں کے ہاتھوں تختہ مشق بنا اور اپنے آپ کو سیلی خارا سے لالہ رنگ بناتا رہا۔ نصف صدی سے زیادہ کے اس سفر میں عائشہ بانو کے حصہ میں آئے ہوئے دُکھ درد اور رنج والم کا پلڑا اپنے ذاتی پلڑے سے بھاری ہونے کے اعتراف میں نازکی صاحب اپنے کشمیری مجموعہ قطعات ''آوازِ دوست'' کی انتسابی تحریر کے ان چند فقروں میں اُن کی سخت جانی اور وفا شعاری کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

''جو چھپن ۵۶ سال تک میرے دُکھ سُکھ میں میرا ساتھ دے چکی،
پر اِس دوران اُس نے دُکھ زیادہ جھیلے اور سُکھ بہت ہی کم دیکھا
اس نے اپنا سارا وجود میرے ہی وجود میں ضم کر کے رکھ دیا تھا۔
اس کی وفات کے بعد مجھے احساس ہوا کہ زندگی اور اس کا پیدا
کردہ کرب کس قدر شدید ہوتا ہے''۔ (کشمیری سے ترجمہ)

اس کیفیت کو نازکی صاحب اشعار کا جامہ یوں پہنا رہے ہیں ؎

أچھن مَنز اوش چُھ ہو کھمتِ ماتموٕ سٕتی
دِلس ہِلہِ پَل گومُت پیہم غموٕ سٕتی
گُران چُھس صُبح شامَس، شام صُبحس
دِوری گنہِ بال چھس پڑاٹان نَموٕ سٕتی

(ماتم کرتے کرتے میری آنکھوں سے آنسو بھی خشک ہوئے ہیں اور مسلسل غم و آلام سے دل پتھر کی سِل بن چکا ہے۔ میری زندگی کا حال اب یہ ہے کہ صبح کرتے کرتے شام ہوتی ہے اور شام کرتے کرتے صبح ایسے حالات میں ناخنوں سے سنگلاخ کریدنا پڑتے ہیں)

عایشہ بانو اور نازکی کا یہ رشتہ اکتوبر ۱۹۸۰ء میں اس وقت ٹوٹ گیا جب عایشہ عجوزہ داماد صد ہزار کی شوخ چشمی سے اُوب کر بیابانِ عدم کی اوٹ میں چلی گئی۔

تجربہ رکھنے والے لوگوں کی رائے یہ ہے کہ زندگی کے آخری ایام میں اگر کسی کی ازدواجی زندگی کا شیرازہ بکھر جائے تو بیوی کے مقابلے میں شوہر کی زندگی اس کے لئے وبال جان بن جاتی ہے۔ کیوں کہ بڑھاپے میں شوہر کا آخری سہارا اس کا مال و متاع ہوتا ہے نہ اولاد۔ اصل میں یہ سخت کوش اور پیکرِ صبر بیوی ہی ہوتی ہے جو اپنے شریکِ حیات کے دُکھ سُکھ کو سمجھ لیتی ہے، اس کے رکھ رکھاو کا خیال رکھتی ہے، اس کی نفسیات سے پوری طرح واقف ہو کر اس کی ضرورتوں کو پورا کرتی ہے غرض شوہر کی ہر تکلیف کا درمان بیوی کا ہی اشتراک ہوتا ہے۔ بڑھاپے کا تذکرہ ہونے کے ناطے انگریزی شاعر

لارڈ بائرن کی "اولڈ ایج" نظم کی طرف خیال مرکوز ہوا جس میں وہ بڑھاپے کا صحیح نقشہ کھینچ کر ایک جگہ کہہ چکا ہے کہ "بڑھاپا روحانی سرمستیوں کے فطری عمل کا نام ہے جو اس انسان کو چڑچڑا متلون مزاج کھو جانے مغلوب الغضب، افسردہ خیال اور پیکر یاس بنا دیتا ہے۔" نازکی صاحب بھی اپنے مخصوص انداز میں بڑھاپے کی تصویر اپنی اس رُباعی میں بہت اچھے ڈھنگ سے کر چکے ہیں ؎

وُچھم پۂزی کنٕ بُڈ یوٗمت نازکی صٲب
اُچھن تل چیز اَستھ چھس گژھان غاب
مَشُن، راوُن، تھکُن، شانَن کُشُن یُن
اَکس بجرَس چھہِ آسان سائہ بدٕی عاب

(نازکی صاحب اب سچ مچ بوڑھے ہو چکے ہیں۔ کوئی چیز سامنے ہو کر بھی ان کو دکھائی نہیں دیتی۔ کوئی بات بھول جانا، چیز کھو جانا، تھکاوٹ محسوس ہونا اور شانوں میں کھجلاہٹ کا آنا سب ایک بوڑھاپے کے ہزاروں عیوب ہیں)

نازکی کو آج سے آٹھ دس سال پہلے جب اپنی رفیقہ حیات کی جُدائی کے المیہ سے دوچار ہونا پڑا تو انہوں نے اپنے داخلی کرب کا اظہار اپنی اس رباعی کا سہارا لے کر کر لیا ؎

بہارس اوس یاوُن کوٚسمن کرٛاو
خبر کَتہِ آو وٲران بونہِ ہُند کاو
سیٚے مَنز وولَرس پھٹم یاشا کرِتھ ناو
نہ گوٚبی گرٛ ہٕنی نہ گٔیہ وُزمَل نہ ووٚتھ واو

(بہار پورے جوبن پر تھی، پھول مہک رہے تھے، کلیاں چٹک رہی تھیں تو ایسی کیف زائی میں ایک کھنڈراتی چنار پر بسیرا لینے والا کو بدشگونی کی علامت بن کر کہیں سے آ ٹپکا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایکدم بادل پھٹ جانے، بجلیاں کڑکنے اور طوفانی لہریں اُٹھ جانے کے بغیر ہی میری کشتی بیچ وُلر میں ڈوب گئی)

عایشہ بانو کے بطن سے نازکی صاحب کو اولادِ نرینہ میں سات بیٹے، ریاض الاسلام، محمد فاروق، طارق، اقبال، بلال، ایاز اور وقار ملے۔ نازکی صاحب بہت ہی خوش بخت والد ہیں، جن کے سبھی بیٹوں نے اعلیٰ تعلیم پائی اور اپنے والد کی اچھی تربیت سے اچھے پوشٹوں پر فائز ہو کر خود کفیل ہی نہیں بلکہ اپنا مقام بھی بنا چکے ہیں۔ ان میں سے نازکی صاحب کے دوسرے فرزند محمد فاروق نازکی اپنے والد کی طرح نشریاتی ادارے سے وابستہ رہ کر سٹیشن ڈائیریکٹر کے منصب پر جا پہنچے اور اپنے والد سے اُن کو دوسرے بھائیوں کے مقابلے میں فکروفن کا سرمایہ وراثت میں ملا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ فاروق کہیں کہیں کئی قدم آگے نکل آئے ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ اولادِ مادینہ میں اکلوتی بیٹی نادرہ ہے جو سبھوں سے بڑی ہے۔ اس کی شادی گرورہ (بانڈی پورہ) کے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص محمد سعید اندرابی کے ساتھ برس ہا برس پہلے ہو چکی ہے اور آج کل پوتے پوتیوں والی بھی ہے۔

نازکی صاحب نے ۱۹۲۸ء تک زندگی کی بیس بائیس بہاریں دیکھ لی تھیں اور اس دوران اُن کی وجدانی قوتِ نمو اور بالیدگی پا کر اُردو میں شعر تخلیق کرنے کی طرف منعطف ہو چکی تھی۔ یہ وہ دَور تھا جب وادی میں

صحافت کا شعبہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس صحافتی شعبہ کے فقدان سے وادی کے سبھی اُردو شعرا اپنے رشحاتِ قلم کی اشاعت و تشہیر کے لئے راولپنڈی، لاہور اور امرتسر سے شائع ہونے والے رسائل کا سہارا لیا کرتے تھے۔ اپنے ہم عصر شعراء کی اِسی روش پر ناؔزکی صاحب بھی چل پڑے اور جو کچھ لکھتے اُس کی اشاعت اُن ہی غیر مقامی جرائد کے ذریعے کیا کرتے۔ یہ وہ دن تھے جب ہندوستان کے نامور شاعر جوشؔ ملیح آبادی نے بھوپال شہر سے "کلیم" نام کا رسالہ شائع کرنا شروع کیا تھا۔ نازکی صاحب نے مخمس طرز پر چار بند والی ایک اُردو نظم "اندھی لڑکی کی دُعا" رسالہ کلیم میں چھپوانے کے لئے جوشؔ صاحب کے پاس بھیج دی جسے انہوں نے نمایاں طور "کلیم" میں چھاپ لیا۔ بعد ازاں مدیر اَدبی دُنیا، اَدبِ لطیف، اور ہمایوں رسائل اسی نظم کو لفٹ کر چکے۔ یوں نازکی ادبی دُنیا کے ساتھ متعارف ہوئے۔ اس نظم کا مرکزی خیال یہ ہے کہ ایک اندھی لڑکی کو اپنی آنکھوں کی بصارت کی کوئی تمنا نہیں ہوتی ہے البتہ اُسے اپنی ماں کی صورت دیکھنے کی چاہ ہے۔ چنانچہ یہ اندھی لڑکی کہتی ہے ۔

لوگ کہتے ہیں کہ رنگوں کے کئی اقسام ہیں
سُرخ ہیں، کالے ہیں، پیلے اور نیلی فام ہیں
اور ان رنگوں سے وابستہ ہزاروں کام ہیں
مجھ کو کیا؟ یہ آنکھ والوں کیلئے انعام ہیں
یہ تمنا ہے کہ اپنی ماں کی صورت دیکھ لوں

ناؔزکی نے ابتداء میں جو اُردو غزل لکھی وہ سب سے پہلے رسالہ

ہمایوں میں چھپ چکی تھی جس پر اُردو زبان کے شاعر نواب جعفر علی خان اثر نے بھر پور تبصرہ کیا گیا اور اس تبصرہ میں اس بات کا اظہار کیا تھا کہ یہ ایک ایسے شاعر کا کلام ہے جس کی مادری زبان اُردو نہیں مگر اس کے باوجود اغلاط سے صاف ہے۔ اس غزل کے چند شعر یہ ہیں۔

اس شوخ کو کیا دیکھا آنکھوں میں سمٹ آئی
کشمیر کی شادابی، شیراز کی رعنائی!
ہر شے کی حضوری میں جھکوا دیا سر میرا
اے ذوقِ جبیں سائی، اے لذّتِ رُسوائی
سوکھا ہوا سبزہ ہوں گلزارِ محبت کا
کب سایہ فگن ہوگا وہ سرودِلارائی

اُردو شعر و شاعری کے علاوہ نازکی صاحب کو فارسی شعر و ادب کے ساتھ ابتدا سے لگاؤ تھا ہی اور اس زبان کے شعراء کا اچھا خاصا مطالعہ بھی۔ اگر فارسی میں شعر گوئی کیا کرتے بھی تھے لیکن توے کی بوند کے مصداق۔

اس ضمن میں اس بات کا انکشاف کرنا مناسب رہے گا۔ "ادارۂ ثقافت روس" آج سے کچھ برس پہلے "مشاعرہ" نام کی ایک انتھالوجی منظرِ عام پر لا چکا ہے جس میں ہندوستان، پاکستان، افغانستان اور ایران کے کئی فارسی شعراء کے کلام کو لیا گیا ہے اور برِصغیر کے شعراء میں جہاں علامہ محمد اقبالؔ اور صوفی غلام مصطفےٰ تبسمؔ کا کلام شاملِ مجلّہ کیا گیا ہے، وہاں نازکی صاحب کے یہ کچھ اشعار اُس انتھالوجی کے مندرجات میں ہیں۔

مُرغلے دی شب بہ گل زارے بہ شاخ می سرود
شاہد گل راثباتے نیست دِل دادیٔ چہ سُود
ہرکہ راحُسنے عطا کردند اوقاتش کم است
بلبل ازگل، گل زِشبنم شبنم ازانجم شنود

یہ اشعار نازکی کے پہلے اُردو مجموعہ کلام ''دیدۂ تر'' کے دوسرے صفحے پر بھی درج ہیں۔ ان کی معلومات میں اضافہ کرنے کی غرض سے وادی کے مشہور افسانہ نگار اختر محی الدین صاحب ''مشاعرہ'' نام کا یہ تاریخی مجلّہ ماسکو شہر سے اس وقت اپنے ساتھ لائے جب وہ سویٹ لینڈ ایوارڈ لینے روس گئے تھے۔ یہ جریدہ آج کل نازکی کے کتب خانے کی زینت ہے۔

سرشتہ تعلیم میں تقرر پانے سے پہلے ہی میر صاحب نے آٹھویں جماعت اور منشی کا امتحان دیا ہی تھا۔ پھر آگے چل کر ۱۹۳۱ء میں فارسی زبان کا دوسرا امتحان منشی عالم، اعزاز کے ساتھ پاس کیا۔ اپنی تعلیمی قابلیت کو بڑھانے کے سلسلے میں اُن کا آتشِ شوق اور بھڑک اُٹھا جس کے نتیجے میں انہوں نے ۱۹۳۴ء میں بارہویں جماعت کا امتحان ایف اے پاس کرلیا۔ اس کے بعد وہ اُردو میں ڈگری لینے کی طرف متوجہ ہوئے اور ۱۹۳۷ء میں ادیبِ فاضل بھی ہوئے۔ اس امتحان کے بارے میں نازکی کو ذاتی طور یونیورسٹی آفس لاہور جانا پڑا جہاں اُن کو شاعرِ مشرق علامہ اقبال سے ملنے اور ملاقات کرنے کا خیال دِل میں آیا، پر اُن کا وہ چاہنا علامہ کی بیماری کی وجہ سے پورا نہ ہوسکا۔

اسی سال نازکی نے جموں کے قیس شیروانی کے اشتراک وتعاون سے سرینگر میں پہلی بار آل انڈیا مشاعرے کا اہتمام کیا۔ اس میں غیر کشمیری

شعراء کی فہرست میں سر تیج بہادر سپرو، لِسان العصر حفیظ جالندھری، مزدور شاعر احسان دانش، روشؔ صدیقی اور پروفیسر تاثیرؔ قابلِ ذکر ادبی شخصیتیں تھیں۔ اس تاریخ ساز مشاعرہ کی صدارت سر تیج بہادر سپرو نے انجام دی تھی جس نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا تھا کہ اُردو زبان ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ میراث ہے اور قطعاً نا قابلِ تقسیم۔ اس مشاعرہ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ یہاں ملکی سطح پر مشاعرے منعقد کرنے کا رواج ۱۹۳۷ء سے ہی چل پڑا ہے۔

ہندوستان کے نامور ماہرِ تعلیم، کامیاب ایڈمنسٹریٹر اور مصنّف خواجہ غلام السیّدین ناظمِ تعلیمات کی حیثیت سے یہاں سر رشتہ تعلیم پر چھائے ہوئے تھے اور اپنی دھاک پوری ریاست میں بٹھا چکے تھے۔ سیّدین صاحب نے جب نازکی کی فطری صلاحیتوں کا جایزہ لیا تو انہیں محکمہ تعلیم کی طرف سے نکالے جارہے رسالہ ''تعلیمِ جدید'' کی ادارت کی ذمہ داری ۱۹۴۳ء میں سونپ دی گئی۔ دو سال تک اس ذمہ داری کو نبھانے کے بعد اُن کو ریاست کے انڈر گریجویٹ اساتذہ کے مرکزی تربیتی ادارہ ٹیچرز ٹریننگ اسکول سرینگر میں اُردو زبان سکھانے اور پڑھانے کے لئے لایا گیا ہے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب نازکی صاحب سو (۱۰۰) روپیہ کے گریڈ میں پچاسی (۸۵) روپیہ تنخواہ پاتے تھے۔

ملک تقسیم ہونے کے بعد کشمیر میں شیخ محمد عبداللہ کی پہلی وزارت کے دِنوں میں جب پہلا الیکٹرونک میڈیا (ریڈیو کشمیر) قائم کیا گیا تو نازکی صاحب کو محکمہ تعلیم سے اُٹھا کر ۱۹۴۸ء کو ریڈیو کشمیر میں پروگرام اسسٹنٹ

کے گزٹیڈ عہدے پر فائز کیا گیا۔ ریڈیو کشمیر میں ان کے تقرر کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہیں اپنے والد کی طرح نقلِ مکانی کر کے ماڈر سے واپس کادی کدل نہ سہی، پر اُس کے مشرق میں محلّہ ''حسن آباد'' اور کاٹھی دروازہ'' کے باکل وسط میں سکونت اختیار کر کے شہرنو اسی ہونا پڑا اور یوں سرشتہ تعلیم کے چھوٹے سے خول اور سماج کے محدود دائیرے سے نکل کر ایک بوقلموں اور وسیع دائیرے میں قدم رکھ چکے۔ اصل میں دیکھا جائے تو نازکی کی اسی ہجرت نے ان کی شہرت میں جہاں چار چاند لگا دیئے وہاں ان کے تخلیقی عمل کو خوب سے خوب تر بنا دیا۔

نازکی صاحب کی ماڈر سے نقل مکانی کے دور میں یہاں گراں بازاری اور مہنگائی کا عفریت ابھی کتمِ عدم میں ہی تھا اور روپیہ پیسہ کی ریل پیل نے جنم بھی نہ لیا تھا۔ اِسی ارزانی کے نتیجے میں انہوں نے دس بیس ہزار روپیہ خرچ کر کے کوئی چار کنال زمین مکان کے لئے خرید لی اور آج کی مہنگائی اور ڈیمانڈ کے حساب سے یہ قطعۂ زمین چالیس پچاس لاکھ روپیہ میں بھی نہیں مل سکتا ہے۔ اسی زمین پر انہوں نے پہلے مرحلے میں ایک مکان تعمیر کیا اور دوسرے مرحلہ میں ایک اور مکان تعمیر کیا گیا۔ مگر کئی سال پیشتر نازکی نے اپنا پہلا مکان آٹھ لاکھ روپیہ میں فروخت کر دیا اور زیرِ تمن مکان اپنے بیٹوں میں تقسیم کر دی۔

۱۹۲۸ء سے ۱۹۴۸ء تک بیس ۲۰ برسوں میں جتنی بھی رباعیاں غزلیں اور نظمیں انہوں نے لکھی تھیں اُن کو ۱۹۴۹ء میں شیرازہ بند کر کے ''دیدۂ تر'' کے نام سے منظرِ عام پر لا کر نازکی صاحب دیوان ہوئے۔

مجموعہ ۱۳۶ صفحات پر پھیلا ہوا ہے اور اس میں ۱۰۶ رباعیاں، ۲۲ غزلیں اور ۲۰ نظمیں درج ہیں۔ جناب طاؤسؔ پانپوری نے اس کا دیباچہ لکھا ہے جو ۱۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ صاحبِ کتاب ہونے کے بعد میر صاحب نے ۱۹۵۰ء میں گریجویشن کی ڈگری لے کر اپنی تعلیم مکمل کرلی۔ اس زمانے تک آتے آتے انہوں نے مادری زبان کشمیری میں طبع آزمائی کرنے کی طرف بھولے سے بھی توجہ نہ دی تھی۔ لیکن ان کو کشمیری زبان میں شعر کہنے کی تحریک ان دنوں ملی جب ۱۹۵۳ء میں مرکزی سرکار نے شیخ محمد عبداللہ کو برخاست کر کے مرحوم بخشی غلام محمد کو مسندِ وزارت پر بٹھا دیا۔ اس حقیقت میں دو رائیں ہرگز نہیں ہوسکتیں کہ بخشی مرحوم بلا کے ذہین، نبض شناس اور کشمیریوں کی تقلید اور انتہا پسندانہ نفسیات سے پوری طرح واقفیت رکھنے والے سیاسی لیڈر اور حکمران تھے۔ اس لئے انہوں نے وزارتی تبدیلی اور شیخ عبداللہ کی گرفتاری سے پیدا شدہ بے چینی اور بدلے ہوئے سیاسی حالات سے کشمیریوں کی توجہ ہٹانے کے پیشِ نظر ریاست بھر میں سیاسی کنونشنوں کی زوردار تحریک چلانا شروع کرائی۔ ان ہی سیاسی کنونشنوں کے تحت منعقد شدہ مشاعروں اور شعری مجلسوں کے اثر سے نازؔ کی بھی کشمیری میں لکھنے کی طرف راغب ہوئے اور سب سے پہلے اس زمین کی کشمیری غزل ایک مشاعرے میں پیش کی ؎

یتھ سٕرس منٛز ساسہ بدٕ نے تارلوٗگ میانوٕ اتھو

پانہٕ روٗدُس ژاکہٕ وأراہ ہیوٗہٕ بہٕ طوٗفانَن اٮ۪ندٕر

(اس طوفانی سمندر میں میری ہی کوششوں سے ہزاروں کا بیڑا پار ہوا

مگر خود طوفانی لہروں کے درمیان اُس چھوٹی سی کشتی کی طرح ہچکولے کھاتا رہا جس کا کہیں بادبان ہو اور نہ ہی کوئی مستول)

نازکی صاحب نے کشمیری زبان میں اپنے داخلی جذبات کے اظہار کے لئے اگر چہ غزل کا ہی انتخاب کیا تھا لیکن اصل میں وہ رباعیوں اور قطعات کے ہی شاعر بن کر اُبھر چکے ہیں۔ اسی وجہ سے انہوں نے ابتدائی غزل گوئی کے ساتھ ساتھ رباعیاں اور قطعات لکھنا سنجیدگی سے شروع کئے اور غزل گوئی سے کنارہ کر کے وہ قطعات کے اچھے اور کامیاب شاعر ہوئے اور ابتداء میں اُن کی یہ رباعی تخلیق ہوئی۔

نژان بالَن بیابانَن پھُلِم پۆدٕ
أچھوسیٚو دجوے چھم دژامژٕ مے ؤدِؤدِ
تمِس سنگین دِلَس ووتُم نہٕ ژۆک تل
گران نٲلہٕ وَٹھ کنٕن آبٕچ ڈٕگٕنٕ ژٕدٕ



(بیابانوں اور کہساروں پر چڑھتے اُترتے اب میرے پاؤں بھی گھس چکے ہیں اور رونے کا عالم یہ ہے کہ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی ہے۔ سیلابِ اشک کا اس قدر زور ہے کہ میرے آنسو سنگلاخ کو بھی غربال کرنے کی شدت رکھتے ہیں لیکن پھر بھی میرے اس سنگدل پر ذرا بھی اثر نہیں ہو رہا ہے)

بخشی غلام محمد نے جب اپنے سیاسی کنونشنوں کے مثبت نتائج برآمد ہوتا دیکھ لئے تو انہوں نے ریاستی سطح پر ۱۹۵۶ء میں ''جشنِ کشمیر'' منانے کا

ہمہ گیر پروگرام بنواکراس پر عمل کرنے کا حکم دیا۔ اُن کی اس تاریخی ادا پر
عوام الناس تو کیا بڑے بڑے صاحب ہش، زعمائے کشمیر اور فہم و ادراک
رکھنے والے لٹو ہو گئے۔ یہ حال دیکھ کر علامہ اقبالؔ کا یہ شعر باضمیر اور ہوش
مند لوگوں کے کانوں کے ساتھ ٹکرا کر اُن کا مذاق اُڑاتا رہا ؎

ساحر الموط نے تجھ کو دیا برگِ حشیش
اور تو اے بے خبر سمجھا اِسے شاخِ نبات

بہر حال، عام کشمیری جشنِ کشمیر کے ہنگاموں میں کھو گئے۔ اسکے جو
بھی منفی اثرات رہے ہوں، وہ ایک طرف، لیکن اس دوران ایک ادبی ماحول
بھی پیدا ہوا۔ بخشی نے اس خاص سیاسی مشن کی کامیابی کے لئے یہاں کے کئی
باصلاحیت سرکاری افسروں پر ڈورے ڈال کر اُن کو استعمال میں لایا۔ نازکی
صاحب چونکہ اس میڈیا میں کام کر ہی رہے تھے اس لئے اُن کو جشنِ کشمیر کی
سلبیریشن کمیٹی کی ایک ذیلی شاخ لٹریری کمیٹی کا کنویز بنا دیا گیا اور انہیں
سرینگر میں مشاعرے منعقد کروانے کی ذمہ داری سونپ دی گئی۔ اِدھر وہ
ریڈیو کشمیر میں اسسٹنٹ پروڈیوسر کے عہدہ سے ترقی کرتے کرتے آٹھ
سو روپیہ کا گریڈ پا کر پیکس (پروگرام ایگزیکٹیو) ہوئے۔ اس گزٹیڈ پوسٹ
نے اُن کو سرینگر سے ڈسلوکیٹ کر کے جموں، ناگپور اور اندور پہنچا دیا۔

سرکاری ملازمت کے سلسلہ میں نازکی صاحب نے سرشتہ تعلیم میں
لگ بھگ ۲۲ سال کام کیا اور ہندوستان کے نشریاتی اداروں میں ۱۶ سال
۱۹۶۴ء میں وہ مرکزی سرکار کے قواعد کی رُو سے اٹھاون سال کی حد مکمل
کرنے کے بعد ریڈیو ملازمت سے سبکدوش ہو گئے اور نتیجتاً ملازمت کے

طوق سے چھٹکارا پانے کے بعد اپنے تخلیقی عمل کو تیز کرنے کی طرف توجہ مبذول کرنے لگے۔ چنانچہ ۱۹۵۵ء سے اپنی ریٹائرمنٹ تک جتنی بھی کشمیری رُباعیاں اور قطعات وہ تخلیق کرتے رہے اُن کو شیرازہ بند کیا گیا۔ اس طرح سے ۱۹۶۵ء کے دوران وہ اپنا مجموعہ قطعات ''نمرود نامہ'' منظر عام پر لائے۔ اپنی یہ دوسری مگر کشمیری میں پہلی تصنیف پیش کر کے نازکی نے کشمیر کا پہلا رباعی گو شاعر اور مصنف ہونے کا امتیاز حاصل کیا ہے۔ اس جیبی سائز کے مجموعہ میں ۱۲۳ر قطعات ایسے ہیں جن میں اُن حقائق کا اظہار ہے جن کا مشاہدہ وہ ایک شاعر کی بینا آنکھ سے ۱۹۶۵ء کے بعد کر چکے تھے۔ ۵۳ء قطعات کو اگر شہر آشوب کی ذیل میں جگہ دی جائے تو وہ زیادہ موزون رہے گا۔ دیگر ۲۴ قطعات پیغمبرِ اسلام کی بے پناہ محبت اور عقیدت میں ڈوب کر اس انداز سے تخلیق کئے گئے ہیں

دِلکُ آرام روٗحکُ رَس محمدؐ | بے کسن ہُند کس محمدؐ | محمدؐ ،
محمدؐ بَس محمدؐ بَس محمدؐ | نَجاتچ چھےٚ کُنی وَتھ رَٹھ یِہَے وَتھ

(محمد بے کسوں کا سہارا، سکونِ قلب اور تسکینِ روح کا باعث ہیں۔ حُب محمدؐ ہی انسان کی نجات کا واحد راستہ ہے اور اسی راستے پر اپنا سفر جاری رکھنا چاہئے۔ دنیا میں اگر کچھ گراں قدر ہے تو وہ محمدؐ ہی ہیں)

علمِ نجوم کے اعتبار سے نازکی صاحب بُرج قوس کے مالک ہیں اور اس بُرج کی خصوصیت یہ ہے کہ جو افراد قوس ہوں وہ گہری نظر رکھنے والے اولوالعزم اور رجائیت پسند ہوتے ہیں۔ کسی معاملے کی تہہ تک پہنچنے کے لئے غور فکر کرنا ان کا امتیاز ہوتا ہے۔ خود بین اور جدّت پسند ہونے کے علاوہ قوسی

بُرج والے مذہبی معاملات کی طرف زیادہ جھکاور کھتے ہیں اور سب سے بڑی بات ان کی وہ آسودہ مندی ہوتی ہے جو قوسی افراد کا پیشِ دامن بن کر رہتی ہے۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو میں دعویٰ کے ساتھ کہوں گا کہ یہ سب خصائص ان میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ نازکی صاحب کی موجودہ اقتصادی اور معاشی پوزیشن کو زیر نظر رکھ کر باورنہ کرنا سچائی کو چھُپانے کے برابر ہے اور اُن کی نظروں میں کفرانِ نعمت کا اقدام بھی۔ قوسی اثرات کی برکتوں اور اللہ کے فضل سے نازکی صاحب نے ۱۹۸۶ء میں زیارتِ بیت اللہ کی سعادت بھی پائی۔ اس کے پانچ سال بعد ۱۹۸۱ء میں لندن کی سیروسیاحت کرنا بھی نصیب ہوا۔ یوں ان کو ملک سے باہر جانے کا موقعہ بھی ہاتھ آیا۔

اپنے تخلیقی عمل کی پیش رفت کے نتیجے میں انہوں نے اپنا دوسرا کشمیری مجموعہ قطعات ''آوازِ دوست'' ۱۹۸۵ء میں چھاپ لیا۔ اس مجموعہ کے مندرجات میں ۱۸۰ رُباعیاں وقطعات'' ایک نظم اور آٹھ غزلیں ہیں۔ اس مجموعہ پر نازکی صاحب کو ۱۹۸۷ء کا ساہتیہ ایوارڈ دیا گیا۔ ۱۹۸۵ء میں ہی ان کو دوسری بار لندن جانے کا چانس ملا اور ۱۹۸۸ء میں حجاز کا۔ دیارِ حبیب اور بیت اللہ کی چھاؤں میں پہنچ جانے کے بعد اس کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

غالباً مرے دِل سے نکلی تھی ملتزم میں دُعا ہوئی تھی قبول

میں نے دوبار حاضری دی ہے کاش ہر سال کا بنے معمول

نازکی صاحب نے رباعیوں اور قطعوں کی تخلیق کشمیری زبان میں ہی نہیں کی، ہے بلکہ اُردو میں بھی ابتداء سے ہی اس صنفِ سخن پر خوب طبع آزمائی کر کے میدان مار لیا۔ اگر چہ انہوں نے ہر قسم کے خیالات اس صنفِ سخن کے

ذریعے پیش کئے ہیں۔ لیکن بنیادی طور یہ نعت کے شاعر ہیں اور نعت کے لغوی و اصطلاحی معنی کے تناظر میں ہی نعت لکھتے ہیں جبکہ معاصر شعراء میں مشکل سے ہی کوئی نعت نگاری کا صحیح مفہوم سمجھ چکا ہو۔ نعت میں اپنی بے بسی اور بے کسی کا ذکر کرنا نعت کے صحیح مفہوم سے اسے کوسوں دور لے جاتا ہے۔ اسی لئے نعت میں جناب حضورؐ کے جلال و جمال، شکل وشمائل اور آپ کے اُسوہ حُسنہ کا ہی ذکر ہونا چاہیئے ۔ اور تو اور فرقِ مراتب کا اگر نعت لکھتے وقت خیال نہ رکھا جائے تو اندیشہ ہائے دور دراز کے امکانات بڑھ جاتے ہیں لیکن نازکی صاحب ان باریکیوں کو بہت اچھی طرح سے جانتے ہیں۔ اسی لئے ان کا انداز اسطرح سے ہے

یہی ہے حفظِ مراتب ، یہی ہے راہِ ہدیٰ
خدا خدا ہے ، رسولِ خدا، رسولِ خدا
رسول بندۂ مطلق ، خدا سمیع وبصیر
نہ یہ خدا سے جدا ہے، نہ وہ نبی سے جُدا

یا

ہم بھلا کیا لکھیں گے نعتِ رسولؐ
نعت ہی نعت ہے خدا کی کتاب
آپ کی مدح سورۂ حجرات
نون یٰسین، انبیاء احزاب

اپنے قلم کا رُخ جب نعت کی طرف نازکی صاحب موڑ چکے تو اُردو میں نہایت سُرعت کے ساتھ اتنے نعتیہ قطعات لکھے کہ ان کا سبدِ گل تیار

ہوا۔ چنانچہ اپنے نعتیہ مجموعہ کلام موسوم بہ ''چراغِ راہ'' جو ۱۹۸۹ء چھپ چکا،
کے دیباچہ میں اس طرح سے رقم طراز ہیں:۔

''دیدۂ تر کے نام سے میرا اُردو مجموعہ کلام آج سے چالیس سال پہلے
چھپ چکا ہے۔ یہ نسخہ اب نایاب ہے میں نے اراہ کیا کہ دیدۂ تر کا اکثر حصہ
اور اس کے بعد کا کلام مُرتب، کرلوں اور اس کا آغاز بھی کیا۔ اچانک ایک
واقعہ رونما ہوا جس سے میرا ارادہ بدل گیا۔ ہوا یوں کہ ۱۹/جون ۱۹۸۹ء کو
جب میں نیند سے جاگا تو میری زبان پر بلا ارادہ چار مصرعے آگئے۔

پھول کھلتے ہیں خارزاروں میں
جب میں ذکرِ رسولؐ کرتا ہوں
دین ودنیا کی نعمتیں پاکر
نقد قیمت وصول کرتا ہوں

اس قطعہ کا ذہن پر زبردست اثر رہا اور پھر اسی بحر میں قطعات بنتے
گئے جو سب کے سب نعتِ رسولؐ پر متضمن ہیں۔ ۲۶/جون ۸۹ء تک اُن کی
تعداد سو سے متجاوز ہوگئی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ سارے اُردو کلام چھاپنے سے
پہلے اپنا نعتیہ کلام شائع کروں جس میں یہ قطعات شامل ہوں گے۔'' یہاں
ایک خاص بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ نازکی صاحب کی ۱۱۷ کے قریب یہ
چار مصراعی نظمیں صرف آٹھ دنوں میں لکھی گئیں ہیں۔

جہاں تک نازکی صاحب کے نثری کنٹری بیوشن (دین) کا تعلق ہے
اُس میں اُن کے سینکڑوں ریڈیائی ٹاکس کے سوا مُشکل سے سات آٹھ
مقالات ہی نکل آئیں گے جو یہاں کے کئی جرائد میں وقتاً فوقتاً منظرِ عام پر

آئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اصل میں شاعر ہی ہیں، پر نثر جب لکھتے ہیں تو اپنے مخصوص ڈھنگ سے جس کی زبان صحیح ہوتی ہے اور انشا پردازی کے سبھی لوازمات نبھاتے ہیں۔ ناؔزکی شاعری کے بارے میں یہ کہنا مناسب ہے کہ تقسیم ھند سے پہلے ہی اور خاص طور سے اس کے بعد اُردو اور کشمیری شعر و شاعری پر کئی نئے رُجحانات نے یکے بعد دیگرے غالب اثر ڈالا جس کے نتیجے میں ہمارے اُردو کشمیری شعراء بلا تخصیص ترقی پسند تحریک، اشتراکی ادب اور جدیدیت کے نفوذ میں آکر اپنی روایتی کینچلی اُتار پھینک کر ترقی پسند بھی بنے، اشتراکی بھی ہوئے اور جدیدیت کے نقیب بھی۔ ناؔزکی صاحب پرانی قدروں کی نمائندہ آواز اور اپنے ثقافتی وتہذیبی سرمایہ کے وارث ہونے کے ناطے ترقی پسند تحریک کی چکا چوند سے کسی بھی طرح مرعوب نہ ہو سکے۔ نہ اشتراکی ادب کو منہ لگایا اور نہ ہی جدیدیت کی ذہنی جمناسٹک کو قبول کر سکے۔ ہاں یہ بات ہوئی کہ عصری حسیت کے تقاضوں کو محسوس کرتے ہوئے انہوں نے بلاشک شبیہہ کاری، پیکر تراشی اور علامت نگاری سے کام لے کر روایتی ٹرنڈ میں نیا پن دکھا کر اُسے چار چاند لگا دیئے ۔

وہ چال ڈھال جیسے کہ شاداب ڈال ڈال
سر سبز پات پات، رسول خداؐ کی ذات

یا

دھیرے دھیرے چلی نسیم بہار پتے ہلتے ہیں، پھول کھلتے ہیں
والضحیٰ رُخ پہ پردہ واللیل جس طرح دونوں وقت ملتے ہیں

یا

زندگی کی سُلگتی وادی میں دفعتہً دور سے نظر آیا
آپ کی دِلبری کا آبِ حیات، آپ کے لطف کا گھنا سایا

نازؔکی صاحب جو کچھ لکھتے رہے اس میں جہاں سادگی، سلاست اور حقیقت پسندی ہوتی ہے وہاں معنی آفرینی، حُسنِ بیان اور اسلوبِ لفظی کا زبردست اِظہار ہوتا ہے۔ ان کی شاعری پند و نصائح کی بھول بھلیوں سے بے نیاز ایک ٹوٹے ہوئے دِل کی پکار اور روح کی بالیدگی کا ایک ذریعہ ہے۔ ان کا فلسفہ دراصل یہ ہے کہ غم قربِ الٰہی کے باعث اور ہم پایہ روح الامین ہے۔ اسی لئے ان کی ابتدائی اُردو و کشمیری شاعری غم کے تصوّر کا روایتی پہلو ہے۔ بعد کی شاعری خصوصاً ان کے قطعات وقت اور زمانے کا ماتم، قدروں کی شکست و ریخت، محسوسات اور داخلی کرب کی داستان ہے۔ نقد و نظر کے تناظر میں دیکھا جائے تو ان کی قادر الکلامی ان ہی باتوں میں مضمر ہے۔

(نشاط صاحب نے یہ مضمون ۱۹۸۷ء میں قلمبند کیا تھا)

................☆☆☆................

ایاز رسول نازکی

نازکی صاحب کا روزمرّہ

والدِ محترم سحر خیز تھے۔ صبحِ صادق کے مسکرانے سے پہلے وہ نیند کی دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرتے تھے۔ ہم نے کبھی ایسا نہ دیکھا نہ سنا کہ وہ اپنے وقتِ مقررہ پر نہیں جاگ پائے ہوں۔ اپنے قبل از سحر کے معمولات میں نماز، وظائف اور قرآنِ مجید کی تلاوت شامل رہتی تھی۔ مناجات مقبول کی دعائیں اُن کے معمول میں شامل تھیں اور ویسے بھی انہیں قرانی دعاؤں اور رسول کی دعاؤں کا بے مثال علم حاصل تھا۔ فجر کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد وہ سوتے نہیں تھے جیسے کہ بہت سے حضرات کا معمول ہے۔ وہ اس وقت بھی تلاوتِ کلامِ پاک کرتے اور مکمل کرنے کے بعد اپنے باغیچے میں ٹہلتے۔ ہمارے بچپن سے لڑکپن اور جوانی تک بلاناغہ ہمارے گھر میں معمول تھا کہ صبح کا ناشتہ والد صاحب کے کمرے میں ان کے ساتھ کیا جائے۔ تمام افرادِ خانہ پر یہ لازم تھا کہ اس موقع پر حاضر رہیں۔ والد صاحب اپنی مخصوص

نشست پر تشریف فرما ہوتے اور ان کے بغل میں ایک پیٹی پر اُن کا ۱۹۵۰ ماڈل فرگوسن ریڈیو سیٹ صبح کی خبریں نشر کرتا ہوتا۔ اس نشست اور اس ریڈیو پر گویا اُن کی پوری اجارہ داری تھی۔ ہم میں سے کوئی یہ جرائت نہیں کرتا کہ ریڈیو کے ساتھ کسی قسم کی چھیڑ خانی کرتا، وہ زمانہ اور تھا اور شاید آج کے بچے اسے نہ سمجھ پائیں۔ بہر حال یہ صبح کی نشستیں بنیادی طور پر ہماری تعلیم تعلیم و تربیّت کی نشستیں ہوتی تھیں۔ یہاں پر ایک غیر رسمی، انفارمل، غیر محسوس تربیّت ہوتی رہتی تھی اور اس بات کا اندازہ ہمیں کئی دہائیوں کے بعد ہوا کہ ہم سب کی بنیادی تربیّت اِسی چائے کی پیالی کے اطراف و کناف میں ہوئی ہے جو ہر صبح ہم اپنے والد کے روبُرو، اُن سے کچھ کچھ خائف، اور کچھ کچھ ان کی شخصیّت سے مرعوب روز اور ہر روز پیتے تھے۔ کوئی واقعہ، کوئی قصہ کوئی تذکرہ، کوئی لطیفہ، کوئی چٹکلہ، یہ سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ ان کے علم کے بحرِ ذخار کا احاطہ کرنا بہر حال تب بھی ناممکن تھا اور اب بھی ناممکن ہے۔ بات اُن کے معمولات کی ہو رہی تھی، جب تک وہ ملازمت میں رہے، وہ دفتر نکلنے سے پہلے کھانا کھاتے تھے، کھانے میں وہ کم خور واقع ہوئے تھے۔ اُن کے کھانے کا انداز بڑا سلیقے مند تھا۔ ہاتھ سے نوالہ اٹھاتے مگر اُن کی انگلیاں تک جیسے خشک رہتی، کھانے میں نفاست پسند تھے۔ کھانوں اور پکوانوں میں اعتدال پسند تھے، زیادہ تیز اور ترش اشیا مرغوب نہیں تھیں۔ گوشت بھُنا ہوا پسند تھا، سبزیوں کی طرف کوئی خاص میلان نہیں تھا۔ مچھلی شوق سے کھاتے تھے، اور اس میں کشمیری طرز کی خوب تلی ہوئی اور مصالحہ جات سے لیس مچھلی

دونوں کھاتے تھے۔ ہماری والدہ کے ہاتھوں کی پکائی مچھلی بڑی مرغوب تھی۔ مچھلی کے ساتھ مُولی پکائی گئی ہوتی تو وہ بھی شوق سے کھا لیتے۔ میٹھی اشیا بھی پسند کرتے تھے مگر اعتدال میں، جلیبی پسند تھی، پھلوں میں ناشپاتی (ببوگوشہ) اور آم شوق سے کھاتے تھے۔ اُن کے ایک مداح ہر سال ان کے لئے گاؤں سے شہتوت لاتے تھے، اگر چہ وہ بے حد ترش ہوتے تھے مگر ضرور چکھ لیتے۔ ملازمت سے فراغت کے بعد دن کا کھانا لگ بھگ گیارہ بجے کھاتے تھے۔ چائے کے شوقین تھے۔ صبح سویرے میٹھی چائے پیتے (لپٹن چائے) اور یہ اکثر خود اپنے ہی کمرے میں بنا لیتے۔ ہوتا یوں تھا کہ چائے کا سارا مطلوبہ سامان ان کے نماز کے حجرے میں رات کو ہی رکھا جاتا۔ اور ایک بجلی کی کیٹل دستیاب ہوتی۔ وہ صبح اپنی منشا کے مطابق اُس کا سوئچ آن کرتے، چائے پتی ڈال دیتے اور چائے کی دو آدھی پیالیاں قران شریف کی تلاوت کے دوران آہستہ آہستہ نوش فرماتے۔ ہم میں سے کوئی اگر اتنے منہ اندھیرے اُٹھ جاتا اور اُن کے کمرے کی طرف نکل آتا تو اندر بلاتے اور یہ خاص اعزاز بخشتے کہ اپنے ساتھ اس صبحِ صادق کی چائے نوشی میں ہم پیالہ ہونے کی دعوت دیتے۔ پیالہ لباب نہیں بھرتے نہ ایسا پسند کرتے، صبح کے ناشتے میں نمکین چائے کی دو پیالیاں پی لیتے اور کشمیری نانبائی کی ایک روٹی کھا لیتے، یہ اُن کا ناشتہ ہوتا، دن میں کھانے کے ایک دو گھنٹے بعد پھر میٹھی چائے کی ایک پیالی لیتے۔ سہ پہر کو نمکین چائے کی ایک یا دو پیالیاں پیتے مگر روٹی وغیرہ نہیں کھاتے۔ شام آٹھ بجے لگ بھگ کھانا کھاتے۔ اور رات کے

دس بجے سے پہلے عشاء کی نماز اور دیگر عبادات سے فارغ ہو کر سو جاتے۔

اگر کبھی ہم بھائیوں میں بیٹھے ہوتے، کوئی گرما گرم بحث بھی چل رہی ہوتی، دس بجتے ہی وہ اُٹھ جاتے، اُن کے سونے کے بھی اپنے انداز تھے۔ اُن کی جلد بے حد نازک تھی، اور اگر ان کے بچھونے پر ہلکی شکن بھی رہ جاتی تو اُن کے جسم پر نقش چھوڑ جاتی اور وہ کئی کئی دن تک نہیں جاتی اور تکلیف پہونچاتی۔ تکیہ نرم لیتے، نیند ہلکی ہوتی، چھوٹی سے چھوٹی مداخلت سے آنکھ کُھل جاتی۔ مگر عموماً بے خوابی یا کم خوابی کی شکایت نہیں رہتی۔ اپنے وقتِ مقررہ پر سوتے اور وقتِ مقررہ پر جاگتے، آخری سالوں میں دن میں قیلولہ بھی کرتے مگر بہت ہی مختصر۔ صبح کی سیر کے عادی نہیں تھے، البتہ جب تک ملازمت میں رہے، اکثر و بیشتر رعناواری سے ریڈیو کشمیر تک پیدل جاتے تھے۔ چلنے کے عادی تھے، اور شوق سے چلتے تھے۔ عموماً شام کی سیر کو نکل جاتے اور ایک ڈیڑھ کلومیٹر کا فاصلہ طے کرتے۔ لکھنے پڑھنے کا کوئی مخصوص وقت نہیں تھا۔ جب جی میں آیا قلم کاغذ لے کر بیٹھ جاتے اور موضوع کے اعتبار سے وقت صرف کرتے۔ گھنٹوں لکھنے پڑھنے میں گزار سکتے تھے، نئی کتاب، یا کوئی بھی تحریر سامنے آجاتی تو اسے ختم کرنے تک پڑھتے رہتے۔ کسی بھی نوشتے کو پڑھے بغیر نہیں چھوڑتے، چہ جائیکہ وہ تحریر تمبا کو لپیٹنے والے کاغذ پر ہی لکھی ہوئی ہو۔ اخبارات کا مطالعہ اشد ضروری تھا۔ اور اگر اخبارات وقت پر نہیں آتے تو بے چین ہو جاتے، بار بار معلوم کرتے اور اخبار پڑھنے کا بھی اُن کا ایک اپنا انداز تھا۔ اخبارات کا پورا بنڈل اپنے سامنے فرش پر رکھ لیتے۔

اکڑوں بیٹھ کر ایک ایک اخبار دیکھتے۔ اپنے دیکھے پڑھے بغیر کوئی بھی پرچہ اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیتے!! کبھی شام کے وقت اخبارات کا مطالعہ ہو رہا ہوتا، بجلی گُل ہو جاتی تو شمع جلا کے اخبار کے اوپر رکھ لیتے، اسی تحریر کے دائیں بائیں جیسے پڑھ رہے ہوتے۔ اخبار کے اُوراق کو جدا جدا کرنے سے انہیں سخت کوفت ہوتی تھی۔ اگر کوئی ان کی موجودگی میں ایسا کرتا تو اپنی ناراضگی کا برملا اظہار کرتے۔ قلم برداشتہ لکھتے، کبھی کتابوں سے حوالہ جات نہیں ڈھونڈتے، حافظے کی مدد سے حوالے لکھتے جاتے اور اپنے حافظے پر پورا اعتماد تھا۔ شعر کہنے کی کیفیت دُور سے عیاں ہوتی تھی۔ گنگناتے رہتے، اور دائیں بائیں سے جُدا جُدا دکھائی دیتے۔ اپنے ساتھ دیر تک گنگناتے عام طور پر زیرِ لب۔ مگر کبھی دلنشیں آواز میں اپنے یا دوسروں کے شعر پڑھتے اور محظوظ ہوتے۔ ریڈیو سے منسلک ہونے کی وجہ سے ریڈیو سننے کے عادی تھے۔ دنیا بھر کی خبر رکھتے تھے۔ ریڈیو پاکستان لاہور کے کئی پروگرام بلاناغہ سنتے۔ موسیقی میں غزلیں اکثر اُن کے ریڈیو سے سنی جاتی تھیں۔ ہم نے مہدی حسن، نور جہاں، بیگم اختر کے تذکرے ان ہی کی زبان سے سنے ہیں۔ کشمیری موسیقاروں میں محمد عبداللہ تبت بقال، راج بیگم، حسن صوفی، اور شمیم دیو کی آواز پسند تھی۔ لباس کے معاملے میں سادگی پسند تھے۔ پھٹے پرانے کپڑے سے پرہیز نہیں کرتے، مگر چاک گریباں سلواتے ضرور، صاف اور پاک کپڑا پہنتے۔ زیادہ قیمتی لباس سے اجتناب کرتے۔ گھر میں کرتا پاجامہ، واسکٹ، پھرن اور عام ٹوپی پہنتے، باہر جاتے تو اپنی مخصوص کٹ کی شیروانی

پہنتے، جس کے ساتھ کھڑا پاجامہ، آرام دہ نرم جوتے پہنتے، اور سر پہ قراقلی کی ٹوپی، شیروانی گرمی سردی ہر موسم میں پہنتے تھے، مگر کسی بھی وقت دو تین شیروانیوں سے زیادہ استعمال میں نہیں ہوتیں۔ پرانے کپڑے مسکینوں اور محتاجوں میں بانٹ لیتے مگر کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ اپنے بچوں میں سے جب کوئی تحفتاً کوئی کپڑا یا کوئی لباس لے آتا تو اسے لوٹاتے نہیں۔ مگر یہ بھی ضروری نہیں ہوتا کہ استعمال بھی کریں۔ عام طور پر بانٹ دیتے، کھیل کود سے عمر بھر واسطہ نہیں رہا مگر کرکٹ کے ساتھ بڑی دلچسپی تھی اور اس کھیل کے اسرار و موز سے واقف تھے۔ ٹنڈولکر اور انضمام الحق کے درمیان تکنیکی سطح پر موازنہ کر سکتے۔ انضمام کے بارے میں کہتے تھے کہ اس میں "فن ہے شعور نہیں"!! عام طور پر طبیعت میں ایک شرمیلا پن موجود تھا۔ باہری سطح بڑی سخت اور کرخت لگتی تھی۔ جو بھی شخص ان کی اندر کی دنیا میں باریابی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا، وہ اُن کی شخصیت کی بوقلمونی اور رنگارنگی کی ساری قوس قزح دیکھ پاتا۔ بے تکلّفانہ محفلیں مخصوص لوگوں کے ساتھ ہی ہوتی تھیں، اور اُن محفلوں میں طنز و مزاح، فقرے بازی، حاضر جوابی، اور علم کلام کی پھل جڑیاں لگاتار چھوٹتی رہتی تھیں۔

بچوں کے ساتھ اُن کا ایک خاص رشتہ تھا اور بچوں کو ہاتھ سے یا پاؤں سے پکڑ کر بے بس کرتے اور پھر کہتے کہ اب چھوٹ کر دکھاؤ۔ اور بچے دیر تک جستجو میں لگے رہتے۔ کئی بار دو دو تین تین بچے آپس میں مل کر ان کے ہاتھ سے چھوٹنے کی اجتماعی طور پر بھی سعی کرتے، کبھی کامیاب بھی ہوتے اور

کبھی یوں ہی چھوٹتے۔ عمر کے آخری دور میں آکر اپنی اولاد سے اور زیادہ قریب ہو گئے اور پہلے ادوار میں اُن کے ساتھ گفتگو بحر حال یکطرفہ ہوتی تھی۔ ہم ہاں ہاں ہوں ہوں کرتے رہتے مگر آخری دور میں آپسی حباب زیادہ شدید نہیں تھا اور اس طرح ان کی شخصیت کے شگفتہ اور دلاویز پہلو بھی سامنے آتے گئے۔

..............☆☆☆☆..............

''شیرازہ'' میں چھپنے والی نِگارشات

(۱) ہر نگارش کا معاوضہ پیش کیا جاتا ہے بشرطیکہ غیر مطبوعہ اور غیر نشر شدہ ہو۔

(۲) ہندوستانی تاریخ وتمدّن اور ثقافت وادب کے مختلف پہلوؤں پر معیاری تحقیقی مضامین قبول کئے جاتے ہیں۔

(۳) ریاست کے تمدّنی اور فنّی ورثے کے بارے میں تحقیقی اور تنقیدی مقالات ترجیحی طور پر شائع کئے جاتے ہیں۔

(۴) فنِ تعمیر، آرٹ اور مصّوری سے متعلق مضامین کے ساتھ آنے والی نادر تصاویر کا الگ سے معاوضہ دیا جاسکتا ہے۔

(۵) منظومات، بشرطیکہ معیاری ہو' قبول کی جاتی ہیں۔

..........☆☆☆..........

(جسٹس) بلال نازکی

والدِ محترم............

اپنے فرائض کی انجام دہی کے سلسلے میں مجھے ایک قانون دان، جج اور اِس قبیل کے دیگر فرائض کی انجام دہی کے سلسلے میں ملک کے مختلف حصوں میں قیام پذیر ہونا پڑا اور ایک خاص بات جس کا سامنا مجھے ہر بار کرنا پڑا وہ یہ ہے کہ جہاں بھی میں گیا، جن لوگوں سے بھی ملا، پہلا سوال یہ ہوتا ہے کہ نازکی مرحوم سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟۔ بعد میں میری پہچان نازکی صاحب کے فرزند کے نام ہی سے ہو جاتی ہے۔ صورتِ حال کا مشاہدہ کر کے تعجب ہوتا ہے کہ ملک کے کونے کونے میں لوگ نازکی مرحوم کے نام اور کام سے کس حد تک واقف ہیں۔ ایک بیٹے کے لئے اِس سے بڑھ کر فخر کا اور کیا مقام ہو سکتا ہے کہ اُس کے والد کے نام اور کام کی اِتنی پذیرائی ہو۔ یہ پہچان اپنی جگہ لیکن میں نے بارہا کوشش کی کہ لوگ میری شناخت میرے نام سے کریں لیکن مسئلہ اِتنا آسان نہیں جتنا کہ بظاہر نظر آتا ہے۔

والدِ محترم کی صفات کہاں تک بیان کی جائیں۔ جہاں وہ صبر استقامت اور شفقت کی مِثال تھے وہاں بارعب، اور ڈسپلن کے سخت پابند تھے۔ اُنہوں نے گھر

میں ایسا ماحول قائم کرر کھا تھا جس میں ضبط شکنی کی کوئی گنجائش نہیں نِکل سکتی تھی۔ سحر خیزی، وقت پر کھانا، پڑھائی کے لئے مقرّرہ اوقات، جب گھر میں ہوتے تو کی مجال کہ کوئی آواز اُونچی کر کے بات کرے۔ اگر کوئی اِس سے انحراف کرنے کی کوشش کرتا تو اُن کے ہاتھ پیر حرکت میں آجاتے لیکن بعد میں شامت زدہ کے اِس ''شریر'' بچے کو بطورِ خاص والدِ محترم اپنے پاس سُلاتے اور سونے سے قبل اپنے خاص انداز میں اُسے سمجھاتے بجھاتے اور شفقت کا اظہار فرماتے۔ حق تو یہ ہے کہ کئی مرتبہ یہ ''نظرِ التفات'' مجھ پر بھی پڑی۔

1990ء کا واقعہ ہے کہ نازکی کی مرحوم انگلینڈ گئے ہوئے تھے اور سری نگر میں بعض لوگوں نے مجھ پر حملہ کیا۔ جنوری 1992ء میں مجھے ریاست کا ایڈوکیٹ جنرل بنایا گیا۔ میں چاہتا تھا کہ جن لوگوں نے مجھے پر حملہ کیا تھا اُنہیں اس کی سزا دلواؤں۔ میں نے اِس سلسلے میں کارروائی بھی شروع کی جس کی بھنک والدِ محترم کے کانوں میں بھی پڑ چکی تھی۔ اُنہوں نے مجھے بُلایا اور کہا کہ تم کو اِس بات کا حق حاصل ہے کہ جن لوگوں نے تم پر حملہ کی اُنہیں سزا دِلواؤ۔ یہ بات ذہن میں رکھو کہ اُن کی اِس حرکت سے جس قدر تکلیف آپ کو ہوئی اُس سے کہیں زیادہ مجھے بھی ہوئی لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم اِن واقعے کو ہی بھول جاؤ کیوں کہ اللہ تعالیٰ معاف کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔

1995ء میں راقم کو ریاستی ہائی کورٹ کا جج بنایا گیا۔ 6رجنوری 1995ء کو جموں ہائی کورٹ میں حلف برداری کی رسم تھی۔ والدِ محترم جموں ہی میں تھے۔ رات کو قریب دس بجے اُنہوں نے مجھے بُلایا اور کہنے لگے کہ میں سمجھتا ہوں کہ تم جج بننا قبول مت کرو۔ بہت مُشکل معاملہ ہے۔ یہ تو جیسے تلوار کی دَھار پر چل کے دِکھانا

ہے۔ کبھی میرے خلاف فیصلہ دینا ہو تو اُس وقت کیا کروگے؟...... کچھ دیر بات چیت چلی میں نے اپنی معروضات پیش کیں اور اپنے مخلصانہ ارادے ظاہر کئے۔ والدِ محترم نے کچھ دیر غور فکر کے بعد فرمایا کہ تمہیں کل ہائی کورٹ میں حلف لینا ہے لیکن صبح کے چار بجے میرے پاس حاضر ہو جانا۔ جب میں صبح ۴ بجے والدِ محترم کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ اُس وقت کلامِ پاک کی تلاوت کر رہے تھے۔ مجھے سامنے بٹھایا قرآن اور احادیث کی روشنی میں عدل و انصاف کی حرمت ذہن نشین کرائی اور قرانِ مجید پر ہاتھ رکھوا کر مجھے عدل و انصاف کی بالا دستی قائم رکھنے کا حلف لینے کو کہا۔ اس کے بعد فرمایا کہ تمہارا حلف میرے سامنے ہو گیا اَب جاؤ اور ہائی کورٹ میں حلف لے کر اپنے فرائض انجام دو۔

والدِ محترم کی خاص عادت تھی کہ وہ صبح کا ناشتہ اپنے بچوں کے ساتھ کرتے۔ اِس خاص مجلس میں ہم سبھوں کا موجود رہنا لازمی تھا۔ اِسی مجلس میں ہم اُن کے ارشادات اور احکامات سے فیض یاب ہو جاتے تھے۔ ہر روز کوئی نہ کوئی نیا موضوع کوئی نئی بات ...... قرآن، اِسلام، ادبیات اور اخلاقیات کے کتنے ہی درس ہم کو اِس خاص مجلس سے حاصل ہوئے۔ ہم میں سے کِسی بھی بہن بھائی نے باضابطہ طور فارسی نہیں پڑھی ہے لیکن یہ اِسی مجلس کا اعجاز ہے کہ ہم فارسی زبان اور ادبیات سے کماحقہ آشنا ہو گئے۔

راقم اَپنی نوجوانی کے ایّام لینن اور مارکس کے فلسفے سے کِسی قدر متاثر تھا۔ والدِ محترم کو پتہ چلا تو اُنہوں نے کہا کہ لینن اور مارکس کو پڑھنے میں کوئی قباحت نہیں لیکن ساتھ ہی امام غزالی اور دیگر علمائے دین کی کتابوں کا مطالعہ بھی کرو۔ اِس حکم کی تعمیل میں راقم نے اِن کتابوں کا مطالعہ شروع کیا تو میرے قلب و نظر میں وسعت

پیدا ہوگئی اور میں کھرے اور کھوٹے میں فرق کرنے کے قابل بن گیا۔

والدِ محترم کے جگر مرادآبادی، فراق گورکھپوری، سکندر علی وجد، اور اِس قبل کے دیگر سخنوروں کے ساتھ ذاتی تعلقات تھے۔ مہجور، دینا ناتھ نادم، رحمان راہی، امین کامل وغیرہ کے ساتھ آئے روز اُدبی محفلیں جمتیں تھیں۔ احد زرگر کے ساتھ ایک قلبی لگاؤ تھا۔ صمد میر گاہے گاہے نازکی صاحب کے پاس تشریف آور ہوتے۔

والدِ محترم سماع کے بے حد دلدادہ تھے۔ اُستاد محمد عبداللہ تبت بقال، اُستاد رمضان جُو اور غلام محمد قالین بافت کی صوفیانہ محافل میں بڑے ذوق وشوق سے شرکت کرتے۔ ختمات المعظمات کی بابرکت مجالس یوں سمجھئے ہمارے گھر کے معمولات میں شامل تھیں۔

آج جب کہ والدِ محترم کو اِس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے برس ہا گزر چکے ہیں لیکن آج بھی یُوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ میرے آس پاس ہی ہمیں اپنے ارشاد اور احکامات سے نواز رہے ہیں۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

..................☆☆☆☆☆..................

ڈاکٹر محمد طارق نازکی

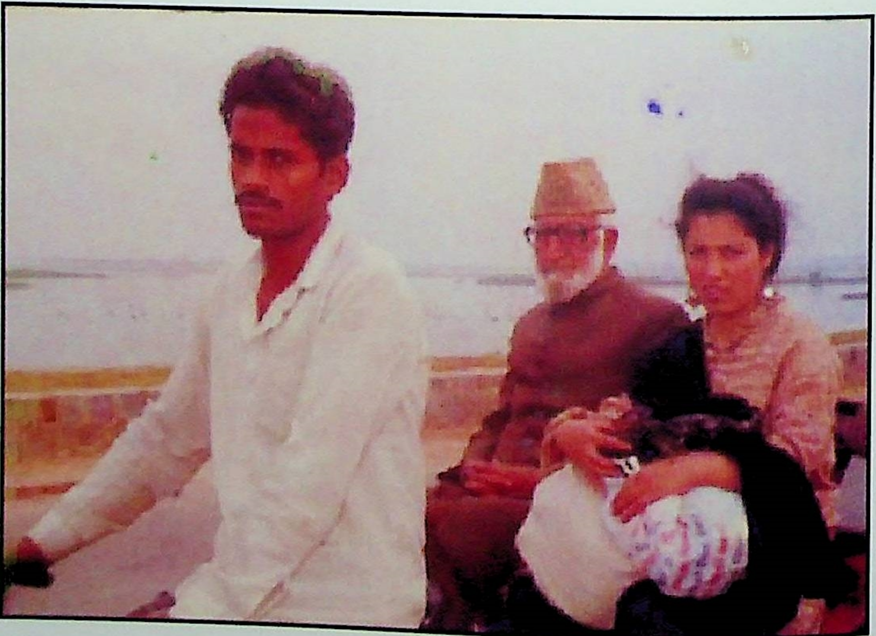
"سلامٌ قولاً مِنْ رَّبِ رَحِیم"

اپنے والدِ بزرگوار کے بارے میں کچھ کہنا میرے لئے اِسلئے بہت ہی مشکل ہے کہ بار بار اُن کا بارعب چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور میں ادب اور خوف کے مِلے جُلے جذبات سے پسینہ پسینہ ہونے لگتا ہوں۔ ایک اور بات یہ بھی ہے کہ میں بچپن میں والد صاحب کے بجائے اپنی والدۂ محترمہ کے زیادہ قریب تھا اور جب ہماری والدہ انتقال کر گئیں تب میں محترم نازکی صاحب کے قریب ہو گیا۔ نازکی صاحب شخصیّت کا رعب اِس قدر میرے دِل دماغ پر طاری تھا کہ اُن کہ آنکھوں میں آنکھیں ملا کر بات کرنے کے لئے مجھے قریب پچاس سال کا انتظار کرنا پڑا۔ بچپن میں میری یہ شدید خواہش تھی کہ میں اپنے والد کی گود میں جا بیٹھوں لیکن کبھی ہمت نہیں ہوتی تھی لیکن میری یہ خواہش اِس طور سے رنگ لائی کہ زندگی کے آخری ایام میں مجھے اُن کو اپنی بانہوں میں لینے کا موقعہ نصیب ہوا۔

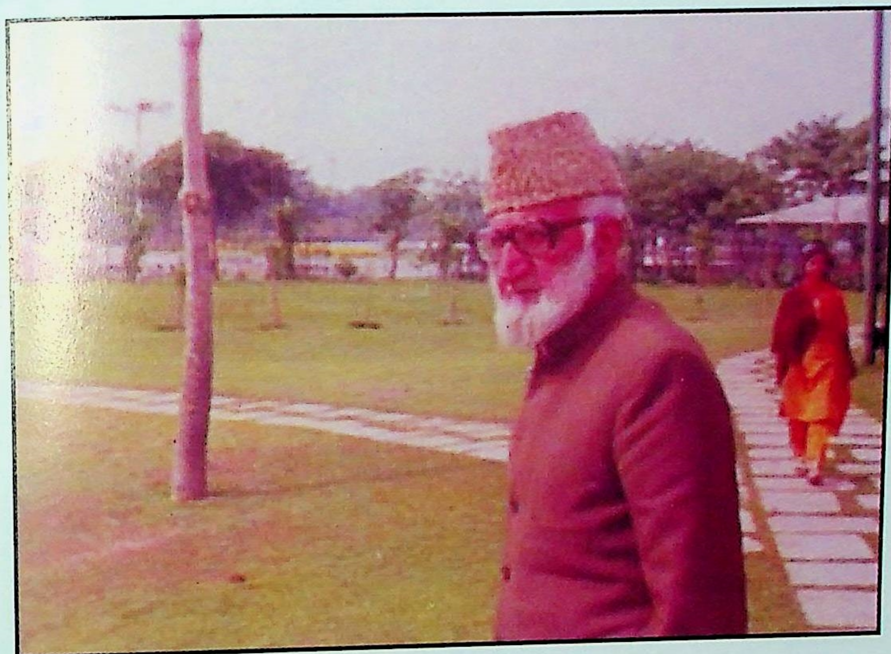
1980ء میں جب ہماری والدۂ محترمہ کا انتقال ہوا تو میں میں اُس وقت برطانیہ میں تھا۔ مجھے اپنی والدہ کی تجہیز و تکفین میں شامل ہونے کی سعادت حاصل نہیں ہو سکی جس کا مجھے بہت ہی افسوس ہوا اِس کا اظہار میں نے والدِ بزرگوار سے



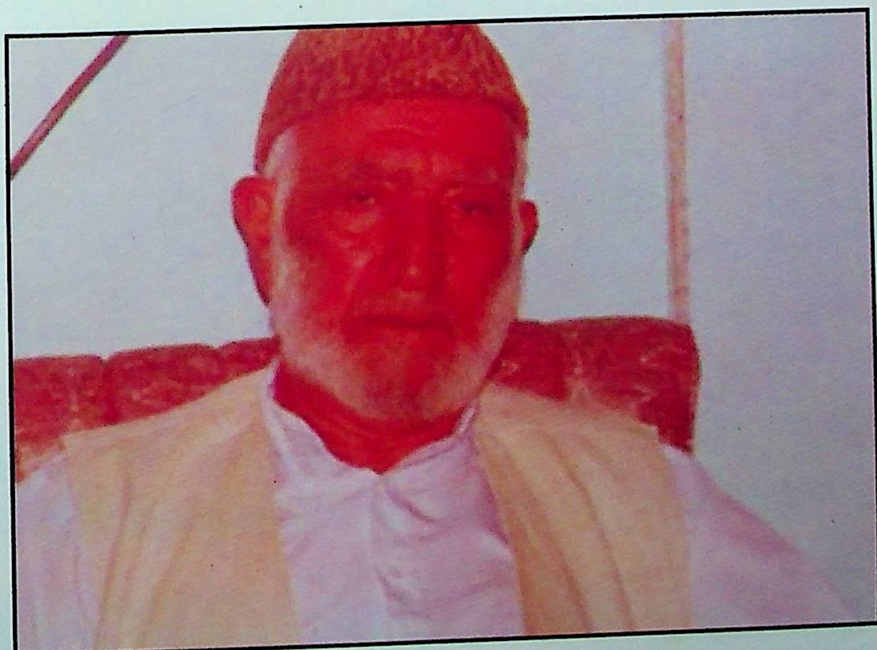
نئی دہلی کے ایک باغیچے میں۔



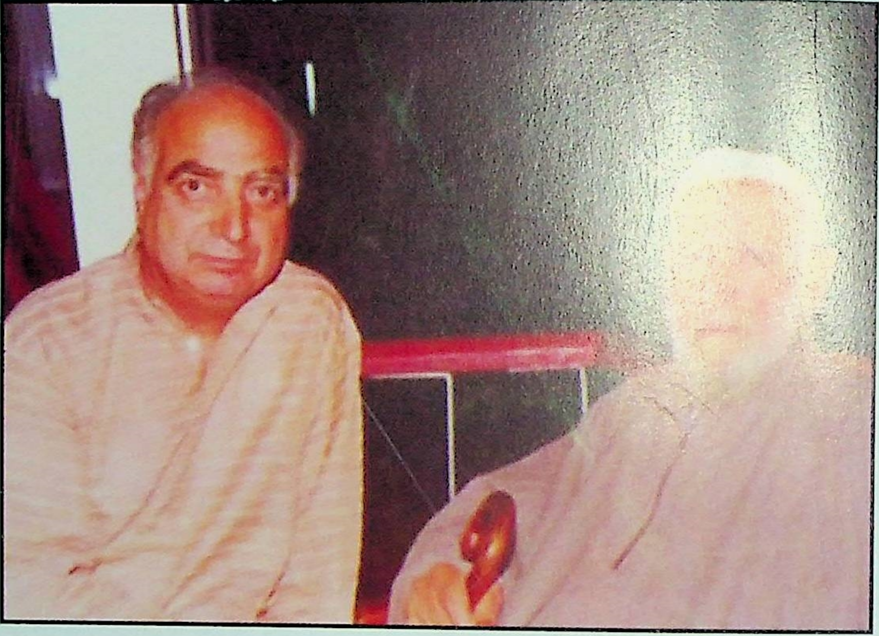
اپنی ایک عزیزہ کے ہمراہ۔



لودھی گارڈن دہلی میں۔



نازکی صاحب۔ایک انداز۔



میر غلام رسول نازکیؔ اور فاروق نازکی۔



ریڈیو کشمیر میں بچوں کے پروگرام کی میزبانی کرتے ہوئے۔



کلا کیندر جموں میں یومِ نازکی ۔ڈاکٹر ظہور الدین، جسٹس بلال نازکی، مسعود چودھری
،ڈاکٹر رفیق مسعودی اور محمد اشرف ٹاک۔



یومِ نازکی ۔افتتاحی کلمات۔



معروف صوفی شاعر، عبدالاحد زرگر اور میر غلام رسول نازکیؔ ۔



(دائیں سے بائیں) بشیر اختر، علی محمد لونؔ، غلام نبی فراقؔ، دینا ناتھ نادمؔ، احد زرگر، غلام رسول نازکیؔ ، محمد یوسف ٹینگؔ، رحمان راہیؔ، محمد یوسف ہمدانی موتی لال ساقیؔ، ظریف احمد۔



عبدالحق برق، میر غلام رسول نازکی، جگر مرادآبادی، سید نصر اللہ اور فاروق نازکی۔



۱۹۶۶ء میں ریڈیو کشمیر سرینگر سے سبکدوش ہو جانے پر الوداعی پارٹی۔



۱۹۵۱ء۔ نازکی صاحب۔ حلقۂ یاراں۔



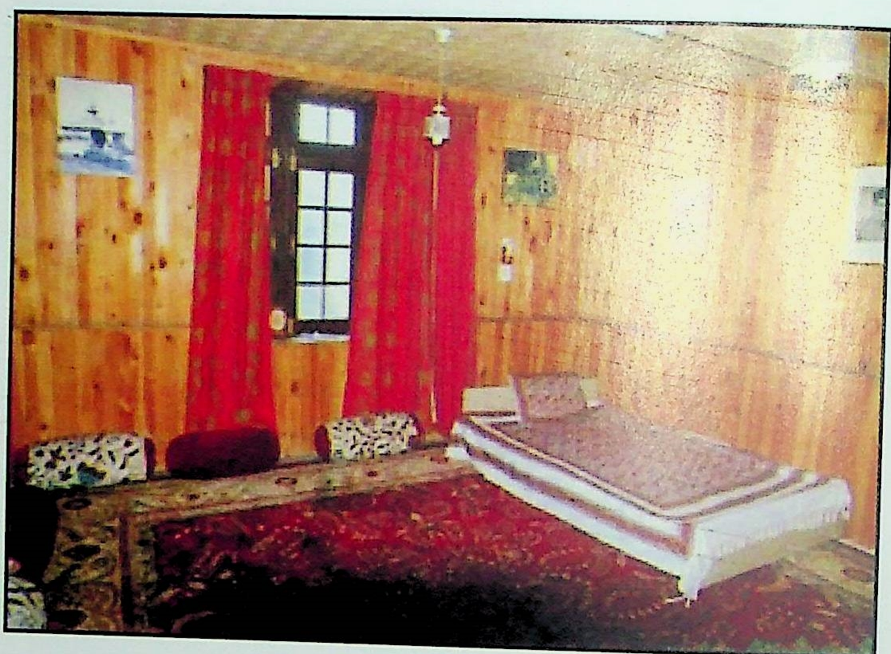
حلقۂ یاراں۔



حالتِ احرام میں۔



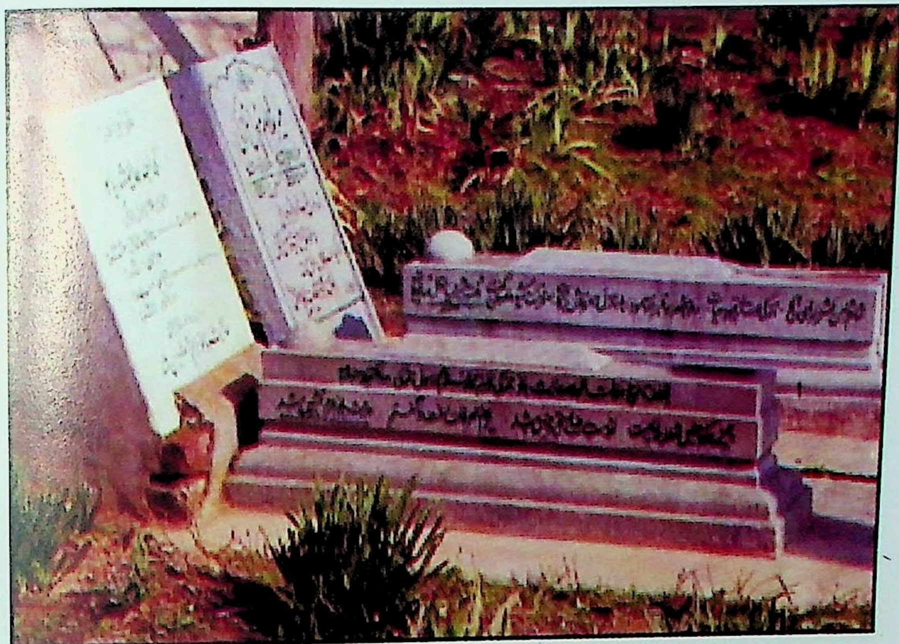
۱۹۵۰ء۔ ریڈیو کشمیر سری نگر میں منعقدہ کل ہند اردو مشاعرہ۔ تصویر میں دینا ناتھ نادم، علی محمد لون، ماسٹر زندہ کول اور سردار جعفری کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔



نازکی صاحب کی آرام گاہ۔



میر غلام رسول نازکیؔ اور انکی اہلیہ کا مرقد۔



مرقد میر غلام رسول نازکیؔ۔



مرقد اہلیہ و میر غلام رسول نازکیؔ۔



حجرۂ عبادت۔



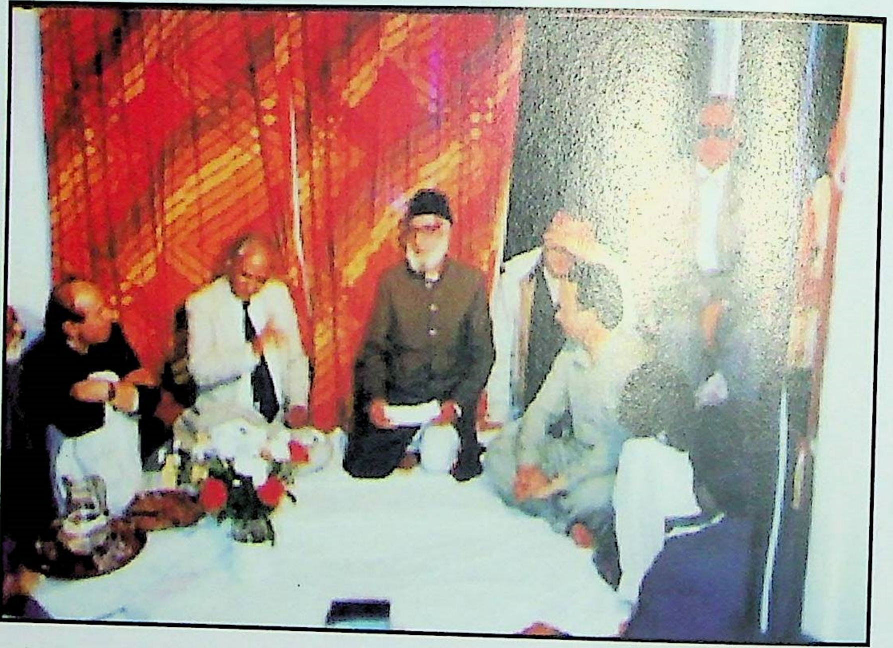
شِو پورہ بٹوارہ میں واقع وہ مکان جہاں نازکی صاحب نے اپنی زندگی کے قریب ۲۲ر سال گزارے اور یہیں اُنکا انتقال ہوگیا۔



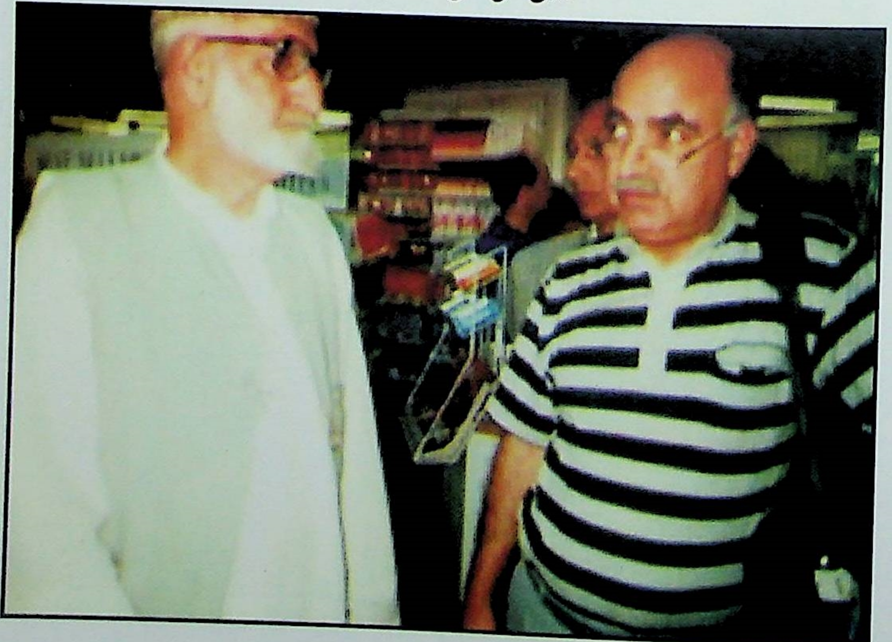
برمنگھم میں محفل شعروسخن۔



وہ کمرہ جہاں ناز کی صاحب لوگوں سے ملا کرتے تھے۔



لندن میں محفل مشاعرہ۔



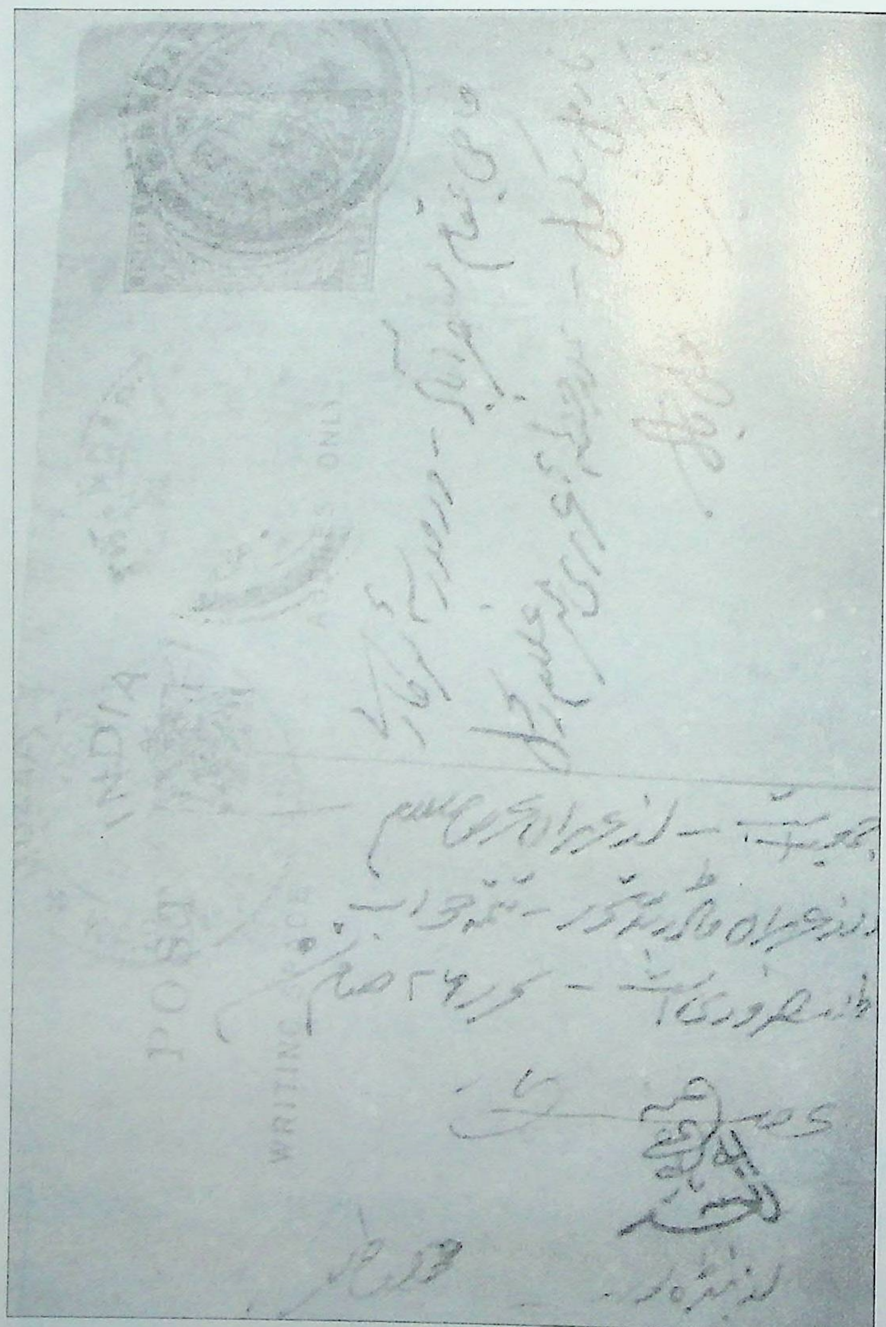
لندن میں اپنے فرزند ڈاکٹر طارق ناز کی کے ساتھ۔



تسبیح وقرآن مجید۔



نازکیؔ صاحب انگلینڈ میں۔



میر غلام رسول نازکیؔ کے نام اُن کے والدِ بزرگوار، میر مصطفیٰ نازکیؔ کے ایک خط کا عکس۔

بالبريد الجوي

BY AIR MAIL
PAR AVION

خطاب جوى

AIR LETTER

AEROGRAMME

MR. FAROOQ NAZKI MA.
RADIO KASHMIR SRINAGAR
JAMMU AND KASHMIR STATE
INDIA.

Second fold here — يثنى هنا ثانيا

Sender's name and address:- اسم المرسل وعنوانه
G. R. NAZKI C/O.
SHAKIR SIKANDAR
MOHALLA JIYAD
MECCA.

G. R. NAZKI
C/O SHAKIR

IF ANYTHING IS ENCLOSED
THIS LETTER MAY BE SENT
BY ORDINARY MAIL.

اذا وضع أي شيء
بداخله يجوز ارسال
الخطاب بالبريد العادي

مکہ معظّمہ سے میر غلام رسول نازکی کے ایک مکتوب کا عکس۔

بھی کیا۔ جس پر اُنہوں نے بر ملا طور کہا کہ تمہارے ساتھ وعدہ ہے کہ جب میرا آخری وقت ہوگا اُس وقت تم میرے پاس ہو گے۔

والد صاحب ڈسپلن کے بہت سخت پابند تھے اور اپنے بچوں کے مستقبل کو لے کر اُنہوں نے جو خاکہ اپنے ذہن میں تیار کیا تھا وہ اس کو ہر صورت میں عملاً نا چاہتے تھے۔ جب میں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا تو اُنہوں نے کہا کہ پالی ٹیکنیک میں درخواست دو...... خود نازکی صاحب کا تبادلہ اِندور ہو گیا تھا۔ میں نے پالی تیکنیک میں درخواست دی اور مجھے وہاں داخلہ مِل گیا لیکن وہاں میرا دِل نہیں لگا اور یہ مضمون میری سمجھ میں نہیں آیا اور میں نے اِسے چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ پالی ٹیکنیک کالج کے پرنسپل جناب حسن خان صاحب تھے۔ وہ والدِ بزرگوار کے ساتھ دوستانہ مراسم رکھتے تھے۔ خان صاحب نے خط لِکھ کر اُنہیں صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ والدِ بزرگوار اندور سے چھٹی لے کر آئے۔ کھانا وغیرہ کھایا اور میرے ساتھ ہمکلام ہو گئے۔ میں نے پالی ٹیکنیک میں اَپنی عدم دلچسپی کا اظہار کیا کہ وہ میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ والدِ بزرگوار نے بڑی ہی سنجیدگی کے ساتھ اَپنا فیصلہ سُناتے ہوئے کہا کہ لگتا ہے کہ تمہاری پاس صلاحیتوں کی کمی ہے۔ اگر محنت کرتے تو دیکھا جاتا کہ تم امتحان میں فیل ہوتے یا پاس لیکن تم نے ایسا کچھ نہیں کیا اور لہذا میں تم سے دستبردار ہو جاتا ہوں اور اپنے لئے کوئی نوکری تلاش کر لو۔ اس کے بعد ایک لمبے عرصے تک میرے ساتھ بات نہیں کی جب تک نہ میرا داخلہ ایم بی بی ایس میں ہو گیا۔

میری زندگی میں ایک ایسا دَور بھی آیا جب میں خدا کے وجود کے بارے میں شبہات میں مبتلا ہو گیا (نعوذ باالله)۔ ولدِ محترم نے سُنا تو مجھے اپنے پاس بُلایا اور کہا کہ

ایسا مرحلہ قریب قریب ہر شخص کی زندگی میں آتا ہے لیکن یہ تلاش حق کی جستجو کی جانب مراجعت ہے اپنے دِل کو خالی مت رکھو۔

" But Don't leave it vacant.
Creat a God for yourself.Who ever is your God"

نہیں تو اِس میں شیطان آ کے بیٹھ جائے گا۔ اِس کے بعد کئی بار بحث ومباحثے کے بعد میری سوچ بدل گئی اور میرے شکوک وشبہات رفع ہو گئے۔

مذہب کے بارے میں اُن کا اپروچ بالکل سائینسی تھا اور وہ کہیں بھی عقلی استدلال سے باھر نہیں جاتے تھے۔ایک بار میں نے کہا کہ نماز کے دوران بعض اوقات توجہ اِدھر اُدھر بھٹک جاتی ہے تو اُنہوں نے کہا کہ آپ کا کام نماز پڑھنا ہے آپ پر جو فرض تھا وہ آپ نے ادا کیا۔آگے کا کام اللہ تعالیٰ کا ہے۔

والدِ بزرگوار کئی مرتبہ انگلینڈ آئے۔ 1982ء میں وہ چار پانچ مہینے تک انگلینڈ میں قیام پذیر رہے۔لندن میں اُن کی ملاقات سرکردہ شاعروں اور ممتاز شخصیات سے ہوئی جن میں بلبلؔ صاحب، محمود ہاشمی، افتخار عارف، ڈاکٹر جعفر، سیّد ضمیر جعفری، جگن ناتھ آزاد وغیرہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔میں برمنگھم میں رہتا تھا جہاں ھندوستانیوں اور پاکستانیوں کی اچھی خاصی تعداد آباد ہے۔وہاں آئے روز مشاعرے منعقد ہوتے اور والدِ بزرگوار بڑے ذوق وشوق کے ساتھ اِن میں شرکت فرماتے تھے۔ والدِ بزرگوار کی فرمائش پر ہم اُنہیں شیکسپیئر اور ورڈس ورتھ کی یادگاروں پر لے گئے اور وہ وہاں کافی دیر تک اپنے ہی خیالوں میں گُم صم بیٹھے رہے۔

1986ء میں نازکی محترم دوسری مرتبہ انگلینڈ آئے۔اَب کی بار اُن کا قیام چھ ہفتوں تک رہا۔اُنہوں نے مختلف لائبریریوں سے استفادہ کیا۔۱۲ بجے دوپہر کو

کھانا کھا کر میری اہلیہ اُن کو لائبریریوں لے جاتی جہاں وہ مختلف موضوعات پر کتابوں کا مطالعہ کرتے اور شام کو واپس لوٹ آتے۔ وہ شہرۂ آفاق کیو گارڈن بھی گیئے جہاں دُنیا بھر کے پودوں کی اقسام موجود ہیں۔ اُنہوں نے برٹش میوزیم کا بھی دورہ کیا اور اِنڈیا آفس، لندن میں ''تاریخِ حسن'' کا اصلی مسوّدہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

1991ء میں وہ تیسری بار انگلینڈ تشریف لائے اور علمی اَدبی مشاغل میں مصروف رہے۔ اَب کی بار اُن کے ساتھ کھُل کے بحث ومباحثے کے مواقع نصیب ہوئے۔ مذہب، فلسفہ، اَدب، حیات ومما ت کتنے ہی موضوعات پر اُن کے ساتھ گھنٹوں مباحثے ہوتے اور میں حیران رہ جاتا کہ یہ شخص کِس قدر معلومات رکھتا ہے اور اِس کا اپروچ کِس درجہ سائیٹفک ہے۔ وہ مانچسٹر، ویلز، برمنگھم اور لندن کے مختلف علاقوں میں علمی اور اَدبی تقریبات میں بھی شامل ہوتے رہتے تھے۔

فروری۔ مارچ میں اُن کو صحت کی خرابی کی بنا پر جموں میں ہسپتال میں داخل کرایا گیا۔ قریب دو سال قبل اُن کی بیماری کی تشخیص ہوئی تھی۔ آپریشن تجویز کیا گیا لیکن وہ اس کے لئے راضی نہیں ہوئے۔ جب اُنہیں جموں میں ہسپتال میں داخل کرایا گیا تو میری فاروق صاحب سے فون پر بات ہوئی۔ نازکی مرحوم سے بات ہوئی تو میں نے اُن سے کہا کہ میرا سری نگر آنے کا اِرادہ ہے۔ اپریل کے پہلے ہفتے میں جب صورتِ حال پیچیدہ ہوگئی تو والدِ بزرگوار کی اجازت سے ۱۰/اپریل کو برطانیہ سے سری نگر چلا آیا۔ چھ دِن اور چھ رات میں اُن کی خدمت میں حاضر رہا اور تین شب میں نے اُن کے ساتھ اُن کے کمرے میں گزارے۔ 16/اپریل جمعرات، صبح دس بجے کہا کہ آج باہر اچھی دُھوپ ہے، وہیں چل کر بیٹھتے ہیں۔

۱۰ بجے سے ۴ بجے سہ پہر تک ہم وہیں بیٹھے رہے۔ کھانا وغیرہ بھی وہیں کھایا۔ دِن بھر باتیں ہوتی رہیں۔ حیات، موت، فلسفۂ موت۔ ۴ بجے تھوڑی سی سردی ہوئی، طے پایا کہ اندر کمرے میں چلیں گے۔ فرمایا کہ تصوّر کرو کہ ایک بیس بائیس نوجوان کی شادی ایک نوجوان خاتون سے ہوجاتی ہے اُس وقت جو اشتہا مذکورہ نوجوان میں ہوتی ہے وہی اشتہا مجھے اِس وقت موت سے ملنے کی ہے۔

بہر کیف، عصر کا وقت تھا تو فرمانے لگے کہ اگر میں رات کو گزر گیا تو مجھے صبح ۱۱ بجے قبل دفن کردینا کیوں کہ وقتِ زوال سے قبل جس کی تدفین ہوتی ہے تو اُس کی بازپُرس میں وقت لگتا ہے۔ جان کنی کے وقت دو چیزیں مُشکل پیدا کرتی ہیں (۱) زر، اور (۲) اولاد، لیکن میں نے اس کا بھی انتظام کیا ہُوا ہے۔ اِسی اثناء میں وضو کیا۔ بیٹھ گئے۔ سگریٹ پیا۔ قاضی غلام رسول اور اُن کے فرزند جان صاحب مزاج پُرسی کے لئے آگئے تھے۔ ڈاکٹر رفیق مسعودی فون پر خیر و عافیت پوچھ رہے تھے اور نازکی مرحوم خندہ پیشانی سے استفسارات کا جواب دے رہے تھے۔ اسکے بعد جسٹس بلال نازکی کا بھی فون آیا۔ نازکی مرحوم کہنے لگے کہ کھڑکی کھول دیجئے اسکے بعد لیٹ گئے۔ میں نے ماتھا چھُوا تو اُنہوں نے لمبا سانس لیا۔ اللہ کو یاد کیا اور اسکے ساتھ ہی اَپنی جان جانِ آفرین کے سپرد کردی، انا للہ انا الیہ راجعون ۔ میں نے غسل دیا اور لحد میں اُتارا۔ اِس طرح وفات کے وقت میری اُن کی خدمت میں حاضر ہونے کی اُن کی پیش گوئی حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔

قرآنِ کریم کی اِس آیت سے تاریخِ وفات نکلتی ہے۔

"سلامٌ قولاً مِّنْ رَّب رحیم"

..............☆☆☆☆☆..............

پروفیسر حامدی کاشمیری

اُردو کا سلسلہ...... میر غلام رسول نازکی

ادبی زندگی کی شروعات میں جناب شہہ زور کاشمیری کی خدمت میں مشورۂ سخن کیلئے حاضر ہوتا تھا۔ وہ عموماً سیمابؔ سکول سے وابستہ شعراء کا فخریہ ذکر کرتے، کبھی کبھی وہ کشمیر کے اردو شعراء کے بارے میں بھی کچھ نہ کچھ کہتے تھے۔ وہ عموماً اپنے معاصرین کے بارے میں تنقیصی رَوّیہ اختیار کرتے۔ البتہ وہ میر غلام رسول نازکی کا ذکر قدرے احترام سے کرتے تھے۔ وہ غ، م، طاؤس کی بھی عزت کرتے تھے۔ نازکی صاحب کو یاد کرتے ہوئے وہ انکے تیئں ستائشی لہجہ اختیار کرتے، مگر اپنی برتری کا ذکر اشارتاً ہی سہی، ضرور کرتے، ہم دوسرے شاگرد بھی بالعموم خاموشی سے سنتے تھے۔ میں اس میدان میں بالکل نَو وارد تھا۔ میں نے نازکی صاحب یا دیگر بزرگ شعراء کو ریڈیو سے سنا تو تھا مگر دیکھا نہ تھا۔ ایک دن انہوں نے ایک مصرعہ طرح جس کا قافیہ اور ردیف 'آ کر چلے گئے' تھے، پر اپنی غزل سنائی اور پھر نازکی صاحب کی اسی زمین میں لکھی ہوئی غزل کے دو شعر سنائے۔ دونوں حضرات کی طرحی غزلوں کے چند اشعار سن کر مجھے محسوس ہوا کہ نازکی

صاحب کی غزل سادگی کا حُسن رکھتی ہے اور شہ زور صاحب کی غزل مرصع ہے۔ یہ بات میں زبان پر لا نہ سکا، مگر دونوں اصحاب کے بارے میں یہ رائے دیر تک دل میں جاگزیں رہی، ناز کی صاحب کے کلام پر از دل خیز د بر دل ریزد کا مقولہ صادق آتا تھا۔

میں نے ۱۹۴۸ء میں سری پرتاپ کالج میں داخلہ لیا اور بی اے کی ڈگری لینے تک میں مختلف اخبارات اور جرائد میں ریاستی شعراء کا کلام پڑھتا تھا۔ میں عشرتؔ کاشمیری، تنہاؔ انصاری، رساؔ جاودانی، غ، م، طاؤس، کشن سمیل پوری، مہندر رینہ، شہ زورؔ کاشمیری اور نند لال طالبؔ کا جستہ جستہ کلام پڑھتا رہا۔

نازکی صاحب سکول ایجوکیشن سے مستعفی ہوکر ریڈیو کشمیر سے وابستہ ہوئے تھے۔ اس زمانے میں ریڈیو سے کشمیر، اُردو کے گمنام شعراء کے بارے میں معلوماتی Talks نشر ہوتی تھیں۔ میں نے سوچا کہ اس نوع کی Talk میں بھی لکھ سکتا ہوں، چنانچہ میں نے امام مسجد مبارک شاہ صاحب کے والد اسد کاشمیری کی کشمیری شاعری پر Talk لکھ دی۔ اسد صاحب کو مرثیہ گوئی اور نعت نویسی میں خاصی دستگاہ تھی۔ میں نے ایک دن کالج سے نکل کر ریڈیو کا رخ کیا اور نازکی صاحب سے ملا۔ انہوں نے ایک گہری نظر مجھ پر ڈالی اور اگلے روز ملنے کو کہا۔ میں چُپ چاپ ان کے کمرے سے نکلا، دوسرے دن ان سے ملا تو انہوں نے کہا کہ اس مضمون میں کچھ تبدیلیاں کرنا ضروری تھا۔ انہوں نے استادانہ انداز میں دو یا تین الفاظ کے معنی پوچھے، میں نے جھٹ سے معنی بتائیے۔ انہوں نے ساتھ ہی اگلے روز مجھے وہ Talk نشر کرنے کیلئے بلایا۔ میں ان کی سنجیدگی سے نروس ہو رہا تھا۔ میں شکریہ تک ادا نہ کر سکا حالانکہ میرا دل احساسِ تشکر سے معمور تھا۔

اس کے بعد میں گاہے گاہے ان سے ملتا رہا، وہ اپنی وضع کے مطابق یعنی کم سخنی اور سنجیدگی سے پیش آتے رہے، اکثر ملاقاتیں یا تو آل انڈیا ریڈیو، کلچرل اکیڈیمی یا مشاعروں میں ہوتی تھیں۔ ایک خاص برد باری اور وضع داری ان کا شیوہ تھا۔ میں خود ان سے ایک فاصلہ قائم کر کے ملتا۔

۵۸ء میں ریاست کے وزیر اعلیٰ بخشی غلام محمد نے نہ صرف اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگو یجز کی بنیاد ڈالی اس کی ترقی و ترویج کیلئے ریاست کے تین خطوں یعنی کشمیر، جموں اور لداخ سے تین لوگوں یعنی مجھے سری نگر کیلئے، پروفیسر نیلامبر دیو شرما کو جموں کیلئے اور لداخ کیلئے اکبر لداخی کو اسسٹنٹ سیکرٹریز کی حیثیت سے تعینات کیا۔ اسی زمانے میں بخشی صاحب نے ریاست کے مختلف اضلاع میں 'جشن کشمیر' کے عنوان کے تحت ادبی اور کلچرل پروگرام منعقد کروانے کا اہتمام کیا۔ مشاعرے منعقد کروانے کی ذمہ داری نازکی صاحب کو تفویض کی گئی تھی۔ جشن کشمیر کے سلسلے میں ہم بانڈی پورہ گئے، کلچرل پروگرام کے بعد مشاعرہ ہوا۔ بانڈی پور میں سارا پروگرام کامیاب رہا۔ نازکی صاحب زیادہ ہی سرگرم تھے۔ معلوم ہوا کہ ان کا آبائی گاؤں بانڈی پورہ سے جڑا ہوا ہے اور نازکی صاحب نے ابتدائی تعلیم اسی علاقے میں حاصل کی ہے۔

معاً ایک بات یہ یاد آئی کہ میرے اکیڈیمی میں آنے سے قبل نازکی صاحب نے بڑے پیمانے پر ایک کل ہند مشاعرے کا اہتمام کیا۔ ملک کے مختلف حصوں سے نامور شعراء مدعو تھے۔ مقامی شعراء میں کئی لوگ شامل مشاعرہ تھے۔ میں بھی مدعو تھا۔ نازکی صاحب میر مشاعرہ تھے۔ انہوں نے پہلے مقامی شعراء کو شعر خوانی کی دعوت دی۔ ایک ایک کر کے سبھی مائیک پر آ گئے۔ میں منتظر

تھا کہ مجھے بھی بلایا جائے گا لیکن ایسا نہ ہوا یہاں تک کہ قیصر قلندر کو دعوتِ سخن دی گئی۔ مجھے دال میں کچھ کالا نظر آیا کیونکہ وہ اس وقت مقامی شعراء میں کافی سینئر تھے۔ ان سے قبل مجھے بلانا ضروری تھا۔ بعد ازاں غیر ریاستی شعراء ایک ایک کر کے اپنا کلام سناتے چلے گئے۔ یہاں تک میں میرِ مشاعرہ نے اپنا کلام سنایا۔ دوران مشاعرہ میں توقع پر توقع کرتا رہا کہ اب میرا نام لیا جائے گا لیکن ایسا نہ ہوا۔ میں گھر کی طرف جاتے ہوئے ایک عجیب محرومی کا احساس کرتا رہا لیکن راہ چلتے چلتے میں اچانک میں امید و یاس کی کشمکش سے نکل کر امید و یقین کی ذہنی حالت سے گزرنے لگا مجھے وہ کہاوت یاد آئی:

ہائے مرا لنگ نیست

ملک خدا سنگ نیست

میں سوچتا رہا کہ مقتدر شعراء میں جگہ پانے کیلئے تعلیم و تدریس کے ساتھ ساتھ شعر گوئی کی طرف متوجہ ہونا ضروری ہے۔ میں اس واقعہ کے بعد دم لئے بغیر لکھتا رہا اور آہستہ آہستہ میرے کرم فرما احباب عزت سے میرا نام لینے لگے۔ جناب محمد یوسف ٹینگ سیکرٹری اکادمی نے میرے اعزاز میں Meet the Eminent پروگرام کے تحت ایک پر شکوہ اور یادگاری ادبی پروگرام براڈوے ہوٹل کے ہال میں منعقد کیا۔ ڈائس پر محمد یوسف ٹینگ، مہمان خصوصی پروفیسر گوپی چند نارنگ تھے، جو صدارت فرما رہے تھے۔ محمد احمد اندرابی، ایڈیٹر شیرازہ نظامت کا کام انجام دیتے رہے۔ صفِ سامعین میں دیگر احباب اور بزرگوں کے ساتھ ناز کی صاحب بھی تھے۔ ان کو دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی۔ دیگر معتبر اور نامور ادیبوں کے ساتھ ادب دوست احباب کی موجودگی بھی باعثِ مسرّت تھی۔

شعبہ اردو میں صدارت کا عہدہ سنبھالنے پر اکادمی کے اربابِ اختیار نے میرے لئے ادیبوں کی ایک تہنیتی نشست کا اہتمام کیا۔ کشمیری اور اردو کے نامور لکھنے والے مدعو کئے گئے تھے۔ نازکی صاحب بھی تشریف لائے تھے۔ ان کے ساتھ مرزا عارف بھی آئے تھے۔ انہوں نے صدارت کا عہدہ سنبھالنے پر مجھے مبارک باد دی۔ انہوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہمارے لئے یہ باعثِ افتخار ہے کہ کشمیری نژاد ادیب یونیورسٹی کے شعبہ اُردو کے سربراہ مقرر ہوئے ہیں۔

کچھ وقت گزرنے کے بعد ہی میں نے شعبہ اردو میں بزمِ ادب کے زیرِ اہتمام اردو اور فارسی کے نامور اور مایہ ناز لکھنے والوں کے اعزاز میں جلسے منعقد کئے۔ اس ضمن میں ریاستی قلمکاروں میں مرزا عارف، رحمان راہی، قیصر قلندر، اختر محی الدین، مظہر امام، رفعت فیاض، شوریدہ کاشمیری اور دیگر ادیبوں کو دعوت دی۔ دیگر حضرات کی طرح نازکی صاحب بھی تشریف لائے۔ میں نے ان کا خیر مقدم کرنے کے بعد ان کی شاعری کے بارے میں چند باتیں کیں۔ نازکی صاحب نے شانِ بے نیازی کے ساتھ ابتداء میں اپنی زندگی اور شاعری کے بارے میں اظہارِ خیال کیا اور اس کے بعد چند اردو اور کشمیری قطعات سنائے۔ حاضرین نے بہت داد دی۔

ایک روز میں ان کو اطلاع دیئے بغیر ان کی رہائش گاہ پر پہنچ گیا۔ نازکی صاحب گھریلو لباس میں برآمدے پر سامنے لان میں کسی سے مخاطب تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ حیران ہونے کے بجائے خوش ہوئے۔ انہوں نے تپاک سے ہاتھ ملایا اور مجھے اندر کے کمرے میں لے گئے۔ قبل اس کے کہ وہ کچھ کہتے، میں نے کہا، آج کل کی مصروف زندگی اور انتشار خیز دور میں ملنا ملانا خواب ہو کے رہ گیا ہے۔

اتنے میں چائے آ گئی۔ میں پینے سے انکار نہ کر سکا۔ میں نے حرفِ مدعا زبان پر لایا، میں نے کہا کہ میں ریاست کے نامور اور ممتاز لکھنے والوں کی حیات اور کارناموں کے بارے میں مضامین لکھ رہا ہوں۔ اس ضمن میں مجھے آپکی کچھ چیزوں کی ضرورت ہے۔ مجھے آپ کا شعری مجموعہ 'دیدۂ تر' چاہیئے۔ اگر آپ کے پاس اسکی ایک ہی کاپی ہو، تو اس کا زیراکس کروائیں گے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ ایک ریسرچ سکالر 'میر غلام رسول نازکی، حیات اور کارنامے' کے موضوع پر تحقیقی کام کر رہی ہے۔ اس ضمن میں اس نے ایک سوال نامہ مرتب کیا ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ آپ اسے اجازت دیں کہ وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کے آپ کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کرے۔ نازکی صاحب نے یہ سن کر کہا ''میں تو اس کی مدد کروں گا مگر وہ کس حد تک اپنے موضوع سے انصاف کرے گی یہ ذمہ داری آپ کی ہے۔''

ایک باران سے صدر اسپتال کے صحن میں ملاقات ہوئی۔ نازکی صاحب سلام کا جواب دے کر آگے بڑھے۔ میری خیریت پوچھنے کے بعد وہ کچھ نہ بولے۔ میں نے کہا بوڑھاپے میں انسان سے جب خواب بینی، رومانیت، جذبہ تلاش، عشق و عاشقی چھن جاتی ہے تو اس کے پاس کیا رہ جاتا ہے؟ انہوں نے آسانی سے جواب دیا۔ انسان کبھی خالی ہاتھ نہیں رہتا۔ کچھ چیزیں چھن جاتی ہیں تو وہ دوسری دلچسپیاں اپنے لئے پیدا کرتا ہے۔ یادِ الٰہی، خلوت گزینی، کتب بینی، خودشناسی وغیرہ۔ آج جبکہ میں عمر رسیدگی کی منزل پر ہوں، نازکی صاحب کی یہ بات اکثر یاد آتی ہے۔

نازکی صاحب نے رفتارِ عمر کے ساتھ ساتھ نشیب و فراز سے گزرتے

ہوئے اور سمندر پار کے ملکوں کی سیاحت کرنے کے بعد خانہ نشینی اختیار کی۔ انہوں نے کبھی زمانہ کے ہاتھوں کوئی تکلیف پہنچنے پر کوئی حرف شکایت ہونٹوں پر نہ لایا۔ وہ چپ چاپ لوگوں کے حصول شہرت اور ہوس کی تگ ودوکو دیکھتے رہے اور آہستہ آہستہ خانہ نشینی اختیار کرتے گئے۔ بے شک انہوں نے ریاست کی اردو اور کشمیری زبانوں کے ادب کی ترقی میں اپنا حصہ اُدا کیا جس زمانے میں ریاست میں اردو متعارف ہوئی تھی اور 'اخوان الصفا' کی ادبی انجمن کے زیرِ اہتمام مشاعرے منعقد ہوئے تھے وہ بعض کشمیری شعراء کی مانند اردو کو ذریعۂ اظہار بناتے رہے۔ وہ اردو میں شعر کہتے رہے اور نثر بھی لکھتے رہے۔ اس طرح سے وہ آنے والی نئی نسلوں کیلئے راستہ ہموار کر گئے۔ وہ عزّتِ نفس کا تحفظ کرتے رہے اور اپنی کم گوئی، نکتہ سنجی، شعر فہمی، عقائد کی پختگی، روایت پسندی اور خودنگری پر قائم رہے اور یہ اوصاف ان کی شاعری میں بھی متقلب ہوتے رہے۔ نازکی صاحب کے ایک قطعے کا یہ مصرعہ ان کی زندگی اور ان کی آرزوؤں پر محیط ہے۔

آرزو کا سلسلہ لاانتہا، فرصت قلیل

..................☆☆☆..................

ڈاکٹر نکہت نذر

نازکی......ایک عہد ساز شاعر

ریاست جموں وکشمیر میں کئی اعلیٰ پایہ کے ادیب وشعراء پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے اردو شعری افق کو نہ صرف وسعت عطا کی بلکہ اسے ایسے روشن ستاروں سے بھی مزّین کیا ہے جن کی چمک کبھی ماند نہیں پڑے گی۔ وادی کشمیر کے ضلع بانڈی پورہ کی سرزمین اس سلسلے میں خصوصاً قابلِ ذکر ہے جہاں سے مختلف اوقات میں قابلِ اعتنا سخن سنج اٹھ کر نہ صرف ریاست بلکہ بیرونِ ریاست بھی شہرت حاصل کر کے ادبی حلقوں کو متاثر کرتے رہے ہیں۔ وادی کشمیر کے کہنہ مشق شاعر میر غلام رسول نازکی اِسی سرزمین کی دین ہیں۔

میر غلام رسول نازکی کو چونکہ بچپن ہی سے علمی اوراَدبی ماحول میسّر رہا اسلئے ان میں شعروشاعری کا ذوق اوراس سے لگاؤ پیدا ہونا ایک فطری بات تھی۔ فارسی زبان میں تعلیم وتربیت کا سلسلہ چوں کہ اسی زمانے سے شروع ہوگیا تھا یہی وجہ ہے کہ فارسی زبان میں بھی اچھی خاصی استعداد پیدا کی تھی۔ چنانچہ نازکی صاحب نے شاعری کی ابتداء فارسی زبان سے ہی کی۔ ان دنوں چونکہ پریس کی سہولیات میسّر نہ تھیں اس لئے اس دور کے کلام کا بہترین حصہ تلف ہوگیا۔ چند

نعتیں اور غزلیں جو باقی رہ گئی ہیں وہ فنی پختگی کی غماز ہیں۔ اس دور کی ایک فارسی غزل روسی حکومت کے ادارۂ ادبیات سے شائع شدہ ایک کتاب 'مشاعرہ' میں چھپی۔ یہ کتاب جناب اختر محی الدین کو اپنے تاشقند کے سفر کے دوران ملی تھی۔ اس کتاب میں روسی، افغانی، ایرانی اور ترکستانی کے علاوہ برِصغیر ہندوپاک کے منتخب شعراء کا کلام بھی شامل ہے۔

غلام رسول نازکی نے غالباً سترہ برس کے سن میں اُردو زبان میں لکھنا شروع کیا۔ محکمہ تعلیم میں ملازمت کے دوران علمی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے مواقع فراہم ہوئے۔ اسکول کی ادبی محفلیں اور مشاعرے آپ کی سرپرستی میں ہوا کرتے تھے۔ اگرچہ یہ محفلیں معیاری نہیں ہوتی تھیں پھر بھی یہ نازکی صاحب کے ذوقِ سخن کو پروان چڑھانے میں بہت حد تک معاون ومددگار ثابت ہوئیں۔ نازکی صاحب کے والد محترم عربی وفارسی کے جیّد عالم ہونے کے علاوہ سخن شناسی کی استادانہ قدرت رکھتے تھے۔ انہوں نے نازکی صاحب کو نظامیؔ کا خمسہ پڑھاتے ہوئے شعروادب کی نفاستوں اور نزاکتوں سے روشناس کرایا تھا۔

غلام رسول نازکی کی اپنی تمام تر دلچسپیوں کے ساتھ اردو شعروادب کی رنگینیوں کی طرف تب متوجّہ ہوئے جب انہوں نے محمد حسین آزادؔ کی کتاب 'آبِ حیات' کا مطالعہ کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

> "میں نے اسے پڑھا اور آج تک مجھے یاد ہے کہ میں اسے پڑھ کر دیوانہ سا ہوگیا۔ بیسیوں مرتبہ اس کتاب کو پڑھا۔ اس سے پہلے میں فارسی شعروادب کا دلدادہ تھا اور اردو کی چاشنی سے واقف نہ تھا۔ 'آبِ حیات' پڑھ چکنے

کے بعد میں نے اپنی رائے بدل دی اور اردو کا عاشق ہوا۔‘‘[1]

یہ ۲۶-۱۹۲۵ء کے ان دنوں کی بات ہے جب نازکی صاحب ہندوارہ کے ایک پرائمری سکول میں بحیثیتِ مدرّس کام کر رہے تھے۔ آپ یہاں کی چھوٹی لائبریری سے کافی مستفید ہوئے۔ یہاں انہوں نے مولوی نذیر احمد اور محمد حسین آزاد کی کتابوں کا بھرپور مطالعہ کیا اور اردو زبان کے دلدادہ ہوئے۔ یہ وہ دور تھا جب کشمیر میں صرف کشمیری زبان کا ہی چلن تھا۔ اردو جاننے والا شاذ ہی سے کوئی ملتا تھا۔ چنانچہ نازکی صاحب اپنا کلام کسی کو سنانے یا دکھانے سے قاصر تھے۔ وادی میں پریس کی سہولیات بھی میسّر نہ تھیں۔ ان دِنوں 'اَدبی دنیا' اور 'اَدبِ لطیف' رسائل لاہور سے چھپ کر آتے تھے۔ نازکی صاحب کے دل میں اپنے کلام کو چھپوانے کی بہت چاہت تھی۔ اس غرض سے نازکی صاحب نے اپنا کلام ان رسائل میں چھپنے کیلئے بھیجنا شروع کیا لیکن ان کو ہمیشہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس سے وہ بہت مایوس ہوئے۔ ان ہی دنوں بھوپال سے ایک رسالہ 'کلیم' کے نام سے شائع ہوا جس کے ایڈیٹر جوشؔ ملیح آبادی تھے۔ 'کلیم'، 'ادبِ لطیف' اور 'ادبی دنیا' کے مقابلے میں زیادہ معیاری رسالہ تھا۔ نازکی صاحب نے اپنی کوشش جاری رکھتے ہوئے اپنی ایک شہرۂ آفاق نظم بہ عنوان 'ایک اندھی لڑکی کی دعا' چھپنے کی غرض سے بھیجی۔ جوشؔ صاحب نے اس نظم کو رسالہ کے دوسرے تیسرے صفحے پر اس تعریفی نوٹ کے ساتھ چھاپا:

> 'یہ کشمیری ہے اور اردو اس کی مادری زبان نہیں۔ مگر یہ اردو بالکل بے داغ ہے اور یہ نظم تمام غلطیوں سے پاک وصاف ہے۔‘‘[2]

یہ نظم بعد میں 'ادبِ لطیف' اور ادبی دنیا نے بھی نقل کی۔ غلام رسول نازکی نے

ابتداء میں اساتذہ قدیم کی پیروی میں غزلیں کہیں لیکن ان کا فنی شعور زیادہ دیر تک روایت کا پابند نہ رہ سکا۔ انہوں نے جدید شاعری کا گہرا مطالعہ کیا۔ اس مطالعے کے نتیجے میں قدیم رنگ میں لکھی ہوئی جتنی بھی غزلیں موجود تھیں وہ انہوں نے ضائع کردیں۔ جدید شاعری کے مطالعے کے ساتھ ساتھ نازکی صاحب مشقِ سخن میں مشغول رہے۔ شعر وادب کی مسلسل تبدیلیوں کو وہ برابر محسوس کرتے رہے اور بدلتے رجحانات پر خاص طور سے ان کی نظر رہی۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"اردو کے رجحانات بدلتے گئے اور بعد میں مسلسل مطالعہ کے ذریعے اس کے بدلتے ہوئے رجحانات سے متاثر ہوتا گیا اور میرے کلام میں اسی طرح تبدیلیاں آتی گئیں۔"[۳]

نازکی صاحب اب تک صرف اخباروں یا رسالوں ہی میں چھپتے تھے۔ مشاعروں میں پڑھنے کا موقعہ نہیں ملا تھا۔ کیونکہ مشاعروں کا انعقاد برائے نام تھا۔ فارسی اور اردو زبان کے نامور شاعر جناب مبارک شاہ فطرتؔ گیلانی نے اسی زمانے میں ایک انجمن ترتیب دی جو 'انجمن اخوان الصفا' کے نام سے مشہور ہوئی۔ اردو شعر وادب کا یہ عاشق موسم گرما میں بہت ہی اہتمام کے ساتھ مشاعرے کرواتا تھا کیونکہ ان دنوں بیرون ریاست سے اکثر شعراء حضرات وادی کشمیر آتے تھے۔ فطرتؔ کاشمیری ان شعراء کو دعوتِ سخن دے کر بڑے بڑے مشاعروں کا قیام عمل میں لاتے تھے۔ ایک ایسی ہی نشست میں نازکی صاحب کو بھی دعوتِ سخن دی گئی۔ اس پہلے تجربے کے بارے میں نازکی صاحب فرماتے ہیں:

"میں کسی بھی صورت میں مشاعرے میں پڑھنے کیلئے تیار نہ تھا۔ مجھ میں شاعری پڑھنے کی ہمت نہ تھی۔ حالانکہ میرا کلام چھپتا تھا اور جب میرا نام اناؤنس کیا گیا تو میں کانپنے لگا۔ میرے پسینے

چھوٹنے لگے۔ بہر حال ہمت کر کے میں نے پہلا شعر پڑھا۔

؎ جہاں جاتا ہوں پہلے حال کہتا ہوں حسینوں کا
ادب کرتا ہوں ان کا شانۂ دل کے مکینوں کا

احسان دانش اور حفیظؔ جالندھری نے یہ شعر مجھ سے پندرہ سولہ بار پڑھوایا۔ بہر حال میری جھجک دور ہوگئی۔''[۴]

اس مشاعرے میں اردو کے بلند پایہ شاعر حفیظؔ جالندھری، روش صدیقیؔ اور احسان دانش موجود تھے اور یہ مشاعرہ آپ کی شاعری کی جڑوں کو مستحکم کرنے میں مشعل راہ ثابت ہوا۔

اس یادگار مشاعرے کے بعد نازکی صاحب ریاستی اور ملکی سطح پر منعقدہ بڑے بڑے مشاعروں میں شرکت کرتے رہے۔ نازکی صاحب اپنے دوسرے تجربے کے بارے میں فرماتے ہیں۔

''میں نے ایس پی کالج کے ہال میں منعقدہ مشاعرے میں دوسری بار پڑھا ہے۔ قیس شیروانی ان دنوں کے ایک جانے مانے شاعر تھے۔ انہوں نے کل ہند مشاعرے کا اہتمام کیا جس کے صدر سر تیج بہادر سپرو تھے اور بابائے اردو عبدالحق مہمانِ خصوصی اور کیفیؔ جنرل سیکرٹری تھے۔ اس مشاعرے میں بھی مجھے داد تحسین ملی اور جھجک دور ہوئی۔''[۵]

یہ سلسلہ ۱۹۴۷ء تک بتدریج چلتا رہا۔ اس کے بعد تمام تر رجحانات میں تبدیلی رونما ہوئی اور مشاعروں کا انعقاد بڑھتا گیا۔ ریڈیو نے مشاعر کے انعقاد کے سلسلے میں نمایاں رول ادا کیا۔ ان تمام مشاعروں میں نازکی صاحب ذوق وشوق کے ساتھ شریک ہوتے رہے اور اپنی سوچوں کو نئے پیکر اور اپنی شاعری کو

نئی جہت اور نئی روشنی دیتے رہے۔

آزادی کے بعد ملک کی اقتصادی، معاشی، سیاسی اور اخلاقی صورتِ حال میں بہتری نظر آنے لگی۔ پورے ملک میں قوانین از سرِ نَو نافذ کئے گئے اور اب تک پریس پر جو پابندی لگائی گئی تھی اسے ہٹا دیا گیا۔ جس کے نتیجے میں لوگوں کو اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے مواقعے ملے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ریاست میں بھی تعلیم کی طرف خاص طور سے توجہ دی جانے لگی۔ اس نئے ماحول سے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے صوفی محی الدین اپنی کتاب 'کشمیر میں سماجی اور ثقافتی تبدیلیاں' میں لکھتے ہیں:

"۱۹۴۷ء کے بعد جب ایک نئے دَور کا آغاز ہوا اور آقائیت پرستی ختم ہوگئی تو کشمیر کے مسلمان تعلیم میں آگے آنے لگے اور اقتصادی اور معاشی شعبوں میں بھی انہوں نے اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کرنا شروع کیا۔"[۶]

جب تک کشمیر میں اُردو چھاپ خانوں کا قیام عمل میں آیا تب تک نازکی صاحب کے کلام کا ایک قابلِ قدر سرمایہ جمع ہو چکا تھا۔ جس کے نتیجے میں ۳۳-۱۹۳۲ء میں 'نزاکت' کے نام سے نازکی صاحب نے اپنے اوّلین مجموعے کو ترتیب دیا۔ اس مجموعے کا ذکر کرتے ہوئے ترلوکی ناتھ رینا لکھتے ہیں

"Nazki published his collection of poems "NAZAKAT" in 1932-33 "DEDA-E-TAAR" another collection of poems was published later."

'نزاکت' میں موضوع کی رنگارنگی اور تنوع کے ساتھ ساتھ اسلوب کی شگفتگی اور الفاظ کی تراش خراش بہت ہی جاندار انداز میں ملتی ہے۔ زبان عام فہم اور سلجھی ہوئی ہے۔ تشبیہات و محاورات کا برمحل استعمال زبان پر ان کی گرفت کا غمّاز ہے۔ سلگتے

ارمانوں کی کسک، جذبات کی فراوانی، خیالات کی روانی، احساسات کی شدّت مذکورہ مجموعے میں شامل اشعار کی خصوصیات ہیں۔ اپنے اس اوّلین مجموعے میں نازکی صاحب ایک رومان پرست شاعر کے طور پر متعارف ہوئے ہیں۔

نازکی صاحب کے شعری میلانات اور تخلیقی رجحانات کا اندازہ ان کے مجموعہ شعر 'دیدۂ تر' سے ہوتا ہے۔ اس میں شامل کلام ان کے سماجی شعور، فطرت سے لگاؤ، داخلیت پسندی، وارداتِ قلب اور زبان و بیان کی پختگی کا غماز ہے۔ یہ مجموعہ ۱۰ دسمبر ۱۹۴۹ء کو شائع ہوا۔ اردو کے ایک جانے مانے نقاد، شاعر اور نازکی صاحب کے گہرے دوست غ۔م۔ طاؤس نے اس مجموعۂ شعر کا مقدمہ لکھا۔

غ۔م۔ طاؤس 'دیدۂ تر' کو ہی نازکی صاحب کا پہلا مجموعہ قرار دیتے ہیں اور اس کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "آج پہلی بار آپ (نازکی) اپنے کلام کا مجموعہ شائع کروا رہے ہیں اور آج ہی پہلی بار ہمالہ کی بلندیوں پر جدید اردو شاعری کی تاریخ کا ایک نیا ورق الٹا جا رہا ہے۔"[۷]

حیران کن بات یہ ہے کہ خود نازکی صاحب اپنے اوّلین شعری مجموعے 'نزاکت' کے بجائے 'دیدۂ تر' کو پہلا مجموعہ قرار دیتے ہیں۔ اس بات کا اعتراف وہ 'دیدۂ تر' کے حرفِ اول میں یوں کرتے ہیں:

> "دیدۂ تر...... میرے کلام کا پہلا مجموعہ ہے جو چھپ رہا ہے۔"[۸]

مجموعہ شعر 'دیدۂ تر' تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں رباعیات، دوسرے حصے میں نغمات کے عنوان سے قطعات اور تیسرے حصے میں آیات کے عنوان سے نظمیں شامل ہیں۔ نازکی صاحب کو قطعات میں خاص مہارت حاصل

ہے۔اس سلسلے میں عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

"قطعات چھ مصرعہ ہیں اوران میں نازکی کوایک امتیاز حاصل ہوگیا ہے۔ان میں بعض ان کی فکر کے نفیس نمونے ہیں۔نظمیں شاعر کے انفرادی تاثرات اور تجربات پر مشتمل ہیں۔"[۹]

'دیدۂ تر' کی اشاعت کے بعد نازکی صاحب برابر مشقِ سخن کرتے رہے اور اپنی کامیاب کوششوں کے نتیجے میں ۱۴؍اکتوبر ۱۹۸۹ء کو نازکی صاحب کا تیسرا مجموعہ 'چراغِ راہ' جو نعتوں پر مشتمل ہے، منظرِ عام پر آیا۔نازکی صاحب اس کتاب کے مقدمے میں خود لکھتے ہیں:

"۹؍جون ۱۹۸۹ء کو جب میں نیند سے جاگا تو میری زبانپر بلا ارادہ چار مصرعے آگئے۔

پھول کھلتے ہیں خار زاروں میں
جب بھی ذکرِ رسول کرتا ہوں
دین و دنیا کی نعمتیں پاکر
نقد قیمت وصول کرتا ہوں

اس قطعہ کا ذہن پر زبردست اثر رہا اور پھر اسی بحر میں قطعات بنتے گئے جو سب کے سب نعت رسولؐ پر متضمن تھے۔۲۶؍جون تک ان کی تعداد سو سے متجاوز ہوگئی۔میں نے چاہا کہ یہ سلسلہ جاری رہے لیکن اچانک بند ہوا۔"

میر غلام رسول نازکی کی شاعری کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی شخصیّت میں غیر معمولی وسعتِ نگاہ، بلندی اور تخیّل میں ہمہ گیری ملتی ہے۔ انہوں نے فارسی اور اردو شاعری تک ہی اپنے خیالات و تجربات کو محدود نہ رکھا

بلکہ اپنی مادری زبان کشمیری کو بھی اپنے تجربات واحساسات کا وسیلہ اظہار بنایا۔ نازکی صاحب نے کشمیری شاعری کو ایک بیش بہا سرمایہ دے کر اس کے تنگ نائے کو وسعت بخشی۔

کشمیری قطعات اور رباعیات کے تو وہ استاد مانے جاتے ہیں۔ نازکی نے صنفِ رباعی کو بامِ عروج پر پہنچایا اور اپنی شاعری کا لوہا منوایا۔ کشمیری رباعیات میں ایک اور جانے مانے شاعر مرزا حسن بیگ عارف ہیں لیکن بقول فراق:

"ان کی رباعیات نازکی کی رباعیات اور قطعات کا حسن حاصل نہ کرسکیں۔ "[۱۰]

اردو شاعری کے ایوان میں ایک بلند مقام حاصل کر لینے کے بعد وہ کشمیری زبان کے شعروادب کی طرف متوجہ ہوئے جس کے نتیجہ فکر میں ۱۹۶۴ء میں ان کی کشمیری شاعری کا پہلا مجموعہ 'آوازِ دوست' کے نام سے اشاعت پذیر ہوا۔ اس میں رباعیوں کے علاوہ چند غزلیں بھی شامل ہیں۔ یہ کتاب انہوں نے اپنی مرحوم بیوی بیگم عائشہ کے نام معنون کی ہے۔ ۱۹۸۷ء میں اسی کتاب کو ساہتیہ اکادمی کی طرف سے انعام ملا۔ نازکی کی طبیعت میں یہ بات خاص ہے کہ انہوں نے نہ صرف فارسی وارود کو بلکہ کشمیری کو بھی اپنا وسیلہ اظہار بنا کر اپنے تخلیقی ذہن کے ذریعے کشمیری ادب کو مالامال کیا۔ انہوں نے اپنی شاعری میں گردوپیش کے مسائل، سماجی زندگی کی الجھنوں اور پیچیدگیوں کو اپنا موضوع بنایا۔ زندگی اور کائنات کے مختلف پہلوؤں کی نقاب سرکا کر اپنی شاعری کو حقیقت سے ہمکنار کیا۔ نازکی کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے جناب موتی لال ساقی اپنی کتاب 'گاشر' میں یوں لکھتے ہیں:

"نازکی صاحب کو بچپن سے ہی شعر و شاعری کے ساتھ گہرا لگاؤ تھا۔ ان کا اردو کلام پاکیزہ خیالات کا ایک کِھلتا اور مہکتا گلستان ہے۔"

نازکی صاحب کے اردو و فارسی شاعری میں عرفان حاصل ہونے کے اعتراف میں عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

"نازکی فارسی اور اردو شعری روایات کا اچھا عرفان رکھتے ہیں۔ اس لئے ان کے کلام کو پڑھتے ہوئے اساتذۂ قدیم کی فضا ذہن میں پیدا ہو جاتی ہے۔ کشمیر کے فارسی شعراء میں غنؔی سے انہیں فطرتاً عقیدت ہے اور اس عقیدت مندی کے سبّب انہوں نے غنی کے کلام کو مرتّب بھی کیا ہے۔ ایک شعر میں اپنی شاعری کو غنؔی کے فیض سے اس طرح تعبیر کرتے ہیں:

کہاں میں کہاں نغمۂ زندگانی

مرے روپ میں جلوہ فرما غنؔی ہے

نازکی صاحب کی غزل کی زبان سادہ، عام فہم ہونے کے ساتھ ہی ساتھ موضوعات میں وسعت اور رنگا رنگی رکھتی ہے۔ انہوں نے غزل تک ہی اپنی شاعری کو محدود نہیں رکھا بلکہ قطعات، رباعیات، نعت، آیات اور نظمیں لکھ کر اردو شعر و ادب کے میدان کو بے پناہ وسعت بخشی ہے۔ ان تمام اصناف پر طبع آزمائی کرنے کے بعد ان کی شاعری میں وسعت اور ہمہ گیری پیدا ہو گئی ہے۔

حواشات

۱۔.....حامدی کاشمیری۔ ریاست جموں و کشمیر میں اردو ادب۔ گلشن پبلشرز، سرینگر

۲۔.....مسرت اقبال (ایڈیٹر)۔ واد۔ (رسالہ) سرینگر ۹۳۔۱۹۹۲ ص ۲۸

۳۔.....حامدی کاشمیری۔ ریاست جموں و کشمیر میں اردو ادب۔ ص ۱۱۳

۴۔.....مسرت اقبال (ایڈیٹر) واد۔ سرینگر۔ ۹۳۔۱۹۹۲۔ ص ۲۹

۵۔.....مسرت اقبال (ایڈیٹر) واد۔ رسالہ۔ سرینگر۔ ۹۳۔۱۹۹۲ء ص ۲۹

٦.....صوفی محی الدین۔ کشمیر میں سماجی اور ثقافتی تبدیلیاں

٧.....غ،م،طاؤس،تعارف۔ دیدۂ تر از غلام رسول نازکی۔ بروکا پریس۔ سرینگر۔۴۹۔۱۹۴۸ء۔ص ۳

٨.....غلام رسول نازکی۔ دیدہ تر۔ص ١٢

٩.....عبدالقادر سروری۔ کشمیر میں اردو (حصہ دوم) کلچرل اکادمی۔ سرینگر۔١٩٨٢ص ٣٨٦

١٠.....کشیر۔(سون ادب)۔ کلچرل اکادمی۔ سرینگر۔١٩٧٧ء۔ص ١٧٨

..................☆☆☆..................

مشعل سلطانپوری

میر غلام رسول نازکی مرحوم
اپنی محبوب صنفِ سخن کے آئینے میں

میر غلام رسول نازکی ریاست کے سربرآوردہ اردو شعراء میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ موضوع اور مواد اظہار و بیان، فنی پختگی، زبان کی سلاست و صفائی، ایجاز و اختصار ہر لحاظ سے انہوں نے اپنی شاعرانہ اہلیت کا لوہا منوایا۔ یوں تو انہوں نے مختلف اصنافِ شعر میں کامیاب طبع آزمائی کی ہے لیکن ایک صنفِ شعر خاص طور پر ان کی توجہ کا مرکز رہی ہے، جسے قطعہ کہا جاتا ہے۔ ان کے ذریعہ اظہار کی یہ صنفِ شعر، موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے بعض اوقات بحث کا موضوع بھی بنتی رہی ہے اور قارئین ادب کے ساتھ ساتھ اہل نظر کو غلط فہمی کا شکار بھی کر چکی ہے۔ کبھی اسے قطعہ سمجھا گیا اور کبھی رباعی کا نام دیا گیا۔ آیئے پہلے اس پہلو سے کچھ اظہار خیال ہو جائے۔ اردو اصنافِ شعر میں جو اصناف فارسی ادب سے لے لی گئیں ان میں رباعی اور قطعہ بھی شامل ہے۔ ان اصناف کی جو شناخت فارسی ادب میں ہے، وہی پہچان اردو ادب میں بنی رہی۔ رباعی کیلئے صرف چار مصرعوں کی تحریر کے ساتھ ساتھ پہلے، دوسرے اور چوتھے مصرعوں کا ہم قافیہ

ہونا اور خاص طور پر اس کیلئے مخصوص چوبیس بحروں میں سے ہی کسی ایک بحر کا استعمال ہیتی لوازم قرار پائے ہیں۔ اس کے علاوہ چاروں مصرعوں کا مربوط ہونا، تسلسل خیال کی موجودگی، چوتھے مصرعہ کا بیساختہ اور زوردار ہونا اور موضوع کی تخصیص بھی اس کی شناخت میں شامل رہی۔ بعد کے زمانے میں صرف اس قدر لچک آ گئی کہ موضوعات کا دائرہ تھوڑا وسیع ہو گیا اور تیسرے مصرعے کا قافیہ بند ہونا برداشت کر لیا گیا لیکن چار مصرعوں کی صنف شعر یوں بھی صورت و معنی کے اعتبار سے آنکھ مچولی کھیلتی رہی ہے اور مربع، دوبیتی، ترانہ، چوپدا، چوبولا جیسے اصناف سے خلط ملط ہوتی رہی ہے لیکن رباعی، ہیئتی اور موضوعاتی تخصیص کے ساتھ ساتھ تواتر استعمال کی بنا پر عرصہ دراز سے اپنی شناخت کو استحکام دے چکی ہے۔

اور اب مصرعوں کی تعداد، ردیف قافیہ کی پابندی، معنوی ربط اور بحر کی تخصیص جیسے شرائط کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بقول ڈاکٹر گیان چند جین، ''اس کیلئے بحر ہزج کے چوبیس اوزان مقرر ہیں۔ یہ اوزان آپس میں بہت ملتے جلتے ہیں، جو رباعی اِن اوزان میں نہ ہو اسے رباعی نہیں کہہ سکتے، جیسا کہ اقبالؔ کی بالِ جبریل میں ہوا۔ یہ دراصل قطعات ہیں[1] میر غلام رسول نازکی کی چار مصرعوں والی یہ محبوب صنف، رباعی کے تمام لوازم خاص کر مخصوص اوزان و بحور کی پابندی، مدِ نظر رکھ کر رباعی کے ذیل میں نہیں آ سکتی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اسے کس صنف میں شمار کیا جائے۔ اصطلاح شعر میں جب شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوں تو بیت کہلائیں گے[2] چونکہ رباعی میں پہلا شعر یعنی پہلے دو مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں تو ایک بیت ہوا بعد کا شعر یعنی تیسرا اور چوتھا مصرعہ بھی ہم قافیہ ہو تو یہ دوسرا بیت ہوگا اور چاروں مصرعے دوبیتی کہلائیں گے۔ لیکن رباعی میں یہ دوسرا شعر یعنے

تیسرا اور چوتھا ہم قافیہ نہیں ہوتا۔ اس لئے دوبیتی سے موسوم ہونا صحیح نہیں۔ مولانا حسین واعظ کاشفی چاروں مصرعوں کی ہم قافیہ صنف کو مصرع کہتے ہیں۔ درسِ بلاغت اور اصنافِ سخن کتابوں کی رُو سے اگر تیسرے مصرعے میں قافیہ نہ ہو تو ایسی رباعی کو خصی اور قافیہ ہو تو غیر خصی کہتے ہیں۔ نازکی صاحب جہاں کہیں چاروں مصرعے ہم قافیہ لاتے ہیں انہیں دوبیتی کہا جاسکتا ہے، لیکن ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔

قارئینِ ادب کو معلوم ہے کہ جہاں کہیں قصیدہ یا غزل کے چند اشعار میں تسلسل خیال یا معنوی ربط پایا جائے، ایسے اشعار کو قطعہ کہتے ہیں۔ یعنی قطعہ کیلئے معنوی ربط پہلی شرط ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے اشعار میں صرف دوسرا مصرعہ ہی دوسرے اشعار کے ساتھ ہم قافیہ ہوتا ہے۔ جس شعر کے دونوں مصرعے باہم قافیہ نہ ہوں، فرد کہلاتا ہے۔ اس طرح قطعہ کے سارے اشعار اصطلاحی معنوں میں افراد ٹھہرے۔ روایتاً قطعہ کا مطلع نہیں ہوتا۔ اس کیلئے کسی خاص بحر کی پابندی بھی ضروری نہیں۔ دورِ حاضر میں قطعہ کیلئے یہ پابندی اٹھادی گئی ہے کہ پہلے دو مصرعے ہم قافیہ نہ ہوں یعنے مطلع نہ ہو۔ بحر الفصاحت کے مطابق اس کیلئے کم سے کم دو شعر ہونا ضروری ہے، زیادہ کی حد ایک سو ستر (۱۷۰) تک مقرر کی گئی ہے۔ گیان چند جین کے بقول نظم نگاری کے دور کے کئی شعراء نے نظموں کیلئے قطعہ کی صنف سے کام لیا ہے۔ مثال کے طور پر علامہ اقبال نے نمودِ صبح، لینن اور فرمانِ خدا فرشتوں سے، نظموں میں، چکبست نے حب قومی، سیماب اکبر آبادی نے شکست جمود اور عید امروز میں، جوش ملیح آبادی نے باغی انسان، شکستِ زنداں کا خواب اور ساون کے مہینے میں، نظموں میں واضح ہوا کہ کسی بھی قسم کے

اظہار خیال کیلئے قطعہ کی صنف سے کام لیا جاسکتا ہے۔ بشرطیکہ تسلسل خیال کی شرط مدنظر ہو۔ میر غلام رسول نازکی کی محبوب صنفِ شعر جو چار مصرعوں پر مشتمل ہے، قطعہ ہی قرار دی جاسکتی ہے۔ اس بناء پر کہ اس میں خیال کا تسلسل ہے، معنوی ربط ہے اور کسی خاص بحر کی پابندی بھی نہیں لیکن اس میں خاص بات یہ ہے کہ اگرچہ قطعہ میں دو سے زیادہ اشعار بھی ہوسکتے ہیں لیکن انہوں نے ہر قطعہ صرف دو اشعار یعنی چار ہی مصرعوں کا کہا ہے۔ دوسری خاص بات یہ کہ بیشتر قطعات ہلکی پھلکی بحروں میں ہیں۔ اختصار، ایجاز، فنی چابکدستی اور موضوعات انہیں معنوی لحاظ سے رباعی کے قریب لے آتے ہیں۔

اردو کی ادبی تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ شروع ہی سے قریب قریب ہر شاعر نے اس صنفِ شعر کو کسی نہ کسی حد تک ذریعہ اظہار بنایا ہے۔ غزل کے مسلسل اشعار سے ہٹ کر نظم نگاری کے دَور میں اور اس کے بعد اس کے روائیتی استعمال سے صرف نظر کرتے ہوئے موضوعات کے تنوع کے اعتبار سے اس کا دائرہ وسیع کردیا گیا۔ اس کی شروعات مولانا حالؔی، مولوی محمد حسین آزاد، اکبرؔ الہ آبادی سے ہوئیں اور اقبالؔ اور جوشؔ کے بعد ترقی پسند شعراء تک اس کے خاطر خواہ استعمال سے فائدہ اٹھاتے رہے۔ مناظرِ فطرت کی عکاسی، جذبات و احساسات کا بیان، روزمرہ زندگی کے مسائل، ذاتی واردات، شہرِ آشوب، حالاتِ حاضرہ، عصری آگہی، غرض موضوعات کی رنگارنگی نے قطعہ کو گلستان ہزار رنگ بنادیا۔

نازکی صاحب کے قطعات اس صنف کی عشوہ طرازی کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔ ان کے پہلے مجموعہ کلام 'دیدۂ تر' کا تعارف لکھتے ہوئے غ۔م۔ طاؤس نے اس طرف خاص اشارہ کیا ہے۔ ملاحظہ ہو، ''زیرِ نظر مجموعہ کا معتد بہ حصہ قطعات پر

مشتمل ہے۔ ایک خیال کو چار مصرعوں میں مکمل طور پر اس طرح ادا کرنا، کہ پڑھنے والے ذہن پر نقش ہو کر رہ جائے۔ اتنا آسان نہیں جتنا پہلی نظر میں معلوم ہوتا ہے۔ نازکی اس فن کے استاد ہیں۔ فکر کی وسعت اور نفسیاتِ انسانی کے گہرے مطالعہ نے پیشِ پا افتادہ مضامین سے بھی نہایت بلند موضوعات پیدا کر لئے ہیں۔[3]

نازکی صاحب نے یوں غزل اور نظم میں بھی اپنی استادانہ مہارت کا ثبوت دیا ہے لیکن ان کے کلام کا بغور مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی طبّیعت ریزہ خیالی کی بہ نسبت تسلسلِ بیان کی طرف مائل تھی۔ ان کی غزلوں میں بھی اشعار اگر چہ بہ ظاہر جدا جدا لگتے ہیں لیکن ان میں ایک غیر مرئی تسلسل موجود رہتا ہے۔ بقولِ عبد القادر سروری، نازکی کی غزل کی سرحدیں نظم سے مل جاتی ہیں۔[4]

ہیتی اعتبار سے انہوں نے نئے تجربات کرنے کی کوشش کرنا ضروری نہیں سمجھا بلکہ مرّوجہ اصناف ہی سے کام لیتے رہے لیکن اپنی افتادِ طبع سے بے وفائی نہیں کی۔ مزاج کے اسی نظم وضبط نے انہیں اپنی محبوب صنف شعر 'قطعہ' کے قلمرو کا تاجور بنا دیا۔ ان کے قطعات مواد اور موضوع کے اعتبار سے متنوع ہیں۔ مناظرِ فطرت کی تصویر کشی ہو، ابنائے زمانہ کا گلہ ہو، گردوپیش کے ناگفتہ بہ حالات کا بیان ہو، محبوب سے راز و نیاز ہو، ذاتی واردات کا اظہار ہو، ہر جگہ فنکارانہ کامیابی کے جھنڈے گاڑتے ہیں۔ قدرتی نظاروں کی مصوّری کے ضمن میں ان کا یہ قطعہ زبان زد ہو گیا ہے۔

اک سہانی چاندنی رات اور مانسبل کی جھیل | حُسن کی چپ چاپ دنیا خلد کا عکس جمیل
دور تا حدِ نظر سرسوں کے کھیتوں کی قطار | آرزو کا سلسلہ لا انتہا فرصت قلیل

سفرِ انگلستان کے دوران بھی وہاں کے مناظر نے انہیں موہ لیا۔

اس سے پہلے میں نے دیکھا ہی نہ تھا یہ رنگ و روپ | تختہ ہائے لالہ وگل اور انگلستان کی دھوپ
یہ بہارِ جاں فزا یہ لالہ وگل کا نکھار | بلبل وقمری صف اندر صف' قطار اندر قطار

اس ضمن میں یہ قطعہ بھی ملاحظہ ہو۔

یہ شبِ مہتاب یہ پانی سے مالامال جھیل
دامن کہسار کا جھرنا عدیلِ سلسبیل
ہر ادا مخمور، ہر جانب سکون، ہر سو سکوت
ہر پہاڑی طور، ہر منظر حسین، ہر شے جمیل

ڈاکٹر حامدی کاشمیری اس صنف میں نازکی صاحب کی مہارتِ تامہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ”قطعہ نگاری میں ان کو یدِ طولیٰ حاصل ہے۔ اس ضمن میں وہ علامہ اقبال سے بے حد متاثر ہیں۔ بعد میں انہوں نے اختر انصاری اور احمد ندیم قاسمی سے بھی اکتسابِ فیض کیا۔ وہ قطعات میں خیالات و تجربات کی ایک فکر انگیز دنیا آباد کرتے ہیں۔ یہ قطعے ان کے شعورِ عصر کے غمّاز بھی ہیں۔ ان میں جذبات کا ارتعاش بھی ہے، مشاہدے کی رنگینی بھی ہے اور فکر کی گہرائی بھی ہے۔[۵]

فکرِ اقبال سے متاثر ہونے کا معاملہ تو نازکی صاحب کی پوری شاعری سے جڑا ہوا ہے۔ جہاں تک قطعات کا تعلق ہے وہ ان سے صرف حمد و نعت کے موضوع پر قلم اٹھانے کی حد تک ہی متاثر لگتے ہیں۔ باقی تمام قطعات میں ان کی انفرادیت بولتی نظر آتی ہے۔ مثلاً:

ہر طرف جلوہ نما شانِ خداوندی ہے
شبِ تاریک ہے انوار کی در بندی ہے
چادرِ ظلمت شب میں ہے عروسِ مہتاب
سرخیِ رنگِ شفق اس کی حنا بندی ہے

یا

یہ سکون پرور سکون آموز رات
یہ حیات آگین حیات افروز رات
چاند جھومر کہکشاں ہے حلقہ بند
اور خیالِ چہرۂ نوروز، رات

نازکی صاحب کے قطعات میں ان کے ذاتی واردات کا بیان نہایت بے ساختگی سے ملتا ہے۔ ان کے قطعات کی اہم خوبی یہ ہے کہ یہاں نثری ترتیب برقرار رہتی ہے۔ تعقید معنوی نہ تعقید لفظی۔ استادانہ مہارت اسی کا نام ہے۔

غمِ اولاد سب پہ بھاری ہے
مرگِ اولاد ضرب کاری ہے
آج محسوس کر رہا ہوں میں
زندگانی نفس شماری ہے

ترقی پسند تحریک کے زمانے میں بھی وہ شعر کہتے تھے۔ اس تحریک کے نظم سے دور رہنے، عملی طور پر اس میں شامل نہ ہونے اور اس کا حصہ نہ بننے کے باوجود وہ اس تحریک اور اس ادب سے ضرور متاثر ہوئے جس کا انداز ان کی غزلوں اور نظموں کے ساتھ ساتھ ان کے قطعات سے بھی ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

وہاں بھی قیصر و فغفور ہوں گے　　وہاں بھی فاقہ کش مزدور ہوں گے ؟
یہی رِستے ہوئے ناسور ہوں گے ؟　　ترے فردوس میں بھی یا الٰہی !

نازکی صاحب شعر میں الجھاؤ، تعقید، لفظی گورکھ دھندوں اور دوسری شعبدہ بازیوں کے خلاف ہیں وہ ترسیل و ابلاغ کے آسان ترین انداز کے روادار ہیں اس پر عمل بھی کرتے ہیں اور اس کا اعلان بھی۔

کہ بس الفاظ کی جادوگری ہے　　اگر تو شاعری وہ شاعری ہے
کہ اصل شاعری پیغمبری ہے　　ہم ایسی شاعری سے باز آئے

نازکی صاحب کے جذبات احساسات میں نزاکت، تجربات میں صداقت اور مشاہدہ میں گہرائی ہے۔ حُسن کی دلفریبی اور عشق کی تڑپ کا اظہار بڑے لطیف انداز میں، بڑی سادگی سے اور بڑی متانت سے کرتے ہیں۔

ہوائیں مل کے دیپک گا رہی ہیں　　وہ پھلواری سے واپس آ رہی ہیں
ادائیں خود بخود شرما رہی ہیں　　فضائیں نکہتیں برسا رہی ہیں

اظہارِ عشق میں بے بسی کا انداز کبھی ایسا ہے کہ :

دل سے اٹھی لب پہ آئی لڑکھڑا کر گر پڑی
اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا مآلِ التجا
حسن بے پرواز نظر آتا ہے مغرور و متین
ملتجی کو جب نہیں رہتی مجالِ التجا

اور کبھی اس حد تک دلیرانہ اور بے ساختہ کہ ؂

میرے نغموں کی موسیقار تم ہو مری دیپک، مری ملہار تم ہو
میں فواروں میں کردوں گا چراغاں کہ میری شامِ شالامار تم ہو

نازکی صاحب مانگے تانگے کی روشنی سے اپنے شبستان میں اُجالا نہیں کرتے۔ وہ اپنے تجربات سے کسبِ فیض کرتے ہیں۔ اپنے گردوپیش سے مثالیں، تشبیہیں اور تمثیلیں اخذ کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ؂

میں اس غریب کی مانند دل سے ٹوٹا ہوں جو بے کسی میں الجھتا ہے قرض خواہوں سے
جونا امید ہو لڑنے کے بعد اور دیکھے متاعِ خانہ کو حسرت بھری نگاہوں سے

موصوف کی شاعری کا مطالعہ اس بات کا ثبوت پیش کرتا ہے کہ انہیں اپنے وطن کشمیر سے، یہاں کے مناظر سے، رعنائیوں اور پہنائیوں سے، یہاں کے لوگوں کی زندگی، ان کے حالات اور ان کے مسائل سے کس قدر وابستگی ہے، پیار ہے، وہ ان کے دکھ سے دکھی اور ان کی شادمانی سے مسرور نظر آتے ہیں ؂

مرے کشمیر کی ہر شے حسیں ہے یہاں کی ہر پہاڑی نازنیں ہے
فلک پر اس زمین کی سرزمیں ہے فلک خود جھیل ڈل میں تہ نشیں ہے



ہر صبح ایک تازہ قیامت کی ہے نمود ہر شام تیرہ بخت برنگ دل حسود
یہ روز وشب یہ شام وپگاہ وریہ ماہ وسال اب تک میں جی رہا ہوں حوادث کے باوجود

نازکی صاحب نے سفرِ حیات کے مختلف مراحل پر، مختلف منزلوں سے حاصل ہونے والے تجربات کو بیان کی گرفت میں لایا ہے۔ اور جو کچھ خود محسوس کیا ہے، قارئین کو محسوس کرانے کی کوشش کی ہے ؂

وہ جواں سالی وہ ایامِ شباب وہ غرورِ حسن وہ رعنائیاں
یہ قویٰ کا ضعف یہ راہ دراز یہ وفورِ گریہ یہ نم ناکیاں

ے زیست کیا چیز ہے بڑھاپے میں کیا کشش ہے جہاں فانی میں
اب بھی آتا ہے یاد رہ رہ کر ہم بھی کچھ چیز تھے جوانی میں

نازکی صاحب کی شاعری کا اہم موضوع رہا ہے عشقِ رسولؐ۔ یہ شعلہ جوالہ ان کے دوسرے اصنافِ شعر کے ساتھ ساتھ قطعات میں بھی تب وتاب کی نیرنگیاں دکھاتا ہے۔ اس موضوع کے بیان میں وہ نفاست، وہ شائستگی، آداب کی پاسداری، سوز دروں کی تپش وتابنا کی اور تخیل کی کرشمہ سازی نظر آتی ہے وہ واقعی ان ہی کا حصہ ہے۔

تجھے خبر نہیں عالی مقام ہوں میں بھی مثیلِ خضر علیہ السلام ہوں میں بھی
جہاں لوح وقلم میرے زیرِ فرمان ہے محمدؐ عربی کا غلام ہوں میں بھی

یا

دین میرا شوقِ پابوسِ رسولِ ہاشمیؐ
عشق میرا رقصِ طاؤسِ رسولِ ہاشمیؐ
میری عزت خواجہ یثرب کی عزت پر نثار
میرا مذہب حفظِ ناموسِ رسولِ ہاشمیؐ

ے سحر کا وقت ہے بیدار ہے دل آگاہ نزولِ رحمتِ پروردگار پر ہے نگاہ
درود خواں ہے گل وخار و یاسمین و گیاہ کلی کلی کی زبان پر ہے یا رسول اللہؐ

ے دل غم دیدہ کو تسکین سامل جاتا ہے جب عقیدت سے ترا نام لیا کرتا ہوں
جب میں گھر جاتا ہوں طوفانِ حوادث میں کہاں دامنِ سید کلؐ تھام لیا کرتا ہوں

مرحوم حکیم منظور ان کے قطعات سے متعلق رقم طراز ہیں۔ ''جہاں تک رباعیات اور قطعات کا تعلق ہے ان کو پڑھ کر فوری طور پر جو باتیں ذہن میں آتی ہیں وہ یہ ہیں کہ شاعر کو رباعی اور قطعہ کے فن پر بے پناہ گرفت ہے۔ شاعر زندگی

اور ماوری زندگی کے حسین گوشوں کو کھنگالنے کے علاوہ مسلّمہ اقدار کے پُر اثر بیان پر قادر ہے۔"[۲]

مرحوم کی نظر رباعی اور قطعہ کی صنفی شناخت کی طرف نہیں گئی ہے یا دونوں کے مابین فرق کو نظر انداز کیا ہے۔ اس کے باوجود شاعر کی فنی دسترس سے متعلق ان کی رائے سے اختلاف نہیں ہو سکتا۔

نازکی صاحب شاعری میں جمالیاتی آسودگی کے سامان کے ساتھ ساتھ کچھ اور بھی چاہتے ہیں۔ وہ شاعری جزویست از پیغمبری کے قائل ہیں۔ اس لئے مقصدیت کا عنصر ادبی کاوشوں میں رکھنے کے روادار ہیں۔ یہ مقصدیت، ترقی پسندوں کی مقصدیت سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ مرحوم صالح اقدار کی تبلیغ اور تعمیرِ حیات کے اصولوں کا پرچار چاہتے تھے۔ ان کے قطعات میں یہ عنصر کئی جگہوں پر نظر آتا ہے۔ مثلاً ؎

شیر کا کتّے کے آگے کیسے سرخم ہو سکے
تجھ سے کس نے کی تھی ایسی زندگی کی آرزو
اے مرے دل کر لے جتنا تجھ سے ماتم ہو سکے
زندگی کم کر الٰہی جس قدر کم ہو سکے

؎ آج سینائے فکر انسان میں
ایک فالج زدہ عضو کی طرح
جلوہ ہائے درختِ طور نہیں
اس میں احساس ہے شعور نہیں

؎ کون کہتا ہے شبِ غم کی سحر ہونے لگی
جب سے ڈالی فکرِ انساں نے ستاروں پر کمند
امن و آزادی کی صورت جلوہ گر ہونے لگی
زندگی دشوار تھی دشوار تر ہونے لگی

؎ تیرہ دل کی ہم نشینی سے مری جاں دور بھاگ
آگ کی آغوش میں پڑ کر چمکتا ہے زغال
صحبت روشن نفس سے دل کی کھل جاتی ہے جاگ
راکھ کے نیچے دبا رکھنے سے بجھ جاتی ہے آگ

سور گباشی ڈاکٹر برج پریمی بھی دوسرے نقادوں اور ادیبوں سے ہم رائے ہیں کہ نازکی صاحب قطعات لکھنے میں استاد کا رتبہ رکھتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ

'نازکی کا چار مصرعوں والے قطعات کہنے میں بڑی قدرت حاصل ہے۔'' [۶]

ناظر کولگامی کا خیال ہے کہ ان کی شاعری میں کلاسیکی تقدس اور مقصدیت سے انقطاع نہیں بلکہ اس میں ایک انفرادیت ہے۔ یہ رائے ان کی غزلوں اور نظموں کے ساتھ ساتھ ان کے قطعات سے متعلق بھی درست ہے۔ ان کے قطعات میں زندگی کے دوررے پہلوؤں کی جگمگاہٹ بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ یہاں غم ونشاط نہیں، نشاطِ غم ہے اور یہ چیز فانی کے بعد یہیں نظر آتی ہے [۷]

بندہ ومولا کو آپس میں ملادیتا ہے غم — کلبۂ عصیاں کی بنیادیں ہلادیتا ہے غم
تشنہ کامانِ محبت کو پلادیتا ہے غم — بادۂ تسکین خاطر انتہائے یاس میں

نازکی صاحب کے قطعات میں تاریخ گوئی کی بیساختگی اور برجستگی بھی پائی جاتی ہے۔ علامہ اقبال کی تاریخِ وفات کے سلسلہ میں یہ قطعہ ملاحظہ ہو۔

مشرق ہوا تاریک تر ازدیدہ خفاش — جب عازمِ فردوس ہوئے حضرتِ اقبال
''اِک مردِ قلندر نے کیا رازِ خودی فاش'' — تاریخ لکھی بے شش و پنج عقل وخرد نے

۱۔.....ادبی اصناف۔ گیان چند۔ گجرات اردو اکادمی ص ۶۴

۲۔.....اگر یہ غزل کا پہلا شعر ہوتو مطلع کہلائے گا

۳۔.....دیدۂ تر۔ تعارف ص ۱۰

۴۔ کشمیر میں اردو۔ عبدالقادر سروری حصہ دوم ص ۳۸۷

۵۔.....متاعِ فقیر۔ مقدمہ ص ۱۶

۶۔.....متاعِ فقیر۔ پیش لفظ ص ۲۶

۷۔.....جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشو ونما۔

..................☆☆☆..................

ایاز رسول نازکی

قندِ پارسی

جناب میر غلام رسول نازکی کئی زبانیں جانتے تھے۔ بشمول انگریزی وہ پانچ زبانوں کے ادب پر عالمانہ نظر رکھتے تھے۔ ان میں سے چار زبانوں یعنی اردو، کشمیری، فارسی اور عربی میں انہوں نے اعلیٰ معیار کی شاعری کی۔ ان چار زبانوں کے فنِ شعر پر ان کی قدرت ان کی اس نعتیہ تضمین سے پوری طرح ظاہر ہو جاتی ہے جس میں انہوں نے مشہور و معروف نعت 'بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر' پر چار زبانوں کشمیری، اردو، فارسی اور عربی میں تضمین کے اشعار کہے:

ہرڈُک ہوا چھُ سرد، سَپدٕ زرد بام و در
پن پیۆو ہٕرِتھ تھرٛن تہٕ ڈٕزِتھ پوش پیٚے پتھر
بُلبُل چھ بدحواس، صنوبر چھُ خمؔ گمر
باغس چھِ بَر وٕتھی تہٕ پریشاں چھُ رأچھی در
اۆبراہ چھ بے حساب، شِناۘیاہ چھ سَر بسر
واوس چھ تیۆت زور زِ گُلی پھیرٕی، ژاکھ ور
لۆب گُن چھُ باغواں تچھاں، وَچھ ژٹاں جگر
وأنجِ پھٕٹم، زباں وٕٹم، کتھ گھٕٹم ـ مگر

ہردِس بنبم مبے سونتھ ، مبے کُن تژاو اکھ نظر
یَا صَاحِبَ الجمال و یا سیّد البَشر



نو روز دِل فروز ، چمن یاسمیں بر
گلشن روشِ روشِ ارم و جنّتِ نظر
گلزارو کشت وجوے وخیابان و بحر و بر
نیساں عدن بدوش ، بہاراں بکف ثمر
فردوس گوش شور عنادل بہ بام و در
بلبل سرودنغمہ یانور بے خطر
نرگسِ نگاہ کرد و بپاشید لالہ زر
شبنم ببرگ یاسمن و نسترن نِگر
ظلمت زِ کائنات شُد آمادہ سفر
خاور دمید از دل فاراں دم سحر
مِنْ وَجْھِکَ المُنیر لَقد نُوِّرَ القَمَر



کس شے کی تجھکو اے دلِ ناداں ہے جستجو
کِس چیز کی طلب میں بھٹکتا ہے کوُ بکوُ
خالی ترا ایاغ ، شکستہ ترا سبوُ
محفل تری اُجاڑ ، طلب کم، تہی کدُو
خونِ جگر سے تُو نے کیا ہے کبھی وضُو؟

چاکِ جگر سے پہلے ہی اَندیشۂ رفُو!
خلوت میں تجھکو فکرِ تماشائے چار سُو
جلوت میں تجھکو وقر، نہ وقعت نہ آبرُو
آنکھوں سے بن کے اشک نہ ٹپکا ترا لہُو
کرتا ہے نعتِ احمد مُرسل کی آرزُو !
مدحِ رسول پاک' ارے تُو کرے گا' تو!
لایُمکن الثّناء کما کان حقہٗ



یاجامع الصفات و یا احسن الصُّوَر
یا قامع الضلال و یا افضل البشر
یا مهبط الکتاب و یا ناطق الحجر
یا ایُّها النّبی و یا دافع الضّرّ
یَا نعمة النعیم جزاء لمن شکر
یا صاحب الجمال و یا سیّد ِالبشَر
مِنْ جهک المُنیر لقد نوِ رَ القمر
ابن المفر لمنکر ایاتک العُزر
من ذَالّذی راک رالله با لبصر
بعد از خدا بزرگ توئی قصه مختصر



نازکی صاحب نے اپنی تعلیم کی ابتداءہی فارسی ادب سے کی تھی اور نہایت

کم عمری میں ہی وہ فارسی کے ادب عالیہ سے متعارف ہو گئے تھے۔ ان کے اردو اور کشمیری تمام مجموعوں میں کہیں نہ کہیں فارسی کے اشعار کی آمیزش ضرور نظر آتی ہے۔ آخری اردو مجموعہ 'متاعِ فقیر' کی ابتدا 'نغمۂ توحید' سے ہوتی ہے اور یہ فارسی میں لکھی گئی ایک حمد ہے۔ اس کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں،

گفتگو۔ لا الہٰ الا اللہ

جستجو۔ لا الہٰ الا اللہ

چشم دل واکن وتماشا کن

سوبسو۔ لا الہٰ الا اللہ

چشمِ غمناک قلب راسازد

باوضو۔ لا الہٰ الا اللہ

موبمو نقش کن بہ لوحِ دلم

ہوبہو۔ لا الہٰ الا اللہ

اسکے علاوہ اس مجموعے میں فارسی کی آٹھ غزلیں بھی موجود ہیں جن میں تین نعتِ رسولؐ پر مبنی ہیں۔ کچھ اشعار۔

ناز ہادارم کہ دلدارم توئی

یا رسول اللہؐ مددگارم توئی

از غمِ دنیا و از فکرِ معاد

غافلم، دانم کہ غم خوارم توئی

خفتہ اَم درسایۂ دیوار تو

یا محمدؐ بخت بیدارم توئی

اللہ اللہ ایں عنایت یا رسولِ ہاشمیؐ
سرنہادم زیرِ پایت یا رسولِ ہاشمیؐ
کاروان نسلِ آدم خفتہ و آشفتہ بود
خاست از بانگِ درایت یا رسولِ ہاشمیؐ
سایہ گستر شو بحشراہم بدنیا از کرم
کن مہماتم کفایت، یا رسولِ ہاشمیؐ

نازکی صاحب کی فارسی شاعری کے معیار کا اس بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی فارسی غزل ایک عالمی انتخاب میں شامل ہوئی جو سوویت روس سے شائع ہوا تھا۔ اس بات کو لے کر کشمیری زبان کے مشہور ادیب اختر محی الدین مرحوم نے اپنے سوویت یونین کے سفرنامے 'سلاوامر' میں ایک دلچسپ واقعہ درج کیا ہے۔ اختر صاحب ۱۹۶۸ء میں سوویت یونین کے دورے پر گئے تھے۔ واقعہ ان ہی کی زبان سے سنئے۔

'با اعتبار شاہد:۔ مجلس برخواست ہونے کو تھی۔ ہمیں کتابوں کے سیٹ پیش کئے گئے۔ ایک کتاب کا نام ہے مشاعرہ، جانے کیوں میں نے یہ کتاب کھولی اور اس کے اُوراق پلٹنے لگا۔ اچانک میری نظر اس وقت ٹھہر گئی جب میں نے ایک صفحے پر لکھا نام پڑھا میر غلام رسول نازکی۔ مشاعرہ نام کی اس کتاب میں نازکی صاحب کی ایک فارسی غزل تھی ۔میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ کشمیر میں آج بھی فارسی لکھنے والے موجود ہیں۔ نازکی صاحب کی اس غزل نے زندہ اور با اعتبار شہادت فراہم کی ۔میں چلا اٹھا۔

'میر غلام رسول نازکی۔ شاعر از کشمیر است'

سب کے کان کھڑے ہوگئے۔ میں کھڑا ہو گیا۔ نازکی صاحب کی غزل اونچے لہجے میں پڑھنے لگا۔ مجھے فاتح نیازی نے کہا تھا کہ تمہارا فارسی تلفظ ٹھیک نہیں ہے کیوں کہ میں نے لفظ 'کم کم' استعمال کیا تھا جبکہ مجھے 'کھیم کھیم' کہنا چاہیئے تھے۔ بہر حال اس بات کا دھیان کئے بغیر میں نے ان کو نازکی صاحب کی غزل سنادی۔ اپنے فارسی شاعروں کا معیار مجھے کسی طرح بھی کم نہیں لگا اور اس بات پر مجھے فخر محسوس ہوا۔ نازکی صاحب کی یہ غزل آپ بھی سن لیجئے۔

(کشمیری سے ترجمہ)

غزل

از تو قائم گرمئ ہنگامۂ بودو نبود
خیز وکم کن شکوہ ہائے گردش چرخ کبود

روزگارے درخم ابروئے دلبر باختم
زاں سبب پیش خداوندے نیاوردم سجود

مرغکے دیشب بگلزارے بشاخے می سرود
شاہدے گل را ثباتے نیست دل دادن چہ سود

ہر کہ را حسنے عطا کردند اوقاتش کم است
بلبل از گل ، گل ز شبنم، شبنم از انجم شنود

جنت کشمیر را نازم کہ حسن ایں دیار
عشوہ کردد و دل ایرانیاں باخود ربود

(سلاوامر۔ اختر محی الدین)

صفحہ نمبر ۱۲۰۔۱۲۲

نازکی صاحب کے علاوہ اس انتخاب میں برِ صغیر کے جن شعراء حضرات کا کلام شامل ہے وہ گنتی کے تین نام ہیں۔ حضرت علامہ اقبالؒ، حضرت یکتا بھوپالی اور صوفی غلام مصطفی تبسم۔

ریاست جموں و کشمیر میں چونکہ فارسی کا چلن آہستہ آہستہ ختم ہو گیا اس لئے بھی شاید فارسی شاعری کرنے والے پوری دل جمعی کے ساتھ فارسی میں شاعری کو برقرار نہیں رکھ پائے اور اردو یا پھر کشمیری کی طرف نکل گئے۔ نازکی صاحب نے جو بھی فارسی میں کہا ہے، ظاہر ہے کم کہا ہے، مگر اعلیٰ پائے کا کہا ہے۔ جو کچھ شائع ہوا ہے وہ بھی کم قلیل مقدار میں ہے۔ لیکن حال ہی میں ان کی ایک پرانی بیاض کی بازیافت ہوئی جس میں زیادہ تر کلام اردو کا ہے اور اس کے بارے میں ایک الگ مضمون شامل اشاعت ہے جو فارسی کا کلام اس کھوئی ہوئی بیاض میں پایا گیا۔ اس کے بارے میں سننے میں آیا تھا خاص کر ایک نظم 'لالہ کول'۔ اس کا تذکرہ راقم الحروف کے سامنے لاہور میں نازکی صاحب کے ایک عزیز جناب علی محمد میر (برادر اصغر غلام محمد میر طاؤس نے کیا تھا)۔ اسی طرح کئی اور چیزیں بھی اس بیاض کی بازیافت سے سامنے آئی ہے اور انہیں یہاں پڑھنے والوں کی دلچسپی کیلئے شامل کیا جا رہا ہے تاکہ فارسی کے تعلق سے نازکی صاحب پر کام کرنے والے تحقیق کاران سے استفادہ کر سکیں۔

حافظ شیرازی کے ایک شعر پر تضمین کے کچھ خوبصورت اشعار یوں درج ہیں۔

غزل تضمینی بر شعر حافظ۔

بیا بہ پیش ستمگر ادا نماز کنیم — بروئی اہل دلاں انکشاف راز کنیم

کسے بغیر گلاب و شراب اینجا نیست — بیا بباغ نشینیم و در فراز کنیم

نشستہ بیخبر ازاین وآں بہم دیگر	بخید بوسہ بسازیم وترک آز کنیم
بخوبروئی آں یار ہر یکے شیداست	میان شیخ و برہمن چہ امتیاز کنیم
کدورتے کہ میان من وتو حائل بود	زدل گداشتہ خود را شہید ناز کنیم
صدائے قمری وطوطی گذار وآن بشنو	نوائے بلبل شیراز راکہ ساز کنیم

حکایت از قدآں یار دلنواز کنیم
بدیں بہانہ مگر عمر خود دراز کنیم

(حافظ)

اس غزل پر مطبوعہ ۱۹۹۰ء بکرمی لکھدیا گیا ہے۔کہاں چھپی اس کا عندیہ نہیں ملتا۔

ایک اور غزل جو ۱۹۹۰ بکرمی میں ہی لکھی گئی پوری طرح پڑھی نہیں جاتی۔ اس کے آخر کے کچھ اشعار ضائع ہو گئے ہیں۔

چوں آں نازک بدن بارے میان انجمن آید
بااستقبال اور دررقص شیخ وبرہمن آید
زخط سبز وروئے خوب و زلف پیچ در پیچت
دلم را یاد ریحان و گلاب و نسترن آید
گل رنگیں قبائے خویشتن بایارے سازد
چوبیندر درچمن آن گل بدن گل پیرہن آید

۱۹۹۰ بکرمی یعنی ۱۹۳۴ء میں نازکی صاحب نے شیخ محمد عبداللہ کے نام یہ اشعار تحریر کئے اور یہ اپنے آپ میں ایک داستان کی نشاندہی کرر ہے ہیں۔شعرا کا وجدان اس طرح آنے والے وقتوں سے باخبر ہوتا ہے اس کی ایک مثال ان

اشعار میں نظر آتی ہے۔

بنامِ شیخ محمد عبداللہ

برآسمان شجاعت چو شیخ ماہے نیست
بہ ملک عقل وخرد ہمچو کج کلاہے نیست
خدا عطا کندش عمر خضر و عقل سلیم
وگرنہ مسلم کشمیر را پناہے نیست
نصیحتے کنم اے سرو باغ ہوش ترا
کہ مثل من بجہاں دور بیں نگاہے

لالہ کول نظم ۱۹۸۹ بکرمی یعنی ۱۹۳۳ء کی تخلیق ہے۔ اس کے ساتھ بھی مطبوعہ درج ہے۔ اس نظم میں کئی اشعار ایسے ہیں جن میں کوئی کوئی لفظ ٹھیک سے پڑھا نہیں جاتا ہے۔ بہر کیف۔

رفتار ناز ماروار لالہ کول	ہست چوں فرش زمرد جو یبار لالہ کول
ہست مصروف خرام ناز چوں جانانہ	غالباً باشد کسے در انتظار لالہ کول
از برائے انتظام نزہت بینندگاں	قد آدم شیشہ شد آبشار لالہ کول
کیست آن کو دست...... جوفت جائے	اے چنار لالہ کول اے چوبدار لالہ کول
حسرت آید جنت الفردوس را بر بخت خود	چوں وٹاون را بہ بیند بر کنار لالہ کول
اے وٹاون اے پناہے رہزنان و قاتلاں	کردۂ صد ہا جواناں را نثار لالہ کول
نالہ پہرو بگریہ زار چوں بیند کہ ہست	مولد مافوق فوق اندر جوار لالہ کول
باغ...... یکتا ہست در انداز خویش	ہست چوں باغ نشاط و شالمار لالہ کول
کاہ میگریہ چو عاشق گاہ مے نازد چو یار	ہست دلجوئی این و آن شعار لالہ کول

دیدہ عشاق راشد اکتساب فیضِ عشق　　لازم و واجب زچشم اشکبار لالہ کول

زلف محبوباں نباشد پیچد اروخم بہ خم　　چوں درختان قطار اندر قطار لالہ کول

یاد نہر مد متی شد محو از خود دلش　　نازکی راچوں مقدر...... لالہ کول

اس بیاض میں جو فارسی کلام موجود ہے اس میں ایک خوبصورت اور دلنشین غزل 'یارب اسیر گرداں بہ کمند زلف یارے' بھی ہے۔ یہ غزل جہاں مرصع کاری کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے وہیں اس کے ہر مصرعے سے کشمیر کا حسن جھلکتا ہے۔

یارب میسرم کن در فصل نو بہارے
بالائے کوہسارے نزدیک آبشارے

یک مطرب خوش الحاں یک ساقی پری رو
یک بادہ محبت یک دانہ انارے

مقصود زندگانی بخیال من ہمیں است
دست بدست یارے ، بکنارے جوئبارے

درباغ شالمارے، درسایہ چنارے
فارغ زہر کنارے بالالہ رخ نگارے

تو مست ناز باشی مصروف خواب نوشیں
من سرنہادہ باشم برسینۂ فگارے

برتخت ناز باشی مانند شاہ خوباں
من سرفگندہ باشم باچشم اشکبارے

حیف است من سبک سر در عشق تو بمیرم
تو سرگراں نشینی بانشہ خمارے

یارب چگونہ یا بم لذت ز زندگانی
نہ سلام دوستداراں نہ پیام گلعذارے
آزادی جہاں رانہ خرم بہ نیم درنگے
یارب اسیر گرداں بہ کمند زلف یارے
ور آرزوئے وصل دلدار بامراداں
چاکے زنم بداماں چوں صبح نور بارے
درد دلم فزودی اے درد تو جہاں را
آتش زدی بجانم از چشم شعل بارے
دل من طپیدو آخر خاکستر ش نمودند
نے سنگ تربتے شد نے مشعل مزارے

(یہ تخلیق ۲۷ ماہ پوہ ۱۹۹۳ بکرمی یوم یکشنبہ بمقام آیتمولہ وجود میں آئی)

علامہ اقبالؒ کی وفاتِ حسرت آیات کا نازکی صاحب کی طبیعت پر گہرا اثر ہوا اور ان کی وفات ۱۸ اپریل ۱۹۳۸ء کے دس دنوں کے اندر انہوں نے ۲۵ اشعار پر مشتمل ایک نوحہ لکھا اور اس میں علامہ مرحوم کے تیئں ان کی عقیدت اور محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ (دو شعر صاف پڑھے نہیں گئے)۔

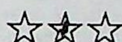
'نوحہ حضرت علامہ اقبالؒ متوفیہ ۱۸ اپریل ۳۸ء بمقام لاہور'

اے کہ دادی قوم را درس حیات — وانمودی ملک را راہ نجات
در تخیل غرق شب ہائے دراز — فاش کردی راز آگاہان راز
داغ دل دادی ز فکر عرش سا — لالہ زار خطۂ کشمیر را

خضر را ہے بودۂ اقوام را — نغمۂ تو قوم را بانگ درا
رسم شاہیں سار را آموختی — کرمک بے مایہ را افروختی
باز را آموختی آداب صید — آنکہ در زندان پستی بود قید
خیز اے شمع شبستان خیال — خیز اے مہر سماوات کمال
خیز اے شاہنشہ اقلیم فن — مقتدائے اہل دل اہل وطن
از فراقت دیدہ ہا بے نور شد — روز مشرق چوں شب دیجور شد
شکوہ ہادارم من از یزداں بسے — کو جواب شکوہ ام گوید کسے
شمع گرید بادل پر سوز و تاب — سینۂ شاعر ز ہجرانت کباب
عندلیباں ہر گل داود ہا — درزبور نوحہ ات محو بکا
باجہاں کوتاہ کردی التفات — آشکارا کردہ راز حیات
خود تو فرمودی نیایم باصفات — مصطفیٰؐ راضی نہ شد الالابذات
باغ دنیا دلفریب و دلکشاست — دامن گل چاک از باد صباست
نہر ہا جاری بسان سلسبیل — منظر پر رونق زرع و نخیل
کوہ ہا تو قیر بر جا داشتہ — تا فلک اعلام خود افراشتہ
الفرض باغ است چوں باغ بہشت — پر ز غلمان وشراب وحور وکشت
تو دریں فردوس مانند ہزار — مے سرودی نغمہ ہائے بے شمار
آں جہان دلکشا قائم ہنوز — دیدۂ غفلت در آن نایم ہنوز
عندلیب خویش راگم کردہ است — بے رونق و افسردہ است
خیز و از سرتازہ کن ایام را — باز آ شیرازہ بند اقوام را
دیدہ برراہت عزیزاں بستہ اند — درغمت از ہر دو عالم رستہ اند

اس بیاض میں آخری فارسی نوشتہ 'بادہ شیراز' کے عنوان سے چھ اشعار پر مبنی ہے۔

بداند آنکہ بداند محال ممکن نیست	بہ عشق صادق زوال ممکن نیست
کرم کن اے بت بیداد گرکہ	کرم برائے شنیدن وصال ممکن نیست
بسان چشمہ خورشی.....نور افشاں	کہ بے تو زندگی ماہ وسال ممکن نیست
شراب عشق نبیؐ بے شمار نوشم	ہیچگو نہ زمن اعتدال ممکن نیست
بگفت کاہش و افزائش قمر مارا	زوال جز بحصول کمال ممکن نیست
بشیشہ سنگ زن یا بعکس ہر دو یکیست	بروئے سنگدلاں انفعال ممکن نیست



پروفیسر محمد اسد اللہ وانی

میر غلام رسول نازکی کی شاعری پر اقبال کے اثرات

وادی کشمیر کو ''ریشی وأر'' ریشیوں کا مسکن کہا جاتا ہے۔ یہ قدیم زمانے سے ہی علم و ہنر کا گہوارہ رہی ہے۔ یہاں کی گل پوش دھرتی نے ایسے نابغہ روزگار اور یکتائے زمانہ افراد پیدا کئے ہیں جن کے علم و ہنر، تدبر و تفکر اور عالمانہ تبحر کا اعتراف ساری دنیا نے کیا ہے۔ علامہ اقبال کا شمار بھی انہی نابغۂ روزگار اور یکتائے زمانہ اشخاص میں ہوتا ہے جن کا فارسی اور اردو شاعری میں اپنا ایک اہم اور خاص مقام اور مرتبہ ہے۔ انہیں اپنے کشمیری الاصل ہونے کا فخر تھا۔ اِسی لئے انہوں نے کہا ہے:

تنم گلے ز خیابانِ جنّتِ کشمیر
دل از حریمِ حجاز و نوازِ شیراز است

اتنا ہی نہیں ان کے اپنے آباؤ واجداد کی نسبت کشمیری برہمنوں سے ہونے کی وجہ سے انہوں نے خود اپنے یکتا ہونے کا احساس یوں دلایا ہے

مرا بنگر کہ در ہندوستان دیگر نمی بینی
برہمن زادہ رمز آشنائی روم وتبریز است

علامہ اقبال کی شاعری ان کے شعری اسلوب، آہنگ اور فلسفیانہ اندازِ فکر میں اس قدر قوت، کشش اور تاثیر ہے کہ ان کے ہم عصر اور بعد کے شعراء نے ان کا بے پناہ اثر قبول کیا ہے۔ وادی کشمیر کے شعراء میں سے میر غلام رسول نازکی اقبال کے فکروفن اور اسلوب وآہنگ سے سب سے زیادہ متاثر ہیں۔ وہ اردو اور کشمیری کے ایک کہنہ مشق شاعر ہوئے ہیں۔ انہیں فارسی اور اردو کی شعری روایات کا اچھا عرفان تھا۔ کشمیر میں ''نمرود نامہ'' اور ''آواز دوست'' ان کے شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن کا بیشتر حصہ اقبال کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔

نازکی کی ادبی زندگی کا آغاز اردو شاعری سے ہوتا ہے۔ ان کے اردو قطعات، غزلیات اور نظموں کا مجموعہ 'دیدۂ تر' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے جو ان کی فکر، نجی تجربات، مشاہدات اور منظر نگاری کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ ان کا کلام مضامین کی بوقلمونی لئے ہوئے ہے۔ ڈاکٹر حامدی کاشمیری لکھتے ہیں:

''......ان کے یہاں غمِ روزگار، عشق، حسن، درد، تزکیہ نفس، درد وحسرت، بے ثباتی دنیا، طول امل، استغنا اور عدیم الفرصتی کے مضامین لفظ وپیکر میں مجسم ہوئے ہیں۔''[1]

اقبال سے متاثر ہونے کا اعتراف نازکی خود کرتے ہیں۔ وہ ان کے کلام کو زندگی کے آغاز سے ہی اپنا جزو جان تسلیم کرتے ہیں اور ان کے اکثر کلام کا از بر[2] ہونے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں۔ اسی لئے انہیں کلامِ اقبال کا حافظ[3] بھی کہا جاتا ہے۔ ان کے کلام میں اقبال کے اثرات جابجا ملتے ہیں۔ پروفیسر عبدالقادر سروری، نازکی پر اقبال کے اثرات کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''اقبال اردو کے بہت سے شعراء کی طرح کشمیر کے اکثر اردو شعراء کیلئے الہام کا باعث ہوئے۔ نازکی کے ذیل کے اقتباس میں اسی کا ردِ عمل ملتا ہے۔

گفتگو کل ہو رہی تھی ، بلبل و شہباز میں دے دیا بلبل نے شاہیں کی تعلیٰ کا جواب

ہے بظاہر تلخ، لیکن یہ حقیقت ہے جناب زندگی ہے سینکڑوں تاروں کی مرگ آفتاب[۴]

میر غلام رسول نازکی یہ غزل اقبال کے رنگ میں کس قدر رنگی ہوئی ہے ملاحظہ ہو:

وہ خلوص ہے مرے ناز میں، میری بندگی کے گداز میں

کہ میں نورِ دیدہ حور ہوں تو ابھی ہے صیغۂ راز میں

یہ ظہورِ نورِ سحر نہیں یہ فروغ شمس و قمر نہیں

شبِ غم اچھل کے سمٹ گئی خم و پیچ زلفِ دراز میں

مرے ذکر و فکر کو کر عطا وہ ابد کہ تا بہ ابد رہے

مرا ذکر شام و عراق میں، مرا فکر روم و حجاز میں

وہ شہیدِ نازِ وفا ہوں میں وہ نیاز مندِ جفا ہوں میں

شب و روز جس کے بسر ہوئے تب و تاب ناز و نیاز میں

نہ سرور میرے رکوع میں، نہ حضور میرے سجود میں

نہ نظام میرے قیام میں، نہ گداز میری نماز میں[۵]

نازکی کے کلام میں زندگی کے نشیب و فراز ، واردات و مشاہدات اور دوسرے عوامل کا اظہار بھرپور انداز میں ملتا ہے۔ جس طرح اقبالؔ کے نزدیک زندگی جہدِ مسلسل ہے۔ اسی طرح نازکی اسے سعی پیہم کہتے ہیں:

لوگ کہتے ہیں کہ یہ دنیا ہے میدان عمل زندگانی سعی پیہم کے سوا کچھ بھی نہیں[۶]

انسان نے اگرچہ موجودہ سائنسی اور تکنیکی دنیا میں ترقی کے زینے طے

مرا بنگر کہ در ہندوستان دیگر نمی بینی

برہمن زادہ رمز آشنائی روم وتبریز است

علامہ اقبالؔ کی شاعری ان کے شعری اسلوب، آہنگ اور فلسفیانہ اندازِ فکر میں اس قدر قوت، کشش اور تاثیر ہے کہ ان کے ہم عصر اور بعد کے شعراء نے ان کا بے پناہ اثر قبول کیا ہے۔ وادی کشمیر کے شعراء میں سے میر غلام رسول نازکی اقبال کے فکروفن اور اسلوب وآہنگ سے سب سے زیادہ متاثر ہیں۔ وہ اردو اور کشمیری کے ایک کہنہ مشق شاعر ہوئے ہیں۔ انہیں فارسی اور اردو کی شعری روایات کا اچھا عرفان تھا۔ کشمیر میں ''نمرود نامہ'' اور ''آواز دوست'' ان کے شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن کا بیشتر حصہ اقبالؔ کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔

نازکی کی ادبی زندگی کا آغاز اردو شاعری سے ہوتا ہے۔ ان کے اردو قطعات، غزلیات اور نظموں کا مجموعہ 'دیدۂ تر' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے جو ان کی فکر، نجی تجربات، مشاہدات اور منظر نگاری کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ ان کا کلام مضامین کی بوقلمونی لئے ہوئے ہے۔ ڈاکٹر حامدی کاشمیری لکھتے ہیں:

> ''......ان کے یہاں غمِ روزگار، عشق، حسن، درد، تزکیہ نفس، درد وحسرت، بے ثباتی دنیا، طول امل، استغنا اور عدیم الفرصتی کے مضامین لفظ وپیکر میں مجسم ہوئے ہیں۔''[1]

اقبال سے متاثر ہونے کا اعتراف نازکی خود کرتے ہیں۔ وہ ان کے کلام کو زندگی کے آغاز سے ہی اپنا جزو جان تسلیم کرتے ہیں اور ان کے اکثر کلام کا ازبر[2] ہونے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں۔ اسی لئے انہیں کلامِ اقبالؔ کا حافظ[3] بھی کہا جاتا ہے۔ ان کے کلام میں اقبال کے اثرات جابجا ملتے ہیں۔ پروفیسر عبدالقادر سروری، نازکی پر اقبال کے اثرات کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اقبال اردو کے بہت سے شعراء کی طرح کشمیر کے اکثر اردو شعراء کیلئے الہام کا باعث ہوئے۔ نازکی کے ذیل کے اقتباس میں اسی کا ردِ عمل ملتا ہے۔

گفتگو کل ہو رہی تھی ، بلبل و شہباز میں ۔۔۔ دے دیا بلبل نے شاہیں کی تعلّی کا جواب
ہے بظاہر تلخ، لیکن یہ حقیقت ہے جناب ۔۔۔ زندگی ہے سینکڑوں تاروں کی مرگ آفتاب[4]

میر غلام رسول نازکی یہ غزل اقبال کے رنگ میں کس قدر رنگی ہوئی ہے، ملاحظہ ہو:

وہ خلوص ہے مرے ناز میں، میری بندگی کے گداز میں
کہ میں نورِ دیدہ حور ہوں تو ابھی ہے صیغۂ راز میں
یہ ظہور نورِ سحر نہیں یہ فروغ شمس و قمر نہیں
شبِ غم اچھل کے سمٹ گئی خم و پیچ زلفِ دراز میں
مرے ذکر و فکر کو کر عطا وہ ابد کہ تا بہ ابد رہے
مرا ذکر شام و عراق میں، مرا فکر روم و حجاز میں
وہ شہیدِ نازِ وفا ہوں میں وہ نیاز مندِ جفا ہوں میں
شب و روز جس کے بسر ہوئے تب و تاب ناز و نیاز میں
نہ سرور میرے رکوع میں، نہ حضور میرے سجود میں
نہ نظام میرے قیام میں، نہ گداز میری نماز میں[5]

نازکی کے کلام میں زندگی کے نشیب و فراز ، واردات و مشاہدات اور دوسرے عوامل کا اظہار بھرپور انداز میں ملتا ہے۔ جس طرح اقبالؔ کے نزدیک زندگی جہدِ مسلسل ہے۔ اسی طرح نازکی اسے سعی پیہم کہتے ہیں:

لوگ کہتے ہیں کہ یہ دنیا ہے میدان عمل ۔۔۔ زندگانی سعی پیہم کے سوا کچھ بھی نہیں[6]

انسان نے اگرچہ موجودہ سائنسی اور تکنیکی دنیا میں ترقی کے زینے طے

کر کے خلاؤں کی بلندیوں پر اپنے پرچم گاڑ لئے ہیں لیکن وہ ابھی تک اپنے افکار کی دنیا میں سفر کرنے کے نااہل ہے۔ نازکی کے یہ اشعار اقبال کے ایسے ہی افکار وخیالات سے لبریز اشعار سے ہم آہنگ اور متاثر ہیں۔

کون کہتا ہے شبِ غم کی سحر ہونے لگی — امن وآسائش کی صورت جلوہ گر ہونے لگی
جب سے پھینکی فکر انسان نے ستاروں پر کمند — زندگی دشوار تھی، دشوار تر ہونے لگی[7]

خودی کا فلسفہ اقبال کی شاعری کا ایک اہم عنصر ہے۔ نازکی اس کی اہمیت تسلیم کرتے ہوئے اقبال ہی کے لہجے میں کہتے ہیں:

ترا مقام، مقامِ رضا سے آگے ہے — خودی نہ بیچ، طفیلی نہ بن، سوال نہ کر[8]

نازکی اقبال کی طرح آزادی، احترام آدمیت اور اُخوت ومساوات کے علم بردار اور ننگِ آدمیت کو یک قلم نابود کرنے کے حامی ہیں۔

وہ جس کے دم سے آزادی کی حد محدود ہو جائے — وہ ننگِ آدمیت یک قلم نابود ہو جائے
سبق دے گا زمانے کو مساوات واُخوت کا — ایاز اس دور کا کل کو اگر محمود ہو جائے[9]

نازکی اِس دنیا میں انسان کے مجبور ہونے کے باوجود اس کے کارہائے نمایاں کو اجاگر کرتے ہوئے اقبال کے انداز میں خدا سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

ہر چند کہ تیری دنیا میں مجبور ہیں ہم، مختار ہے تو — جو ہم نے زمین پر کر ڈالا وہ تجھ سے فلک پر ہو نہ سکا[10]

میر غلام رسول نازکی نے غزل، نظم، مرثیہ، قطعات، نعت غرض تمام اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کی ہے لیکن قطعات کہنے میں وہ کامل دستگاہ رکھتے ہیں۔ کشمیری زبان میں اس صنف کو فروغ دینے میں ان کی گراں قدر خدمات ہیں۔ ان کی شاعری میں اگرچہ غم واندوہ، مناظرِ فطرت، تسخیرِ کائنات، وارداتِ قلب اور حسن وعشق کی جلوہ گری ہے لیکن ان کا انداز روایت سے جداگانہ ہے بلکہ یوں کہنا بجا ہوگا کہ انہوں نے ان موضوعات کو نئے ابعاد سے روشناس کرایا ہے۔ ان کی کسی بھی صنف کی شاعری کا مطالعہ کیوں نہ کیا جائے۔ اقبال کی برتی ہوئی

اصطلاحیں اور علامتیں ان کے اشعار میں نہ صرف اپنی موجودگی کا احساس دلاتی ہیں بلکہ ان کی تمام شاعری اقبال کے اثرات کی چغلی کھاتی ہے۔ نازکی کی غزلیات کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں۔

تمہارے ساتھ تھا ہر لحمہ نغمہ جبریل — وہ نغمہ جس میں معانی کی روح تھی تحلیل
خلیل پیکرِ تسلیم تھے، تو کیا کرتے — اگر نہ ہوتی میسّر رضائے اسماعیل
شبِ دراز جدائی کی تیرگی میں بھی — تمہاری یاد سے روشن تھی روح کی قندیل
مرے سجود سے ثابت ہوا وجود ترا — مرے اَنا کی فنا ہے ترے بقا کی دلیل
فغانِ نیم شبی ہے کہ نغمۂ داوٗد — اذانِ وقتِ سحر ہے کہ صورِ اسرافیل
بس اک نگاہ تری نیم باز آنکھوں سے — شفائے قلب پریشان ہے جس کا حسن علیل
یہ اور بات کہ میرا وجود ہے کہ نہیں ☆ تیرا وجود ہے میرے ہی دل کا عکس جمیل

ادا شناس بن یہاں قیاس کا محل نہیں — یہ عشق بے نیاز ہے دماغ کا خلل نہیں
قضا کے کارکن سنیں کہ موت ان کے بس میں ہے — قسم بہ عزم نوجواں، یہ حکم بھی اٹل نہیں
یہ زعم فلسفہ نہیں قلندری کی بات ہے — حیاتِ نو کی ابتداء ہے، انتہا اجل نہیں
خدا دلوں سے دور ہے مہیب و ناصبور ہے ☆ یہ مولوی کا فلسفہ نوشتۂ ازل نہیں

ایمان بقدر طولِ امل بیچتا ہوں — لیکن ضمیر پہلے پہل بیچتا ہوں
تسبیح و دلق وخرقہ وسجادہ بیچ کر — مصحف کو رکھ کے زیرِ بغل بیچتا ہوں
اپنا سیاہ فرد عمل لے کے ہاتھ میں — پیغمبرِ خدا کا عمل بیچتا ہوں
میں جانتا ہوں کیا ہے خریدار کا مزاج — زہر اب میں ملا کے عسل بیچتا ہوں
میں جانتا ہوں کیا ہے تقاضائے عہدِ نو — نام حیات لے کے اجل بیچتا ہوں
ہر شے بکاؤ ہے میرے بازارِ فکر میں ☆ ہر شے بغیر لیت ولعل بیچتا ہوں

تیری نگاہ قبلۂ حاجات ہوگئی — بدلی ذرا تو مرگ مفاجات ہوگئی
ابن الکتاب جب سے بنے صاحبِ الکتاب ☆ اُم الکتاب نذر خرافات ہوگئی

ظفریابی پہ نازاں تھے کہ بے نیل مرام آئے — خدا کا شکر ہے ہر حال میں ہم شادکام آئے
ہزاروں مرحلے میں رہ نوردانِ محبت کو — کہیں دارالصنم آئے کہیں بیت الحرام آئے

یہ استغراق ومحویت کے عالم کا تقاضا ہے
کسی کا نام لینا ہو تو لب پر تیرا نام آئے
زمانہ بھی نیا ہو اور دنیا بھی نئی جس میں
نہ دن آئے، نہ رات آئے، نہ صبح آئے نہ شام آئے
خلوص معصیت بہتر ہے مکارانہ طاعت سے
یہ پند پیر دانا یاد رکھ، ممکن ہے کام آئے
زیارت کیلئے جبریل با صد احترام آئے
اگر شاہِ رسل ماہِ عرب بالائے بام آئے[۱۵]

نازکی کی منظومات پر بھی اقبال کے افکار وخیالات کی گہری چھاپ ملتی ہے۔ دیدۂ تر کے آخری حصے ''آیات'' ان کی نظم بانگِ درا، اس کی ترجمان ہے۔ ''ایک اندھی لڑکی کی دعا'' ان کی ایک ایسی نظم ہے جس میں ایک نابینا لڑکی اپنی ماں کی صورت دیکھنے کی تمنا کرتی ہے۔ نازکی نے اس کے جذبات کی ترجمانی فن کارانہ چابکدستی سے کی ہے۔

تو نے تاروں کو ضیا بخشی ہے سوچ کو جمال
بارشِ انوار سے دنیا کی کھیتی ہے نہال
نور پاشی میں قمر ہے آپ ہی اپنی مثال
مجھ کو ان چیزوں کی خواہش ہی نہیں اے ذوالجلال
یہ تمنا ہے کہ اپنی ماں کی صورت دیکھ لوں

لوگ کہتے ہیں کہ رنگوں کے کئی اقسام ہیں
سرخ ہیں، کالے ہیں، پیلے اور نیلی فام ہیں
اوران رنگوں سے وابستہ ہزاروں کام ہیں
مجھ کو کیا؟ یہ آنکھ والوں کیلئے انعام ہیں
یہ تمنا ہے کہ اپنی ماں کی صورت دیکھ لوں

میری آنکھوں کو بصارت کی ہوس اصلا نہیں
بے بصر ہوں میں، مگر اس کی مجھے پرواہ نہیں
تو نے سمجھا ہے میں عاجز ہوں مگر ایسا نہیں
مجھ کو ہرگز آرزوئے دیدۂ بینا نہیں
یہ تمنا ہے کہ اپنی ماں کی صورت دیکھ لوں[۱۶]

نازکی کو قطعہ نگاری میں بڑی مہارت حاصل ہے۔ کشمیری اور اردو دونوں زبانوں میں انہوں نے کافی قطعات کہے ہیں۔ ان کی قطعہ نگاری کے بارے میں پروفیسر حامدی لکھتے ہیں:

''قطعہ نگاری میں ان کو یدِطولیٰ حاصل ہے۔ اس صنف میں وہ علامہ

اقبالؔ سے بے حد متاثر ہیں...... انھوں نے اپنے قطعات میں خیالات وتجربات کی ایک فکر انگیز دنیا بسالی ہے۔ان کے قطعات ان کے شعورِ عصر کے غماز ہیں۔ان میں جذبات کا ارتعاش بھی ہے۔مشاہدے کی رنگینی بھی اور فکر کی گہرائی بھی۔[۱۷]

نازکی اپنے قطعات میں خدا سے یوں شکوہ سنج ہیں:۔

ہزیمت ہوگئی جہدِ وفا کو | بہیمیت بھی پہنچی انتہا کو
کھڑی فطرت تماشا دیکھتی ہے ☆ اسی پر ناز ہے میرے خدا کو[۱۸]

تمنائیں ہیں شکوے ہیں، گلے ہیں | دلوں میں حسرتوں کے قافلے ہیں
یہ کسی زندگی ہے یا الٰہی ☆ میرے معبود یہ کیا سلسلے ہیں[۱۹]

خدا ہے تو ترا رتبہ ہے عالی | نہیں تیرے جہاں میں پائمالی
تیری ساری خدائی میں بھی لیکن | نہیں میرے لئے آسودہ حالی[۲۰]

نازکی کو نعت گوئی میں بھی کافی دستگاہ ہے ان کا نعتیہ مجموعہ 'چراغِ راہ' شائع ہو چکا ہے۔جو علامہ اقبالؔ کے اس شعر کا ماحصل ہے جو نازکی نے اپنے نعتیہ قطعات سے پہلے تحریر کیا ہے۔

کافرِ ہندی ہوں میں دیکھ مرا ذوق وشوق
دل میں صلوٰۃ و درود لب پہ صلوٰۃ و رود

نازکی کے مطابق نعت کہنا آسان نہیں بلکہ جان جوکھوں کا کام ہے کیوں کہ ان کا اپنا بیان ہے کہ:

''......سب سے پہلے نعت خود خالق کائنات اللہ جل شانہ نے لکھی ہے اور وہ قرآن مجید کی صورت میں ہمارے پاس ہے۔''[۲۱]

نازکی نعت گوئی میں بھی اقبالؔ سے متاثر ہیں اور اس سلسلے میں وہ اقبال کو

عصرِ حاضر کا سب سے بڑا نعت گو شاعر قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''متاثرین میں نعت کو ایک نیا روپ اقبالؔ نے بخشا، 'جاوید نامہ' 'اسرار و رموز'، 'مسافر' اور 'پیام مشرق' نعت کا پہلو ہر کتاب میں غالب ہے۔ 'ارمغانِ حجاز' کا مرکزی خیال ہی نعت رسولؐ ہے اقبال کی نعت ایک الگ مبسوط اور مستقل موضوع ہے۔''[۲۲]

نازکی کے نعتیہ کلام 'چراغِ راہ' کی ابتداء میں نغمہ 'توحید کے عنوان سے جو نظم موجود ہے اسے پڑھنے کے بعد قاری کا ذہن فوراً علامہ اقبالؔ کے مجموعہ کلام 'ضرب کلیم' کی مشہور نظم لا الہ الا اللہ کی جانب منتقل ہو جاتا ہے اور اس نتیجے پر پہنچنے میں دیر نہیں لگتی کہ نازکی کی نظم اقبالؔ کی نظم کا ایک پرتو ہے؛

گفتگو لا الٰہ الا اللہ ۔۔۔ جستجو لا الٰہ الا اللہ

چشم دل واکن و تماشا کن ۔۔۔ سو بسو لا الٰہ الا اللہ

باغِ بود و نبود را بخشد ۔۔۔ رنگ و بو لا الٰہ الا اللہ

بے حقیقت زن و زر و فرزند ۔۔۔ من و تو لا الٰہ الا اللہ

آنچناں ذی کہ سو بسو بینی ۔۔۔ رو برو لا الٰہ الا اللہ

اعتبار تو لا شریک لہٗ ۔۔۔ آبرو لا الٰہ الا اللہ

مو بمو نقش کن بلوح دلم ۔۔۔ ہو بہو لا الٰہ الا اللہ[۲۳]

نازکی کی نعتوں میں کچھ قطعات بھی موجود ہیں جو ہیت اور اسلوب کے علاوہ فکر و خیال کے اعتبار سے اقبالؔ کا کافی اثر لئے ہوئے ہیں:

سدرۃ المنتھیٰ سے بھی آگے ۔۔۔ ان کی پرواز آنسوئے گردوں

رونق افروز برج عرش بریں ☆ درج لاہوت کا درِ مکنوں[۲۴]

سرمدی زمزمہ ہے میرا وجود ۔۔۔ ہر نفس تارِ نغمۂ داؤد

دیکھ میری نماز میرا سجود ☆ مصطفیٰؐ پر درود لاکھ درود[۲۵]

گونج اٹھے گا نغمۂ توحید پھر یقین و عمل کی ہوگی جیت
سن کے پھر لاالٰہ الااللہ ہار جائے گا کفر کا عفریت[۲۶]

نازکی کی نعتوں میں اقبال کے رنگ کے ساتھ ساتھ آں حضورؐ کے تئیں انہی کے جیسا والہانہ عشق کا جذبہ بھی موجود ہے۔

نازہا دارم کہ دلدارم توئی یا رسول مددگارم توئی
از غمِ دنیا واز فکر معاد غافلم دانم کہ غم خوارم توئی
خفتہ اَم درسایۂ دیوار تو یا محمدؐ بخت بیدارم توئی
چوں کنم اندیشہ سودوزیاں اندکم شادم کہ بسیارم توئی
منت ساحل کشیدن ابلہی است ☆ کشتی و دریائے ذخارم توئی[۲۷]
رونقِ بازار امکانم توئی کعبۂ شوق فراوانم توئی
عشقِ بے پروائے من گرم سفر کشتی و گردات و طوفانم توئی
تومرا آموختی رمزِ حیات ☆ جسم وجانم دین وایمانم توئی
تزئینِ کائنات رسولِ خدا کی ذات تنویرِ شش جہات رسول خدا کی ذات
مجموعہ صفات رسول ِخدا کی ذات عرفان عینِ ذات رسول خدا کی ذات

میر غلام رسول نازکی نے فارسی میں بھی شاعری کی ہے۔ مندرجہ بالا نعتیہ کلام کے بعض نمونوں کے علاوہ اقبالؔ کے رنگ میں ان کے یہ فارسی اشعار بھی ملاحظہ ہوں:

وجہ تکوین عالمِ ناسوت شاہباز بلندی ملکوت
رازدان سرائیر جبروت خازن گنج خانۂ لاہوت



کاروان نسلِ آدم خفتہ وآشفتہ بود خاست از بانگِ درایت یارسول ہاشمی
یک نگاہے کیمیاسازے کہ گردو مستنیز جانم از شوقِ لقایت یا رسول ہاشمی

نازکی نے اقبال کے مصرعوں پر جو طرحی غزلیں کہی ہیں یاان کے اشعار پر تضمین کی ہیں اِن کا تخلیقی عمل یوں تو اقبالؔ ہی کے زیر اثر پروان چڑھا ہے لیکن

ان کی تخلیقات کا اسلوب و انداز اور لب ولہجہ بھی اقبال جیسا ہی ہے۔

اقبال کے دو اشعار پر ان کی یہ تضمین ملاحظہ ہو:

میں جانتا تھا کہ ہے عرصہ حیات مصاف
ہر ایک ذرہ تھا شعلہ سلگ رہا تھا مطاف
اسی سبّب سے تھا پیرِ حرم، بھی میرے خلاف
کمالِ جوشِ جنوں میں رہا میں گرمِ طواف
خدا کا شکر سلامت رہا حرم کا غلاف

یہ اجنبی سے نہیں، تجھ سے ہو رہا ہے خطاب
کر آپ اپنے عمل کا اسی جہاں میں حساب
یہی ہے جانِ تمنا یہی ہے کارِ ثواب
ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

نازکی کی یہ طرحی غزل بھی اقبالؔ کے اثرات کی غماز ہے۔

نہ بیم موج معلق نہ فکر یاد مراد — حیات جہد مسلسل ہے ہر چہ بادا باد
خیال و فکر وصداقت کا ذروہ سینا — پیام تیرا حیات آفریں خطِ ارشاد
ترا کلام ہوا اس صدی کا علمِ کلام — تیرے وجود سے لاہور بن گیا بغداد
تجھی نے ہوش دیا سادہ دل مسلماں کو — تو سرد پڑ گیا ملا کا کاروبارِ فساد
تجھی نے درس دیا بے عمل غلاموں کو — عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد
یہ تیرا فیض نظر ہے کہ روزِ محشر تک — کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد

اسی رنگ اور اسلوب میں نازکی کی ایک اور طرحی غزل قابل مطالعہ ہے:

فسانہ ہے غمِ مجنوں و تیشہ فرہاد — جمال دوست سے رنگیں ہے عشق کی روداد
بسان شعلہ نہ لپکے گا تو اگر تیری — مثال قطرہ شبنم سرشت ہے افتاد

مرا خلوص مری معصیب میں شامل تھا　　ہے تیرے زہد سے پاکیزہ تر مرا الحاد

وہ اک نگاہِ کرم ایک ہوا کا جھونکا تھی　　ذرا سی راکھ کی چٹکی تھی ، ہوگئی برباد

میں اس قیامت کبریٰ کا ساتھ دے نہ سکا　　کرم ہے یا کہ ستم تیری لذتِ ایجاد

غزل ہوئی ہے یہ اقبالؔ کے تتبع میں　　بڑی عظیم جسارت ہے ہر چہ بادا باد

اقبال کے فن ، اسلوب، فکر، فلسفہ اور آہنگ سے غلام رسول نازکی براہِ راست متاثر ہیں۔ وہ کشمیر کے علاوہ اردو کے بھی کہنہ مشق شاعر ہیں۔ انہیں کلامِ اقبالؔ کا حافظ بھی کہا جاتا ہے۔ ان کے یہاں اقبال کے اثرات کے سلسلے میں محمد یوسف ٹینگ لکھتے ہیں:۔

''اقبال کی فنی نزاکت کو اگر کسی شاعر نے اپنی شبنم آسا خوبصورتی کے ساتھ کشمیری زبان کی آرسی میں اتارا ہے تو وہ میر غلام رسول نازکی ہیں۔'' [۲۸]

اقبال کے اثرات کا اعتراف انہوں نے اپنے شعری مجموعہ ''نمرود نامہ'' میں کیا ہے کہ انہوں نے اقبالؔ کے اکثر خیالات کا ترجمہ کیا ہے یا ان سے استفادہ۔ اسی طرح محمد یوسف ٹینگ کے استفارات کے جواب میں بھی انہوں نے یہی بات تفصیل سے کہی ہے:۔

''اقبال کا کلام زندگی کے آغاز سے میرا جزوِ بدن تھا اور میں ان کے کلام سے بے حد متاثر تھا اور خاص کر کے ان کی رباعیوں نے مجھ پر جادو سا کر دیا تھا۔ پیامِ مشرق میں لالہ طور کی رباعیاں ، ارمغانِ حجاز تقریباً سارا، بالِ جبرئیل کی رباعیاں مجھے تقریباً ازبر تھیں۔ کشمیری زبان میں ایک نئی صنفِ سخن کو ایجاد کرنے کی طرف مجھے انہوں نے رباعیوں نے مائل کر دیا اور میں نے اسی

وزن اور بحر میں رباعیاں لکھنا شروع کیں۔ اقبالؔ چوں کہ ذہن پر مستول تھا اس لئے قدرتی طور پر اس کے خیالات میری رباعیوں میں آنے لگے۔ کبھی کبھی میں سوچتا تھا کہ ان رباعیوں کا کشمیری زبان میں ترجمہ کروں مگر ترجمے کے متعلق میرا خیال ہے کہ یہ ناممکن ہے۔ ہر زبان کا اپنا مزاج ہوتا ہے اس لئے اس مزاج کو قائم رکھنے کیلئے دوسری زبانوں کے مشاہیر کے شاہکار سے خوشہ چینی کی جاسکتی ہے۔ ترجمہ نہیں کیا جاسکتا۔ کہیں کہیں اتفاق سے ترجمہ بھی ہوگیا ہے لیکن وہ ارادتاً نہیں ہوا ہے۔"[29]

میر غلام رسول نازکی نے اپنی رباعیوں میں سے اس ضمن میں کئی ایک کا حوالہ پیش کر کے اقبال کے اثرات کی خودنشاندہی کی ہے۔ مثلاً اقبالؔ کی مشہور نظم 'محاورہ مابین خدا و انسان' کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

تو شب آفریدی چراغ آفریدم سفال آفریدی ایاغ آفریدم
تو بیاباں وکہسار وراغ آفریدی خیاباں وگلزار وباغ آفریدم

جن کا نازکی نے ہُو بہو ترجمہ یوں کیا ہے۔

شبک گٹہٕ کارُیت ژھم زژل کوٗرمس پیٚم بیکار کتراہ پیالہٕ گور مس
کرِم چائنس زینس ملہٕ پوشن ستن طرفن وتن الماس جورمس

(تو نے مجھے تیرہ و تار شب دی میں نے اس میں چراغاں کیا۔ میں نے معمولی سے ٹھیکر سے پیالہ بنایا۔ تیری زمین کو میں نے پھولوں کے ہار پہنائے اور راستے میں ہر سو الماس جڑ آئے۔)

اقبال کی ایک اور رباعی ہے۔

شبے پیش خدا بگریم زار مسلمان چرا زارند و خوارند
ندا آمد نمے دانی کہ ایں قوم دلے دارند و محبوبے نہ دارند

جس کے بارے میں نازکی کا بیان کہ اس کا ترجمہ تو نہیں البتہ تغزل سے بھرپور ایک کشمیری رباعی ہوگئی جس کا مرکزی خیال یہی رباعی ہے۔

لگس داوس قرارہ چھم نہ ویسے دوکھن دادن شمارہ چھم نہ ویسے
لگے ناوس ژٕ مازانکھ مےٚ کیا گوو دلا چھم، بالہٕ یارہ چھم نہ ویسے

(میرے محبوب! میں بڑی مشکل میں ہوں کیا کہوں دل کو کسی پہلو قرار نہیں ہے۔ میرے مصائب وآلام کا کوئی شمار نہیں ہے۔ میں تیرے واری جاؤں تجھے اس کا علم نہیں ہے۔ میرے پہلو میں دل تو ہے مگر کوئی چاہنے والا ہی نہیں ہے۔)

میر غلام رسول نازکی کے کلام کا جہاں تک تعلق ہے انہوں نے علامہ اقبالؔ کے کلام کو اپنے حافظے میں اس طرح محفوظ کرلیا ہے کہ وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں، اس پر اقبالؔ کی چھاپ نظر آتی ہے۔ یہ درحقیقت اقبالؔ کے خیالات وتصورات کو اشعار کا پیکر عطا کرنے کی ایک ایسی مجبوری ہے جو کلامِ اقبال کے گہرے مطالعے کا نتیجہ ہے۔ نازکی کے کلام پر اقبالؔ کے اثرات کا اندازہ ان مثالوں سے لگایا جاسکتا ہے:

اقبال: تو خورشیدی ومن سیارہ تو سراپا نورم از نظارہ تو
ز آغوش تو دورم نا تمام ☆ تو قرآنی ومن سیپارہ تو

نازکی: سبٹھا کالس کرٕم تلخی گوارا مےٚ دوٗر بر ژالنک روٗدم نہ یارا
بہر تقدیرٕ ودس نامکمل قرآنس زن جداگامژ سپارا

(میں نے بہت عرصہ تک سختی برداشت کی مگر اب میرے اندر ہجر برداشت کرنے کا مادہ نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ میں ایسے نامکمل ہوگیا ہوں جیسے قرآن سے اس کا پارہ جدا ہوکر نامکمل رہتا ہے)

اقبال: تیری خدائی سے ہے میرے جنوں کو گلہ اپنے لئے لامکاں میرے لئے چارسُو
نازکی: سبٹھاہ کالا مےٚ ووتم بور ساران گرٕ ھان چھم راتھ دوٗہ انہ کانہ چاران

بۆشبن طرفن اندر کوٗرنس گرفتار چھُ پانس لامکانس ڈلہٕ ماران

(میں کافی عرصے سے بوجھ ڈھو رہا ہوں اور میرے دن رات اسی بوجھ کی رسیاں باندھنے میں بیتے جا رہے ہیں۔ مجھے شش جہات میں پابند کر کے خود لامکان کی سیر میں محو ہے)

اقبال: تری دنیا میں میں محکوم و مجبور ☆ مری دنیا میں تیری بادشاہی

نازکی: ژِ چھکھ میائنس جہانس منز شہنشاہ بہٕ چھس چانس جہانس منز مسافر

(تو میرے جہاں میں شہنشاہ اور میں تیرے جہاں میں مسافر ہوں)

اقبال: گزشتی تیز گام اے اخترِ صبح مگر از خوابِ ما بیزار رفتی

من از ناآگاہے گم کردیم راہم ☆ تو بیدار آمدی بیدار رفتی

نازکی: دوہس رفدم یتی رُودُم مذاقاً یتھے دوہ لوٗس نیرتھ گوم کیا گوم

دپان پتہٕ اوس آمت پتہٕ مہ پیارے شوٗنگتھ وُچھنس نہٕ پھیرتھ گوم کیا گوم

(وہ میرا محبوب) دن بھر میرے ساتھ میرا مذاق اڑاتا رہا لیکن کیا کہوں جونہی سورج غروب ہوا وہ چلا گیا۔ کہتے ہیں وہ رات کے پچھلے پہر پھر آیا تھا مگر مجھے سویا ہوا دیکھ کر واپس چلا گیا۔ ہائے اب میں کیا کروں)

اقبال: انجامِ خرد ہے بے حضوری ☆ ہے فلسفہ زندگی سے دوری

نازکی: چھُ اُزکس فلفس علمس ہوکھے ناو نہ چھُس گرمی، نہ چھس سوزش نہ چھُس تاو

(آج کے فلسفے اور علم کا بس نام رہ گیا ہے اس میں زندگی کی کوئی ہلچل ہی نہیں ہے)

اقبال: عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین و ظن

نازکی: شکک کھٕ کوٗش گمانن ہنز ششر گانٹھ

قیاسک شین، تخمینک ترُن واد

(شکوک وشبہات کی یخ بستگی اور وہم و گمان کا چقش بام، قیاس کی برف

اور اندازے کی ٹھنڈی ہوا)

اقبال: مرا گوئی کہ از شیطاں حذر کن　　بگو با من کہ او پر وردہ کیست

نازکی: بہ ژچھس زاناں ژٕ چھکھ مشتاق میونے　　نہ چھے ئیٚنڈر نہ چھے نیہہ میانہِ دادے

بہ نۆن ونہٕ ہاژیئے ہمراز شیطان　　مےٚ کیا کۆرمے کتھ کۆرتھن اگادے

(مجھے معلوم ہے کہ تو میرا مشتاق ہے، میری جدائی کی وجہ سے تجھے آرام وسکون میسّر نہیں ہے۔ میں تو اعلانیہ کہوں گا کہ شیطان تیرا ہمراز ہے۔ مگر میں نے ایسا کیا کیا جو تو نے اسے میرے پیچھے لگا دیا)

علاّمہ اقبالؔ کے اشعار کا حوالہ دیئے بغیر ہی نازکی کے یہاں ایسے اشعار وافر تعداد میں موجود ہیں جن پر اقبالؔ کے اثرات کی چھاپ ملتی ہے۔ مثلاً:

مےٚ چاٲنی درےٕ ژٕ نے نالس ژھنکھ تھپھ　　زمینس آسمانس ، لامکانس

نہ تحریکا نہ طوفانا ، نہ شورا　　تلاوٗک آب چھُم گومت ضمیرس

(مجھے تیری قسم تو اگر میری دست گیری نہ کرے۔ تو اس کائنات میں میری حیثیت کیا ہے۔ نہ تو کوئی تحریک ہے، نہ طوفان ہے اور نہ کوئی ہنگامہ ہے۔ میرا ضمیر تو بس جوہڑ کا پانی بن گیا ہے۔)

نازکی نے اگرچہ اقبالؔ کے خیالات اور تصوّرات سے متاثر ہو کر انہیں کشمیری قالب میں ڈھالا ہے مگر اس عمل کے دوران میں انہوں نے کشمیری زبان کے مزاج کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ لہٰذا اقبالؔ کے خیالات نازکی کے کشمیری اشعار میں ڈھل کر ان کے اپنے خیالات معلوم ہوتے جن کی بدولت ان کی اپنی انفرادیت قائم بھی رہی ہے۔

اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے اقبالؔ کے خیالات کو کشمیری زبان میں منتقل کرتے وقت زبان کی تمام نزاکتوں کا خیال رکھا ہے۔ اس بات کا

اعتراف کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

"ایک مفکر اور فلسفی کے خیالات کو دوسری زبان میں منتقل کرتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا جانا چاہئے کہ اس زبان کا مزاج مجروح نہ ہو۔ میں نے یہی کوشش کی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ کوشش بالکل رائیگان نہیں ہوگی...... کشمیری زبان اور اقبالؔ کے افکار سے شغف رکھنے والوں کو معلوم ہے، کہ میری اکثر رباعیوں پر اقبالؔ کی چھاپ ہے۔ میں فخر کے ساتھ اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ اسے اپنی زبان کی خدمت کے سلسلے میں اپنی ایک حقیر سی کوشش سمجھتا ہوں۔"[۹]

مختصر یہ کہ کشمیر کا یہ نابغۂ روزگار شاعر علامہؔ اقبالؔ کے اسلوب، آہنگ اور فکر و فلسفہ سے نہ صرف بے حد متاثر تھا بلکہ اس کا کلام بقولِ ان کے اپنے ان کا جزوِ بدن تھا...... اپنے قافلے کا یہ آخری شاعر...... راہِ عدم کی ابدی مسافت پر روانہ ہوگیا۔

حواشات

۱...... پروفیسر حامدی کاشمیری، ریاست جموں وکشمیر میں اردو ادب، گلشن پبلیشرز، سرینگر ۱۹۹۱ء۔ ص ۱۱۴

۲،۳...... محمد یوسف ٹینگ، علامہ اقبال کا اثر کشمیری شاعری پر، بشمولہ ماہنامہ شیرازہ (اردو) جلد ۲۴ شمارہ ۴ ص۔ ۱۲

۴...... پروفیسر عبدالقادر سروری، کشمیر میں اردو (دوسرا حصہ)

۵...... نور شاہ، مرتّب انتخاب اردو ادب مطبوعہ جموں وکشمیر کلچرل اکیڈیمی، سرینگر ۱۹۷۳ء ص۔ ۳۴۹

۶...... میر غلام رسول نازکی، دیدۂ تر بروکا پریس، سرینگر ۱۹۴۸/۴۹ء۔ ص۔ ۳۷

۷...... ایضاً...... ص۔ ۴۲

۸...... پروفیسر حامدی کاشمیری، ریاست جموں وکشمیر میں اردو ادب ص۔ ۱۱۸

۹...... میر غلام رسول نازکی...... دیدۂ تر...... ص۔ ۲۹

۱۰۔...... ایضاً............

۱۱۔......دو ماہی شیرازہ (اردو) جلد ۱۵ شمارہ ۱،۲ ص۔۱۰۰

۱۲۔......ہمارا ادب ۱۹۶۶ء جموں وکشمیر کلچرل اکیڈیمی، سرینگر ص۔۱۸۴

۱۳۔......ہمارا ادب، شیرازہ انتخاب نمبر۔۱۹۷۸، ۱۹۷۹ء جموں وکشمیر کلچرل اکیڈیمی سرینگر

ص ۳۶۷۔۳۶۸

۱۴۔......ماہنامہ شیرازہ (اردو) اپریل۔۱۹۸۰ء جلد۔۱۹ شمارہ ۴۔ص ۳۷

۱۵۔......ماہنامہ شیرازہ (اردو) اپریل ۱۹۸۹ء جلد ۲۸ شمارہ ۴ ص۔۱۱۵

۱۶۔......میر غلام رسول نازکی۔دیدۂ تر ص۔۱۰۸۔۱۱۰

۱۷۔......پروفیسر حامدی کاشمیری، ریاست جموں وکشمیر میں اردو ادب۔ص ۱۲۰

۱۸، ۱۹۔......میر غلام رسول نازکی......دیدہ تر ص۔۶۳

۲۰۔...... ایضاً ص ۶۷

۲۱۔......میر غلام رسول نازکی۔ چراغِ راہ شالیمار آرٹ پریس۔سرینگر ۱۹۸۹ء ص ۹

۲۲۔......میر غلام رسول نازکی۔نعتیہ ادب (۲) مشمولہ دو ماہی شیرازہ (اردو) نومبر ۱۹۶۲ء ص ۴۵۔۸۵

۲۳۔......میر غلام رسول نازکی۔ چراغ راہ ص۔۵۔۶

۲۴۔...... ایضاً ص۔۲۵

۲۵۔......میر غلام رسول نازکی۔ چراغ راہ ص ۲۸

۲۶۔...... ایضاً ص۔۵۵

۲۷۔۲۸۔......محمد یوسف ٹینگ ''علامہ اقبال کا اثر کشمیری شاعری پر''، مشمولہ ماہنامہ شیرازہ (اردو) جلد ۲۴ شمارہ ۴ ص ۱۲

۲۹۔...... محمد یوسف ٹینگ، علامہ اقبال کا کشمیری شاعری پر اثر' مشمولہ ماہنامہ 'شیرازہ' (اردو) جلد ۲۴۔ شمارہ ۴ صفحات ۱۲۔۱۳

۳۰۔......محمد یوسف ٹینگ۔علامہ اقبال کا اثر کشمیری شاعری پر۔ مشمولہ ماہنامہ شیرازہ (اردو) جلد ۲۴ شمارہ ۴ ص ۱۶

....................

غلام نبی خیال

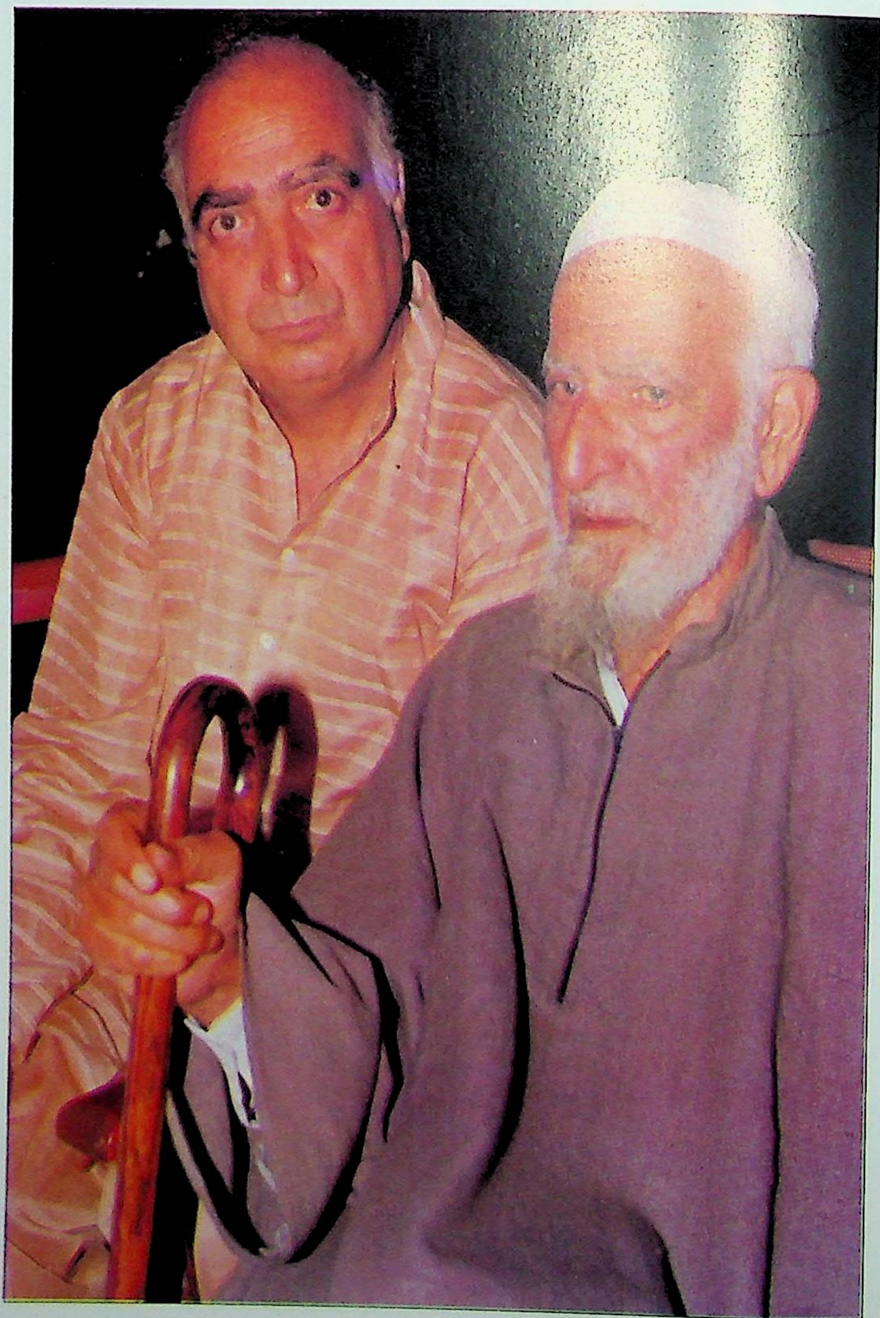
رُباعیاتِ نازکی

رُباعی شاعری کے اصناف میں ایک مشکل ترین صنف ہے جس میں اظہارِ خیال کی برجستگی کے لئے شاعر کو فنی باریک بینی اور شاعرانہ کمال فن سے کما حقہ، واقف ہونا چاہئے۔ ایک مختصر بحر کے چار مصرعوں پر مشتمل یہ صنف سخن ایک ہی رُباعی میں ایک ایسے جہانِ معنے کو سمو دینے کا تقاضا کرتی ہے جس کا خیال کئی صفحات پر پھیلی ہوئی ایک طویل نظم میں کیا جا سکتا ہے۔ لیکن رباعی میں مصرعوں کی پابندی اور وزن کی تنگ دامنی کے باوجود جو سخن گو اِس میدان میں کامیاب تجربے کا حوصلہ رکھتے ہوں وہی اس تنگ دامن مگر بے حد اثر کن شاعری کے زمرے میں اپنی فنی مہارت اور فکری نزاکت کے جلوے دکھاتے ہیں۔

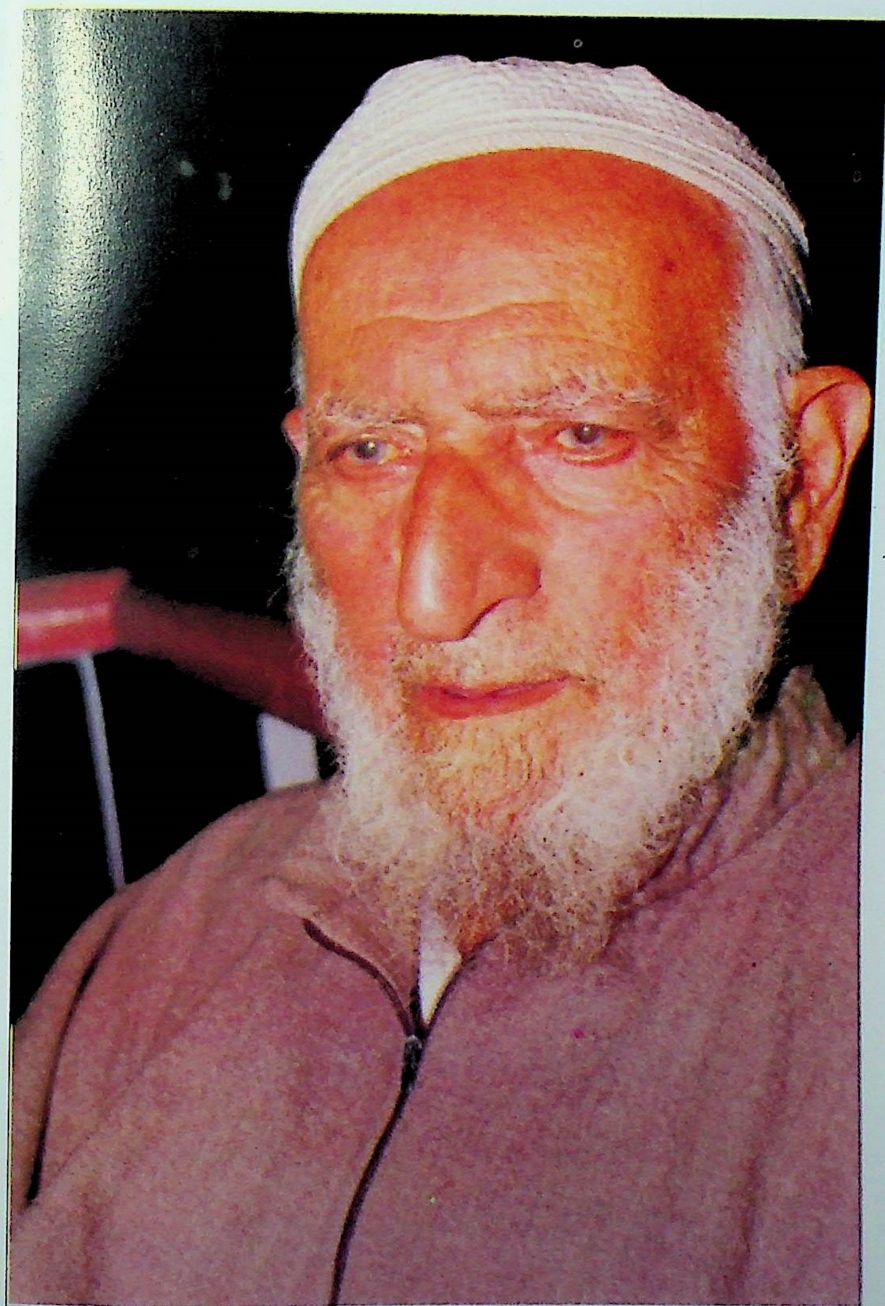
سید سلیمان ندوی نے رُباعی کے مقبولِ عام وزن کی دریافت کے بارے میں یہ واقعہ درج کیا ہے کہ۔ ''اہلِ ادب اور اہلِ تذکرہ جن کا خیال ہے کہ رُباعی اتفاقیہ ایجاد کا نتیجہ ہے اس کے متعلق ایک قصہ بیان کرتے ہیں کہ غزنین یا سجستان کے کسی شہر میں چند لڑکے گولی کھیل رہے تھے۔ ایک گولی لڑھکتی ہوئی سوراخ کے پاس آئی اس پر خوشی کے عالم میں ایک لڑکے





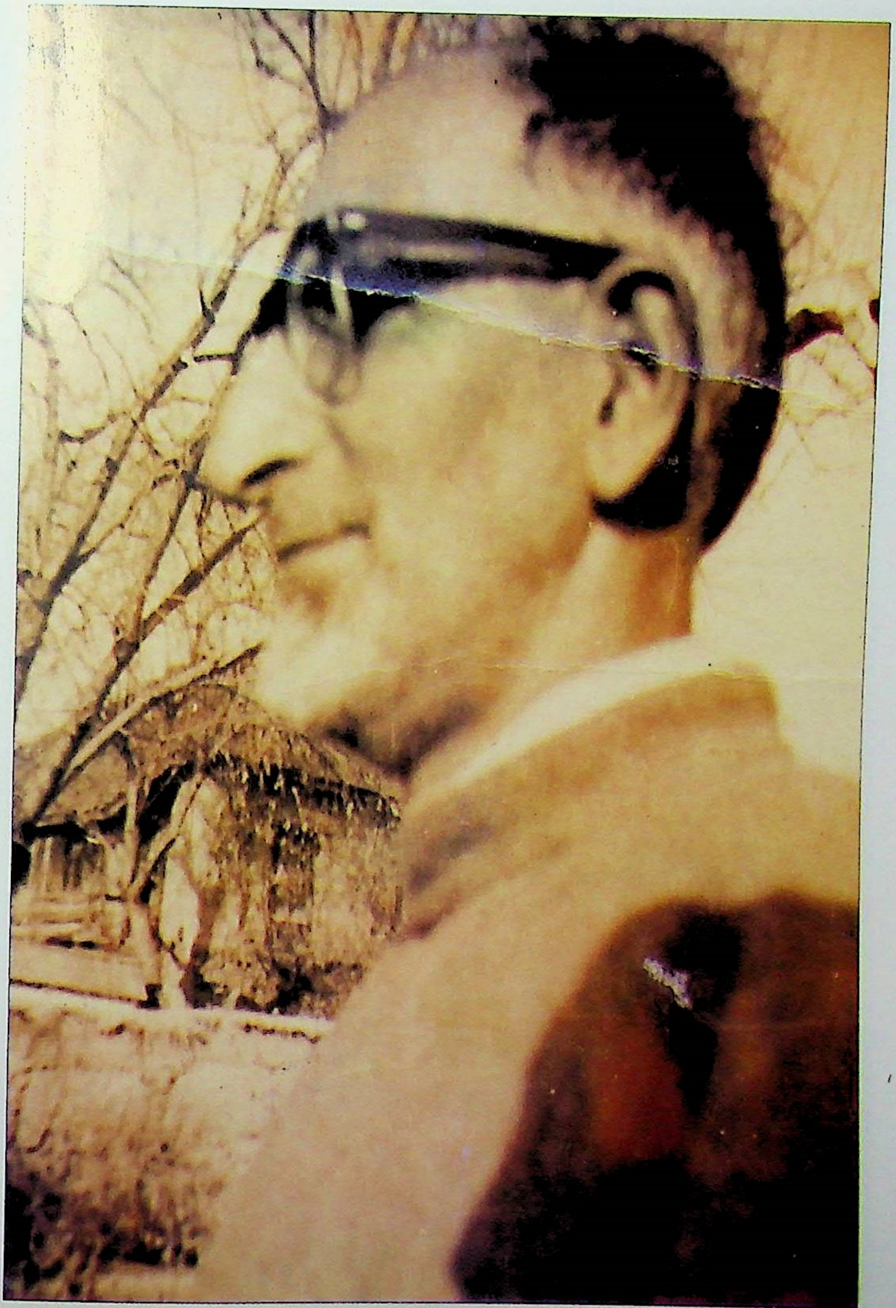


میر غلام رسول نازکی اور فاروق نازکی۔



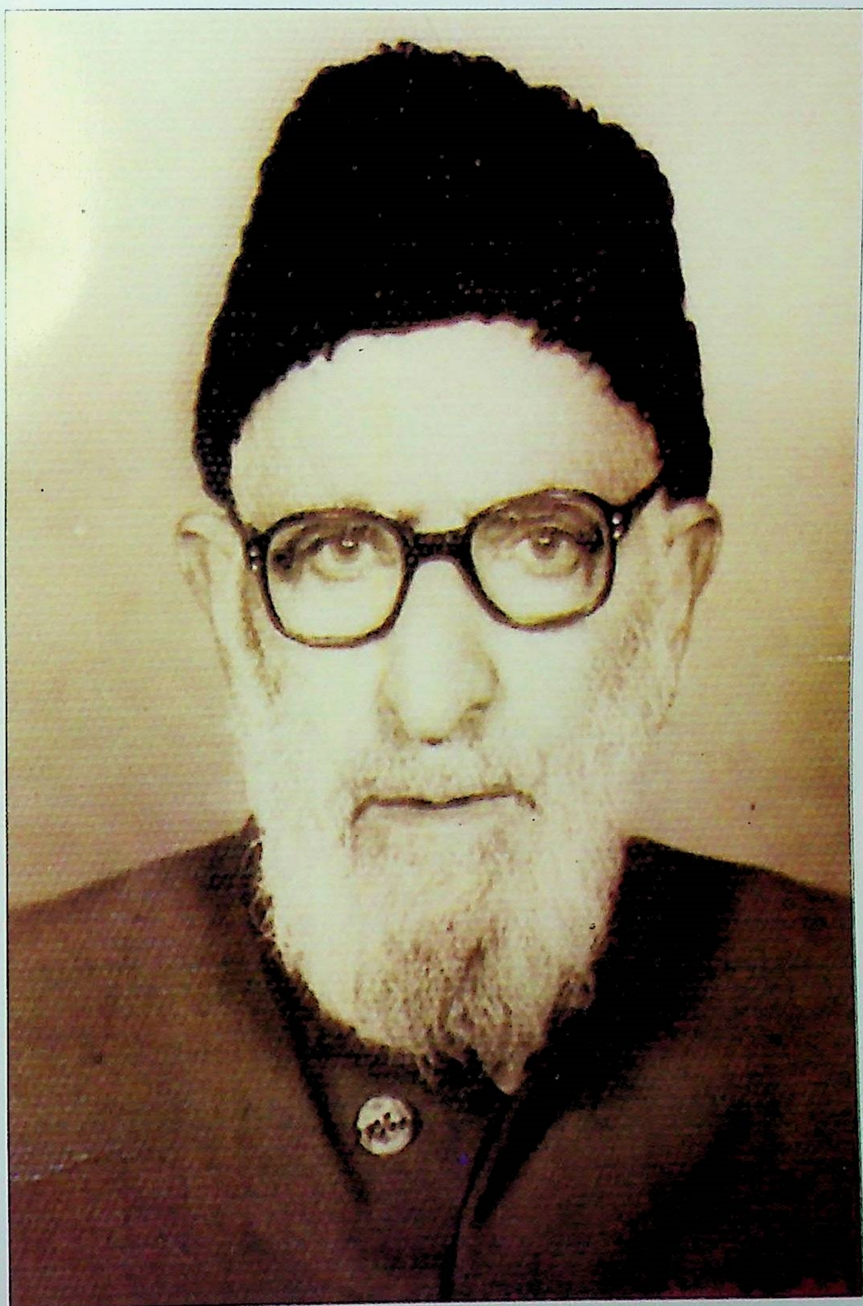


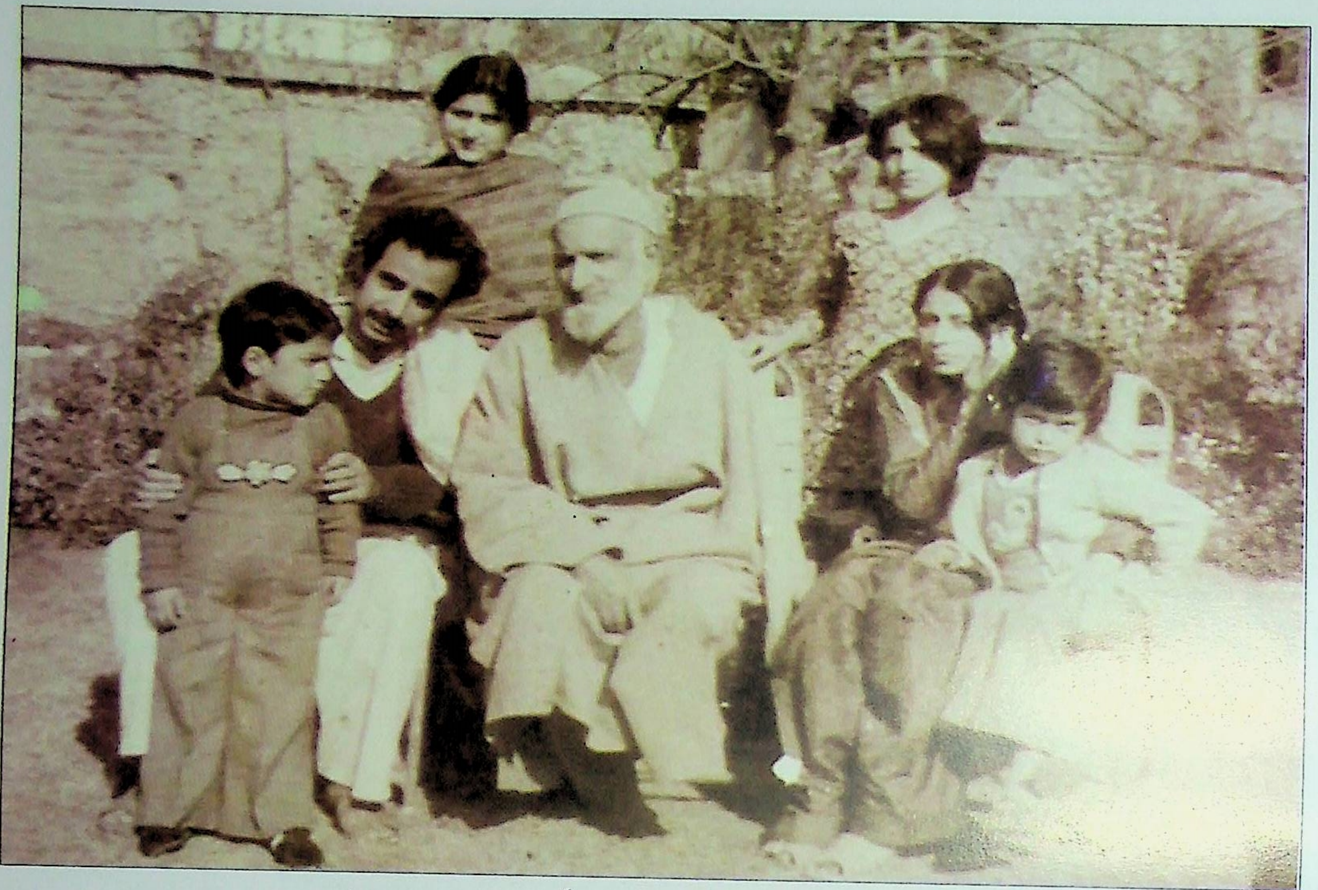
اپنے عزیز و اقارب کے ہمراہ۔



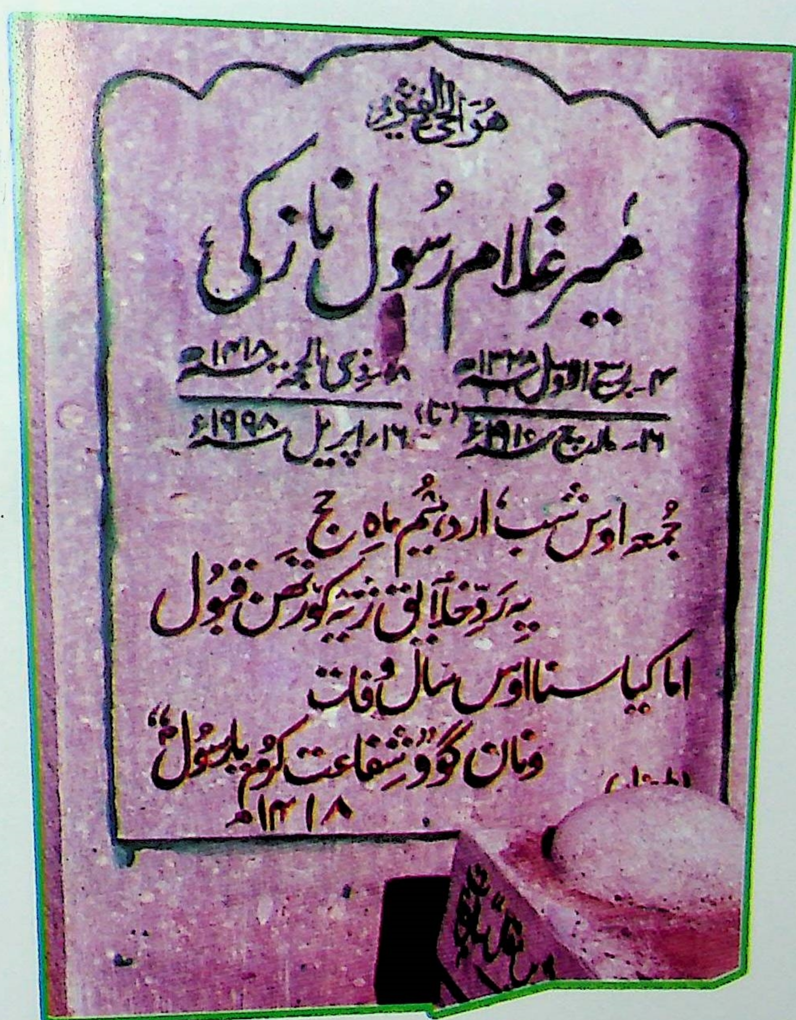


Running Commentary ۱۹۴۹ء۔ پنڈت نہرو کی آمد پر دریائی جلوس کی





میر غلام رسول نازکی، ایاز نازکی اور دیگر افرادِ خانہ۔

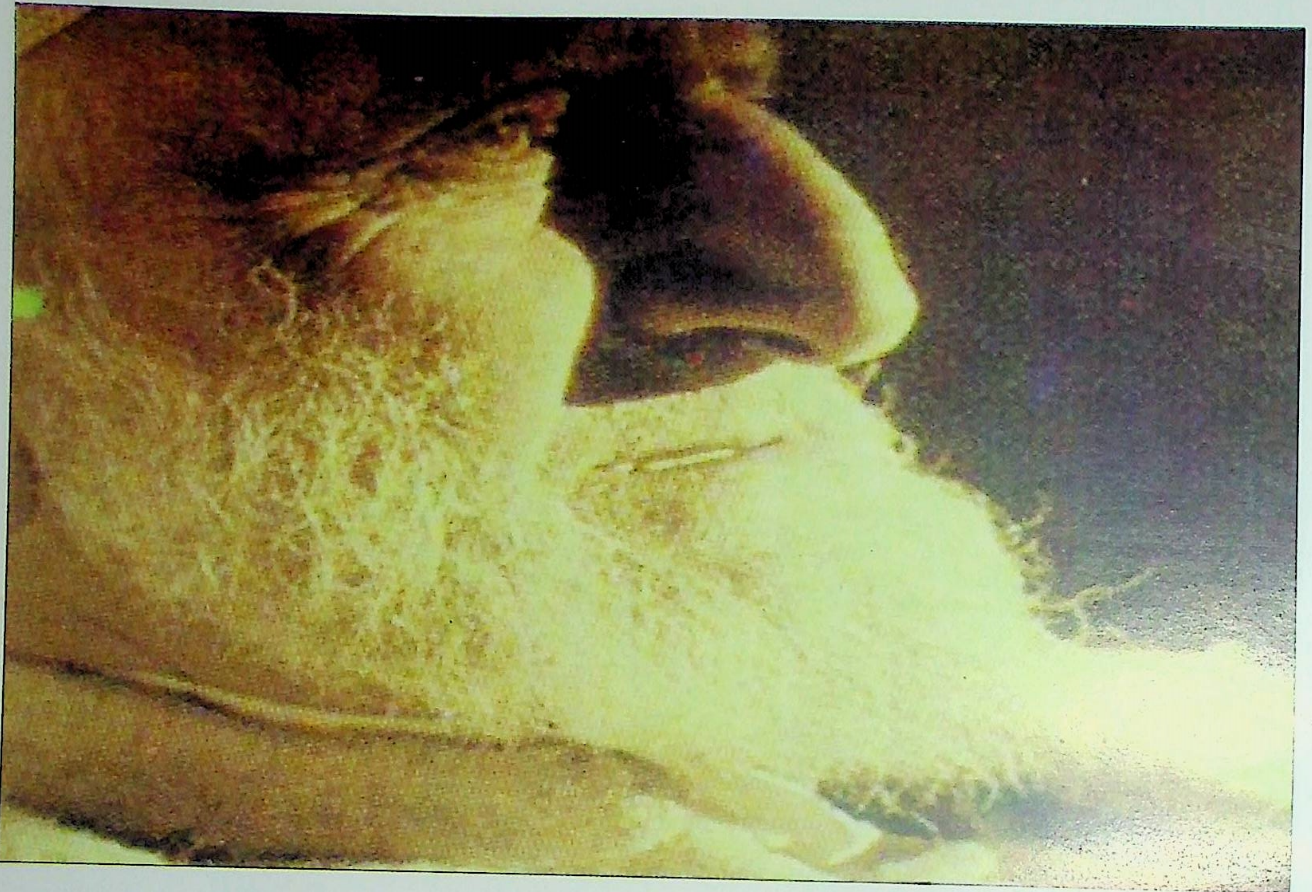


۴/ربیع الاول ۱۳۲۸ھ تا ۱۸/ذالحجہ ۱۴۱۸ھ بمطابق ۱۶/مارچ ۱۹۱۰ء تا ۱۶/اپریل ۱۹۸۹ء

جمعہ اوس شب اَردہُیم ماہِ حج — یہ رَدِ خلائق ژیۂ کوٗ رتھَن قبول

اما کیا سنا اوس سال وفات — ونان گوو "شِفاعت کرُم یارسولؐ"

(طبع زاد) — ۱۴۱۸ھ



مظفر علی کے رسالہ 'ہو' میں ناز کی صاحب کی تصویر۔



میر غلام رسول نازکی ۔ افرادِ کنبہ ایک یادگار تصویر

کاوِینہِ وول

میر غلام رسول نازکی

کاوِینہِ وول (کشمیری) کا سرورق۔

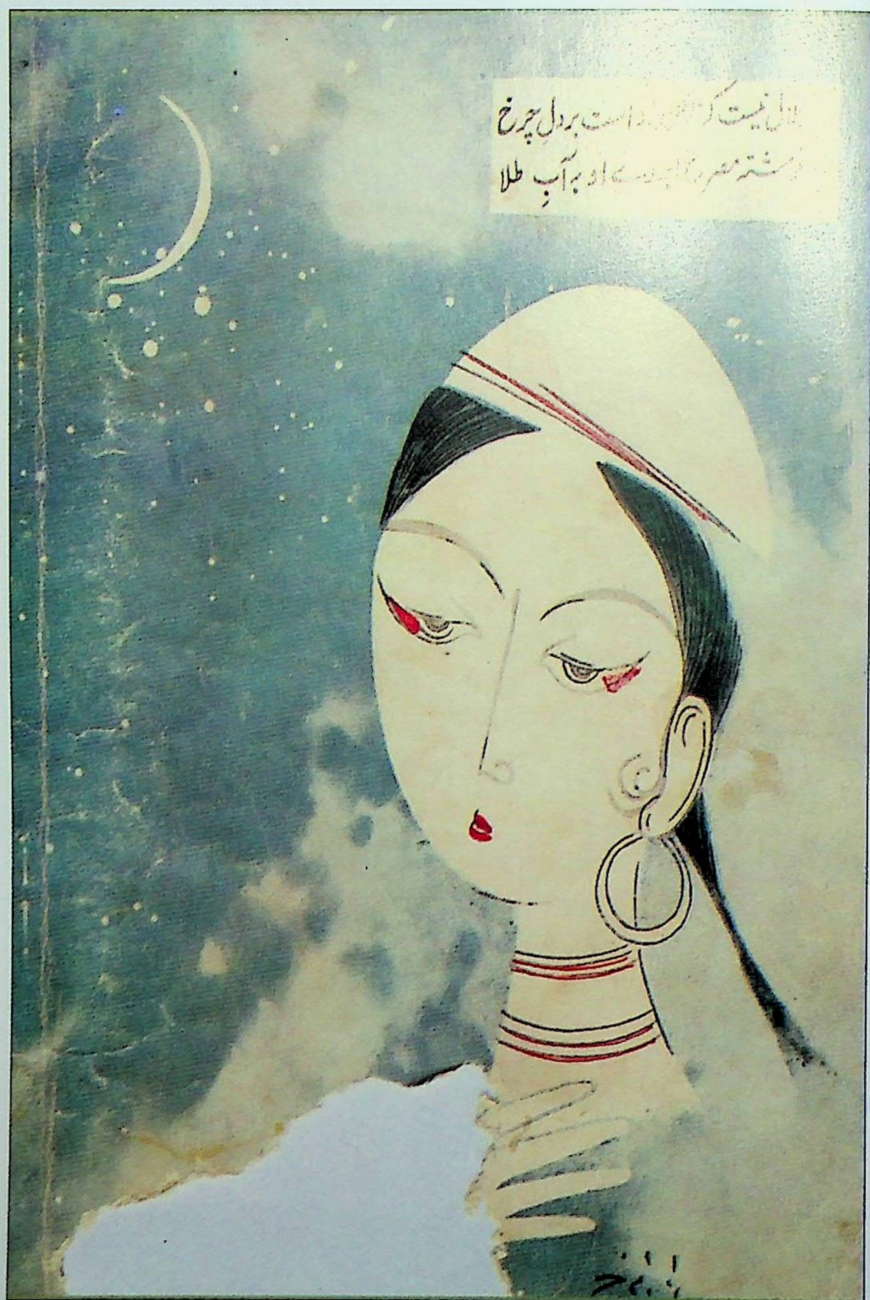
چراغِ راہ

عالم نمے از رشحۂ بحرِ کرمِ اوست
آدم کفِ خاکے زغبارِ قدمِ اوست



میر غلام رسول نازکی

چراغِ راہ کا سرورق۔



روح غنی کا بیک ٹائیٹل کور۔

متاعِ فقیر

میر غلام رسول نازکی

متاعِ فقیر کا ٹائیٹل صفحہ۔

کے منہ سے بے ساختہ نکلا:

غلتان غلتان ہمے رود تابنِ کو

اتفاق سے کوئی صاحب ذوق وہاں کھڑا تھا۔ اُس کو یہ وزن بہت پسند آیا۔ اُس نے اس کا وزن عروضی دریافت کیا اور پھر وہ اور شعراء میں مقبول ہو کر رواج پذیر ہو گیا۔

"تذکرہ دولت شاہ (تالیف ۸۹۲ھ) میں ہے کہ یہ بچہ صفاریہ خاندان کے بانی یعقوب مغازی المتوفی ۲۶۵ھ کا لڑکا تھا اور وہ صاحبِ ذوق خود یعقوب صفاد تھا جو کھڑا اپنے بچے کا تماشا دیکھ رہا تھا کہ دفعتہً بچے کی زبان سے یہ برجستہ مصرعہ نکلا۔ یعقوب کو یہ وزن بہت پسند آیا لیکن چونکہ اُس وقت تک یہ وزن شعراء میں مستعمل نہیں تھا اس لئے اُس نے ابودلف عجلی اور ابن الکعب کو، جو دربار کے شاعر تھے بُلوا کر پوچھا کہ یہ کون سی بحر ہے۔ انہوں نے تحقیق کر کے بتایا کہ یہ بحرِ ہزج کی ایک قسم ہے اور اس پر اسی وزن کے تین اور مصرعے لگا کر دو شعر پورے کر دیئے اور دو بیتی اس کا نام رکھا۔"

(۱)

چونکہ ندوی نے اس واقعہ کے محل وقوع کا ذکر نہیں کیا ہے لیکن گمان اغلب ہے کہ عربستان کے برعکس عجم میں رونما ہوا ہوگا کیونکہ بچے کے منہ سے جو مصرعہ نکلا وہ عربی میں نہیں بلکہ فارسی زبان میں ہے۔

رُباعی کے لئے جو کئی اوزان مقرر کئے گئے ہیں اُن سبھی کے لئے کشمیری زبان کی شاعرانہ دُنیا اجنبی سی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کشمیری شاعری کا اکثر و بیشتر حصہ یہاں کے مقامی رنگ میں ڈھل کر لوک رنگ کے گیتوں اور

نغموں سے آباد ہے۔

ہمارے یہاں جن شعراء نے رُباعی کے عام بحر لاحول ولا قوۃ اِلاّ باللہ میں طبع آزمائی کی بھی ہے وہ اس مختصر سے سلسلے کو ترسیل کے خوبصورت اظہار کا جامہ پہنانے میں ناکام ہی رہے ہیں۔ بعد میں اس صورتحال کی حقیقت کو تسلیم کیا گیا تو میر غلام رسولؔ نازکی نے ایک قابلِ قبول اور آسان بحر میں رُباعیات لکھنے کا آغاز کیا۔ اِس میں وہ اسطرح سے کامیاب ہوئے کہ آج نازکی صاحب کی کشمیری رباعیات اپنے معیار، حُسن اسلوب اور معنی آفرینی کی بدولت اُن کے سارے اُردو کلام پر حاوی ہیں جو انہوں نے ۱۹۵۳ء تک موزون کیا۔

اپنی رُباعیات کے اَوّلین مجموعہ ''نمرودنامہ'' کے پیشِ لفظ میں وہ لکھتے ہیں کہ ''اگست ۱۹۵۳ء تک میں نے کبھی کشمیری شاعری نہیں کی ہے۔ میں اُردو لکھتا تھا۔ اگست ۱۹۵۴ء میں مشاعروں اور کنونشنوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوا۔ مجھے سرکاری حیثیت میں ان میں شامل ہونا پڑتا تھا۔ ان مشاعروں میں اگرچہ چند خوش کلام کشمیری شاعر بھی اپنا کلام سُناتے تھے۔ مگر اکثر ایسے تھے جو معلوم نہیں کیا کہتے تھے اور جسے انہوں نے شاعری کا نام دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ انہی خودساختہ شاعروں نے مجھے کشمیری میں شاعری کرنے کی طرف مائل کیا۔'' (۲)

اور آگے چل کے علامہ اقبالؔ سے متاثر ہونے کے بارے اعتراف کرتے ہیں کہ ''میری شاعری میں اکثر خیالات حضرتِ اقبالؒ کے ہیں جن کا میں نے یا تو ترجمہ کیا ہے یا اُن سے استفادہ کیا ہے۔ میں اس میں کس حد

تک کامیاب ہوا ہوں اس کا فیصلہ آپ خود کریں گے"۔(۳)

میر غلام رسول نازکی نے ہم عصر کشمیر کے جن سیاسی اُدوار میں اپنا رُوئے سخن اُردو سے کشمیری کی طرف مبذول کیا وہ سبھی پُر آشوب۔ ہنگامہ خیز اور ایک باشعور سخن ور کے لئے محسوسات اور جذبات کے بھرپور اظہار کا پسِ منظر، پیش نظر میں لانے کے لئے بے ممد ثابت ہو سکتے تھے۔ نازکی صاحب نے ان تغیّرات کو محسوس کیا اور انہوں نے اپنی کشمیری شاعری میں اپنے ماحول کی عکاسی کرتے ہوئے کشمیری زبان کو قطعات اور رُباعیات کی شکل میں ایک بیش بہا سرمائے سے مالا مال کیا۔

نازکی صاحب اگرچہ عملی طور پر کشمیر کی ترقی پسند ادبی تحریک میں کبھی شامل نہیں ہوئے لیکن اُن کی رُباعیات میں اس خاص مکتبِ فکر کی ساری حسیت پوری طرح سے جلوہ گر ہے۔ وہ ایک نہایت ہی حسّاس سخن گو تھے اور اپنے ماحول میں پیدا شدہ یا پیدا کردہ کوائف کا گہرا مطالعہ کر کے انہوں نے ہر جذبات خیز عمل کے ردِ عمل کو اپنے فن کا جامہ پہنا کر کئی ترقی پسند شاعروں پر سبقت لے لی ہے۔ مثال کے طور پر اُن کی یہ رباعیات ترقی پسند شاعری کی بہترین مثالوں میں ایک اعلیٰ وارفع جگہ پانے کی مستحق قرار دی جا سکتی ہیں:

مَرنُ چھُنہ موت، اَدِ ہ؟ نُو زندگانی
سٹھاہ رژ زندگانی جاوِدانی
بڈس وُسواس ئلہِ ہےَ ہےَ مُرن چھم
بُڈس پزہِ جل مرُن، بتھہِ چھُس جوانی

(مرنا کوئی موت کا آنا نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسی نئی زندگی کی بشارت

ہے جو نیک ہے اور جاودانی ہے۔ پیرِ مرد خوف زدہ ہے کہ اُسے مرنا ہے۔ اُسے تو فوراً مر جانا چاہئے کیونکہ اُس کے سامنے جوانی اُس کا انتظار کر رہی ہے)

پکھن وِاشاہ کڈتھ وچھہ ہا تماشاہ
گرشہان چھُم دم یوان چھُم جیرہ وۍسیئے
سرن، مرگن، گرن، بالن تہ آرن
چھُہ اندی اندی گیرہ ۔کتھہٕ کنٕز نیرہ وۍسیئے

(اپنے پَر پھیلا کر میں تماشائے دہر دیکھنا چاہتا ہوں مگر میرا دم گھُٹ رہا ہے اور میں تنگ آ چکا ہوں کیونکہ میرے یہاں جھیلوں، مرغزاروں، گھروں، کوہساروں اور ندی نالوں پر پہرہ بٹھا دیا گیا ہے۔ میں باہر آؤں کیسے آؤں؟)

خداین چھُے ژیہہ استعداد دِیُتمت
مہ کر برباد شہہ فائترِ کتھن منز
غنیمت زان یمِ دوہ زین کینژہ ہاہ
پنُن تقدیر تھوَ پننن اَتھن منز

(خدا تعالیٰ نے تمہیں استعداد بخشی ہے۔ فضول کی باتوں میں اپنا وقت برباد مت کر۔ یہ چند روز غنیمت جان اور کچھ تو حاصل کر، اپنی تقدیر کو اپنے ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑ لے)

وَنداہ، شیناہ، سماواراہ، حماماہ
کونگاہ، ہٕری ساہ تہ توٗت نُنہ چایہ داماہ
علی شیخاہ، حسن صُوفیاہ، شیمیماہ
رسول میرنُ تہ مہجورُن کلاماہ

(زمستانی کے دن ہوں، برف ہو، سماوار ہو اور ایک حمام ہو، زعفران ملا ہوا ہریسہ کھانے کو اور گرما گرم نمکین چائے کی پیالی پینے کیلئے، علی محمد شیخ، غلام حسن صوفی اور شمیمہ دیو کا سنگیت اور رسول میر اور مہجور کا کلام ہو)

ترقی کرٔ، ترقی رُوز جارٔی

عوامس کیاہ گومُت تمِ کیازہ نالان

ؤنن ڈٔدون کرتھ موکلے یہ راتھی

چھہ از کل اَسی وٕں بونٕین مُول گالان

(ہم نے ترقی کی اور اس کی رفتار جاری رہی، معلوم نہیں کہ عوام پھر بھی نالاں کیوں ہیں۔ ہم نے تو جنگلوں کا پہلے ہی صفایا کر کے رکھ دیا اور آج کل ہم چناروں کی جڑیں تک کھوکھلی کرنے کے ترقی پذیر کام میں لگے ہیں)

ایک ترقی پسند شاعر قنوطیت یا رجائیت کے پیمانوں سے اپنے خیال کو ماپ کر اُسے بنے بنائے سانچوں میں نہیں ڈھال سکتا۔ ترقی پسندی زندگی کی صحیح اور حقیقی عکاسی ہے جس میں بعض اوقات دنیاوی حالات کا نوحہ یا زندگی سنوارنے کے ایک ایسے عزم کو فوقیت حاصل ہوتی ہے جس کے اظہار میں شاعر کو قنوطی لہجہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔

ہمارے ترقی پسند شاعروں نے گذشتہ نصف صدی میں جو کچھ لکھا اُس میں زندگی کے تلخ حقائق، معاشرہ کی بدحالی اور تنزل، انسانی اقدار کی پامالی اور زندہ رہنے کی تگ ودو میں بے حساب مصائب اور آلام کا رونا دھونا بھی شامل ہے جسے کسی بھی صورت میں حقیقت سے مفر یا نا اُمیدی کی لہروں میں بہہ جانا نہیں کہہ سکتے بلکہ یہ شاعری کشمیری زبان کے ہم عصر ادب کا سرمایہ افتخار کہلایا

جا سکتا ہے۔

''نمرودنامہ'' میں مندرج رُباعیات کو شاعر نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے جو انہوں نے بالترتیب ان شاعرانہ عنوانات کے تحت اس مجموعہ میں شامل کی ہیں (۱) داغِ جبین، حُبِ دنیا اور سوزِ دل (۲) عشق مدینہ۔ سینے کا جشنِ نوروز اور (۳) احوالِ زمانہ اور حکایاتِ دوستان۔

اوّلین حصّے میں عشق، شور و مستی، دُنیا کی بے ثباتی اور ایسے ہی دیگر متعلقہ موضوعات کی ناؔزکی صاحب نے رباعی کے آئینہ خانے میں سجا کر اسے گوناگو رنگوں سے آراستہ کیا ہے۔

چونکہ یہ مضمون عام طور پر اُردو دان طبقوں کے لئے قلم بند کیا جا رہا ہے لہٰذا ہم نے یہاں پر اُن کی منتخبہ رُباعیات اُردو میں نثری ترجمہ کرنے کی کوشش میں اُسے قارئین کے سامنے پیش کیا ہے جس میں غالباً خامیاں بھی رہ گئی ہوں لیکن اس حقیقت کے مدِ نظر کہ ترجمہ اور خاص طور شاعری کا ترجمہ ناممکن ہے۔ اُمید ہے کہ اس ترجمے کی بدولت ہر ایک کو ناؔزکی صاحب کے خیالات اور احساسات اور اُن کی عکاسی کے بارے میں کم از کم واقفیت تو ضرور حاصل ہوگی۔ مقامی تقاضوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے رُباعیات کا اصل متن بھی درج کیا جاتا ہے۔

نازکی صاحب کی رُباعیات کا انتخاب اس لئے اور بھی مشکل بن جاتا ہے کہ اُن کی تقریباً ہر رُباعی میں ایک پختہ مشق اور ماہرِ فن اُستاد کے قلم کی نوائے سروش سُنائی دیتی ہے لیکن مقالے کے غیر ضروری طور پر طویل ہونے کے خدشات نے اس انتخاب کو مختصر کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔

ہمارے خیال میں ان رُباعیات کی تشریح وتوضیح غیر ضروری ہے کیونکہ اس سے یہ گمان غالب ہو جاتا ہے کہ پڑھنے والے وضاحت کے طلبگار ہیں لیکن در حقیقت ایسا نہیں ہے اور وہ بھی اُس صورت میں جب اصل اور ترجمہ ساتھ ساتھ ہوں۔

غمن منز گیر اوُسس یاد پیوہم
پھیکو پیٹھہٕ بور زُن ترووُم کوٚڈم واش
ژُٹتھ زن درایہ اوبرس نارہ وُزمل
گُٹھِس زن ژاو برٕ ژری نوٕ اندری گاش

(غموں نے مجھے گھیر رکھا تھا کہ تم یاد آ گئے گویا کندھوں سے بوجھ اُتار کر میں نے دم سنبھالا، گویا کڑکتی بجلی بادلوں کا سینہ چاک کر کے باہر آ گئی اور گویا کمرے میں دروازوں کی دراڑوں سے روشنی اندر آ گئی ہے)

جُدائی ہندی شبن روٹ طول یِکھنا
غمو دِتی ہم دِلس منز مُول یِکھنا،
ژلہم گٹہ زوٚل غمکُ چشمن ییمِ گاش
اُچھر والوَچھہ کوٚزمُت زُول یِکھنا

(شبِ ہجران نے طول پکڑا ہے، اب تو آ، غموں نے دل میں جڑیں پکڑ لی ہیں، تو آ جا، اگر تم آؤ گے تو حُزن کا اندھیرا چھٹ کر میری آنکھوں میں روشنی آ جائے گی۔ میری پلکوں نے آنسوؤں کا چراغاں کیا ہے، اب تو آ جا)

بے ثباتی دُنیا اور موت کی اٹل حقیقت کو شاعر نے اس غم ناک لہجے میں بیان کیا ہے:

کتھاہ ژُجس وُئی صُبحکی ستارن

روپس چائنسِ ہلم عالَم چھہ دارن

مگریس چانہِ پتہٕ موتن قبر کھٔنز

سُہ کیاہ منگہِ دولتس ہارن تہ دَیارن

(ستارہ صبح نے صبح سے ہم کلام ہو کر کہا کہ تمہاری چاندی جیسی روشنی کو دنیا اپنے دامن میں بھر لیتی ہے۔ لیکن جو تمہاری آمد سے اس دنیا ہی سے اُٹھ گیا اُس کے لیے دولت اور امارت کس کام کی؟)

نازکی صاحب' بقولِ خود علامّہ اقبآل سے بھی بے حد متاثر تھے اور ہمیں اُن کی رباعیات میں کہیں کہیں شاعرِ مشرق کے فن کی جھلک واضح طور پر نظر آتی ہے۔

شبکُ گٹہٕ کارد یُتھتم زُول کوٚرمسَ

لُہم بے کار کنزاہ پیالہ گوٚرمسَ

کرَہم چائنسِ زمینس مالہ پوشن

ستن طرفن وتن الماس جوٚرمس

یہ رُباعی اقبآل کے اس مختصر فن پارہ کے توارد سے ہی موزُون ہوئی ہے۔

تو شب آفریدی چراغ آفریدم

سفال آفریدی ایاغ آفریدم

بیابان و کہسار وراغ آفریدی

خیابان و گلزار و باغ آفریدم

من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم

من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

اس نوع کے تقابلی مطالعہ کی غرض یہاں پر کلام اقبال کے ساتھ ناز کی صاحب کی اُن چند رباعیات کو بھی درج کیا جا سکتا ہے جن میں اثر پذیری کا یہ محسوساتی عمل نظر آتا ہے لیکن فی الحال اسی ایک مثال پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

کران چھکُ تی یہ پانس خوش کران چھے

ستم گر چھکُ دو ہے اوسے نہ بوزُن

مرُن اوس سہل پانُس تام ماچھُم؟

بہ مجبوری پہوان چھم زندہ روزنُ (نازکی)

//☆☆//

خداوندا ترے یہ سادہ دل بندے کدھر جائیں

یہاں مرنے کی پابندی، وہاں جینے کی پابندی (اقبال)

اسی طرح نازکی صاحب نے اپنے کلام میں عمر خیام کو جس طرح سے واضح طور پر اپنے فکر کے سانچے میں ڈھالا ہے وہ اُن کی رباعیات میں اقبال سے بھی زیادہ نمایاں ہے۔

//☆☆//

سِتارَو زُونہِ ووٚن وُچھ سائیٔ محفل

ژ یہ کیاہ گوے کیازہ چھک رُوزِتھ ژہ تنہا

دوشاہ ترأوتھِ گرن نظراہ تہ ووتکھ

گوژھُم اکھ محرماہ یَس راز وَنہ ہا! (نازکی)

اسرارِ جہاں چناں کہ در دفترِ ماست
گفتن نتواں زانکہ وبالِ سرِ ماست
چوں نیست دریں مردمِ ناداں اہلے
گفتن نتواں ہر آنچہ در خاطرِ ماست (خیامؔ)

//☆☆//

یہ کتھ سرہ کرنہ باپتھ چھس کران پاپ
گناہ چھامیٔ نی غالب کنہٕ کرم چون؟ (نازکیؔ)

//☆☆//

صد سال بہ امتحان گنہ خواہم کرد
تا جرمِ من است بیش یا رحمتِ تو؟ (خیامؔ)

//☆☆//

سبٹھاہ سوٗنچم گُنے ووتس نہ، رووسُ
بہ کتہٕ پیٹھ آس کوت گژھہ کس چُھہ معلوم (نازکیؔ)
مے خور کہ ندانی زکجا آمدۂ
خوشباش ندانی کہ کجا خواہی رفت (خیامؔ)

//☆☆//

پتولاکن یہ دنیاہ تےَ امیکُ رنگ
ژھوٗرُے دھوکاہ فریباہ حسرتھاہ بس
~~اماننتہٕ کیا سنا حالات آسن؟~~
یہِ ان چُھنہ تورہ کانہہ پھیرتھ بہ پرژھہ ہس (نازکیؔ)

افسوس کہ سرمایہ زکف بیروں شدُ
وزدستِ اجل بسے جگر ہا خوُن شدُ
کس نا آمدازاں جہاں کہ تا پرُسم ازو
کاحوالِ مسافرانِ عالم چوں شدُ؟ (خیّام)

//☆☆//

اگر حاصل کرُن چھُے کینہہ تہِ کرأزی
پگاہ موکلکھ تہ سورُے سازوسامان
جوانی، زندگی، شہرت تہ فُرصت
یہ سورُے سپدِہ خاکس ستیٖ یکسان (نازکی)

//☆☆//

ازدفترِ عُمر پاک مے باید شد
وزدست اجل ہلاک مے باید شد
اے ساقی مہہ لقا تو خوش خوش مارا
آبے دردہ کہ خاک مے باید شد (خیّام)

//☆☆//

دوہا بَنہِ فان گرٛھہِ یتھ کارخانس
زمین پھٹہِ سم سۆتُر گرٛھہِ آسمانس
سمندر مندنہ ییٚن ٹھولہ ٹھول کرن بال
دِنن گرٛھہِ ترٛٹھ زنٛتھ اژہِ لامکانس (نازکی)

//☆☆//

روزے کہ شود اِذَالسَّماءُ انشقّت
واں دم کہ بودَ اذَالنجّومُ انکدرَت
من دامنِ تو بگیرم اندر عرصات
گوئم منما بایِّ ذَنبِ قُتِلتَ ؟ (خیام)

''آوازِ دوست'' نازکی صاحب کا دوسرا مجموعہ رباعیات ہے جو ۱۹۸۵ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اس کے دیباچے میں شاعر اپنی رُباعی گوئی کے بارے میں کہتا ہے۔ ''میں رُباعی ارادتاً نہیں لکھتا ہوں۔ ایک جذبہ اُبھرتا ہے، ایک خیال جنم لیتا ہے، چوتھا مصرعہ موزون ہو جاتا ہے اور اُس سے پہلے تین اور مصرعے جوڑے جاتے ہیں۔'' (۴)

اس مجموعہ میں نازکی صاحب نے مُلا محمد توفیق کشمیری کی اس فارسی رباعی کا ترجمہ بھی شامل کیا ہے۔ اصل رباعی یہ ہے۔

بروز حشر آلہا چو نامۂ عملم
کنند باز کہ آں روز دادخواہ من است
بکن مقابلہ او بہ سر نوشتِ ازل
اگر زیادہ کمی ہست آں گناہِ من است

اور نازکی صاحب کا ترجمہ یوں ہے:

ازل نامس تہٖ بیہٕ اعمال نامس
مقابلہ کرِکی زِہ تی چھم مُدعا بس
اگر تتھ منز کمی بیش ژِ یہ باسی
تہِ لکھ عأشاہ کرتھِ میأنِس حسابس

نازکی صاحب نے اپنے آس پاس رونما ہونے والے ہر ایسے واقعہ سے تاثر قبول کیا ہے، جس نے اُن کے ضمیر، فکر اور ادراک کو جھنجھوڑا ہو، ہم عصر زمانے کے تکلیف دہ کوائف اور اعمال کو انھوں نے اس رُباعی میں قلم بند کیا ہے۔

//☆☆//

چُھہ بأیس بوے یارس یارزاگان
مُریدس پیر، پیرس دٔیار زاگان
عوامس منتخب سرکار زاگان
أکس دٲنٕس زٕہ ہتھ بیمار زاگان

(بھائی بھائی کی تاک میں لگا ہے۔ اور دوست دوست کے پیچھے پڑا ہے۔ پیر اپنے مُرید کی ٹوہ میں ہے اور پیر کے پیچھے اُس کا مال لگا ہوا ہے۔ منتخب حکومت عوام کے خلاف سرگرمِ عمل ہے اور یہ ایک انار اور صد بیمار والی بات ہے)

نیم خواند، مُلّاوں اور پیروں فقیروں کے کالے کرتوت اس رباعی میں فاش کئے گئے ہیں:

دُچھتھ صاحبِ دلن سپدان چھہ افسوس
ملٕن ہُند لُوٹھ پیرن ہُند تھپلٕی ہُوس
دِلٕن ہندی خانقاہ وأران پیٚمٕتی
مشیدن سنگِ مرمر، جار، فانوس

(اہلِ دل یہ دیکھ کر غمگین ہیں کہ مُلّاوں نے لُوٹ مچا رکھی ہے اور پیروں نے ہر شے پر جھپٹنا اپنا شعار بنالیا ہے۔ افسوس کہ دلوں کی خانقاہ ہیں

ویران ہیں اور مسجدوں کو سنگِ مرمر اور فانوسوں اور جھالروں سے سجایا جاتا ہے)

ہم عصر دورِ ناہنجار کے ان تکلیف دہ حالات و واقعات کی مایوسی کے عالم سے نکل کر جب نازکی صاحب اپنے کشمیر کی حسین تصویر کو نظروں کے سامنے لاتے ہیں تو اُن کا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے اور وہ مقامی سخن گو شخصیات کو فارسی دُنیا کے سرکردہ شاعروں کے مقابلے میں ایک بلند مقام بخشنے میں خوشی اور مسرّت محسوس کرتے ہیں:

وطن میونُے جہانس منز چھہ نامی
چھہ یتی کی میرِ تے محمود گامی
چھہ اَکی سیٖ نادمس منز جمع گامتی
عراقی، انوری، جامی، نظامی

(میرا وطن ساری دُنیا میں نامور ہے، اسی سرزمین نے رسول میر اور محمود گامی کو جنم دیا ہے اور میرے اسی کشمیر کا ایک عبدالاحد نادم، عراقی، انوری، جامی اور نظامی کے ہم پلہ ہے)

ایک دو مقامات پر نازکی صاحب کے خیال میں تکرار موجود ہے جو قاری کی توجہ فوراً اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ غالباً اُنہیں یہ خیال نہیں آیا ہو گا کہ جس مضمون کی رباعی وہ موزون کر رہے ہیں اُسی موضوع کو انہوں نے پہلے بھی کسی اور وقت قلم بند کیا ہے۔ مثلاً:

جوانی، مال وزر، اولاد، واہ واہ
لُکن ہُند یُن گرٛھن، ناماوری، جاہ
پھٹِم سأری پوٗتلی الحمدُ للہ
بصدقِ دل پوٗرُم آمنتُ باللہ (آوازِ دوست۔ ص ۱۲)

///☆☆☆///

تعلق، مال و دولت، حشمت و زر

زن و فرزند، خیر اندیش، بدخواہ

زضرب لَآ الٰہِ پوتلہن ژ کرژینۍ

دلس تلقین کر آمنتُ باِاللہ

(آوازِ دوست۔ ص ۱۶)

اسی طرح اُن کے ایک اور مجموعہ ''کوؤں کی برات'' میں بھی کم از کم یہ تکرار نظر آتی ہے:

پزر گوییی زہِ دشمن چھے نہ دُشمن

تسند ہ شرہ چھُے پبوان اکثر خدایاد

کران چھُکھ دوستن سیتی یار بأشی!

گژھان چھُے غفلتس منز وقت برباد

(کووں کو برات۔ ص ۶۹)

☆

کفیلاہِ چھُم نہ کانہہ جُز حقِ تعالےٰ

وسیلا چھم نہ جُز یاسین والصّاد

خدایا میونِ دشمن زندہ تھاوُن

تسندِ ہ شرہَ چھم پبوان اکثر خدایاد

''آوازِ دوست'' میں ایک رباعی کا مصرعِ اوّلین وزن سے گرا ہوا ہے۔ ناز کی صاحب جیسے ماہر عروض و علوم کے بارے میں ہرگز یہ خیال ذہن میں نہیں آسکتا

کہ وہ بحر و وزن کے سلسلے میں کسی بھی غفلت کے مرتکب ہو سکتے ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ مصرعہ رواروی میں کاتب نے نقل کیا ہے لیکن اس تصنیف کے مرتّب کو اس کا خیال رکھنا چاہئے تھا۔ مصرعہ یوں ہے:

دپان مخدوم صاٲبن وون میرزٕ صاٲبس

یہ مصرعہ اس شکل میں موزون کہلایا جا سکتا ہے:

یہ وون مخدوم صاٲبن میرزٕ صاٲبس

"کاوہ ینہٕ وول" یعنے کوّوں کی برات (۱۹۹۶ء) میر غلام رسول نازکی کا آخری مجموعہ رُباعیات ہے جس کے پیش لفظ میں انہوں نے خود یہ پیش گوئی کی تھی کہ۔ "اندازہ یہی ہے کہ یہ مجموعہ کلام میرا آخری مجموعہ ہوگا۔ اگر چہ اس بارے میں کسی کو کچھ علم نہیں مگر ظاہری حالات کی بنا پر اندازہ یہی ہے کہ غالباً مجھے اب اتنی مہلت نصیب نہ ہو سکے کہ میں اور کچھ لکھ سکوں۔" (۵)

"کوؤں کی برات" کے نفس مضمون کے بارے میں شاعر اس کی نشان دہی مختصراً یوں کرتا ہے۔ "اس کتاب میں زیادہ تر دُنیا کی بے ثباتی اور فکر آخرت کے مضامین غالب ہیں۔ ہمارے پرانے صوفی شعراء نے اس دنیا کو ایک سسرال سے اور دوسری دنیا یعنے آخرت کو میکے سے تعبیر کیا ہے۔ مولوی رومؒ نے اسے نَے کا نام دیا ہے۔ جسے نیستان سے کاٹ کر یہاں لایا گیا اور جس کا دل بے قرار ہے کہ میں واپس اَپنے نیستان میں جاؤں جہاں سے مجھے جدا کر کے یہاں پہنچایا گیا۔ میں گرفتار عذاب ہوں اور مجھے گونا گوں آفتوں نے گھیرا ہے۔" (۶)

نازکی کا دل عشقِ محمدیؐ سے ہمیشہ سرشار رہا ہے جس کا اظہار وہ ہر موقعہ کی مُناسبت سے نظم و نثر دونوں میں بیان کرتے ہیں۔ اس عشقِ جاودانی کا دل نشین

عکس اور تصویرِ دل کش ہمیں اُن کی اُن رُباعیات میں جلوۂ صدرنگ لے کے نظر آتی ہے جو اُن کی نعتیہ رباعیات ہیں اور جو غالباً بشدّتِ تاثر، اشتیاقِ عقیدت اور جذبۂ محبت میں عبدالاحد نادم کے بغیر اور کسی شاعر میں اپنی نظیر نہیں رکھتی ہیں۔ اس مضمون کی تکمیل ادھوری رہے گی اگر اس میں نازکی صاحب کی ایسی ہی چند رُباعیات کو تبرکاً شامل نہ کیا جائے۔

سحروقتن پُھلےٲلجمۍ چھہ گوشن
چھہ سنگر مالہ طورکی پأٹھی روشن
دلنِ منز یا محمدؐ پوشہ ٹورٕن
زیوٚن پیٹھ یارسولؐ اللہ چُھہ پوشن

وقت سحر ہے اور ہر گوشے میں پھول ہی پھول کھلے ہیں۔ پہاڑوں کی چوٹیاں کوہِ طور کی طرح روشن ہیں۔ اس عالم میں کلیوں کے دلوں میں یا محمدؐ کا ورد ہے اور گلوں میں زبان پر یا رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا دُرود ہے۔

محمدؐ بے کسن ہُند کس محمدؐ
دلکُ آرام رُوحکُ رس محمدؐ
نجاتچ چھے کنُی وتھ رٕژھ ییٚہے وتھ
محمدؐ بس محمدؐ بس محمدؐ

(بے کسوں کی دستگیری کرنے والا محمدؐ ہے۔ محمدؐ آرام جاں اور رُوح کا سُرور ہے۔ نجات کا بس یہی واحد راستہ ہے اور تو بھی اسی پر گامزن ہو جا، اور وہ راستہ ہے محمدؐ، محمدؐ اور بس محمدؐ)

بہ سُنہٕ پوشن ژٕیہٕ کرہ ہے مالہٕ پکھنا

بہ برہ ہے لولہ کی مس پیالہٕ پکھنا

اَچھن ہُند گاش وَندہ ہے لالہٕ پکھنا

مَدینکہِ ٹاٹھہِ ساتھا سالہٕ پکھنا

(میں تمہارے لئے پھولوں کے ہارُ بنوں، میں تمہارے لئے شراب معرفت کے پیالے بھر کے رکھوں، میرے معشوق میری آنکھوں کی روشنی تم پر قربان، اے محبوب مدینہ، میری دعوت پر میرے ہاں پَل بھر کے لئےتو آ)

نظر کرٕتھم تہٕ زٕن پیوٚو تاپھ شینس

گُلن نوی ہَرتہ نوٕ کُلی کھتی زمینس

اَکی پرٕدہ آم زن دون عالمن سونتھ

بہ وندہ ہے دین وٕ دُنیا اتھ جبینس

(تم نے مجھ پر نظر ڈالی گویا برف پر دُھوپ پھیل گئی۔ شاخوں سے نئی کونپلیں پھوٹ پڑیں اور زمین سے نئے درخت اُگنے لگے۔ تمہارے ایک ہی جلوے نے میرے دین و دُنیا کو بہار سے ہم کنار کر دیا۔ میں اپنا سب کچھ تمہاری جبین پر وار کے یہاں اور وہاں بھی سرشار ہو جاؤں)

ناؔزکی صاحب کی رباعیات میں جو دیگر اکابرینِ سخن کے اثرات کہیں کہیں ملتے ہیں اُس کے باوجود وہ اپنے انفرادی اسلوب اور ترسیلِ تجربہ کو قائم رکھتے ہوئے اپنے کمالِ فن کا مسلسل مظاہرہ کرتے ہیں۔ انہوں نے اور بھی کئی اساتذہ اور صحائف سے اثر پذیری قبول کرنے کا خود اعتراف کر لیا ہے جن میں سرِفہرست کلام اللہ اور حدیثِ پاک ہیں اور ان کے علاوہ اس حوالے سے مولانا رومیؔ، بیدلؔ، فیضیؔ، مرزا

صائب، سعدی، ابن یمین، نظامی اور غنی کشمیری کے ساتھ ساتھ مولانا حالی اور داغ دہلوی کا اثر بھی جہاں جہاں نازکی صاحب کی رباعیات میں موجود ہے وہاں انہوں نے اس کی طرف واضح طور پر اشارہ کیا ہے۔

میر غلام رسول نازکی بھی ایک ایسے عاشق تھے جس کی عام فہم زبان میں کوئی تشریح نہیں کی جاسکتی، یہ عشق، عشقِ خدا بھی تھا۔ اس میں عقیدتِ رسول بھی غالب تھی، اور اس کے علاوہ انہوں نے اپنی مادرِ وطن کشمیر، اپنی زندگی اور اس کی رعنائیوں اور جلوہ سامانیوں سے بھی محبت کی ہے۔ اگرچہ وہ دُنیا کو "وانگج وور" یعنے کرایہ کا گھر ہی سمجھتے رہے۔

یہ عشق نازکی صاحب جیسے اُستاد شاعر کے دل پر کاری ضربیں بھی لگاتا ہے اور زمستان کی کڑاکے کی سردی میں چنار کے پتوں سے تپتی ہوئی آگ کی حدّت اور حرارت بھی بخشتا ہے اور اسی عشقِ لایزال کے دیوانوں کے بارے میں بُلبُلِ شیراز نے کہا ہے۔

هرگز نه میرد آں که دلش زنده شد به عشق
ثبت است بر جریدهٔ عالم دوام ما

حوالہ جات

(۱) خیام، سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین اکیڈمی، اعظم گڈھ، یوپی ص ۲۲۸۔۲۲۷

(۲) نمرودنامہ، کوہِ نور پرنٹنگ پریس سرینگر، ۱۹۶۴ء ص ۷

(۳) ایضاً۔ ص ۸

(۴) آواز دوست، فوٹو لیتھو ورکس۔ دہلی۔ ۱۹۸۵۔ ص ۳

(۵) کاوہ یئہِ وول، تابش پبلی کیشنز سرینگر۔ ۱۹۹۶ء۔ ص ۸۔۷ (۶) ایضاً۔ ص ۸

ڈاکٹر اعجاز محمد شیخ / تنویر احمد

نازکی صاحب: ایک اُسلوبیاتی مطالعہ

(" آوازِ دوست" کے حوالے سے)

میر غلام رسول نازکی کشمیری اور زبان کے ایک مایہ ناز شاعر گذرے ہیں۔ کشمیری زبان میں اپنے جوہر دکھانے سے پہلے وہ اردو میں بھی اپنا لوہا منوا چکے تھے اور بعد میں کشمیری میں بھی اپنی اہمیت منوالی اور آوازِ دوست، نمرود نامہ اور کاوِ پنہِ وول کی صورت میں اِس زبان میں اپنے پیچھے ایک بیش قیمت خزانہ چھوڑ گئے۔

اسلوبیات میں کسی فن پارے کا تجزیہ لسانی نقطۂ نظر سے کیا جاتا ہے اور فن پارے میں موجود لسانی خصائص کی شناخت کی جاتی ہے جس سے شاعر یا قلمکار کے اسلوب کی نشانہ ہی ہوتی ہے۔ یہاں یہ بات زیرِ نظر رہنی چاہیئے کہ ہر شاعر یا قلمکار کا اپنا اپنا اسلوب ہوتا ہے جو اُسکو باقی قلمکاروں سے ممتاز بنا دیتا ہے۔ یہ اسلوبی خصائص زبان کی مختلف سطحوں مثلاً صوتی، صرفی، نحوی، وغیرہ پر پائے جاتے ہیں۔ زیرِ نظر مضمون میر غلام رسول نازکی کی کتاب " آوازِ دوست"

کو اسلوبیاتی نقطۂ نگاہ سے دیکھنے کی ایک ادنیٰ کوشش ہے۔ اِس میں مختلف لِسانی سطحوں پر اُنکی شاعری کے ممتاز اسلوبیاتی خصائص کی نشانہ ہی کی کوشش کی جائے گی۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ مذکورہ کتاب رُباعیوں پر مشتمل (آٹھ غزلوں کو چھوڑ کر) ہے۔

ادبی زبان، بالخصوص شاعری ، میں خیالات کے اظہار (Expression) کو کلیدی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ ہر ادیب اور شاعر کے پاس زبان کے یکساں وسائل موجود ہوتے ہیں اور یہ بات کہ شاعر کیسے اُن وسائل کو بروئے کار لاتا ہے اُسکے اسلوب کو ایک نہج فراہم کرتا ہے۔ نازکی صاحب نے کشمیر زبان کے صوتی ،صرفی ،نحوی و لفظی وسائل کو بڑے موٗثر انداز میں استعمال کر کے اپنے خیالات کو لِسانی جامہ پہنایا ہے۔ اِسوجہ سے اُنکی شاعری میں ہر لِسانی سطح کے اسلوبیاتی خصائص پائے جاتے ہیں جو کہ اُنکی شاعری کو بہت ہی پُر کیف اور مسحور کُن بنا دیئے ہیں۔

قافیہ بندی (Rhyming) رُباعی کی ایک اہم خصوصیت ہے اور اِس کے پُر اثر استعمال سے نہ صرف رُباعی کی موسیقیت دوبالا ہوتی ہے بلکہ شاعر کی فنّی مہارت کا بھی ثبوت مِلتا ہے۔ زیرِ نظر کتاب کی رُباعیوں کو اُٹھا کر دیکھیئے، نازکی کی فنکاری اپنے عروج پر مِلتی ہے۔

غزل جوراہ پَرِو دُنیا چھُ فأنی
کتھا باتھاہ کرِو دُنیا چھُ فأنی
کرِو کیٛژن دوہَن ہنگامہٕ برپا
پتو لاگن مرِو دُنیا چھُ فأنی

رُباعیوں کی کثیر تعداد میں اندرونی قافیہ بندی بھی دیکھنے کو مِلتی ہے جس میں دو (یا زیادہ) لفظوں کے اجزا میں صوتی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ مِثال کے طور پر درج ذیل رُباعی کو دیکھیں:

گندَکھ ڈُبِی آسہِ ترٛہن ساسَن تہٕ شیٖتن
ترٛہَن ساسَن کرَن داہ زٕنی رٔتَس ناس
ترقی ہُند یہِ عالَم ولتہِ جَلدٕے
عوامُ الناس یِیٚلہِ ساسَن کرَن ڈاس

اوپر دی گئی مِثال میں الفاظ اندرونی قافیہ بندی کی واضح مِثال ہیں۔ رُباعی کی اندرونی قافیہ بندی اِن لفظوں کی صوتی ساخت کی یکسانیت سے وجود میں آئی ہے۔ پہلی لائن میں 'ساسَن' اور 'شیٖتن' دونوں الفاظ 'CVCV' صورت رُکنی ساخت (Syllabic Structure) کے حامل ہیں (یہاں پر C = مصمتہ اور V = مصوتہ آوازوں کو ظاہر کرتے ہیں)۔ اِسی طرح دوسری اور آخری لائنوں میں 'ساسن' اور 'کرن' الفاظ میں بھی یہی صوتی ساخت پائی جاتی ہے۔ دوسری اور چوتھی لائنوں میں 'ناس' اور 'ڈاس' لفظوں کی صوت رُکنی ساخت 'CVC' ہے۔ ان الفاظ میں صوت رُکنی یکسانیت کی وجہ سے پوری رُباعی میں موسیقیت اور خوش آوازی (Evphony) عروج پر پہنچ گئی ہے۔

تجنیسِ صوتی (Alliteration) نازکی کی شاعری کی ایک اور اہم اسلوبیاتی خاصیت ہے۔ اِس میں دو (یا زیادہ) الفاظ کے ایک (یا زیادہ) اجزا الفاظ کے شروع آخر یا درمیان میں ایک جیسے ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر اوپر دی گئی رُباعی میں 'ساسن'، 'شیٖتن'، اور 'ترٛہن' اور 'کرَن' میں سب الفاظ کے آخر

میں 'اَن' صوت رُکن (Syllable) پایا جاتا ہے۔

اِس سلسلے میں ایک اور مِثال ملاحظہ فرمائیں:

سٔرِتھ سَکھرِتھ پَریشانٔی چھُ خانٛدر
گٔرِتھ کرٛأوِتھ پشیمانٔی چھُ خانٛدر

جیسا کہ واضح ہے اس میں 'سٔرِتھ'، 'سَکھرِتھ'، 'گٔرِتھ' اور 'کرٛأوِتھ' الفاظ 'اِتھ' پر ختم ہوتے ہیں۔

'آوازِ دوست' صوتی تجنیس کی ایسی مِثالوں سے بھری پڑی ہے۔ صوتی تجنیس کے استعمال سے نازکیؔ کی شاعری میں صوتی آہنگ اور موسیقیت پیدا ہوتی ہے۔

صوتی آہنگ پیدا کرنے کیلئے نازکیؔ نے اپنی شاعری میں مصوتی تکرار (Assonance) اور مصمتی تکرار (Consonance) کا بھی خاطر خواہ استعمال کیا ہے۔ اوّل الذکر میں االفاظ کے شروع یا آخر یا درمیان میں ایک ہی مصوتے (Vowel) کا استعمال ہوتا ہے اور مؤخر الذکر میں ایسی صورت میں ایک ہی مصمتے کا استعمال ہوتا ہے۔

مثلاً: درج ذیل شعر میں /س/ کی تکرار سے بہت ہی دِلکش صوتی آہنگ اُبھرتا ہے:

دوہَس روٗتل تہٕ صبحَس شام زاگان
سوٗنس سَرتل تہٕ سَرتلہٕ ترٛام زاگان

اس شعر کے پہلے مصرعے میں 'دوہَس' اور 'صبحَس' کے آخر میں اور دوسرے مصرعے میں 'سوٗنس'، 'سَرتل' اور 'سَرتلہٕ' کے ابتدا میں اس /س/ کی

تکرار پائی جاتی ہے۔

اِسی طرح درج ذیل مصرعے کو لیجئے:

تُرُن تاپھاہ وُشُن واواہ چھُ دُنیا

مذکورہ مصرعہ میں مصمتی تکرار کا بہت ہی اعلیٰ استعمال پایا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ چھوٹا سا مصرعہ اپنے اندر کچھ اور اسلوبی خصائص سموئے ہوئے ہے۔ جو اسکو فنّی اور اسلوبی اعتبار سے بے نظیر بنادیتے ہیں۔ مذکورہ مصرعہ میں 'تُرُن' اور 'تاپھاہ' کے ابتدا میں /ت/، 'وُشُن' اور 'واواہ' اس ابتدا میں /و/ اور 'تُرُن'، 'وُشُن' کے آخر میں /ن/ کے تکرار اور 'تاپھاہ' اور 'واواہ' کے آخر میں /ہ/ کے تکرار سے مصمتی تکرار کا خوبصورت استعمال ہُوا ہے۔ اِسی طرح مذکورہ مصرعہ میں 'تُرُن'، 'وُشُن'، 'چھُ' اور 'دُنیا' میں / ُ / کا استعمال مصوتی تکرار کی نمایاں مِثال۔ اِس کے علاوہ اِس مصرعے میں موجود فقرے 'تُرُن تاپھاہ، اور وُشُن واواہ' متوازیت (Parallelism) کی ایک بھی عمدہ مثال ہیں جن میں 'صفت ۔ اسم' ساخت کا دو مرتبہ مکّرر استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ واضح ہے 'تُرُن تاپھاہ' اور 'وُشُن واواہ' کے پہلے الفاظ (تُرُن اور وُشُن) صفت اور آخری الفاظ (تاپھاہ اور واواہ) اسم ہیں۔ اسی کے علاوہ 'تُرُن تاپھاہ، اور وُشُن واواہ، میں قولِ محال (Paradox) کا بھی اچھا استعمال ہوا ہے۔

غوری سطح پر ساختی متوازیت (Constructional Parallelism) نازکی کی شاعری میں اکثر دیکھنے کو مِلتی ہے۔ ساختی متوازیت میں دو یا دو سے زیادہ جُملے یا جُملے کے قریب الواقع اجزا 'مثلاً فقرے' ترکیب وغیرہ نحوی ساخت کے اعتبار سے متوازی (parallel) ہوتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہہ

سکتے ہیں کہ ان اجزا میں نحوی مماثلت یا مطابقت پائی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر نازکی کی درج ذیل رُباعی کو لیجیے:

سٔرِتھ سَکھرِتھ پَریشائنی چھُ خانٛدر
کٔرِتھ کرٛ اۆتھ پَشیمائنی چھُ خانٛدر
وَنان چھِس خانۂ آبادی و لیکن
عظیم الشان وٲرٲنی چھُ خانٛدر

اِس رُباعی کے پہلے دو مصرعوں میں متوازیت بالکل ظاہر ہے دونوں مصرعے پانچ پانچ الفاظ پر مشتمل ہیں اور دونوں میں ایک ہی جُزِ کلام (Part of Speech) سے تعلق رکھنے والے الفاظ یکساں ترتیب میں پائے جاتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر دونوں کی نحوی ساخت ایک جیسی ہے جو کہ یوں ہے:

فعل + فعل (ماضی) + اسم + امدادی فعل + اسم

اِس کے علاوہ دونوں مصرعوں میں صوتیاتی ساخت کے اعتبار سے بھی متوازیت پائی جاتی ہے۔ دونوں مصرعوں میں شامل الفاظ (ایک دوسرے کے مدِ مقابل) میں صوتیموں کی یکسان تعداد پائی جاتی ہے ('سٔرِتھ' اور 'کرٛ اۆتھ' میں معمولی فرق کو چھوڑ کر) اور ان صوتیموں کی صوت رُکنی ساخت (Syllabic Structure) بھی ایک جیسی ہے۔ یہ صوتی متوازیت صوتیمی ساخت کی بُنیاد پر یوں دکھائی جاسکتی ہے:

س ٕ ر ِ ت ھ س َ ک ھ ِ ت ھ پ َ ر ے ش ٲ ن ع
چ ھ ُ خ ان د َ ر ک ٕ ر ِ ت ھ ک ر اۆ ِ ت ھ

پ َ ش ے م اُ ن ی   چ ھ ُ   خ اں د ر

اِس کے علاوہ رُباعی کے پہلے، دوسرے ار چوتھے مصرعوں میں معنیاتی سطح (Semantic Level) پر بھی ایک ہی معنیاتی دائرے (Semantic Field) سے تعلق رکھنے والے الفاظ یعنی 'پریشانی'، 'پشیمانی' اور 'وأرأنی' کواستعمال کر کے پوری رُباعی میں معنیاتی پیوستگی (Coherence) اور لِسانیاتی ربط (Cohesion) اُجاگر کیا گیا ہے۔

عکسِ ترتیب (Inversion) کی اسلوبی خصوصیت بھی زیرِ نظر کتاب میں دیکھنے کو مِلتی ہے۔ عکسِ ترتیب میں الفاظ کی جگہ تبدیل کر کے ان کو ایک دوسرے کی جگہ پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک رُباعی کے نیچے دِیئے گئے دو مصرعوں میں اِس خصوصیت کا بہت ہی اچھا استعمال ہُوا ہے:

چھُ گامَن شہر ، شہرَن گام زاگان

عوامَن خاص، خاصَن عام زاگان

جیسا کہ واضح ہے پہلے مصرعے میں 'گام' اور 'شہر' اور دوسرے میں 'عام' اور 'خاص' لفظوں کی جگہ تبدیل کر کے عکسِ ترتیب کا بھرپور استعمال ہُوا ہے۔ اِسکے علاوہ یہ الفاظ معنوی لحاظ سے ایک دوسرے کے متضاد بھی ہیں جو کہ عکسِ ترتیب سے پیدا کردہ معنوی تاثیر کو دوبالا کر دیتا ہے۔

'آوازِ دوست' میں مبالغہ یا اغراق (Hyperbole) کا بھی اچھا خاصا استعمال ہُوا ہے۔ اِس اسلوبی تکنیک میں حقائق کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے۔ مِثال کے طور پر ایک رُباعی کے درج ذیل مصرعے کو لیجیے:

أ رکس دانس زِ ہتھ بیمار زاگان

نازکی اس تکنیک کو سماج کے مختلف پہلوؤں پر تنقید کرنے کے لئے بھی استعمال کرتا ہے۔ نیچے دی گئی رُباعیوں میں اس تکنیک کے ذریعہ سے نہ صرف سماجی خوشحالی کے دوش دبدوش ' روپے کی کمیت میں کمی' (Devaluation of Currency) کو اُجاگر کیا گیا ہے بلکہ بدلتے سماجی منظر نامہ کو بھی بڑے لطیف پیرایہ میں تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے:

ترقی ہُنڈ یوہے رفتار اگر روٗد
یہِ ساٲرے زِندگی بَنہِ اَکھ مذاکھاہ
دوہا بَنہِ روپیہِ ساس ہِن زِ کسی پوٗتی
لچھس روپیں سُواں آسَن پوشاکھاہ



گندَکھ ڈٲلِ آسہِ ترہن ساسَن تہٕ شیتھن
ترٕہن ساسَن کرَن داہ زٲنی رتھس ناس
ترقی ہُنڈ یہِ عالَم واتہِ جَلدٕے
عوامُ الناس ییٚلہٕ ساسَن کرَن ڈاس

اِسی طرح شاعر نے مجازِ مرسل (Antonomasia) کو بھی بڑے فنکارانہ انداز میں استعمال کیا ہے جس میں کہ ایک اِسم کو پورے گروہ پر منطبق کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر نیچے دیئے گئے مصرعے میں 'سُقراط' اور 'مسیح' کو دانشوروں اور متقی علماء کیلئے استعمال کیا گیا ہے:

مسیحن پھاٗنسی سُقراطن دِیتکھ زہَر

توقع کے مطابق آواز دوست میں استعاروں کا بھی کثیر استعمال ہوا

ہے۔ نازکی اِس تکنیک کو سماج پر تنقید کیلئے بھی جا بہ جا استعمال کرتا دِکھائی دیتا ہے۔ مندرجہ ذیل مِثالیں ملاحظہ ہوں:

چھ بولان گانٹہٕ گربد بُلبُل چھِ خاموش
دٕ تُر سَگو کھ ہُرتھ ہیٚپ زعفران پوش



پَنٕنہٕ کَنہٕ یَبرِ بیول اوسُم ہٕے دۄ دمُت
خبر کیاہ گوٚو زٕمینس اورِ کھرٕ سوے

کسی ادیب یا شاعر کے اسلوب میں اس کے لفظی انتخاب کو کلیدی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ لغوی یا لفظیاتی سطح (Lexical Level) پر دیکھا جائے تو 'آوازِ دوست' میں لفظوں کی ایک کثیر تعداد ایسی مِلتی ہے جو عربی اور فارسی زبانوں سے کشمیری میں آئے ہیں۔ اِسکے علاوہ بہت سی قرآنی ترکیبوں کا بھی براہِ راست استعمال ہُوا ہے۔ مثلاً وَجہتُ وَجہی، فاعفُ عنا اِن نَسِینا، حَسبُنا اللہ، رَبُنا اللہ، عزیزٌ ذوانتِقام، وغیرہ اِسی طرح پیغمبر اسلام کے علاوہ مختلف اسلامی مفکروں اور فلسفیوں جیسے ابنِ جوزی، جلال الدین رومی، فخر الدین رازی' وغیرہ کے نام بھی آوازِ دوست میں مِلتے ہیں۔ نازکی کے لفظی انتخاب (Lexical choice) کے پیچھے اُن کی اسلامی فکر و فلسفہ سے گہری وابستگی، قرآن و حدیث سے غیر معمولی شغف اور اخذ واستفادہ اور عربی و فارسی زبانوں پر اُن کے عبور جیسے عوامل کارفرما ہیں۔

کُلی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ 'آوازِ دوست' میں نازکی کی فنکاری اپنے عروج پر ہے اور اِس میں شامل رُباعیاں مختلف اسلوبیاتی خصائص سے مزیّن

ہیں۔ ہمیں یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ اِس چھوٹے مضمون میں نازکی صاحب کی شاعری کا مُکمل اسلوبیاتی تجزیہ ممکن نہیں ہے۔ تاہم زیرِ نظر کتاب کی روشنی میں اُنکی شاعری کے کچھ اہم لِسانی خصائص کی نِشاندہی کی گئی ہے اور اُمید ہے کہ مستقبل میں اُنکی شاعری کے مُکمل تجزیہ میں یہ اسلوبیاتی جائزہ ممدو معاون ثابت ہوگا۔

کتابیات

۱۔ برائٹ،

۲۔ بیگ، مرزا خلیل احمد۔ ۱۹۸۳ء۔ زبان، اسلوب اور اسلوبیات۔ علی گڑھ: ادارۂ زبان و اسلوب۔

۳۔ بیگ، مرزا خلیل احمد۔ ۲۰۰۵ء تنقید اور اسلوبیاتی تنقید۔ علی گڑھ: شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مُسلم یونیورسٹی۔

۴۔ خان، مسعود حسین۔ ۱۹۶۶ء۔ شعر و زبان۔ حیدر آباد: شعبۂ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی۔

۵۔ چیپ مین، ریمنڈ۔ ۱۹۷۳ء۔ لنگوسٹکس اینڈ لٹریچر: این انٹروڈکشن ٹو لٹریری سٹائیلسٹکس۔ لندن: ایڈ واڈ آرنلڈ لمیٹیڈ۔

۶۔ شیخ، اعجاز محمد۔ ۲۰۰۸ء۔ اسلوبیاتی تنقید۔ مشمول شیرازہ۔ جلد ۴۱، شمارہ ۱-۳

۷۔ شیخ، اعجاز محمد۔ اسلوب تا اسلوبیات۔ مشمول انہار۔ جلد ۳۲، شمارہ ۱

۸۔ فریمین، ڈی۔سی (ایڈیٹر)۔ ۱۹۷۰ء۔ لنگوسٹکس اینڈ لٹریری سٹائل۔ نیویارک: رین ہارٹ اینڈ ونسٹن

۹۔ ملک، نذیر احمد۔ ۱۹۹۴ء۔ کشمیری سرمایۂ الفاظ کے سرچشمے۔ سرینگر: بک میڈیا۔

۱۰۔ نارنگ، گوپی چند۔ ۱۹۸۹ء۔ ادبی تنقید اور اسلوبیات، نئی دہلی: ایجوکیشنل بک ہاؤس۔

۱۱۔ وِڈوسن، ایچ جی۔ ۱۹۷۵ء۔ سٹائیلسٹکس اینڈ دی ٹیچنگ آف لٹریچر۔ لندن: لانگمین۔

..........☆☆☆..........

ڈاکٹر نکہت نذر

شاعرِ فطرت......غلام رسول نازکی

غلام رسول نازکی وادی کشمیر کے کہنہ مشق شاعروں میں صفِ اوّل میں شمار کئے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنے شعری اظہار کیلئے نہ صرف غزل کا سہارا لیا بلکہ قطعات، نظم، رباعی، نعت اور مرثیہ میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور ہر صنف میں قابلِ قدر سرمائیے کا اضافہ کیا ہے۔

نازکی صاحب کی غزل کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ وہ اپنی غزل روایتی حسن و عشق کے موضوع تک محدود نہیں رکھتے بلکہ داخلی اور خارجی واردات و مشاہدات کے ساتھ ساتھ سیاسی، سماجی، قومی، مذہبی اور اقتصادی مسائل کو بھی خوبصورتی سے برتتے ہیں۔ وہ اپنی شاعری کے ذریعے حیات و کائنات اور رموزِ فطرت کا عمیق مشاہدہ کرتے ہیں۔ انہوں نے زندگی کے نشیب و فراز سے جو سبق حاصل کئے ان کی شاعری ان کا عکس پیش کرتی ہے۔ وہ زندگی کی تلخیاں اور الجھنیں سہتے ہوئے حوصلہ مند نظر آتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں اس عہد کے حقیقی پرتو ملتے ہیں جس میں انکا شعری ذوق پروان چڑھا۔ ان کی غزل میں انقلاب، جدوجہد، عمل اور ارادے کی پختگی کے ساتھ ساتھ فطرت نگاری کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔ اگرچہ نازکی صاحب کی شاعری کا اہم موضوع غم رہا

ہے لیکن فطری حسن کی عکاسی ان کا دوسرا اہم موضوع ہے۔ ہر کوئی حسّاس انسان قدرت کے حسن سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اردو کے تقریباً ہر شاعر نے اپنی شاعری کے ذریعے فطری حُسن کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے۔ نازکی نے تو مناظر قدرت سے گہری وابستگی کا بھرپور اظہار کیا ہے۔ وہ کشمیر اور اس کے لازوال حُسن کے شیدائی کے رُوپ میں نظر آتے ہیں۔ ان کے کلام کا جائزہ لیا جائے تو وہ مناظرِ قدرت کی رنگارنگی میں ڈوبے قدرت کے ساتھ اٹکھیلیاں کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

اُردو میں فطری حُسن سے وابستہ شاعری کا رواج اگرچہ پہلے بھی تھا لیکن اسے ایک مخصوص نہج انگریزی شاعری سے ملی۔ جس میں شیلے، بائرن، کیٹس، ورڈس ورتھ اور کالرج نے Romantic Poetry کا آغاز کیا۔ اردو میں ۱۸۷۴ء میں حالؔی اور آزاد نے باقاعدہ ایک تحریک کی صورت میں ایسی شاعری کی داغ بیل ڈالی جو مناظرِ قدرت پر مبنی تھی۔ انہوں نے Romantic Poetry کے بجائے اس کا نام Natural Poetry رکھ دیا اور حُسن و عشق اور گل و بُلبل کی روایتی ڈگر سے ہٹ کر انہیں نئے موضوعات سے روشناس کیا۔ انہوں نے ہندوستان کے ارضی، نباتاتی، حیوانی اور جماداتی غرض ہر طرح کے مناظر پر لکھ کر اردو شاعری کو مناظرِ قدرت کا نباض بنا دیا۔ نظیؔر، حالؔی اور آزاد کے علاوہ سرور جہاں آبادی، چکبسؔت، جوشؔ اور اقباؔل نے مناظر قدرت کو اپنا موضوع بنایا اور اردو شاعری کو ان گنت علامتیں عطا کیں۔ اقبال نے چاند، ابر، ستارہ، بزمِ انجم، ابر کہسار، ہمالہ، لالہ، جگنو، اختر صبح وغیرہ علامتوں کے استعمال سے حسن فطرت کے عاشق ہونے کے ثبوت فراہم کئے۔ وہ حُسنِ فطرت کی وساطت سے انسانی جذبات واحساسات کا نقشہ کھینچنے میں کامیاب

ہوئے جس سے ان کی شاعری کی فلسفیانہ اہمیت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

قومی سطح پر تو یہ شاعروں کا عزیز ترین موضوع رہا ہے۔ جہاں تک کشمیر کے اردو شعراء کا تعلق ہے ان سب کے ہاں فطرت کی جلوہ طرازیاں ملتی ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ کشمیر میں رہتے ہوئے ان کو مناظرِ فطرت سے قربت حاصل تھی۔ جس کے نتیجے میں انہوں نے بہت ہی والہانہ انداز میں کشمیر کے پہاڑوں، کوہساروں، جھرنوں، جھیلوں، سبزہ زاروں اور آبشاروں کا ذکر اپنی شاعری میں کیا ہے۔ چنار تو کشمیری شعراء کیلئے ایک علامت بن گیا ہے۔ لیکن نازکی چنار کی جگہ شمشاد، سرو وصنوبر کے درختوں سے زیادہ متاثر دکھائی دیتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

از بسکہ چمن زاروں میں پلا، صحرا میں اُگا، جنگل میں بڑھا

اس قد کے برابر سرو سہی، شمشاد وصنوبر ہو نہ سکا [1]

کوئی بھی شاعر، ادیب یا فن کار اپنے گرد و پیش سے اثر پذیر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ نازکی صاحب نے اپنی عمر کے بہترین سال کشمیر کی سرسبز گل پوش وادیوں میں گزارے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں قدم قدم پر فطرت کی عکاسی ملتی ہے۔ ان کی شاعری کو کشمیر کے سرسبز کھیتوں، بہتی جھیلوں، برفانی چوٹیوں، زعفران زاروں اور سایہ دار چناروں سے بہت کچھ ملا ہے۔ جس سے ان کی شاعری میں رنگینی اور شادابی نظر آتی ہے۔

غ، م، طاؤس اس سلسلے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ناکام جوانی اور نامراد زندگی کے ماتم کے ساتھ ساتھ شاعر کا حسّاس دل گرد و پیش کے حسین و جمیل مرقعوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ فطرت کے میزبان کی انوکھی نوازشات گاہے گاہے روتے رلاتے مہمان کو اپنی طرف کھینچ ہی لیتی ہے۔" [2]

اس فطری کشش کے نتیجے میں نازکی کشمیر کی خوبصورت جھیل مانسبل کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچتے ہیں:

؎ اک سہانی چاندنی رات اور مانسبل کی جھیل
حُسن کی چُپ چاپ دُنیا' خلد کا عکسِ جمیل
دور تا حدِ نظر سرسوں کے کھیتوں کی قطار
آرزو کا سلسلہ لا انتہا فرصت قلیل[۳]

نازکی نے اس رجحان سے بھی اکتسابِ فیض کیا ہے۔

؎ چاند کی کرنوں سے دنیا حُسن کا گہوارہ ہے
پَر توِ مہتاب ہے یا نورُ کا فوارہ ہے[۴]

مندرجہ بالا کلام کے نمونے اس بات کا انکشاف کرتے ہیں کہ نازکی کشمیر اور اس کے لازوال حُسن کے شیدائی ہیں اور وہ ایک رومانی حقیقت نگار کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ مانسبل کی خوبصورت جھیل میں نازکی کو جنّت کا عکس نظر آتا ہے۔ ان کے ہاں ایسی آرزومندی کا احساس ملتا ہے: جس کا سلسلہ کبھی نہ ختم ہونے والا ہے۔ شاعران دل فریب اور دلکش نظاروں کو دیکھنے کیلئے وقت کی کمی محسوس کرتا ہے۔

درجِ ذیل بند میں جس خوبصورتی سے رات کے حسن کی عکاسی، حسین تشبیہات اور استعارات کی مدد سے کی گئی ہے وہ نازکی کا ہی حصہ ہے۔

؎ یہ سُکوں پَرور سکوں آموز رات
یہ حیات آگیں، حیات افروز رات
چاند جھومر کہکشاں ہے حلق بند
اور خال چہرہ نو روز رات[۵]

اور اس بند میں تو چاندنی رات کی خاموشی میں نہایا ہوا خوبصورت منظر اپنی مخمور اداؤں سے شاعر کا دل کھینچ لیتا ہے۔

ے یہ شبِ مہتاب یہ پانی سے مالا مال جھیل
دامنِ کہسار کا جھرنا، عدیلِ سلسبیل
ہر اُدا مخمور، ہر جانب سکوں، ہر سُو سکوت
ہر پہاڑی طور، ہر منظر حسیں، ہر شے جمیل [۶]

ناز کی عاشقانہ مزاج کے مالک ہیں۔ ان کے ہاں جذبات کی کارفرمائی کے ساتھ ہی ساتھ اس کا وفور بھی ہے۔ ان کے ہاں جذبۂ عشق کی سطح بہت بلند ہے۔ ان کے کلام میں جس جمالیاتی فضا کا احساس ہوتا ہے اسے وہ حسن و عشق کے امتزاج سے تخلیق کرتے ہیں۔

ے مرے نغموں کی موسیقار تم ہو
مرا دیپک، مرا ملہار تم ہو
میں فواروں میں کرلوں گا چراغاں
کہ میری شام شالا مار تم ہو [۷]

ناز کی صاحب کو اپنی وطن سے بے حد محبت ہے۔ ان کی تمام شاعری میں کشمیری ثقافت کی ایک جیتی جاگتی تصویر ملتی ہے۔ ان کو کشمیر کی ہر شے خوبصورت نظر آتی ہے۔

ے مرے کشمیر کی ہر شے حسیں ہے
یہاں کی ہر پہاڑی نازنیں ہے
فلک پر اس زمین کی سرزمیں ہے
فلک خود جھیل ڈل میں تہہ نشیں ہے [۸]

نازکی کی اردو شاعری فنی اور جمالیاتی شعور کے اعتبار سے بہت عمدہ ہے۔ فطری حسن کی نیرنگیاں جس خوبصورت پیرائیہ میں ان کے ہاں نظر آتی ہے وہ ان کو ریاست کے صفِ اول کے فطری شاعروں میں شمار کراتی ہیں۔

حواشات:۔

۱.....غلام رسول نازکی۔ دیدۂ تر (مجموعہ شعر) ص۔۱۴

۲.....غ۔م، طاؤس، تعارف، (دیدۂ تر) ص۱۰۔۱۱

۳،۴.....غلام رسول نازکی۔ دیدۂ تر ص۔۳۴

۵.....غ۔م۔طاؤس، تعارف (دیدۂ تر) ص۔۱۱

۶.....غ۔م۔طاؤس، تعارف (دیدۂ تر) ص۔۱۱

۷.....غلام رسول نازکی۔ دیدۂ تر۔ص ۴۷

۸.....غلام رسول نازکی۔ دیدۂ تر۔ص ۴۷

......☆☆☆ ......

پران کشور

میرے اُستاد، میرے شفیق
نازکی صاحب

اَدب، ثقافت اور تخلیقی عمل کے طویل سفر میں جن عظیم شخصیّتوں نے میرے وجود پر ایک نہایت خوشگوار گہرا اور دیر پا اثر ڈالا ہے اُن میں میر غلام رسول نازکی سرِفہرست ہیں۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اپنی عظمت کے اُونچے ایوان سے اُتر کر تمام انسانوں کو گلے لگا کر اُن کے اپنے ہو جاتے ہیں یہ وصف مرحوم و مغفور نازکی صاحب میں بدرجہ اُتم تھا۔ وہ ہم میں، میری مراد ریڈیو کشمیر کے یارانِ طریقت میں نہ صرف عمر میں بڑے تھے بلکہ علم وادب کے میدان میں ہم سب سے کئی منزلیں آگے تھے۔ لیکن اس کے باوجود اُنھوں نے ہمیں کبھی بھی یہ احساس نہ ہونے دیا کہ وہ ہم سب سے افضل ہیں، ہم سے جدا ہیں۔

۳۱ جولائی ۱۹۴۸ء کا دن کشمیر کی تاریخ میں ایک یادگار دن تھا۔ ریڈیو

کشمیر سرینگر اُسی دن معرضِ وجود میں آنے والا تھا۔ ریڈیو چونکہ اُن دنوں تفریح تعلیم اور انفارمیشن کا نہ صرف سب سے طاقتور ذریعہ تھا بلکہ Glamour World کا ایک دلاویز پہلو بھی تھا۔ اس لئے کشمیری اُس دن کا بڑی بے صبری سے انتظار کر رہے تھے۔ گو، اس سے پہلے ریاست میں براڈ کاسٹنگ کا آغاز جموں سے ہوا تھا لیکن اُسکا سگنل ایک تو بہت کمزور تھا۔ ساتھ ہی وہاں سے نشر ہونے والے پروگرام کشمیری کلچر اور کشمیری مزاج اور سوچ کی تشہیر اور عکاسی نہیں کر سکتے تھے۔ یہ بھی وجہ تھی کہ کشمیری عوام اُس گھڑی کا بے صبری سے انتظار کر رہے تھے جب کشمیر کی آواز چاروں اطراف گونجنا شروع کرے گی۔

میں اُس وقت قومی کلچرل محاذ میں دوسرے ادیبوں اور کلاکاروں، مرحوم پریم ناتھ پردیسی، موہن لال ایمہ صاحب، عبدالغنی نمتہالی، حبیب اللہ، علی محمد لون سوم ناتھ زتشی اور دوسری نامور شخصیات کے شانہ بہ شانہ وادی کے کلچرل احیائے نو کی تحریک میں مصروف تھا۔ اُن دنوں مولانا محمد سعید مسعودی کا لکھا ہوا گیت:

؎ لہرااے کشمیر کے جھنڈے۔

ہر کلچرل اور سیاسی تقریب پر قومی ترانے کی صورت میں گایا جاتا تھا ۔ چنانچہ مرحوم کے۔ ایس ملک، جو آل انڈیا ریڈیو کی طرف سے کشمیر میں براڈ کاسٹنگ شروع کرانے کے لئے مامور کئے گئے تھے ریڈیو کشمیر سرینگر کی افتتاحی تقریب سے چندروز پہلے کلچرل فرنٹ کے دفتر واقع نمائش گاہ آئے

اور ہمیں سب سے پہلے براڈ کاسٹ کے لئے دعوت دی جس میں ہمیں لہرااے کشمیر، کے جھنڈے، کا ترانہ پیش کرنا تھا۔ ہم سب اس عزت افزائی کے لئے خوش ہوئے۔

چنانچہ ہم مقررہ وقت پر پولو گراونڈ کے مرکزی Pavallion پہنچے جس میں ۱۹۴۷ سے پہلے مہاراجہ ہری سنگھ اور اُنکی پولو ٹیم کے کھلاڑی کھیل کے بیچ کے وقفے میں ستانے بیٹھتے تھے اور جس میں اب ریڈیو کشمیر سرینگر کے لئے سٹوڈیوز بنائے گئے تھے۔ چاروں طرف گہما گہمی تھی۔ ایک طرف آل انڈیا ریڈیو دلی سے آئے انجینئر اور دیگر ماہرین مقامی انجینئروں کے ساتھ سٹوڈیوز ٹیسٹ کرنے میں مصروف تھے دوسری طرف پروگرام پروڈیوسر فنکاروں سے نپٹ رہے تھے۔ ہم ڈھونڈتے ڈھونڈتے کے۔ ایس۔ ملک کے پاس پہنچ گئے جو باہر پورٹیکو میں بیٹھے بھُورے رنگ کی شیروانی پہنے ایک نازک بدن صاحب سے Opening announcement کی ری ہرسل کروا رہے تھے۔ کے۔ ایس۔ ملک نے ہمیں ایک طرف بیٹھنے کو کہا اور ان صاحب سے اناونسمنٹ کو زیادہ سے زیادہ موثر بنوانے کے کام میں لگ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب اُنہیں تشفّی ہوئی تو مسکراتے ہوئے ہماری طرف مڑ گئے اور شیروانی پہنے اور سر پر اُودبلاو کے فر کی ٹوپی دھرے صاحب سے ہمارا تعارف کرایا۔ ''ان سے ملئے یہ نازکی صاحب ہیں۔ میر غلام رسول نازکی ہمارے پروگرام اسسٹنٹ۔ یہی پہلی مجلس کا آغاز کریں گے۔ اناونسمنٹ کے لئے انہیں اپنی Details لکھوایئے''۔

میں نے نازکی صاحب کا نام پہلے بھی سنا تھا کیونکہ وہ ریڈیو کشمیر جموں

سے پہلے سے ہی براڈکاسٹ کرتے رہے تھے۔اس کے علاوہ ہم نے اُنکی غزلیں بھی پڑھی تھیں جو اس وقت کے کئی جریدوں میں چھپتی رہتی تھیں۔لیکن میرے لئے یہ نازکی صاحب کی ذات کے پہلے دیدار تھے۔نازکی صاحب مسکراتے ہوئے ہمارے پاس آئے اور ایک ایک سے ملے اور کہا ''اللہ نے چاہا تو اَب ملتے ہی رہیں گے''۔

کے۔ایس ملک ہمیں میوزک سٹوڈیو میں لے گئے اور ہم Opening announcement کا انتظار کرتے رہے۔ ہمارے کلاکاروں نے کئی دن ری ہرسل کی تھی لیکن چونکہ براڈکاسٹ live تھا اور اُسمیں کسی غلطی کی کوئی گنجائش نہ تھی۔اس لئے جوں ہی وقت نزدیک آتا گیا ہمارے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہوتی گئیں۔آخر وہ وقت آگیا جب کشمیر میں براڈکاسٹنگ کا آغاز ہونا طے تھا۔سٹوڈیو لاوڈ سپیکر پر نازکی صاحب کی آواز گونجی ''یہ ریڈیو کشمیر سرینگر ہے۔حق وصداقت کی آواز ریڈیو کشمیر۔نشریات کے اس تاریخ ساز دن کا آغاز مادرِ مہربان بیگم شیخ محمد عبداللہ تلاوتِ پاک سے کریں گی''۔یہ آواز ساری ریاست کے کونے کونے میں گونجی اور اس طرح نازکی صاحب کی مبارک آواز نے کشمیر میں براڈکاسٹنگ کی داغ بیل ڈالی۔تلاوتِ قرآن شریف کے بعد شریمد بھگوت گیتا سے پاٹھ اور گوروگرنتھ صاحب کے شبد نشر ہوئے اور پھر نازکی صاحب نے اعلان کیا۔''اب قومی کلچرل محاذ کے فنکار مولانا محمد سعید مسعودی کا مقبول ترانہ پیش کریں گے۔

لہرا اے کشمیر کے جھنڈے
طفل وجواں وپیر کے جھنڈے

بازوئے بے شمشیر کے جھنڈے۔ ہردم لہرا، ہرسولہرا

لہرا اے کشمیر کے جھنڈے۔"

بات کچھ لمبی ہوگئی۔ لیکن نازکی صاحب کی ذات اقدس کے حوالے سے اُس تاریخی دن کی یاد تازہ ہوگئی اور اُسے قلمبند کرنے سے اپنے آپ کو روک نہ سکا۔ وہ ساعت نیک تھی جس کی وجہ سے ریڈیو کشمیر سرینگر ایک سرکاری ادارہ ہونے کے باوجود علم وفن کا ایک ایسا گہوارہ بنا جو بعد میں ہر کشمیری کی زندگی کا ایک لازمی حصہ بن گیا اور اللہ کے فضل سے آج بھی بدستور بنا ہوا ہے۔

ریڈیو کشمیر سرینگر شروع کرانے کے بعد کے۔ ایس ملک یہاں کے فنکاروں اور ادیبوں کی کھوج میں لگ گئے ۔ وہ برِصغیر کے سب سے معتبر براڈ کاسٹر زیڈ۔اے بخاری کے شاگرد رہ چکے تھے۔اس لئے سرکاری ضوابط کی پروانہ کرتے ہوئے جہاں کوئی اچھا Talent دیکھتے کھینچ کر سٹاف پر لے آتے • چنانچہ اسی رَو میں اُنہوں نے قومی کلچر محاذ کے فنکاروں میں سے پریم ناتھ پردیسی، موہن لال ایمہ علی محمد لون اور اس خادم کو ریڈیو کشمیر کے سٹاف پر آنے کی دعوت دی۔ پریم ناتھ پردیسی اور موہن لال ایمہ پروگرام اسسٹنٹ بنائے گئے۔ علی محمد لون سکرپٹ رائٹر اور مجھے نیوز ریڈر کے عہدے پر تعینات کیا گیا۔ مہندر کول، جن کی بھرتی جموں میں ہوئی تھی اُردو کے نیوز ریڈر تھے۔اُنہیں سرینگر تبدیل کیا گیا اور کشمیری خبروں کے لئے مجھے منتخب کیا گیا۔

لیکن ریاستی سرکار کی طرف سے جو حاکم اعلیٰ مقرر ہوئے تھے اُنہیں کسی اور شخص میں دلچسپی تھی۔اس لئے اُنہوں نے میری تقرری میں روڑے

اٹکانا شروع کیئے۔ سب سے بڑی دلیل جو اُنھوں نے کے ایس ملک کے سامنے پیش کی وہ یہ تھی کہ چونکہ میں درود وسلام کی ادائیگی اور دیگر اسلامی اصطلاحات سے ناواقف تھا۔ اس لئے میں خبروں کے براڈ کاسٹ کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتا تھا۔ ساتھ ہی یہ بات بھی تھی کہ شیخ صاحب ہر جمعہ کو آثار شریف حضرتبل میں نماز کے بعد عوام سے خطاب کرتے تھے جس میں وہ بلاناغہ قرآن شریف اور حدیثِ اقدس کے اقتباسات کا حوالہ دیتے تھے اور اُنکی ان تقریروں کو خبروں میں شامل کرنا لازمی تھا، اس لئے بھی میں اس کام کے قابل نہ تھا۔

(موصوف چونکہ رحلت فرما گئے ہیں اس لئے یہاں اُن کے اسم گرامی کا ذکر کرنا بے ادبی ہوگی۔) یہ الگ بات ہے کہ وہ بعد میں میرے بھی دوست بن گئے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اندر اندر سے یہ کھچڑی پک رہی ہے۔ اس بات کا ذکر ایک شام مرحوم عبدالحق برق نے مجھ سے خبروں کا بلٹن پڑھنے سے پہلے کہا۔ اُنہوں نے مجھ سے کہا کہ حاکمِ اعلیٰ نے تمہیں براڈ کاسٹنگ سے ہٹانے کیلئے مجھ سے میرا تعاون مانگا ہے۔ اور کہا ہے کہ اگر میں تمہاری Performance پر متواتر دو چار بار خراب رپوٹ لکھوں تو اُنکا کام آسان ہوگا۔ عبدالحق برق مرحوم آبِ کوثر سے دُھلی ہوئی شخصیّت کے مالک تھے اور کلچرل فرنٹ کے زمانے سے میرے دوست تھے۔ وہ بھی ریڈیو کشمیر جموں سے تبدیل ہو کر آئے تھے اور ٹرانس مشن اسسٹنٹ کے عہدے پر فائز تھے۔ براڈ کاسٹ کی اچھائیوں یا برائیوں پر روزمرہ رپورٹ لکھنا اُن ہی کے ذمہ تھا۔ جب اُنہوں نے مجھ سے یہ کہا تو میں نے بڑی معصومیت

سے پوچھا۔ ''تو آپ نے کیا سوچا''۔ وہ بولے'''اُنکی ایسی کی تیسی۔ تم بے فکر رہو۔ ہمیں ایسی آواز کہاں ملے گی''۔

اس یقین دہانی کے باوجود میں بہت ہی دل برداشتہ ہوا۔ جواں خون اُبل اُٹھا، میں نے سوچا، میں کسی بھی دم گھٹانے والے ماحول میں کام نہیں کرسکوں گا۔ چنانچہ خبریں پڑھتے پڑھتے ہی میں نے اپنے آپ سے فیصلہ کیا کہ بس بہت ہوگیا میں کل سے کام پر نہیں آؤں گا۔ ابھی خبروں کے بلیٹن کے ختم ہونے میں کوئی چار منٹ باقی رہ گئے تھے۔ میں نے فیصلہ کر کے اعلان کیا۔ ''خبر سپز ختم''۔ سوچ آف کیا اور سٹوڈیو سے باہر آگیا۔ دس منٹ کا بلیٹن چھ منٹ میں ختم کرنا ایک ان ہونی بات تھی۔ باہر چاروں طرف افراتفری مچ گئی تھی۔ اناؤسر فلر ڈھونڈنے لگ گیا، انجینئر سٹوڈیو بدلنے میں۔ برقؔ صاحب ڈیوٹی روم سے بھاگے بھاگے باہر آگئے اور مجھ ڈانٹنے لگ گئے۔ یہ کیا حماقت ہے۔ یہ کیا کیا تم نے؟ میں نے جواب دیا۔ ''بس ہو گیا ۔ میں جا رہا ہوں اُن سے کہنا میری نوکری سنبھال لیں''۔

نازکی صاحب جو ڈیوٹی روم میں بیٹھے تھے اطمینان سے باہر آئے اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے لان میں لے گئے اور پوچھا۔ ''ہُوا کیا ہے'' میں نے اُنہیں ساری روداد سُنائی۔ وہ مسکراتے ہوئے بولے۔ بس اتنی سی بات۔ آو میرے ساتھ وہ مجھے اپنے ساتھ دفتر لے گئے۔ ریڈیو کشمیر کا آفس ایمپوریم کے باہر اُس بنگلے میں تھا جہاں غالباً آجکل سی۔ آئی۔ ڈی کا دفتر ہے۔ اپنے کمرے میں مجھے اپنے سامنے بٹھایا۔ چائے منگوالی اور کاغذ کا ورق لے کر اُس پر کچھ لکھنے لگ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد قلم رکھ کر کاغذ میری

طرف بڑھایا۔ میں نے پوچھا۔ "یہ کیا ہے۔" "دیکھ لو" میں کاغذ پر کی لکھائی دیکھ کر حیران ہوا۔ کاغذ پر اوپر سے نیچے تک ایک کالم سا دیوناگری رسم الخط میں لکھا ہوا تھا۔

میں نے پوچھا۔ "آپ ہندی بھی جانتے ہیں"؟۔ وہ مسکرائے "ہاں اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ آدمی جتنی بھی زبانیں جتنے بھی رسم الخط سیکھے اور جانے، اُتنا ہی اُس کا شعور بیدار اور بالغ ہو جاتا ہے، یہ میرے لئے استاد کا پہلا سبق تھا۔ وہ بولے "لو اَب پڑھو میں نے سارے درود و سلام لکھ لئے ہیں۔ دیوناگری رسم الخط میں اس لئے لکھے کہ تمہیں صحیح تلفّظ سیکھنے میں آسانی ہوگی۔"

پھر کیا تھا ایسا اُستادِ کامل ملا تھا میں ہار کہاں ماننے والا تھا۔ میں نے اُن کے ساتھ ساتھ تلفّظ کی باریکیاں حفظ کر لیں۔ دو ایک گھنٹے کے ریاض کے بعد اُنہیں پوری تشفّی ہوئی۔ میں نے دیکھا اُن کی آنکھوں میں بے پناہ شفقت تھی۔ میں اُن کا شکریہ ادا کرنے کے لئے الفاظ ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ شاید میری بے بسی بھانپ گئے اور مسکرا کر بولے۔ "میں نے اپنا فرض نبھایا اَب تم اپنا فرض نبھاؤ۔ اور جا کر صاحب سے کہو "آپ کو اعتراض ہے کہ میں اسلامی اصطلاحات سے واقف نہیں ہوں آیئے میرا نئے سرے سے آڈیشن لیجیے"۔

صاحب موصوف کچھ بوکھلا اُٹھے۔ اُنہوں نے میرے تیور دیکھ کر چپراسی کو بلایا اور کہا۔ جا کر نازکی صاحب سے کہو کہ پارسٹوڈیوز میں آئیں کسی کا آڈیشن لینا ہے"۔ اُس کے بعد جو ہوا، بقول کسے ہسٹری ہے۔ میری زبان سے صحیح تلفّظ کے ساتھ درود و سلام اور دوسری اصطلاحات سن کر وہ لاجواب ہو گئے۔ نازکی حاصب اس ساری سچویشن کا مزہ لیتے رہے۔ بعد ازاں جب

میں نے پہلی بار شیخ صاحب کی حضرتبل میں کی گئی تقریب کی ریڈیو رپوٹ پیش کی تو شیخ صاحب جو وزیر اعظم ہونے کے ساتھ ساتھ انفارمیشن اور براڈ کاسٹنگ کے وزیر بھی تھے وہ رپورٹ سن کر اتنے خوش ہوئے کہ اُنہوں نے ہدایات بھیجیں کہ اگلے سارے ریڈیو رپوٹ میں ہی پیش کروں۔ چنانچہ یہ سلسلہ اُن کی گرفتاری تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ 9 اگست سے پہلے کے جمعہ کی تاریخی تقریر کی ریڈیو رپورٹ بھی اس ناچیز نے ہی پیش کی۔

یہ نازکی صاحب کی وسیع القلبی، اور اُستادِ کامل کی بروقت دین تھی کہ پران کشور، اچھا بُرا جیسا بھی، براڈ کاسٹر بنا اور زندگی کے تینتیس سال سننے والوں کی خدمت کرتا رہا۔ اور مجھے اس بات کا فخر ہے کہ میں نے اپنے اُستادِ محترم کو کبھی مایوس نہیں کیا۔

اگر میں یہ کہوں کہ میں نے اُردو زبان کے گرائمر کی باریکیاں یہاں تک کہ اُردو لکھنا اور بولنا اُنہی سے سیکھا ہے تو کوئی مبالغہ نہیں ہوگا۔ نہیں تو سبھی جانتے ہیں ہمیں سکولوں میں کتنی زبان سکھائی جاتی ہے۔ مجھے ہی کیا بی۔بی۔سی کے مہندر کول O-B-E بھی میرے ساتھ زبان سیکھنے کی مشق میں نازکی صاحب کے شاگرد تھے۔ ہم ہی کیا بشیر بھٹ مرحوم، عبدالرشید صاحب اور دوسرے براڈ کاسٹر بھی اُن کی رہنمائی کے طالب رہتے تھے۔ اور تو اور پریم ناتھ پردیسی صاحب بھی، جو خود اتنے بڑے ادیب تھے زبان کی باریکیوں کے سلسلے میں اُنکے علم سے استفادہ اُٹھاتے تھے۔

یہ ریڈیو کشمیر کا وہ زمانہ تھا جب آل انڈیا کے ہیڈ کواٹر سے چن چن کر نامور ادیبوں کو یہاں کام کرنے کے لئے بھیجا جاتا تھا جن میں ارجن دیو مجبور، شک،

مضطر ہاشمی، جگن ناتھ عابد، سلام مچھلی شہری، کمال احمد صدیقی اور سہیل عظیم آبادی جیسے اُردو زبان کے جانے مانے ادیب شامل تھے۔ اِن چمکتے ستاروں کے درمیان نازکی صاحب کی ذاتِ بابرکت سب سے زیادہ روشن تھی۔ وہ سبھی مختلف زبانوں خاص طور سے انگریزی، فارسی اور عربی ادب پر نازکی صاحب کی گہری نظر کا لوہا مانتے تھے۔

کشمیر میں براڈ کاسٹنگ میں اُس وقت کے بحران اور قدروں کے تیزی سے بدلنے کے تیوروں کے ساتھ نپٹنے کا، پبلسٹی تخلیق کا سہرا پریم ناتھ پردیسی اور میر غلام رسول نازکی کے سر جاتا ہے۔ بلکہ پردیسی صاحب کی جوانمرگی کے بعد یہ سارا بوجھ نازکی صاحب کے کندھوں پر آگیا۔ ہم تو آوازیں تھے۔ چاہے مہندر کول ہو، بشیر بھٹ ہو یا یہ خاکسار بعد میں عبدالرشید صاحب بھی آوازوں کے اس کارواں میں شامل ہوئے۔ اُن براڈ کاسٹوں کی اصل روح تو وہ الفاظ تھے، محاوروں کی وہ پیوندکاری تھی، طنز کے وہ تیکھے وار تھے جو نازکی صاحب کی قلم سے نکلتے تھے۔ چاہے جوابی حملہ ہو، گنبد کی آواز یا حالات حاضرہ پر تبصرہ۔ آج کی بات ہو، اتنی زود نویسی اور تخلیقی رفتار نازکی صاحب جیسے ادیب کا ہی خاصہ تھا۔

اگر میں یہ کہوں کہ ریڈ کشمیر سرینگر کے اُس وقت کے خلیقے خود ایک دوسرے کے سکھائے ہوئے تھے تو کوئی مغالطہ نہیں ہوگا۔ ہم اپنی غلطیوں اور ایک دوسرے کے پروگراموں پر مخلص تنقید سے سیکھتے رہتے اور ہماری رہبری کے لئے نازکی صاحب جیسے اُستاد تھے جو اُستاد ہونے کے ساتھ ساتھ ہمارے دوست اور رفیق بھی تھے۔

مجھے یہاں ایک اور تاریخی واقعہ یاد آتا ہے۔ صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد کشمیر تشریف لائے اور روایت کے مطابق ریاستی حکومت نے اُنکے لئے دریائی جلوس کا اہتمام کیا تھا۔ ہمیں ارشاد ہوا کہ اس دریائی جلوس پر رواں تبصرے کا بندوبست کیا جائے۔ یہ ایک ایسا حکم تھا جس نے ہم سب کو ہلا دیا۔ کیوں کہ ہم نے کبھی کسی معمولی تقریب تک کی Running Commantary کی نہیں تھی۔ حاکم، حاکم تھا اس لئے بچنا محال تھا۔ آخر جب انجینئروں نے سبز جھنڈی دکھائی تو ہم تیاری میں جٹ گئے۔ کومینٹری کے لئے نازکی صاحب، مہندر کول اور اس ناچیز کا انتخاب ہوا۔ اب پوری طرح یاد نہیں شاید عبدالرشید اور مرحوم علی محمد لون کو بھی ساتھ دینے کے لئے کہا گیا تھا۔

پہلا پوائنٹ سرینگر کا ہیڈ پوسٹ مقرر ہوا۔ دوسرا امیرا کدل اور اس طرح چھتہ بل ویرتک اور کئی لوگوں کی ڈیوٹی مقرر ہوئی۔ دریائی جلوس شراہ یار سونہ وار کے گھاٹ سے شروع ہوتا تھا۔ وہاں کی لکھی ہوئی رپورٹ سٹوڈیو سے نشر ہوئی اور ہم دم سادھے بنڈ پر لگے ایک ہاوس بوٹ کی چھت پر دریائی جلوس کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ نازکی صاحب کے ہاتھ میں مائیکروفون تھا۔ مہندر کول اور میری نظریں شراہ یار پر لگی ہوئی تھیں ہم دونوں بہت نرؔوس تھے۔ لیکن جوں ہی دریائی جلوس کے پرندے سامنے سے آتے دکھائی دیئے اور انجینئر نے ہاتھ کے اشارے سے کومینٹری شروع کرنے کا اِشارہ کیا تو نازکی صاحب کی گوھر افشانی کا دھارا پھوٹا۔ ہم اُنہیں دیکھتے ہی رہ گئے اور ہماری Nervousness کافور ہوگئی۔ اس طرح کی تحریک

کے منبع تھے نازکی صاحب۔

جیسا میں نے آغاز میں لکھا ہے کہ نازکی صاحب نے کبھی بھی اپنی عظمت کا خود اعلان نہیں کیا۔ وہ عمر کی تفاوت اور اپنی علمی بالیدگی کو بالائے طاق رکھ کر ہماری سطح پر آکر ہمارے ایسے دوست بن گئے کہ ریڈیو میں ہماری روزمرہ کی زندگی باغ و بہار بن گئی۔ ہم فرصت کے وقت تاش کھیلنے بیٹھتے تو وہ شامل ہو جاتے۔ تاش کا دلچسپ کھیل Sweep ہم نے اُنہی سے سیکھا جسے ہم ہر روز لنچ کے وقت اور چھٹی کے دن بلا ناغہ کھیلتے۔ وہ کھیلتے کھیلتے ایسا رواں تبصرہ کرتے اور ایسی پھبتیاں کستے کہ ہنستے ہنستے ہماری پسلیاں دُکھنے لگتیں۔ اُنہیں لوگوں کو چھیڑنا اچھا لگتا تھا۔ لیکن اُس چھیڑ خوانی میں بھی شفقت اور پیار ہوتا۔

اس چھیڑ خوانی کا نشانہ سب سے زیادہ سورگباشی ہر بھگوان ملہوترہ ہوا کرتے تھے جو ہماری پشتو سروس کے انچارج بھی تھے اور نیوز ریڈر بھی۔ اُس وقت ریڈیو کشمیر سرینگر سے کشمیری، اُردو، ڈوگری، لداخی زبانوں کے علاوہ پشتو اور پوٹھوہاری (وہ پہاڑی بھاشا جو اوڑی اور اُس سے ملحق علاقوں میں بولی جاتی ہے) میں بھی نشریات ہوا کرتی تھیں۔

ہر بھگوان ملہوترا صاحب شمالی مغربی سرحدی صوبے کے برگزیدہ رہنماؤں خان عبدالغفار اور ڈاکٹر خانصاحب کی سیاسی جماعت کے رُکن رہ چکے تھے۔ بلکہ ڈاکٹر خانصاحب کی سفارش سے ہی وہ براڈکاسٹنگ میں آئے تھے۔ ہر بھگوان پٹھان ہونے کے ناطے یاروں کے یار تھے۔ وہ چونکہ پشتو کے علاوہ فارسی زبان بھی بخوبی جانتے تھے اس لئے وہ نازکی صاحب کے

ساتھ خاص راہ ورسم رکھتے تھے۔ یہ رشتہ جلدی دوستی اور بے تکلفی میں تبدیل ہو گیا۔ اُنہیں تب تک چین نہیں آتا جب تک نہ وہ نازکی صاحب اور ایمہ صاحب کے ساتھ چھیڑ خانی نہیں کرتے ۔ جس کی جوابی کاروائی نازکی صاحب یوں کرتے۔ وہ بڑی معصومیت کے ساتھ ہر بھگوان سے اُردو زبان کے اُن چیدہ چیدہ لفظوں کے پشتو متبادل دریافت کرتے جنہیں اُنہوں نے پہلے ہی ذہن میں رکھا ہوتا تھا۔ پشتو کے ان الفاظ کو کاغذ پر لکھ کر وہ اُنہیں شعروں میں ڈھالتے اور پھر تھوڑی دیر کے بعد ہر بھگوان صاحب کو بُلاتے اور اپنے مخصوص ترنّم کے ساتھ اُنہی کے دیئے پشتو لفظوں میں اُنہیں چڑھاتے اور اُن پر پھبتیاں کستے ۔ ہر بھگوان سیخ پا ہو جاتے۔ لڑ جھگڑ کر قسمیں کھاتے کہ وہ اُس دن کے بعد نازکی صاحب یا موہن لال ایمہ یا ہم میں سے کسی سے کوئی تعلق نہیں رکھیں گے۔ دو ایک دن وہ روٹھ کے بیٹھ جاتے لیکن تیسرے دِن پھر نازکی صاحب کے پاس آ کر بیٹھ جاتے ....اور کہتے ''چپ کیوں ہو۔ پوچھو اور کس کس لفظ کا پشتو ترجمہ سننا چاہتے ہو۔ ارے کچھ بات کرو۔ اور سبھی کھل کھلا کر ہنس پڑتے اس طرح وہ منجمد ماحول پھر پگھل جاتا۔

مجھے یقین ہے نازکی صاحب کی شاعری کے بارے میں بڑے بڑے شعر شناس اِس خاص شمارے میں اپنے خیالات کا اظہار کریں گے۔ میں کیا جسارت کر سکتا ہوں لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اُن کے اشعار میں کوئی غیر موزوں لفظ یا Expression ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل سکتا۔ اُن کا ہر مصرع کس بھی میزان پر بقولِ آل احمد سرور سوٹکا کھرا اُترتا ہے۔ عالم اور دانشور تو تھے ہی اس لئے موضوعات بھی یکتا تھے۔ الفاظ کی روانی اور

بانکپن ماشاءاللہ!۔

زندگی کے آخری حصے میں اُنہوں نے اپنی مادری زبان کشمیری کی طرف رجوع کیا۔ تو ایسی رُباعیات اور قطعات لکھے کہ اُنہیں بار بار پڑھنے، سننے اور حفظ کرنے کو دل کرتا ہے۔ کیونکہ اُن میں نہ صرف اس مٹی کی مہک ہے بلکہ دورِ حاضر کی داستان کا درد بھی ہے۔

ایک ہم سفر شاگرد اور دوست کے ناطے وہ مجھے بہت عزیز رکھتے تھے۔ یہ رشتہ اُن کے آخری سفر تک قائم رہا۔ مجھے جب بھی موقع ملتا تو میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ آخری دنوں میں کافی علیل ہوا کرتے تھے لیکن اُسکے باوجود وہ ریڈیو کشمیر کے پُرانے وقتوں کی داستان لے بیٹھتے۔ جس میں ہر بھگوان ملہوترا کا ذکر ضرور ہوتا۔ اُن سے میری آخری ملاقات رہاڑی جموں میں ہوئی جہاں وہ اپنے صاحب زادے کے ساتھ اُنکی سرکاری رہائش گاہ میں رہتے تھے انہیں سرینگر شدید ذہنی دھکا لگا تھا جسے وہ بُھلا نہیں پائے تھے۔ ہوا یوں تھا جیسا کہ اُنہوں نے مجھ سے کہا۔ کئی Extortionists اُن کے صاحب زادے کے گھر میں گھُس کر ایک بھاری رقم مانگ کر ڈرا دھمکا رہے تھے۔ مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں کمرے میں داخل ہوا اور بڑے پیار سے کہا۔ عزیزو یہ بے چارہ سرکاری ملازم ہے یہ آپکی یہ فرمائش کیسے پوری کر سکے گا۔ میرا یہ کہنا تھا کہ اُن میں سے ایک سر پھرا مسلح نوجوان میری طرف بڑھا اور مجھ سے بڑی بدتمیزی سے بولا اے بوڑھے کھوسٹ تو باہر جائے گا کہ نہیں۔ میں نے اللہ سے کہا میرے مولا مجھے یہ دن دیکھنا بھی نصیب تھا۔ مجھے تو سبھی لوگ بڑے ادب سے میر غلام رسول نازکی کے نام سے یاد کرتے رہے ہیں

اور اس نے مجھے بوڑھا کھوسٹ کہہ کر باہر نکال دیا۔

یہ ذہنی چوٹ یہ حسّاس شخص کیسے برداشت کر پاتا۔ اُنہوں نے مجھ سے کہا۔ ''سب کچھ لوٹ لیا ہے زمانے کی اس گردش نے، کلچر، تہذیب بڑے چھوٹے کی تمیز، سب سے بڑی بات کشمیریت، عمارتیں جلائی گئیں، سکول مسمار کیئے گئے، پل اُڑا دئے گئے۔ ایک نہ ایک دن سبھی پھر سے تعمیر ہونگے، یہاں تک کہ جو لوگ شہید ہوئے اُنکی جگہ بھی اور لوگ پیدا ہونگے لیکن ہماری تہذیب ہمارے تمدّن کا جو جنازہ نکلا ہے اُس میں پڑی لاش کو کیسے زندہ کیا جا سکے گا۔''

کچھ دیر گئے وقتوں کا ماتم کر کے جب میں اُن سے رخصت ہونے لگا تو اُنہوں نے اصرار کیا کہ وہ مجھے ٹیکسی سٹینڈ تک چھوڑ آئیں گے۔ اُنکے فرزند کی رہائش گاہ اوپر پہاڑی کی ایک ٹیکری پر تھی اور ٹیکسی سٹینڈ بہت نیچے۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا کافی اُترائی ہے۔ لیکن وہ نہیں مانے کہنے لگے۔ ''یاد نہیں وہ اُس وقت کے قصے جو میں تم لوگوں کو بانڈی پور سے شہر سرینگر کے اپنے پیدل سفر کے بارے میں سنایا کرتا تھا۔ یہ ہڈیاں پیدل چل چل کر کمائی ہوئی ہیں۔ فکر نہ کرو۔ اور وہ میرے ساتھ چل پڑے۔

نازکی صاحب کی یاداشت سبحان اللہ اور پھر ہر موقع ہر محل پر پرانے اساتذہ کے فارسی اور اُردو اشعار موزوں کرنے کا خاصہ' یہ وصف اللہ تعالےٰ کی دین تھی جو بہت کم لوگوں کو عطا ہوتی ہے۔ اُنکی یہ خوبی اُنکے آخری دن تک برقرار رہی۔ جس کی جھلک اُن کے اُن خطوط میں ملتی ہے جو وہ آخری دنوں تک مجھے وقتاً فوقتاً لکھتے رہتے اور جنہیں میں نے تعویز سمجھ کر سنبھال کے رکھا ہے۔

ذکرِ نازکی ایک پورے یگ کی داستان ہے شروع تو کی ہے لیکن ختم کہاں کی جائے سمجھ میں نہیں آتا۔ بہر صورت مضمون کو جریدے میں میرے حق میں الاٹ ہوئی Space کے اعتبار کے مطابق ختم تو کرنا ہی ہے۔ سو میں اِن چند یادوں کو نازکی صاحب کی اُس محبت کے اظہار کے ساتھ ختم کرتا ہوں جو اُنہیں اپنے وطن سے تھی۔

میرے کشمیر کی ہر شے حسیں ہے
یہاں کی ہر پہاڑی نازنیں ہے
فلک پر اس زمین کی سرزمیں ہے
فلک خود جھیل ڈل میں تہہ نشیں ہے

..................☆☆☆..................

محمد یوسف ٹینگ

غلام رسول نازکی

میر غلام رسول نازکی میرے والدِ محترم کے عزیز ترین دوستوں میں سے تھے اور میرے لئے والدِ محترم جیسے بزرگ اور برتر تھے۔ لیکن مجھے اُن کی حیات میں ان کی نکتہ چینی کرنا پڑی جو کہ اخبارات میں بھی چھپی اور محفلوں میں بھی اس کا چرچا ہوا۔ میں نے لکھا کہ نازکی صاحب نے پہلے اپنے آپ سے اور بعد میں اپنے کشمیر کے ساتھ ناانصافی کی۔ پروردگار نے انہیں بے پناہ نعمتوں سے نوازا تھا۔ انہیں فیاضی اور دریادلی کے ساتھ بے شمار اور ہزار در ہزار نعمتوں سے سرفراز فرمایا تھا، جو کہ میرے خیال میں بیسویں صدی میں شاید ہی کسی کشمیری کو نصیب ہوا تھا۔ مجھے نازکی صاحب کی تقریباً تمام تحریریں پڑھنے کا فخر اور ان کی شیریں تقریریں سننے کا شرف حاصل رہا ہے۔ میں نیازمندی کے ساتھ ان کے قریب تھا لیکن میں اپنے اس بیان کو نہ بدل سکا۔ میں نے لکھا کہ وہ اُپنے دور میں کشمیر کے جامع الکمالات تھے۔ انہوں نے بہت کچھ لکھا ہے اور بہت ہی اچھا لکھا ہے۔ انہوں نے ایک قابلِ رشک زندگی انجام تک پہنچائی۔ انہوں نے اپنے گلشن کی برجستہ بہار بھی دیکھی اور لائق کامیاب اور ہونہار اولاد اپنے پیچھے چھوڑے لیکن یہ

ان کی خداداد قابلیتوں کا محدود استعمال تھا۔ وہ اسی طرح اپنی صلاحیتوں کا استعمال کر سکتے تھے جس طرح سولھویں صدی عیسوی کے کشمیر کے جامع الکمالات ایشاں صاحب شیخ یعقوب صرفیؒ نے کیا تھا۔ جن کے متعلق کشمیریوں نے پہلے ''جامع الکمالات'' کی ترکیب استعمال کی۔ نازکی صاحب کے وجود کے ساتھ صلاحیتوں کا بڑا میزان جمع تھا۔ بہر حال نازکی صاحب جو اپنے پیچھے چھوڑ گئے وہ کچھ کم نہیں۔ ہمارے بعد آنے والی نسلیں اس پر ناز کریں گی...... مگر ہم نے نازکی صاحب کو دیکھا ہے، پرکھا ہے اور بھوگا ہے۔ انہیں عربی، فارسی، اردو، کشمیری، انگریزی اور ہندی زبانوں پر عبور تھا اور اوّل الذکر چار زبانوں میں سند ہونے کا اعتبار تھا انہیں اس قدر معاملہ فہمی، ذہانت اور فطانت ودیعت ہوئی تھی کہ سامنے والے کی کوئی بھی بات مکمل کرنے قبل سے اس کی تہہ تک پہنچ پاتے۔ ان کا حافظہ اس قدر تیز تھا کہ ان زبانوں کے ہزاروں اشعار انہیں دمِ واپسیں تک از بر تھے۔ قرآن مجید کی سینکڑوں آیات یاد تھیں، احادیث کا شمار ہی نہیں۔ میں نے اپنی زندگی میں علمی معاملات میں مولانا محمد سعید مسعودی اور دنیاوی مسئلوں میں بخشی غلام محمد کے بغیر کسی کا بھی اتنا تیز حافظہ نہیں دیکھا ہے۔ جو آخری وقت تک ان کا رفیق بنا رہا۔ نازکی صاحب کی ایک انفرادی خاصیت یہ تھی کہ انہیں حضور رسول اکرمؐ کی بے حد دلنشین دعائیں یاد تھیں۔ علی سردار جعفری نے مجھ سے کہا کہ اتنی دعائیں اس نے کہیں بھی اکٹھی نہیں دیکھی ہیں۔ نازکی صاحب کو ہزاروں لطیفے اور چٹکلے یاد تھے جن سے موقع محل کی مناسبت سے وہ محفلوں میں چراغاں کرتے تھے۔ ان کے ساتھ ہی ایسے سینکڑوں لطیفے ضائع ہوگئے کیوں کہ ان کی کہیں بھی شیرازہ بندی نہیں کی گئی۔ نازکی صاحب لاتعداد کشمیری پہیلیوں، محاورات،

ضرب المثل اور گالیوں کے کلید بردار بھی تھے جو صدیوں سے اور سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے رہے تھے۔ نازکی صاحب کو قدرت نے مترنم آواز سے بھی نوازا تھا اور جب وہ ۱۹۷۰ء سے قبل کے مشاعروں میں شرکت کرتے تو جیسے تمام عالم ہمہ تن گوش ہو جاتا۔ نازکی صاحب کو فنِ خطابت پر بھی عبور تھا۔ آپ اتنا خوشخط لکھتے کہ خوشنویس بھی واہ واہ کرتے۔ اقبال کی بعض کتابوں کی جو خطاطی انہوں نے کی ہے وہ اپنے آپ میں ایک فنی سوغات ہے۔ ان کو بڑی لطیف اور مزے دار حسِ مزاح ودیعت ہوئی تھی اور ان کا کلام ایسی شوخیوں سے جگمگ کر رہا ہے۔ ان کا تدبرِ قرآن اور فہم حدیث معتبر تھا۔ ان کے ساتھ ہی کشمیر میں ابجدی تاریخ کا فنِ شریف جیسے ختم ہو گیا ہے۔ ''انوارِ شیخ محمد عبداللہ'' ان کی کہی ہوئی شاید آخری عظیم تاریخ ہے جو مرحوم شیخ محمد عبداللہ کے لوحِ مزار کی زینت ہے۔ لیکن ایسا شخص اپنے تمام امکانات کے ساتھ Blossom نہیں ہوا۔ اس زیاں کا افسوس آج مجھے ہے لیکن کل تمام کشمیر کو ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ نازکی صاحب کے تحت الشعور میں اس بات کا احساس تھا اور ان کے کلام میں اجل کو گلے لگا لینے کا جو غالب احساس ہے اسکا سرچشمہ کہیں اس کے اندرون کے ہاتفی کا اس کو یہ کہنا تو نہیں کہ بہت کچھ کیا لیکن سارا نہیں جس کیلئے قدرت نے تمہیں آراستہ کیا تھا۔ جو سایہ دار درخت پورے گلستان کا سایہ کر سکتا تھا وہ ایک گملے میں سمٹ گیا جو ابرِ نیساں بہت سے باغیچوں اور کھیتوں کو سرسبز بنا سکتا تھا وہ کچن گارڈن میں بند ہو گیا۔ ان کے فرزند فاروق نازکی نے شاید اپنے کشمیری مجموعے ''نار ہیوتن کزل وُنس'' میں آدابِ فرزندی ملحوظ رکھتے ہوئے نازکی صاحب کے متعلق اس شعر کا استعمال کیا ہے ؎

گرچہ خوردیم نسبت است بزرگ
ذرۂ آفتاب تابانیم

مگراس کے باوجود بے ساختہ طور ایک حقیقت کا اظہار ہے۔ ان کے والد محترم قرار واقعی گرجتے ہوئے دریا تھے جسے غلام آباد کشمیر کی ناموافق فضاؤں نے ایک کوزے میں بند کر دیا۔ علامہ اقبال اس صورت حال کا یوں خلاصہ کرتے ہیں۔

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی

غلام رسول نازکی نے ۱۹۵۳ء کے بعد کشمیری شاعری کا آغاز کیا۔ اس سے قبل وہ اردو کے ایک کہنہ مشق استاد تسلیم کئے جاتے تھے۔ کشمیری شاعری شروع کرنے کے متعلق خود ہی کہتے ہیں:

''اگست ۵۳ء تک میں نے کبھی کشمیری شاعری نہیں کی...... اس برس مشاعروں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوا۔ مجھے سرکاری حیثیت میں ان میں شامل ہونا پڑتا تھا۔ ان مشاعروں میں اگرچہ بعض خوش کلام کشمیری شاعر بھی اپنا کلام سناتے تھے مگر اکثر وہ جو پتہ نہیں کیا کہتے ہیں اور اسی کا نام شاعری رکھا تھا۔ واقعہ یہی ہے کہ ان ہی خود ساختہ شاعروں نے مجھے کشمیری شاعری کی طرف مائل کیا (راقم الحروف کے پاس موجود تحریر)۔

نازکی فنِ عروض کے ماہر اور اصلاً شاعر تھے۔ اس کے پاس ایک سچے شاعر کی Sensibility تھی اور اس کا اسمِ اعظم سلیقہ اور شرافت تھا۔ اس نے کشمیری میں چہار مصرعی صنف استعمال کی جسے وہ رباعی کہتے تھے۔ قریب پچاس برس کے شخص کی رگیں تازہ نہیں ہوتیں اور نہ اسکے خون میں چنگاریاں رقص کرتی ہیں۔ اس کی

آواز بھی مدھم ہو چکی ہوتی ہے لیکن نازکی کے فن نے کشمیری شاعری کو ایک نئے، تازہ اور طرحدار لہجے اور نئے حسُن سے شرابور کیا۔ طوالت کا مقام نہیں لیکن خالص رومانی اور عشقیہ شاعری کا یہ منظر، یہ لطافت اور یہ سطح اس سے قبل نایاب تھی......

سوسوندر مال پھیران اُس آرن
کنن گووِگنہٕ ونہٕ وُن سبزٕ زارن
ژلان تھپہٕ تھار بُتھ چھوٚل آبہٕ شارن
دیپان تلۍ ٹارِ نظراہ کرٕ بہارن

(وہ نازنین کوہستانی ندیوں کی سیر کر رہی تھی
سبزہ زاروں کے کان پریوں کے ترنم سے لبریز ہو گئے
آبشاروں نے جلدی میں اپنے چہرے صاف کئے
کہتے ہیں کہ بہار نے بھی نیچی نظروں سے نظارہ کیا)

☆

زمینس پیٹھ ژُلتھ وُژھ سورگہٕ حوراہ
کٲشیر آیس دِلس پنہٕ نس برابر
ژٔتھ کھاٚرکھ ژٔجس اُش دار نیرتھ
لُکو تتھ ناو کوٚرمانس بلک سر

(جنت کی ایک حور وہاں سے بھاگ کر زمین پر چلی آئی
کشمیر اس کی نظروں میں سما گیا
اسے فرشتے زبردستی اٹھانے لگے تو اس کی آنکھوں
سے آنسوؤں کی ایک دھارا پھوٹی لوگوں نے اسکو
مانسبل جھیل کہہ کر پکارا)

☆

ژٔے کُن ڈیشتھ گژھان سوسن گولابس
ژٔے کُن ڈیشتھ یوان عآرق شبابس
متاں یوسف، زلیخا نوٚی وُچھاں خواب
اُساں مَے خانہٕ بُتھ ووشلاں شرابس

(تمہیں دیکھ کر گلاب سوسن بدل جاتا ہے
تمہیں دیکھ کر شباب پسینہ پسینہ ہو جاتا ہے
زلیخا یوسف کو بھول کر نئے خواب دیکھتی ہے
مے کدہ قہقہے لگاتا ہے اور شراب کا چہرہ لالہ ہو جاتا ہے)

☆

سیاہ برقہٕ وُلتھ بدول جمالاہ
دلن ووٚنم کرُس اَندٕ اَندٕ طوافاہ
مے ووٚنمس دولہِ ناموس شریعت
دوٚپن کعبس تہٕ چھے کرہنی غلافاہ

(سیاہ برقعہ پہن کر اس بدل جمال کے دیدار
میرے دل نے کہا کہ اس کے اردگرد طواف کروں
میں نے منع کیا کہ یہ تو ناموسِ شریعت کی خلاف ورزی ہے
اس نے کہا کہ غلاف کعبہ بھی تو سیاہ رنگ کی ہوتی ہے)

ان اشعار کا حسن آفاقی ہوتے ہوتے بھی اتنا کشمیری ہے کہ یہ صحیح معنوں میں بڑی شاعری کی خاصیت رکھتے ہیں جو Untranslateable ہوتی ہے۔
نازکی کی ذہنی اور حسیاتی جنّت کا نظارہ بھی اتنا کشمیری ہے کہ ان نام نہاد کشمیریوں جن کو فحش ایم ٹی وی اور فائیوسٹار کلچر کا چسکہ لگا ہے، پر واویلا کرنے کو جی چاہتا ہے کہ وہ کس طرح تہذیب کے آبِ حیات کے بجائے کسی گندی نالی کا گدلا پانی پیتے ہیں۔ نازکی صاحب کی ذہنی جنّت کا مقابلہ خواجہ حافظِ شیرازؒ کے اس خیالی پیکر سے کرنا چاہیئے۔

دو یارِ زیرک واز بادہ کہن دو منے
فروغنے و کتابے و گوشہ چمنے

نازکی صاحب جیسا تہجد گزار اور تقویٰ شعار اس کو الگ شیرینی اور رعنائی عطا کرتا ہے۔ ان کی پارسائی کے باوجود یہ عالم دنیا نوازی اور نغمہ نوازی کا سرور عطا کرتا ہے۔

وَنداہ شیناہ، سماواراہ ، حماماہ	(جاڑے کی سردی سماوار اور حمام
گونگا، ہری ساہ تہٕ توٗت نُنہٕ چایہ داماہ	زعفران، ہریسہ اور گرم گرم نمکین چائے
علی شیخاہ ، حسن صوفیاہ ، شمیماہ	استاد علی شیخ گلوکار حسن صوفی، شمیمہ اور پھر
رسول میرن تہٕ مہجورن کلاماہ	رسول میر اور مہجور کا کلام)

☆

چمن زارن اندر اُسی پوش پھلمتی	(چمن زار شگفتہ ہوا ٹھے تھے
ووزلی اُڈی، نیلہٕ اُڈی، قرمزتہٕ اُڈی ناسی	کچھ پھول لال، کچھ نیلے اور کچھ
گلالس اوس بُتھ وہشلاں ووزل نار	گل لالہ کا چہرہ گلنار ہورہے تھے
یمبرزلہ اُسی بری متی شبنمن کھاسی	اور نرگس نے شبنم کے کٹورے بھرے تھے)

نازکی کی دنیا کا دوسرا پُرلطف مگر اہم نظارہ وہ ہے جب وہ لطیفہ گوئی اور طنز و مزاح پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اس کے پاس ایک ستم ظریف کی آگہی ہے۔ اس کا زمانہ کشمیر میں تغیر اور انقلاب کا زمانہ تھا۔ اس میں، بقولِ نازکی کشمیری سماج الٹ پلٹ گیا۔ قدریں بدل گئیں اور انسانی قدریں پامال ہو گئیں ۔

ہوا تروُون تہٕ گو وولرس تلک پیٹھ
ملکھ وُتھی زَنتہٕ دِژ ابلق گرِوہیٹھ
سہ پھراہ ہیوٚ ہیوتن واتن ہموٚ واو
ژٕکس تل موکھتہٕ ووتھ ژھوٹ کھوٹ بٹھن پیٹھ



چھِ بولان گانٹھ گرہد، بلبل چھُ خاموش
دٔر سگوکھ ۂرتھ پیٚے زعفران پوش
مسیحن پھاسی، سقراطن دِتکھ زہر
پُری روخسار عفریتن ہم آغوش

یہ عام اشارہ ہے: نازکی، اکبر الہٰ آبادی کی طرح بہت سے کرداروں کو ان کی اپنی شکل میں پیش کرتا ہے اور ایک اعلیٰ کارٹونسٹ کی مانند کئی لکیروں میں اسکا ظاہر اور باطن پیش کرتا ہے۔ ان میں سے بعض کردار ایکدم پہچانے جاتے ہیں مگر کئی جگہوں پر بات پوری طرح واضح نہیں ہو جاتی۔ ہماری گزشتہ نسل کو یہ سب بخوبی معلوم تھا لیکن آئندہ نسل کیلئے فٹ نوٹوں میں اشارے کرنے پڑیں گے۔ میں نے نازکی صاحب سے گزارش کی تھی اور وہ بھی اپنی کتابوں کے نئے ایڈیشنوں میں ایسا کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ اس کیلئے میں نے اپنی خدمات کی

بھی پیشکش کی تھی۔ بہر کیف ان قطعات کی Durability اتنی زبردست ہے کہ بعض کے نقل کرنے سے معاملہ پیش نظر ہوسکتا ہے

دۆ پکھ   ملکس   بَناوُتاز   دستوٗر

أنکھ رئٹ رئ سرکأری کارٕ تہٕ گرٕ ژۆر

کمن جانانہٕ انسانن کرٕ کھ زٕٹ

کمن صدر الصدورن وٕژھ کلٕس لور



جواہر لال سُودس پیٹھ أنان دِیار

وٕنن ۂدون کوٗرکھ اُستان لوٹکھ

اورسیرن سبداں ورٕ لیس اندر کار

کوٗرکھ اولودِ دؤل معصوم حورن

بڈٕبن صابن بنان یأری گنداں زار

رشیدن شامہٕ زوٗنن شابہٕ گاڈن

مےٚ مسکینس ستن پیرٕبن تھوٕن لار

غنی صأبن سوگأمکی گیلہٕ ژورَن



دپان مخدوم صأبن وۆن میرزٕ صأبس

ووٕں گو استان دیواں خانہٕ سیٚتے رٕہیو

دِوری گنہٕ ، سنگِ مرمر، جار ، فانوس

مےٚ ہیوہ نَے گوکھ کور تھس پانہٕ سیٚتے ہیوٚہ

ان رباعیوں میں طنز ہے لیکن جہاں طنز نہیں ہے بلکہ مزاح، وہاں یہ اس قدر پُرلطف ہے کہ کرداروں کے اصل نمایاں ہوتے ہیں اور دورن پردہ انسانوں کی حماقتوں کے فوارے پھوٹ پڑتے ہیں۔ اکثر مقامات پر غصہ یا خفگی نہیں ہے بلکہ جس کو مزاح کا ہدف بنایا گیا ہے وہ بھی اس کا لطف اٹھانے پر مجبور ہوتا ہے۔ یہ خالص مزاح کی اس صفت کا پتہ دیتا ہے جو نازکی کو حاصل ہے اور شاید یہ اس جاندار اور Pristine صورت میں کسی اور شاعر کے پاس موجود نہیں ہے جو دانشوری، مشاہدہ اور مزاح کی آمیزش سے کسی ادب کا حاصل بن جاتا ہے۔ نازکی کی سماجی مناظر کی نقاشی میں یہ موجود ہے۔

گرِکی ناساز چھم بیمار چھم ماس یہ چھے اَکھ وعظۂ مجلس ایہاالناس
پُرِوتھی کلمہ ساساہ اُسی کروناس وُتھو کانہہ آنہٕ اکتاجی کرو جمع



وَنے کیاہ زن تمن شوٗٹھن بباہ آو دیان گامس اندر قادر صُبا آو
نیازن ڈیرِ گےٚ، کوکرن وو باہ آو زنانو واجہ انہٕ، مردو وَکوگوٗکنٕز

مزاح نگاری کا یہ ہلکا اور لطیف احساس شاعر کو اس کے آس پاس بلکہ اپنی عزیز قوم کو بھی ہنسنے کا موضوع بناتا ہے۔ اس میں کوئی کینہ وری نہیں بلکہ اپنے آپ کو پہچاننے اور اسے صحیح فریم میں بند کرنے کی کوشش...... کشمیریوں کے ذہین اور شریف، ہنرمندی اور چرب دست ہونے کا ذکر بلہن، کلہن، شیخ صرفی، اقبال اور مہجور تک بہت سے کشمیریوں اور کشمیر شناسوں نے کیا ہے۔ مگر نازکی کا یہ انداز بالکل الگ ہے اور اس میں اس کے مزاج کا سیاہ وسفید بہت ہی خوبصورت الفاظ میں کیا گیا ہے۔

چھ پھر فرفیزن اندر انگریز کوشُر
اَتھو کنۍ سوٚت، کتھو کنۍ تیز کوشُر
بنٛتھ حاکم دباوان میز کوشُر
لماں ریڈس ، گنواں گل ریز کوشُر

یہ سرچ لائٹ اور یہ نظر، قوم کے بعد اُن کے اپنے وجود پر بھی مرکوز ہوتی ہے۔ اُن کی شاعرانہ Integrity پامال سرحدوں کو ریزہ ریزہ کرتی ہے اور وہ اس بُت شکن انداز میں اپنے متعلق لکھتے ہیں۔

مےٚ پتہٕ تنقید گژھہ میانس کلامس
دپن یہ چھُ کاشرٕ یک رومی تہٕ رازی
سیاہ کارس دپن دِل چھُس پرٛانوار
سوخن سازی چھ بڈہش جعلسازی

نازکی صاحب کی رباعیات کے تین مجموعے اِس صنف پر اُن کا حاکمانہ کمال ظاہر کرتے ہیں۔ انہوں نے بعض غزلیں بھی لکھیں جو اُن کے آخری کلیات ''کاوہ پیٚنہٕ وول'' میں شامل ہیں۔ جس میں وہ شاندار لیکن لرزہ براندام غزل بھی شامل ہے جس کا ایک مصرعہ یوں ہے۔

نجدٕ ون دوٚد، لاَل ڈز تے لاَلہِ ہندزا نپانہٕ دوٚد

اردو غزل میں کامیاب رہنے کے باوجود انہوں نے کشمیری غزل کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔ انہیں آزاد نظم اور دیگر تازہ اصنافِ سخن زیادہ متاثر نہیں کر سکیں اور نہ انہوں نے کشمیری کا نیا رسم الخط سوفی صد قبول کیا۔ وہ معاصر کشمیری ادب کا آخری مستند کنزرویٹو تھا اور ایسے ہی لوگ زبانوں کی حرمت کے ضامن ہوتے

ہیں۔ کہنے میں ہنسنا، رونے کا ایک معکوس روپ ہوتا ہے اور Cloan وقت کا سب سے غمناک انسان ہوتا ہے۔ ناز کی صاحب کا کلام اس چیز کی تفسیر ہے۔ کشمیر میں گزشتہ تقریباً دو دہائیوں سے جو صورتحال درپیش رہی اس کا عکس ناز کی کے کلام میں موجود ہے جو آنے والوں کو اس کے زہر آب تاثر سے آگاہ کرتے رہیں گے۔ ایسے اشعار اُن کی تمام کتابوں اور خاص طور سے ''کاوہ ییْنہ وول' میں موجود ہیں۔ میں اس بارے میں اُن کی نظم ''بار خدایا'' پڑھنے کی خاص سفارش کروں گا لیکن اس سے اہم بات مجھے یہ کہنی ہے کہ انہوں نے ۱۹۸۷ء میں ایک غزل لکھی، جب کشمیر بظاہر ٹھیک ٹھاک تھا۔ یہ غزل ظاہر کرتی ہے کہ شاعر کا باطن وہ آئینہ ہوتا ہے جس میں بقولِ اقبال پیش آنے والی وارداتوں کا پَرتَو موجود ہوتا ہے۔ یہ غزل اتنی ہیبت ناک ہے کہ کشمیر کے موجودہ شہر آشوب کا کوئی بھی واقعاتی اور صحافتی بیان اس کے قریب نہیں آسکتا۔ چند اشعار۔

پاسِ اٗخر ہنگہٕ تہٕ منگہٕ لوٗگ نار پٕرتھ کانہہ خانہٕ دۄد
باغ دۄد، صحراو دۄد، گلزار دۄد، واٗرانہ دۄد
نارٕ وُزمل درایہ گاہ پھو عالمس ہیٚیہ ژھایہ روز
پانہٕ میانے کیا وَنے کھُل دۄد تہٕ کمہ عنوانہٕ دۄد
شرووئ دٕک متہٕ سینہٕ منزٕ یلہِ راتھ مجلونن ووشا
نجدٕ وُن دۄد، رُوسی کٕٹ دٕز، لاٗلہٕ ہند زانپانہٕ دۄد
(کشمیری سے ترجمہ)



غلام نبی خیالؔ

نازکی صاحب اور چند یادیں

میں ۱۹۵۴ء میں ریڈیو کشمیر سرینگر میں نیوز ریڈر اور اناونسر کی حیثیت میں ملازم ہو گیا۔ اُن دنوں یہ نشریاتی ادارہ وادی کشمیر میں ادب، فن اور ثقافت کا ایک قابلِ توجہ گہوارہ بن چکا تھا جہاں ریاست اور بیرون ریاست کے چیدہ، چیدہ ادیب شاعر اور دانشور مختلف عہدوں پر اپنے فرائضِ منصبی کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ شعر و سخن کی بھی آبیاری کر رہے تھے۔ ان میں میر غلام رسول نازکیؔ۔ عبدالحق برق، علی محمد لون، سُہیل عظیم آبادی، شفیع شفائی، پران کشور، پُشکر بھان، وی ایس این کیمفر، کنول نین پرواز، غلام حسن اعجاز، بشیر بٹ اور اسی قبیل کے دیگر اہل علم و دانش شامل تھے۔

اُنہی دنوں وزیر اعظیم بخشی غلام محمد کی ہدایت پر جشنِ کشمیر کا ایک طویل مگر دلچسپ سلسلہ شروع کیا گیا اور نازکی صاحب کو ادبی کمیٹی کا سیکرٹری نامزد کیا گیا۔ نازکی صاحب کے ذمہ خاص طور وادی کے طول و عرض میں مشاعروں کا اہتمام کرنا تھا جو ڈورُو شاہ آباد سے لے کر سوگام لولاب تک

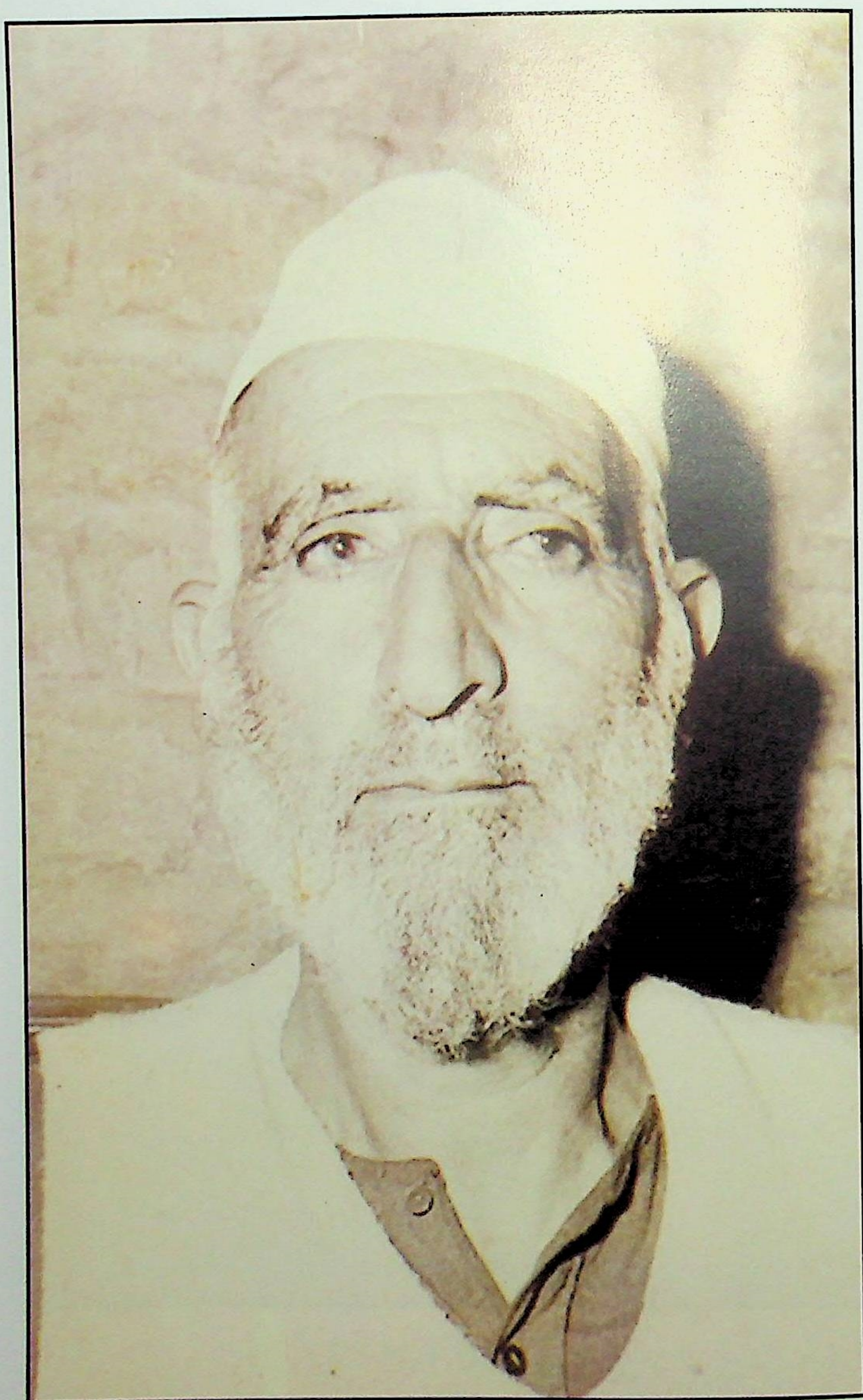
منعقد ہوا کرتے تھے۔

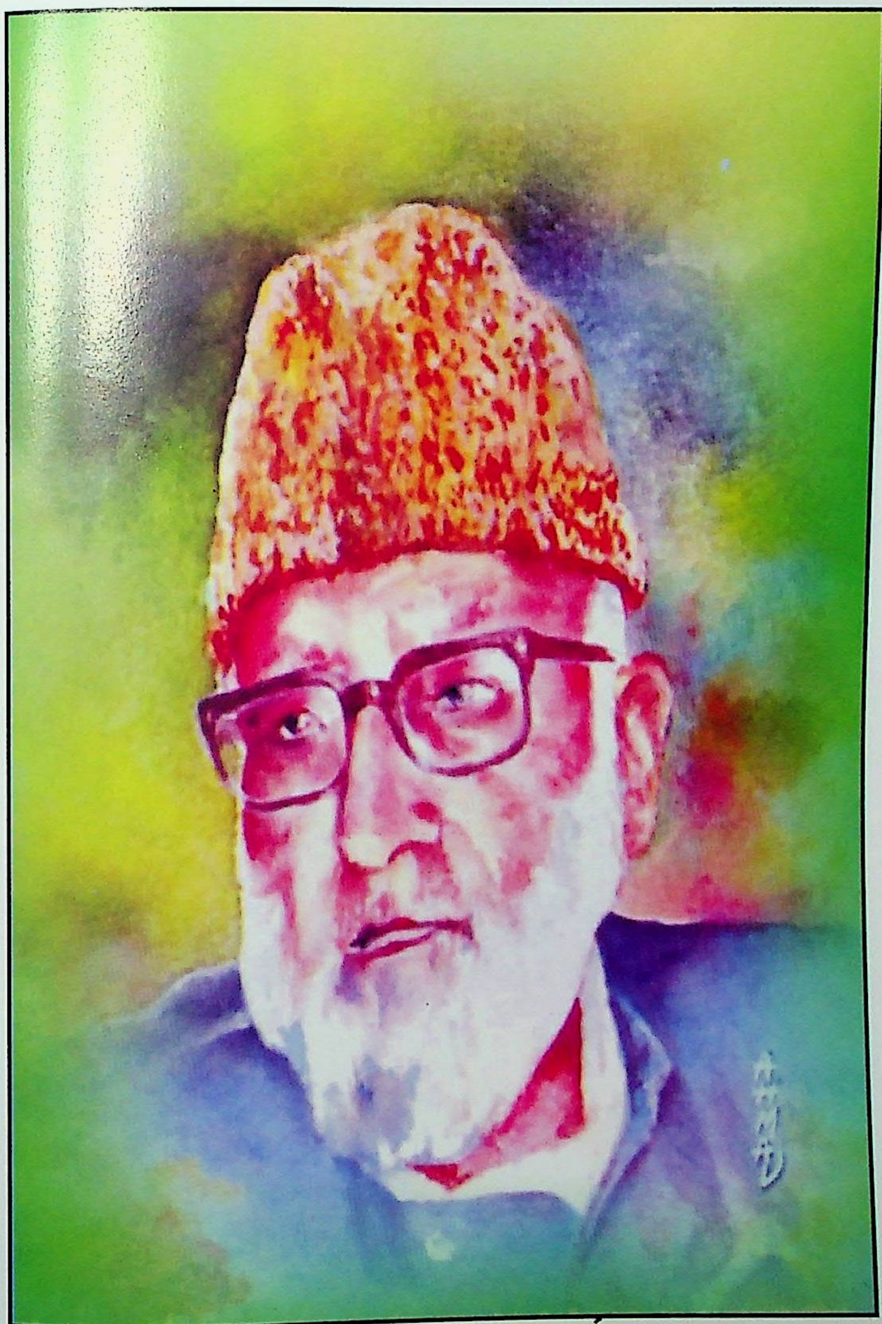
میں نے انہی دنوں دُنیائے سخن میں قدم رکھا تھا لیکن نازکی صاحب کی طرف سے جب مجھے سبھی مشاعروں میں شرکت کے لئے پے در پے دعوت نامے موصول ہونے لگے تو مجھے بھی متوقع طور پر یہ گمان ہونے لگا کہ ہم بھی سخن گو ہیں۔

اِن مشاعروں میں شعراء کی بھرپور شرکت۔ لاتعداد لوگوں کی شمولیت اور خاص کر بخشی صاحب کی بذاتِ خود موجودگی ایک ہنگامہ خیز ماحول پیدا کرتی تھی۔ یہ سلسلہ شعروشاعری کبھی کبھی رات گئے تک جاری رہتا تھا اور بخشی صاحب بعض اوقات اپنی نشست سے اُچھل اُچھل کر شاعروں کی داد دیتے تھے۔ مشاعرے میں شاعر کی شرکت کا اعزازیہ پچیس روپے تھا۔

اُنہی دنوں نازکی صاحب کے ساتھ میری شناسائی کا آغاز ہوا۔

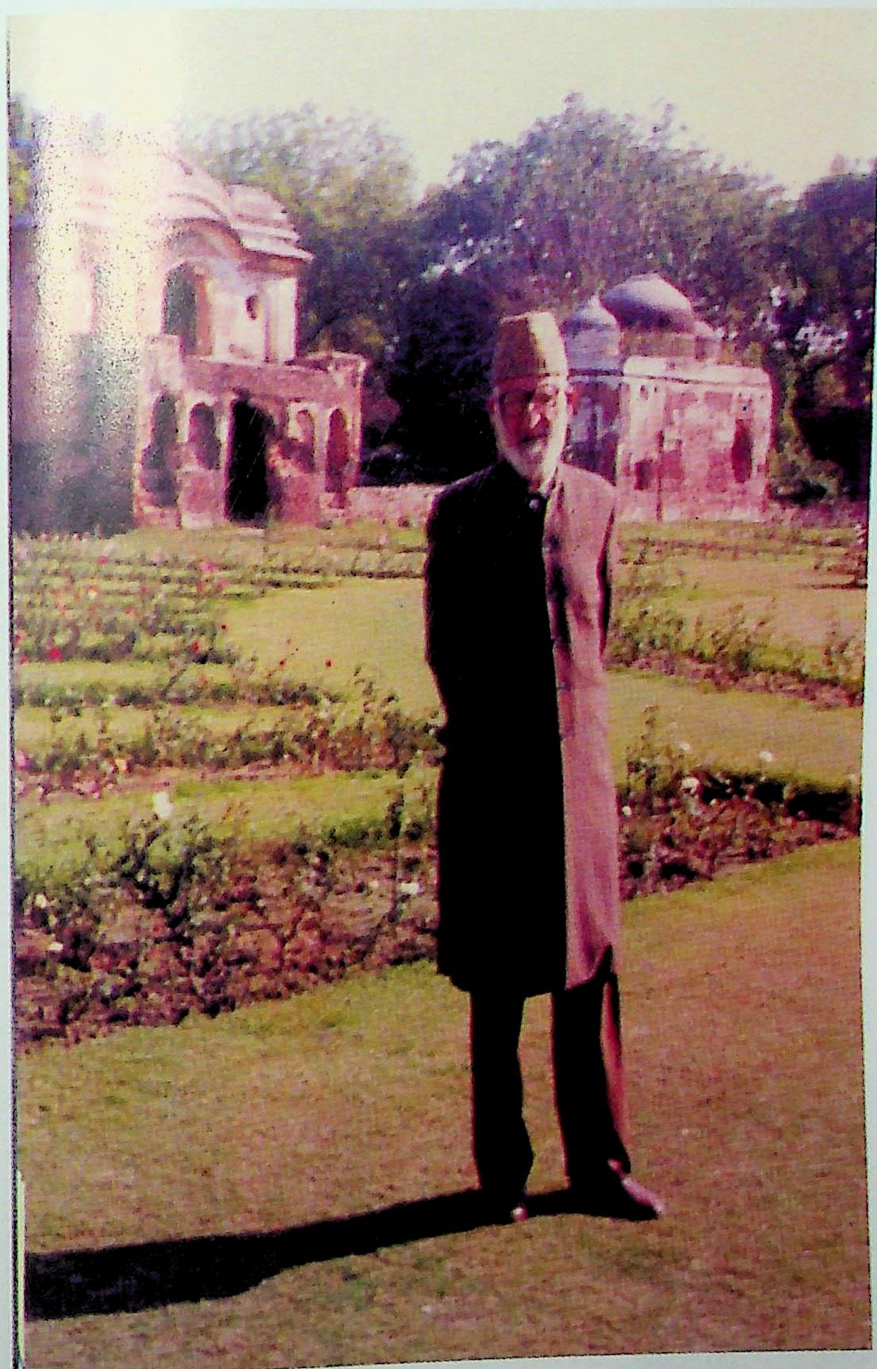
ایک دوبار جب میں چند وجوہات کی بنا پر ان مشاعروں میں شامل نہیں ہوسکا تو نازکی صاحب بظاہر مجھ سے ناراض ہوئے۔ ایک بار وہ ریڈیو کے نیوز رُوم میں داخل ہو کر ہمارے نیوز ایڈیٹر مرحوم جگن ناتھ ولی سے اس طرح میری شکایت کرنے لگے۔ ''دیکھو اِس سادہ لوح نوجوان کو، مُشاعروں میں آتا ہی نہیں، شاید اسے معلوم نہیں کہ پچیس روپے کوئی چھوٹی رقم نہیں ہوتی، ساتھ ہی یہ کہ میں اسے یہاں کے ادبی حلقوں میں متعارف کرانا چاہتا ہوں کیونکہ اس میں مجھے ایک رَمق نظر آتی ہے۔ لیکن اسے دیکھو کہ اپنے ہی نخروں میں اُلجھا ہوا ہے۔'' اس کے بعد میں ہر مشاعرے میں سب سے پہلے پہنچ جاتا تھا اور بعض اوقات تو بن بُلائے بھی حاضر رہا، اگرچہ نازکی صاحب نے اُن مواقع پر بھی



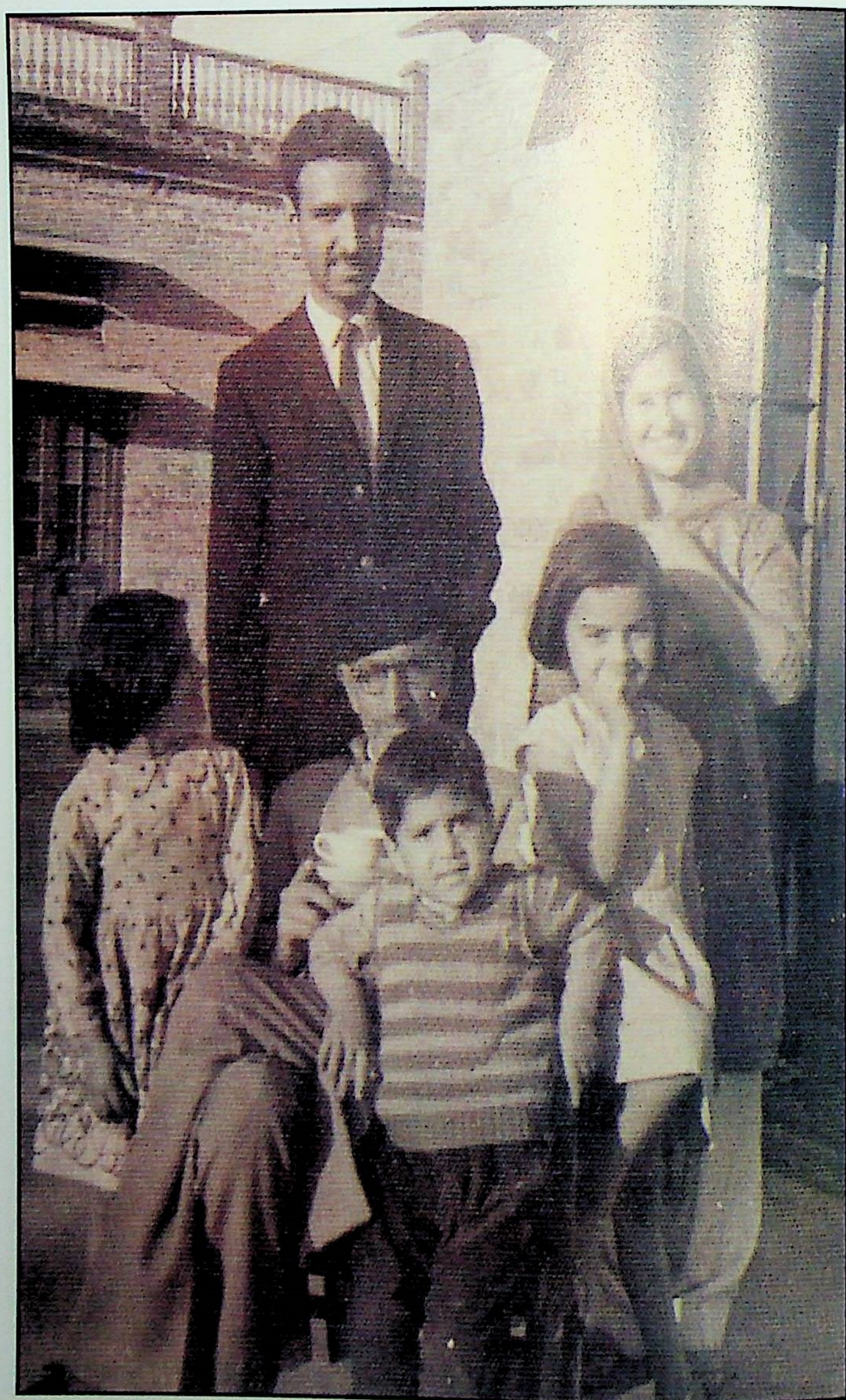


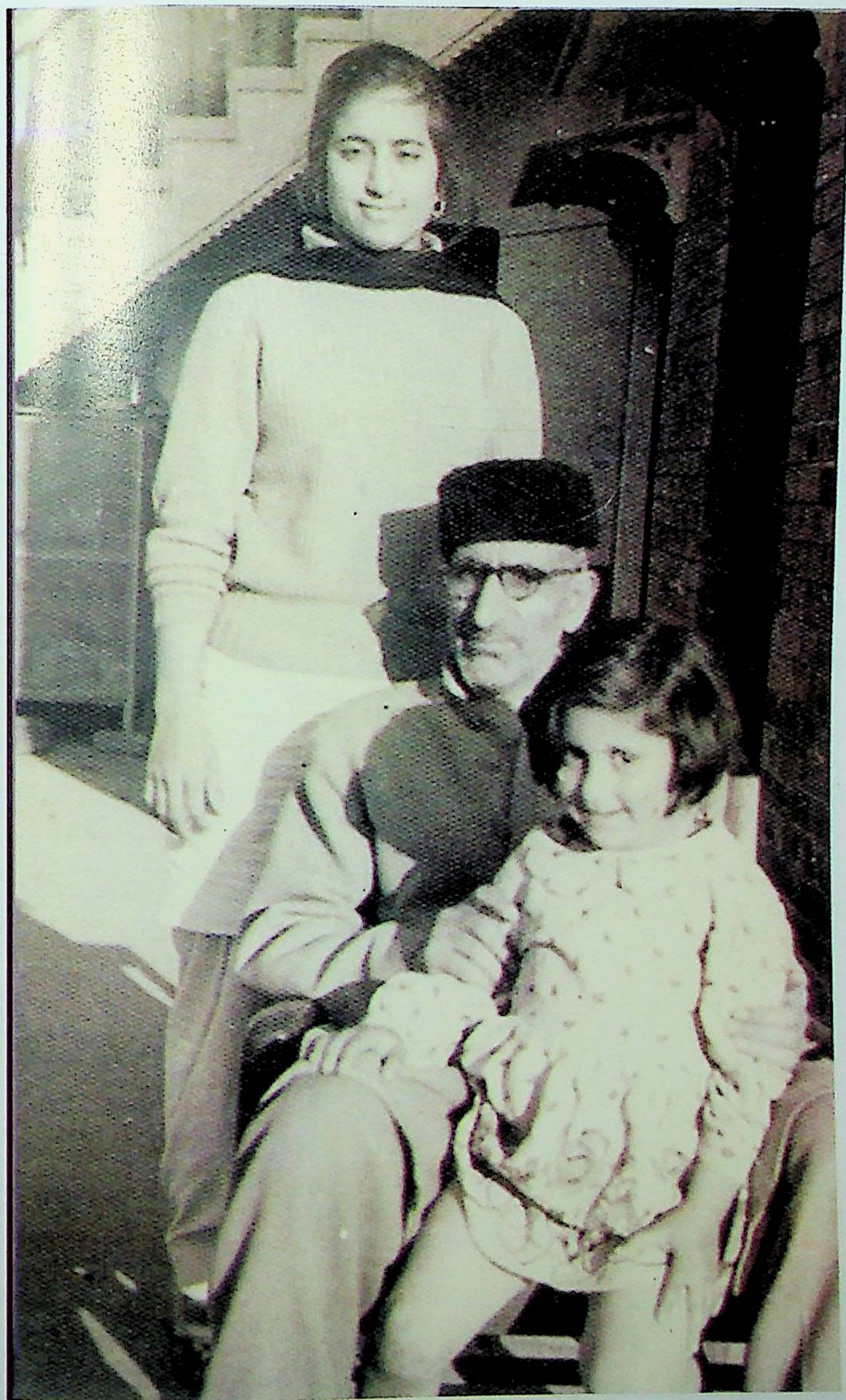
میر غلام رسول نازکیؔ ۔ سرکردہ آرٹسٹ جی، احمد کی نظر میں۔

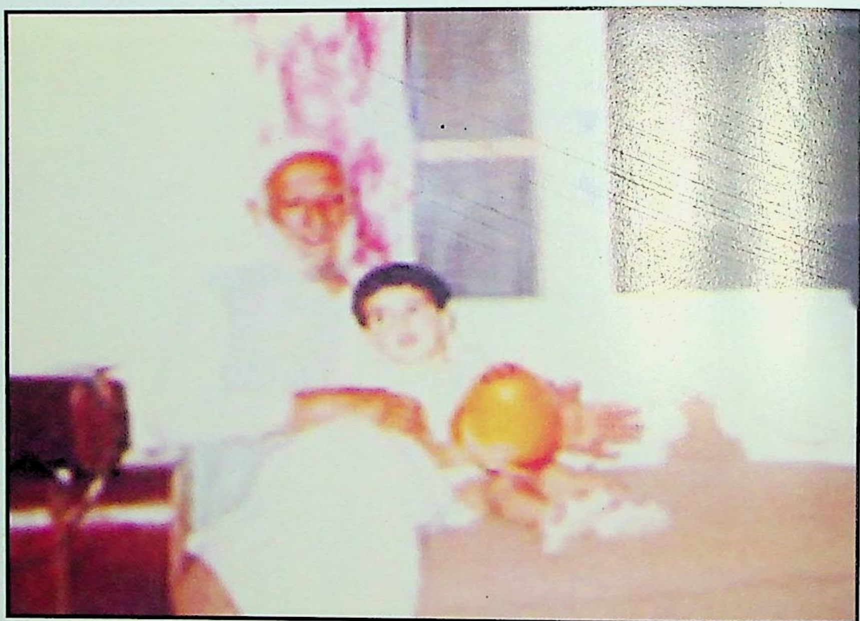




لودھی گارڈن میں۔

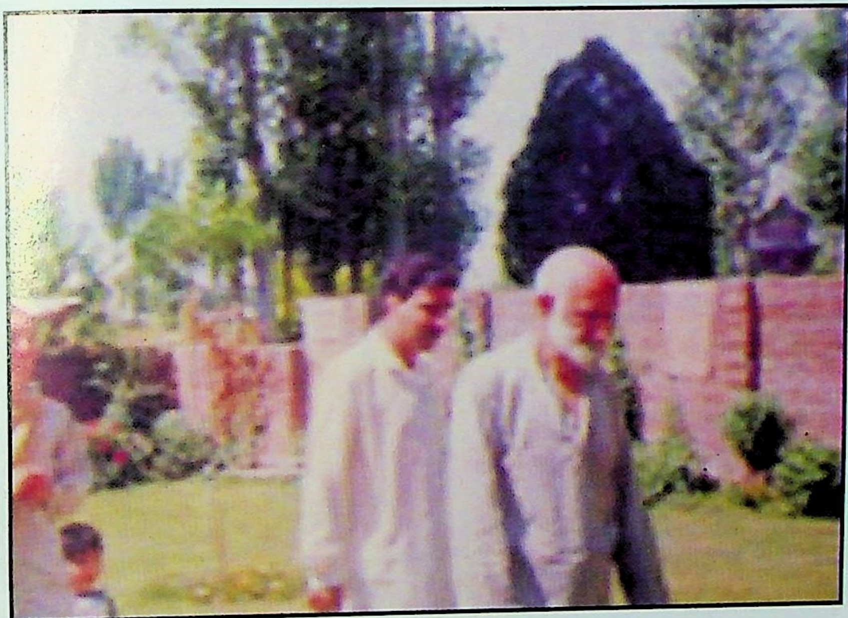


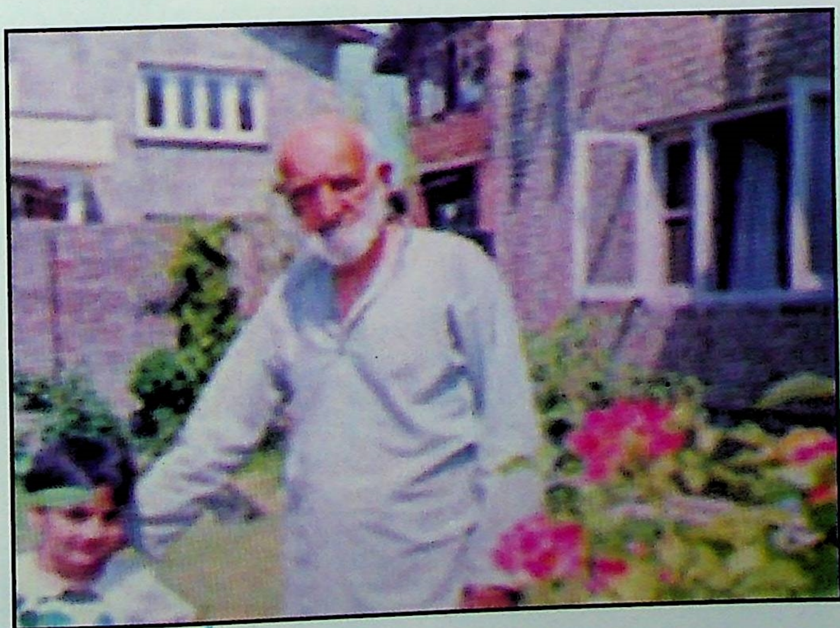


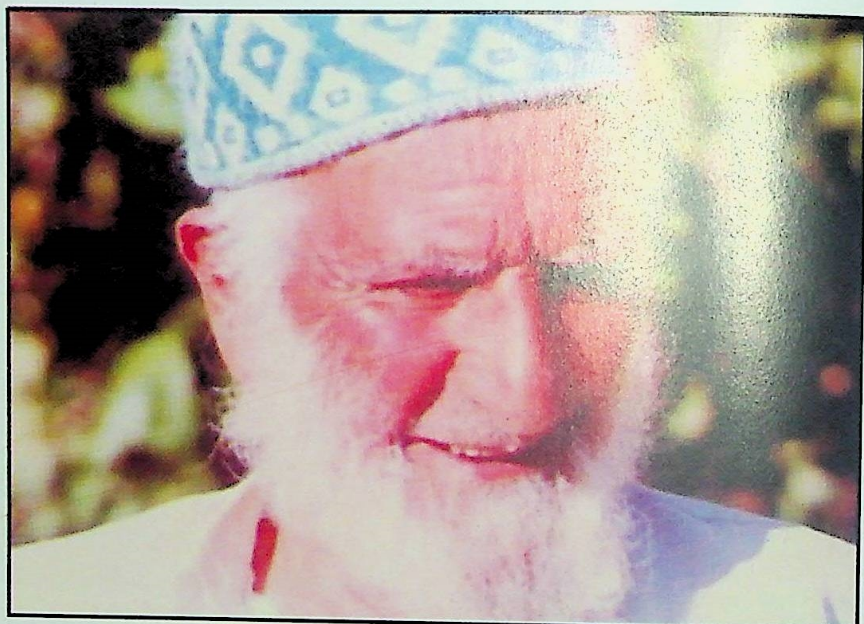




نشریات کے شعبے میں نازکی صاحب کی خدمات کے اعتراف میں ریڈیو کشمیر کا خاص ایوارڈ۔

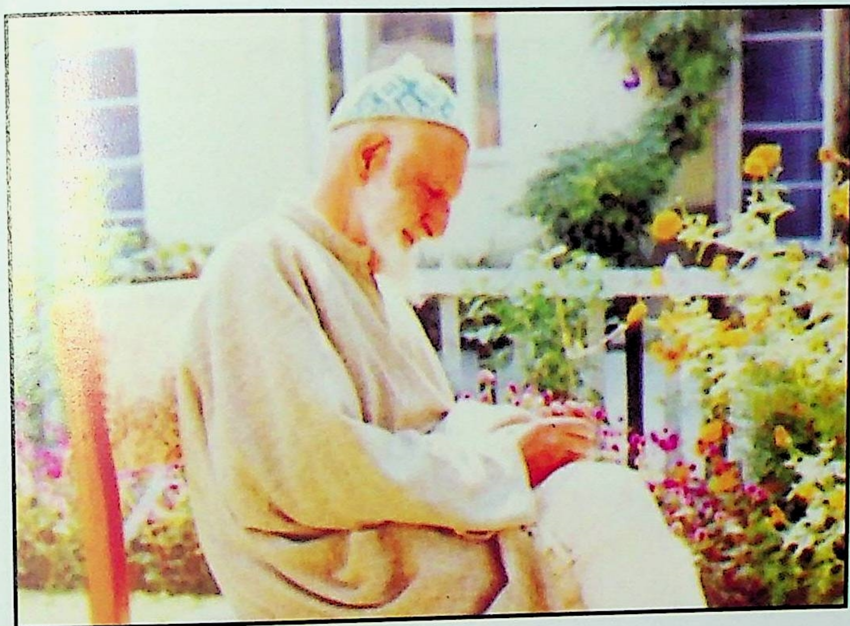




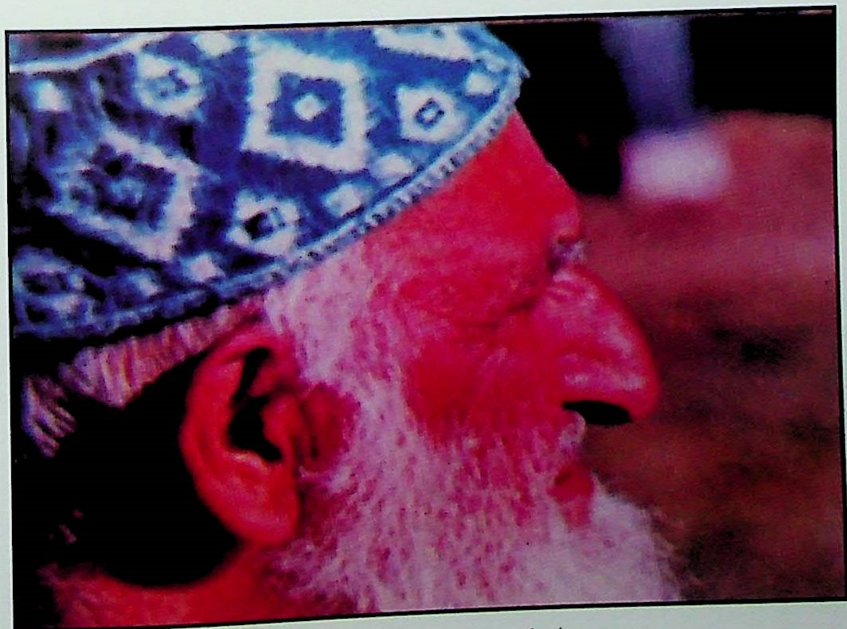




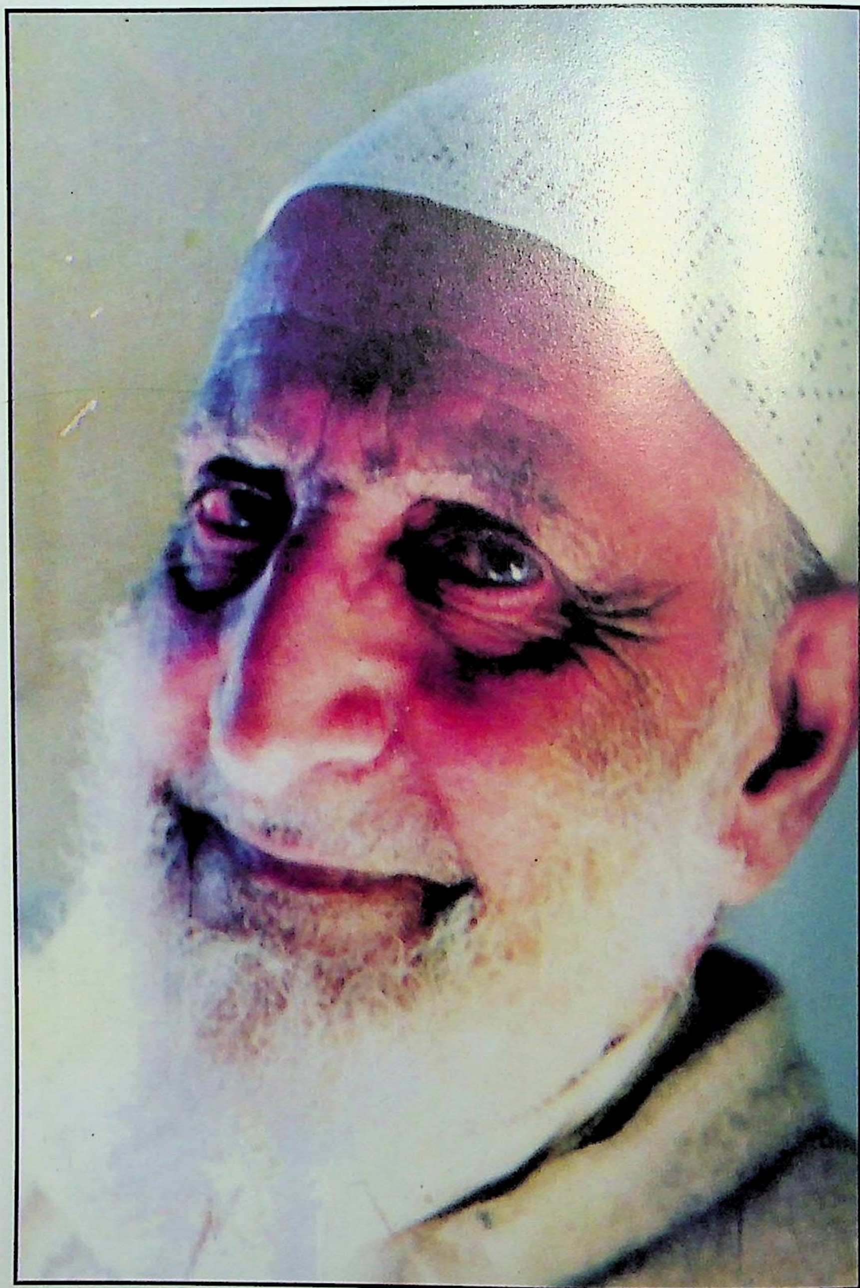
نازکی صاحب۔ افرادِ خانہ کے ساتھ۔



پھولوں کے ساتھ لگاؤ۔



نازکی صاحب۔ایامِ پیری۔



میر غلام رسول نازکی ۔



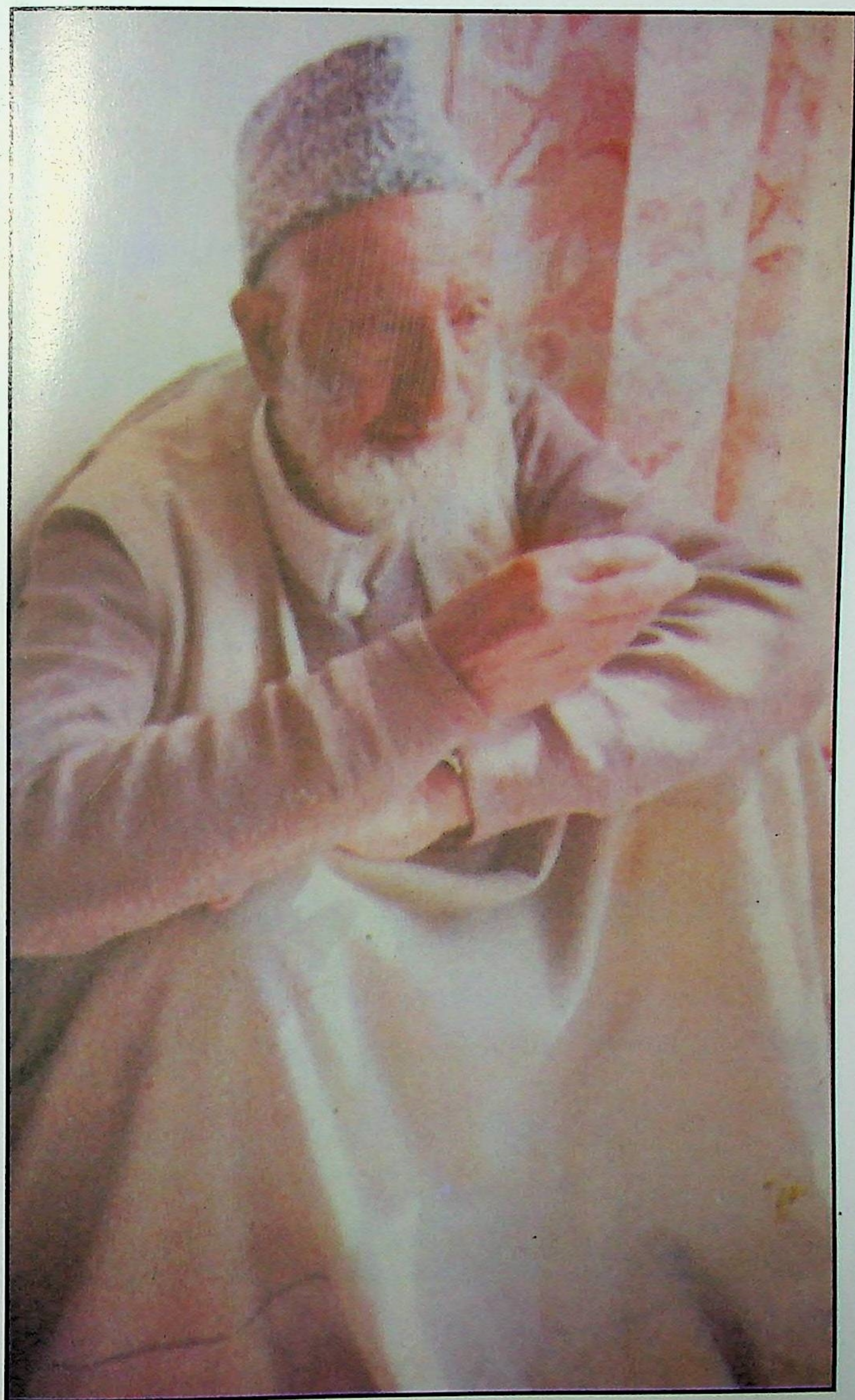
مرقد میر غلام رسول نازکی ۔

وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ
لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ

(العنکبوت ۶۴)

اور بے شک آخرت کے گھر ہیں ہمیشہ کی زندگی
ہے، کاش یہ لوگ اتنا ہی سمجھ لیتے

نازکی صاحب کی رہائش گاہ واقع کاٹھی دروازہ، رعناواری میں موجود سنگ مرمر کا ایک کتبہ۔



مجھے معاوضہ سے محروم نہیں رکھا۔

ایک بار کا ذکر ہے کہ جگر مراد آبادی ایک کل ہند اُردو مشاعرے میں شامل ہونے کی غرض سے کشمیر آئے اور نازکی صاحب کو انہوں نے اپنی ایک غزل اپنے مخصوص اور خوبصورت خط میں تحریر کر کے تحفتاً عطا کی۔ مجھے یاد ہے کہ جب ریڈیو کے ایک کمرے میں جگر صاحب نے تختی اور کاغذ لے کر اس غزل کو قلم بند کرنا شروع کیا تو پروفیسر جیالال کول نے، جو اُس وقت ریڈیو میں مُشیر برائے کشمیری تھے احتراماً جگر صاحب کی تختی کو سنبھال کر اُنہیں سہارا دینے کی کوشش کی لیکن جگر صاحب نے فوراً ہاتھ جھٹک کر وہ تختی نازکی صاحب کے ہاتھ میں تھما دی اور غزل مکمل کر لی جو آج بھی ایک نادر نمونے کی شکل میں خانوادہ نازکی صاحب میں ایک خوبصورت فریم میں محفوظ ہے۔

نازکی صاحب جب مشاعروں میں اپنے منفرد انداز کے ترنّم کے ساتھ اپنا کلام پڑھتے تھے تو وہ اکثر بیشتر اپنا کشمیری کلام بالخصوص رُباعیات سناتے تھے۔ انہوں نے کئی بار میرے سامنے یہ اظہارِ تأسّف کیا کہ میری آواز ترنّم سے خالی ہے اور میں تحت اللفظ ہی پڑھتا ہوں، ورنہ بقول اُن کے ''ایک خوبصورت چہرے کے ساتھ خوبصورت ترنّم تو سونے پر سہاگہ کا کام دیتا''۔

ریڈیو میں میری ملازمت کے دوران انہوں نے کئی بار مجھ سے میرا کلام سننے کی فرمائش کی اور قدم قدم پر وہ میرے ناپختہ اشعار کی نوک پلک خود ہی درست کر کے کہتے۔ ''اب دیکھو تمہارا یہ شعر کیا سے کیا ہو گیا۔'' واقعی پارس پتھر کو چھُو لے تو وہ سونا بن جاتا ہے۔

اُن کی اسی خیال نوازی کے پیشِ نظر میں نے اشاعت سے پہلے اپنا

عمر خیام کا کشمیری ترجمہ اُنہیں مسودہ کی شکل میں دکھایا اور انہوں نے کئی ہفتے تک دل لگا کر اس کی اصلاح کی۔ یہ اصلاح دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ایک اُستاد کی رہبری ایک نو وارد بساطِ ادب کو مجلس ادب میں ایک اعلیٰ مقام پر براجمان کرنے کا باعث بن سکتی ہے۔ بعد میں جب یہ ترجمہ ۱۹۶۳ء میں کتابی شکل میں اشاعت پذیر ہوا تو انہوں نے اپنے ان مختصر سے تبصراتی کلمات میں اس کی رعنائی اور زیبائی کا ان الفاظ میں اعتراف کرلیا۔ ''یہ بات واقعی قابلِ تحسین ہے کہ عمر خیام کی رُباعیات کا یہ کشمیری ترجمہ پڑھنے کے بعد آدمی ایک قسم کی تشفی محسوس کرتا ہے تشنگی نہیں۔ میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ یہ ترجمہ کشمیری ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ کہیں کہیں ایسا گمان ہوتا ہے کہ خیالؔ صاحب نے حُسن بیان، شعر کی لطافت اور استعاروں کے لطیف استعمال میں عمر خیام پر بھی سبقت حاصل کرلی ہے''۔

یہ اللہ کا کرم اور مرحوم و مغفور کی عنایت ہے کہ اُنہیں مجھ سے بے حد شفقت تھی۔ جب بھی ہم ریڈیو میں یا اکادمی میں ملاقی ہوتے تو وہ پہروں تک میرے ساتھ ادب اور دیگر غیر ادبی موضوعات پر اطمینان سے باتیں کرتے رہتے اور اس گفتگو کے دوران میں اُن کے بے مثال حافظہ کی ودیعت سے مبہوت ہو کے رہ جاتا جو خدا شاذ و نادر ہی اپنے کسی بندے کو بخشتا ہے۔ اُنہیں ہمیشہ یہ شکایت رہتی کہ معاشرے میں اور خاص کر ثقافتی دُنیا میں عامیانہ پن روز بروز غالب آتا جا رہا ہے۔ تعلیمی طور پر سند یافتہ لوگ خواندہ تو کہلائے جاسکتے ہیں مگر اُن میں سے اکثر و بیشتر علم و دانش کے زیور سے آراستہ نہیں تھے۔ اس دوران وہ سگریٹ پر سگریٹ پھونکتے اور غالباً ہر

عذاب دہ احساس کو دھوئیں میں اُڑاتے۔

نازکی صاحب کی وفات کے پورے ایک سال بعد یعنے ۱۶/اپریل ۱۹۹۹ء کو ریڈیو کشمیر سرینگر کے آڈیٹوریم میں مرحوم کے لئے ایک یادگاری تقریب ہوئی جس میں کئی ادیبوں اور دانشوروں کے علاوہ ڈاکٹر فاروق عبداللہ اور پروفیسر سیف الدین سوز بھی موجود تھے۔ میں اس تقریب پر مرحوم کے ایک فرزند ڈاکٹر ایاز رسول کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ باتوں باتوں میں اُس نے مجھے اپنے والد کا ایک واقعہ سنایا جس سے میں نازکی صاحب کی طرف سے آنے والے فون سے پہلے ہی آگاہ تھا لیکن فون کے پسِ پردہ دولت کدہٗ نازکی صاحب میں ہونے والی باتیں ایاز رسول نے اس طرح دوہرائیں

''مارچ ۱۹۹۸ء کی ایک شام تھی۔ والد محترم نازکی صاحب صاحبِ فراش تھے۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں اُنہوں نے ناتوانی کے باعث دوسروں کے ساتھ ٹیلی فون پر بھی بات کرنے کا سلسلہ ختم کیا تھا۔

''اُس وقت وہ آپ کی کتاب'' اقبال اور تحریکِ آزادی کشمیر'' کے مطالعہ میں مصروف تھے۔ میں اور بھانجے نعیم اختر اُن کے پاس خاموش بیٹھے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ اس کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے اُن کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

''اچانک انہوں نے نعیم سے کہا، خیال صاحب سے ٹیلی فون پر بات کراؤ، جب فون پر رابطہ ہوا تو نازکی صاحب نے خیال کو ایسی شاندار کتاب لکھنے پر بے تحاشا مبارک باد دی،۔ نازکی صاحب کی طرف سے کسی دوست کے ساتھ فون پر بات کرنے کا یہ عمل ایک طویل عرصے کے بعد ظہور پذیر ہوا تھا۔

”جیسا کہ ہم ان دونوں کی گفتگو سے اخذ کر سکے آپ شاید نازکی صاحب کی تعریف و تحسین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اُن سے کہہ رہے تھے کہ وہ تبرکاً اس کتاب کے بارے میں تحریری طور اپنے خیالات عنایت کریں۔نازکی صاحب نے جواباً آپ سے کہا اور آپ کو یاد ہوگا کہ ”واللہ میں بات بھی ٹھیک سے نہیں کر پاتا۔ یہ اس کتاب کے مطالعہ کا معجزہ ہے کہ مجھ میں ایک نئی قوتِ گویائی پیدا ہوئی اور میں آپ سے بات کر رہا ہوں۔اللہ نے چاہا تو ضرور لکھوں گا لیکن محسوس ہوتا ہے کہ اُس سے پہلے ہی اللہ کو پیارا ہو جاؤں گا“۔

”آپ کے ساتھ فون پر اُن کی باتیں کچھ لمحوں تک ہوتی رہیں۔ پھر نازکی صاحب ہم سے کہنے لگے کہ ایک عرصے کے بعد ایک بہت ہی اچھی کتاب پڑھنے کا موقعہ نصیب ہوا ہے۔خیؔال صاحب نے اس موضوع کے ساتھ نہایت دیانتداری سے پورا انصاف کیا ہے اور ایک بیش بہا اور قابلِ قدر تصنیف ہم تک پہنچائی ہے۔“

”نازکی صاحب اس کے صرف ایک ماہ بعد ۱۶؍ اپریل کو انتقال کر گئے۔“

میں ان چند سدابہار یادوں کو میر غلام رسول نازکی کے تئیں اپنے تحریر کردہ اس منظوم خراجِ عقیدت کے ساتھ اختتام تک لاتا ہوں۔

نزاکت شاعری کی نازکی ہے
جو کچھ اُس نے کہا حرفِ خودی ہے
قلم اُس کا جو تھا آوازِ دل تھا
سخن اُس کا پیامِ زندگی ہے

ڈاکٹر عزیز اندوری

نازکی صاحب......اندور میں

اب سے تقریباً چالیس برس پہلے......
اندور کی سماجی، ثقافتی، ادبی اور شعری فضا کچھ اور تھی۔
کتنی تبدیلیاں آگئیں۔ دیکھتے دیکھتے اندور ملک کا بڑا شہرہ بن گیا۔
مگر لوگوں کو حالات نے چھوٹا اور بہت چھوٹا بنا دیا۔ فاصلے ہی فاصلے۔
ہر طرف بھاگ دوڑ......زندگی کی تیز رفتاری نے ایک دوسرے کو دور کر دیا

بہت دور...........

مگر چالیس برس پہلے کا اندور اب بھی میری آنکھوں کے سامنے رقصاں ہے۔ سائیکل اٹھائی اور نکل پڑے۔ کوسوں کا سفر بھی آسان سا لگتا تھا۔ نہ سڑک پر بھاگم بھاگ تھی نہ شور شرابا۔ اپنی مستی میں مگن جا نکلتے جدھر بھی فن ہوتا۔

ریڈیو اسٹیشن اپنے گھر سے دور ضرور تھا۔ مگر نازکی صاحب کی وجہ سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ رہا۔ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کب ان کے ''درِ دولت'' پر پہنچ جاتے۔

''کال بیل'' کے بجتے ہی ایک قد آور شخص کے دیدار ہوتے۔ پُرکشش

چہرے کے ساتھ جب وہ سامنے آتے تو بس انہیں دیکھتے ہی بنتا۔ کھوسا جاتا تھا انھیں دیکھ دیکھ کر نہیں تو...... پھر زیرِ لب تبسم۔ آنکھیں استقبال کا سراپا بنا جاتیں۔ ڈرائنگ روم کی سجاوٹ دیکھ کر ان کی نفاست کا قائل ہونا پڑتا۔ ہر چیز اپنے مقام پر سجی سجائی دیکھ کر نازکی صاحب کی نفیس طبیعت کا احساس ہو جاتا۔ وہ ہاتھ پکڑ کر کرسی کی طرف لے جاتے......اور فرماتے......''بیٹھیئے......مزاج تو بخیر ہے نا......''

انھوں نے کبھی نہیں پوچھا'' کیسے آنا ہوا......؟'' کہ اس جملے سے تکلّف کی ؤ آتی ہے۔

ہمارے ایک دوست ہیں احمد نور...... چندری کی دوکان ہے ان کی......ان کا پیغام آجاتا......'' چلے آوَ؟ نازکیؔ صاحب تشریف لائے ہیں۔'' اور میں دوڑا دوڑا چلا جاتا......اور بھی چند احباب آجاتے......شعر و ادب سے لے کر نجی گفتگو کی محفل جمتی ......ریڈیو کا ایک افسر اور احمد نور کی دوکان پر۔ لیکن یہ افسر کم'' دوست'' زیادہ تھے۔ ہم جیسے'' نوجوانوں'' سے باری کا اظہار کر بیٹھتے۔ بلا ناغہ تو نہیں۔ مگر شہر کی طرف ان کی آمد ہم سب کے لئے مسرّت کا سبب بنتی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا افسری کا زعم نہیں بلکہ دوستی کی چاہت انھیں اس طرف کھینچ لاتی تھی۔ ایک اچھا خاصہ حلقہ تھا ان کے دوستوں کا......عنبر ہاشمی، شیث ادیبی، دانش ادیبہ، کاشف اندوری...... جسے بھی پتہ چلتا وہ دیوانہ وار نازکی صاحب کی طرف کھینچا چلا آتا۔ خوش گپیاں بھی ہوتیں اور'' ادبی مباحثے'' بھی......نازکیؔ صاحب کی باتوں کو غور سے سنا جاتا...... ان کی ذہنی تر و تازگی سے مستفید ہوا جاتا......ان کی باغ و بہار شخصیّت سے اثر قبول کیا جاتا۔ ان کے خلوص کی خوشبو سے دل و دماغ کو معطر کیا جاتا...... مجھے یاد نہیں کبھی کسی قسم کا'' ٹکراوَ'' سامنے آیا ہو......قدرت نے انھیں'' ٹکرانے'' کے لئے پیدا

نہیں کیا تھا۔ خاص طور کے دوستوں سے ٹکرانے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ نازکیؔ صاحب کے سامنے...... اسی لئے ہر ایک ایک شخص ان کا گرویدہ تھا۔ ان کی آنکھوں کا منتظر۔ کہ وہ اشارہ کریں اور کام ہو جائے۔

ایسے ہر دل عزیز اور محبوب انسان کو اندار کی سرزمین نے جس طرح قبول کیا اس کی مثالیں بہت کم دیکھنے میں آئیں۔

آنے کو تو یہاں ایک سے بڑھ کر ایک ''افسر'' آئے۔ مگر زیادہ تر اپنے ''خول'' میں سمٹے رہے۔ آفیسری کا زعم زیادہ تھا۔ مگر واہ نازکیؔ صاحب واہ......

وہ جب تک اندور ریڈیو سے منسلک رہے، اردو کو اس کا ''مقام'' ملتا رہا اور پھر نازکیؔ صاحب شاعر نواز افسر کبھی کسی ناانصافی یا بے ترتیبی کا شکار نہیں ہوا۔ نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ دوسرے ''افسروں'' کی طرح انھوں نے مخصوص انداز میں مخصوص شخصیات ہی کو نوازا ہو۔ ان کی نگاہِ انتخاب چاروں طرف دوڑتی اور جہاں بھی کوئی ''ہیرا'' نظر آتا...... اُسے تلاشی کر ہی لیتے تھے۔

اندور ریڈیو' جب تک نازکی صاحب رہے، اردو کے جان دار پروگرام کا انعقاد کرتے رہے۔ اسٹیڈیو سے لے کر عوامی سطح پر اردو کی آواز کو دُور دُور تک پہنچانے کی ذمہ داری...... جیسے انھوں نے قسم لے لی تھی...... طرح طرح کی تقاریب منعقد کر کے اردو نوازوں کی چمک دمک سے ماحول کو منوّر کرنے کا ان کا بے بے لوث جذبہ آج بھی یاد آتا ہے۔

کیا زمانہ تھا...... اندور ریڈیو اسٹیشن پر قیصر قلندر' کے۔ کے۔ بہتر، عمیق حنفی بھی یہاں موجود تھے اور جے ڈی بوبجا جیسے اردو نواز ڈائریکٹرز بھی آتے رہے۔ کیسا ماحول تھا۔ اِب عمر کی اس منزل پر تو یہ سب یاد آتے ہیں۔ ماضی' نگاہوں کے سامنے

رقص کرنے لگتا ہے...... برسوں ہو گئے۔ زمانہ کتنا تبدیل ہو گیا۔ سچ ہے ایسے لوگ کہاں ملتے ہیں۔

آج نازکیؔ صاحب کی یاد تازہ ہو گئی۔ یہ تازگی اس وقت تک مہکتی رہی جب تک میرے بزرگم، دوست بقیدِ حیات تھے۔ اکثر ان کے خیریت نامے آجاتے تھے۔ میرا ہی نہیں اندور کے ہر اس دوست کے بارے میں اپنے خطوط میں ذکر فرماتے جنھیں وہ اپنا محبوب سمجھتے تھے۔

آہ! اب ان پرانے دوستوں میں سوائے احمد نور کے کوئی نہیں رہا اور ان سے ملاقات بھی شہر کے فاصلے کی وجہ سے کم ہی ہوتی ہے لیکن جب بھی ہم ملتے ہیں نازکیؔ صاحب (مرحوم کس طرح لکھوں؟) کی باتیں ضرور یاد آتی ہیں۔ ہم دونوں اپنے ماضی کو یاد کرتے ہیں۔ نازکیؔ صاحب کو یاد کرتے ہیں۔...... کاش!...... اے کاش!!...... ہم دونوں جلد سے جلد ملتے رہیں اور نازکیؔ صاحب کی باتوں سے اپنے بجھے بجھے دِل و دماغ کو تازہ کرتے رہیں......



شاعرِ خوش کلام......
............سیّد غلام رسول نازکی مرحوم

سرزمینِ کشمیر کے تعلق سے ایک فارسی شاعر کا یہ شعر حقیقت بیانی کا بڑا نادر نمونہ ہے

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمیں است وہمیں است وہمیں است

یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ اس فردوسِ ارضی یعنی وادیٔ کشمیر کی رنگین بہاروں، روح پرور نظاروں، آگ اگلتے ہوئے چناروں اور سرسبز وشاداب سبزہ زاروں، نیز اونچے اونچے بلند وبالا کوہساروں سے گرتے ہوئے آبشاروں کی رنگینیوں اور بوقلمونیوں سے لطف اندوز ہونے کیلئے دنیا کے گوشے گوشے سے آئے دن ہزاروں اہلِ ذوق، صاحبِ ثروت بندگانِ خدا یہاں کھنچے کھنچے چلے آتے ہیں اور کچھ دن یہاں قیام کرکے دل وجان کو فرحت ومسّرت کا سامان بہم پہنچاتے رہتے ہیں۔ اس فردوس زمین کی تاریخ بتاتی ہے کہ کتنے ہی اہل اللہ صاحبِ

معرفت یہاں آئے اور یہاں کی روح پرور فضاؤں سے متاثر ہوکر بالآخر یہیں کے ہوکررہ گئے۔ کتنے ہی اہلِ علم وقلم نے اپنی خداداد روحانی اور تخلیقی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس سرزمین کو علم ومعرفت اور شعری وادبی خزانوں سے مالا مال کردیا۔ ماضی میں جانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ زمانہ حال ہی کا جائزہ لینے پر معلوم ہوجاتا ہے کہ اس دنیائے حسن وجمال کی سرزمین سے کتنے ہی اہلِ کمال پیدا ہوئے اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے کام لے کر شعروادب کے نادر نمونے پیش کر گئے۔ انہی صاحبانِ کمال میں ایک ہستی جناب سید غلام رسول نازکی مرحوم کی تھی جو اعلیٰ درجہ کے صاحبِ قلم اور نیک خیالات رکھنے والے شاعر تھے۔ مجھے ان سے قربت کی سعادت اس وقت نصیب ہوئی جب وہ ناگپور ریڈیو اسٹیشن میں بحیثیتِ پروگرام اسسٹنٹ کارگزاری کیلئے تشریف لائے تھے مگر کچھ دن ہی قیام کرکے یہاں کی گرمی کی تاب نہ لاکر واپس دہلی چلے گئے۔

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد
روئے گل سیر نہ دیدم کہ بہار آخر شد

جناب غلام رسول نازکی صاحب بڑے ہی نیک دل اور خوش طبع انسان واقع ہوئے تھے۔ ان کی شاعرانہ صلاحیتوں سے ہمارے علاقہ کے تمام اہلِ ذوق حضرات بہت متاثر ومرعوب ہوئے تھے۔ میں انہیں اکثر اپنے کالج کے ادبی وثقافتی پروگراموں میں شریک ہونے کی تکلیف دیا کرتا تھا۔ جہاں آپ اپنے کلامِ بلاغت نظام سے شائقین شعروادب کو مستفیض فرماتے رہتے تھے۔ ان کی شاعری کا عام انداز وہی ہے جسے کلاسیکل کہا جاتا ہے۔ اس میں فنی لوازمات کا پورا پورا خیال رکھا جاتا ہے۔ نازکی صاحب کی کلاسیکل قسم کی شاعری

میرؔ، غالبؔ، ذوقؔ، سودا والی شاعری نہیں ہے بلکہ اس میں حالیؔ اور اقبالؔ والی فنکاری کا عکس صاف نظر آتا ہے۔ان کی تمام تر شاعری میں نہایت مفید اصلاحی اور مذہبی تفکرات کا بھرپور دلکش رنگ و آہنگ اپنی بہار دکھاتا ہے۔ان کے مجموعہ سخن 'متاعِ فقیر' سے ان کی افتادِ طبع، پاکیزہ مزاجی اور زبان و بیان پر مکمل دسترس کا پتہ چلتا ہے۔ بنیادی طور پر وہ غزل ہی کے شاعر ضرور تھے مگر آپ نے حمد، نعت، منقبت اور اسلامی فکر والی نظمیں بھی خوب قلمبند کی ہیں۔انہوں نے اپنے سنجیدہ کلام میں تعمیری اور اصلاحی خیالات کی بھی تصویر کشی کی ہے۔غزل ایک ایسی صنفِ سخن ہے جسے اپنانے والا شاعر دوسری اصنافِ سخن کے مرحلوں سے بھی کامیاب و بامراد گذر جاتا ہے۔لہٰذا نازکی صاحب کے حمدیہ و نعتیہ جواہر پارے بڑے پُرتاثیر ہیں۔ان میں اسلامی فکر اور پاکیزگی خیال کے دلکش نمونے دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتے نظر آتے ہیں۔انہوں نے نعت گوئی میں غزل کے پیکر کے علاوہ مسدّس اور قطعات کے ذریعہ بھی اظہارِ عقیدت حضور سرور کائناتؐ کا حق ادا کر دیا ہے۔وہ ملتِ اسلامیہ کے حقیقی غم خوار تھے۔مسلمانوں کی غم خواری ان کا مقصدِ حیات تھی۔ باالفاظ دیگر وہ حقیقی معنوں سے اقبالؔ کے تصوّرِ مردِ مومن کا عملی نمونہ تھے۔اس لئے ان کا شمار کشمیر کے اسلامی فکر والے بزرگ شاعروں میں بجا طور پر کیا جاتا ہے۔ پاکیزگی فکر و خیال سوز دل اور پاسداری فنِ غزل ان کے امتیازی محاسن میں شامل تھے۔متاعِ فقیر کو ان کے دل کی آواز کہا جاسکتا ہے۔یہ ایک ایسا قیمتی سرمایہ شعری ہے جو بے حد دل پسند اور جاذبِ توجہ ہے۔ نازکی صاحب کی تمام تر شاعری دراصل کلام اقبالؔ کے رنگ و آہنگ کا خوشنما پَرتَو نظر آتی ہے۔اس بیان کی تصدیق کیلئے ان کی درج ذیل غزل پیش کی جاتی ہے۔

جبین ناز کو آسودۂ ملال نہ کر

میں بے ادب ہوں، مری بات کا خیال نہ کر

مچل نہ جائے کہیں یہ دل فراق پسند

خدا کے واسطے آرائشِ جمال نہ کر

فراق نے اسے بخشی ہے زندگی کی تڑپ

دلِ ستم زدہ کو خوگرِ وصال نہ کر

خدا بھی تجھ سے جو پوچھے تری رضا کیا ہے

قلندری کا تقاضا ہے عرض حال نہ کر

ترا مقام، مقامِ رضا سے آگے ہے

خودی نہ بیچ، طفیلی نہ بن سوال نہ کر

زمانہ ایک مسلسل عمل ہے لامحدود

بلاسبّب اسے پابندِ ماہ و سال نہ کر

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ جناب سید غلام رسول ناز کی مرحوم ایک بلند پایہ سخنور تھے۔ان کی مفکرانہ قسم کی شاعری اُردو ادب کا قابلِ قدر اثاثہ ہے۔انہوں نے بجا طور پر تعلّی کے انداز میں فرمایا ہے۔

کشمیر کا رہنے والا ہوں اُردوئے معلّٰی لکھتا ہوں

اس دیس میں مجھ سا کوئی بھی اُردو کا سخنور ہو نہ سکا

صرف اردو تک ہی یہ منحصر نہیں ہے آپ نے فارسی اور کشمیری زبان میں بھی اپنے پاکیزہ جذبات وخیالات کی ترجمانی بصد حُسن وخوبی فرمائی ہے۔جوان کے اعلیٰ مقام اور مرتبہ کو اچھی طرح اجاگر کرتی ہے۔اس خطۂ کشمیر کے بلند مرتبت

سخنور کی شخصیت وشاعری سے متاثر ہو کر درج ذیل اشعار میں ان کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں۔

خراجِ عقیدت

کیا بتاؤں ہے کیا متاعِ فقیر
ہے یہ کیا دل پذیر پُر تاثیر
اس سے ظاہر ہے اس کا خالق تھا
پاک دل، پاک فکر، پاک ضمیر
تھا فقیرانہ ان کا طرزِ حیات
تھے بہر پہلو آپ دل کے امیر
یہ تھے اخلاص کے علمبردار
فکرِ ملّت تھی ان کی دامن گیر
آپ نے اہلِ فن کی نظروں میں
پائی تھی خوب عزت و توقیر
حُسن کردار بٹ رہا تھا جب
مہرباں ان پہ تھا خدائے قدیر
حضرتِ اقبالؒ حکیمِ اُمت تھے
ان کی ہیں آپ بولتی تصویر
ان کے اشعار میں جھلکتا ہے
ہو بہو حُسنِ جنّتِ کشمیر
اس غلامِ رسول کے حق میں

منشاؔ کی ہے دعا بہ قلبِ صمیم
اے رحیم و کریم دینا انہیں
باغِ فردوس میں مقامِ عظیم



کرنل علی محمد
(لاہور۔ پاکستان)

نازکی صاحب۔ کچھ یادیں

میرے لئے اب یہ تعین کرنا مشکل ہے۔ کہ میں مرحوم نازکی صاحب سے پہلی دفعہ کب ملا تھا۔ لیکن میں ابھی چھٹی یا ساتویں جماعت میں ہی پڑھتا تھا جب نازکی صاحب میرے بڑے بھائی طاؤس صاحب سے ملنے کے لئے ہمارے گھر پانپور آیا کرتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ اُن دنوں وہ بانڈی پورہ یا سرینگر سے دور کسی اور جگہ پر تعینات تھے۔ اُن کی طاؤس صاحب کے ساتھ خط وکتابت بھی ہوتی تھی۔ میں اُن کے لکھے ہوئے سارے خط پڑھا کرتا تھا اور بڑا لطف محسوس کرتا تھا۔ خط مختصر، زیادہ سے زیادہ عام سائز کے پیڈ کے ایک صفحے پر ہوتا تھا۔ وہ ہمیشہ دائیں طرف چوڑا سا حاشیہ چھوڑتے تھے۔ عبارت سلیس اور رواں، اور خط خوشنما۔ مجھے یہ سب بہت اچھا لگتا تھا۔ چنانچہ مجھے یہ شوق پڑا کہ میں اسی طرح کی اُردو لکھ سکوں۔ میں اندازہ لگانے کی کوشش کرتا تھا کہ وہ کس طرح کا قلم، کس سائز کی نِب اور کونسی سیاہی استعمال کرتے تھے۔ ان خطوط میں زیادہ ادب، خاص کر شعر وشاعری کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ بھائی طاؤس صاحب اُن سے

اپنے شعروں کی اصلاح بھی لیتے تھے اِن دونوں کے ایک دوست اور ناز کی صاحب کے شاگرد غلام علی بُلبل بھی ہوا کرتے تھے۔ ایک دفعہ اُن کے بیچ کچھ ناچاقی ہوگئی۔ اُس کے بعد کے ایک خط میں ایک جملہ مجھے ابھی تک یاد ہے "بُلبل کو میں نے معاف کر دیا ہے آپ بھی معاف کر دیں"۔

نازکی صاحب اس بات پر فخر کرتے تھے کہ وہ ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ اگر چہ میں عمر میں اُن سے بہت چھوٹا تھا۔ لیکن وہ میرے ساتھ گھل مل جاتے تھے۔ میں نے خود اُن کی زبانی سنا ہے کہ کس طرح وہ سکول کئی میل پیدل آیا جایا کرتے تھے اور کس طرح اُنہوں نے اپنے کسی ہم جماعت سے عاریتاً کوئی کتاب لے کر اس کی نقل کر کے اپنے پاس رکھی تھی۔ کیونکہ وہ بازار سے کتاب خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔

طاؔوس صاحب علیگڑھ پڑھنے کے لئے چلے گئے۔ میں آٹھویں جماعت کیلئے سرینگر کے اسلامیہ ہائی سکول میں داخل ہوا، وہاں سے میٹرک پاس کر کے ایس پی کالج میں چلا گیا۔ میں سرینگر میں ہی "ڈیرے پر" رہا کرتا تھا۔ طاؔوس صاحب اس دوران علیگڑھ سے واپس آکر کچھ دیر بیکار رہ کر نائب کے عہدے کے لئے نامزد ہو گئے اور جموں ٹرینگ کے لئے چلے گئے۔ اُن کی غیر حاضری میں بھی اُن کا ہمارے ہاں آنا جانا رہتا تھا۔ وہ ہمارے والد صاحب کا بہت ادب کرتے تھے، کبھی اُن کے سامنے ٹانگیں پھیلا کر نہیں بیٹھا کرتے تھے۔ اور جہاں تک مجھے یاد ہے۔ اُن کے سامنے حُقہ پینے سے بھی احتراز کرتے تھے۔ والد صاحب بھی اُن کی بہت عزت کیا کرتے تھے۔ جب وہ ناظم تعینات کے لٹریری اسسٹنٹ مقرر ہوئے تو سردیوں میں دربار موؔ (Move) کے

ساتھ اُنہیں بھی جموں جانا پڑتا تھا۔ ایک دفعہ والد صاحب بھی سردیوں میں کسی کام سے یا شاید سیر کرنے کے لئے جموں میں تھے۔ وہاں نازکی صاحب نے اُنہیں کھانے کی دعوت دی تھی اور خلافِ معمول تکلّف سے کام لیا۔ طاؤس صاحب اُن دنوں جموں میں مقیم تھے۔

اِس دوران نازکی صاحب کا ایک خط آیا جس میں اُنہوں نے یہ نہیں لکھا کہ اُنہوں نے والد صاحب کو کھانے کی دعوت دی تھی بلکہ یہ کہ قبلہ حاجی صاحب جموں میں کچھ دن رہے۔ اُنہوں نے ازراہِ شفقت میرے غریب خانے پر بھی قدم رنجہ فرمایا۔ اللہ اللہ کیا وضعداری تھی!

اگرچہ عمر، علم، اور ادبی استعداد کے لحاظ سے میں اُن سے بہت ہی نچلی سطح پر تھا لیکن وہ مجھ سے ہمیشہ بڑے بھائی کی شفقت، بزرگ کی متانت، اور ایک برابر سطح کے دوست کی بے تکلفی برتتے تھے۔ کبھی کبھی میرے ساتھ ایسا مذاق بھی کرتے تھے، جو آدمی صرف اپنے "لنگوٹیا" یار سے ہی کر سکتا ہے۔ میں کبھی کبھی پریشان ہو جاتا تھا کہ کہیں اُن کے اِس طرح کے برتاؤ کے نتیجے میں، میری طرف سے ادب کی حد پار نہ ہو جائے۔ مجھے اِس بات پر فخر ہے کہ میری دانست میں ایسا کبھی نہیں ہوا۔ یہ بھی ایک وجہ تھی وہ مجھ سے اتنا پیار کرتے تھے۔

اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ہمارے دیوان خانے سے رات کو جب والد صاحب اور بھائی طاؤس صاحب سونے کے لئے چلے جاتے تھے، میں اور نازکی صاحب دیر تک بیٹھے باتیں کیا کرتے تھے۔ وہ مجھے کبھی اپنے، کبھی اقبالؔ، حافظ اور سعدیؔ کے شعر سنایا کرتے تھے اور مُشکل شعروں کی تشریح بھی کرتے تھے۔

اگر چہ میں نے صرف نوّیں اور دسویں جماعتوں میں فارسی پڑھی تھی لیکن مجھے فارسی سے کافی لگاؤ تھا اور کافی حد تک سمجھ بھی آتی تھی۔ نازکی صاحب اِس بات پر بہت خوشی کا اظہار کیا کرتے تھے کہ باوجود سائنس کا طالبِ علم ہونے کے مجھے ادب اور شعر شاعری سے لگاؤ تھا۔

میرا حافظہ بہت اچھا تھا اور کسی سے سُنا ہوا کوئی اچھا شعر مجھے یاد ہو جاتا تھا۔

ایسی ہی ایک نشست میں اُنہوں نے اپنے وہ فارسی کے تین شعر سنائے جو بہت اعلیٰ پائے کے تھے۔ میں نے کبھی کسی جگہ وہ لکھ کر نہیں رکھے لیکن مجھے وہ اب بھی یاد ہیں۔

تاب گسیوئے سیاہ و گردش چشم کبود

از دلِ بے تابِ من تاب وتوانائی ربود

ہر کہ را حسنے عطا کردند او قاتش کم است

بلبل از گل، گل ز شبنم، شبنم از انجم شنود

مرغکے دی شب بہ گلزارے بہ شاخے می سرود

شاہد گل را ثباتے نیست دل دادن چہ سود

پھر اُنہوں نے مجھے سمجھایا کہ اُنہوں نے کس طرح دوسرے شعر میں اقبالؔ کی ایک پوری نظم کو سمویا تھا۔ (خدا سے اک روز حُسن نے سوال کیا)۔ اِسی طرح ایک موقعے پر جب ہم دو ہی بیٹھے تھے۔ اُنہوں نے مجھے سعدیؔ کے یہ شعر سنائے۔

چو دخلت نیست خرچ آہستہ ترکُن

کہ می گوئند ملاحاں سرودے

نہ کوہستاں اگر باراں نہ بردو

بہ سالے دجلہ گردو خشک رُودے

پھر فرمایا کہ ان اشعار پر غور کرو۔ یہ سبق جس نے یاد رکھا وہ کبھی مالی پریشانی میں مبتلا نہیں ہوگا۔

طاؔوس صاحب ٹریننگ سے فارغ ہوکر کچھ دیر کے لئے سرینگر میں نائب تحصیلدار لگ گئے۔ ٹینکی پورہ کے ایک مکان میں رہائش رکھی۔ نازکی صاحب اُن دنوں ٹیچرس ٹریننگ سکول میں تعینات تھے۔ میرا ''ڈیرہ'' اگرچہ ڈلحسن یار میں تھا لیکن میری شامیں اکثر بھائی صاحب کے ہاں نازکی صاحب اور اُن کے دوسرے دوستوں خاص کر عبدالحق برؔق مرحوم، محمد امین بچھ مرحوم، صمد خان مرحوم کی صحبت میں ہی گذرتی تھیں ۔ سویپ (Sweep) اُن کے لئے تاش کا پسندیدہ کھیل تھا۔ کبھی کبھی تین ہی دوست (طاؔوس صاحب سمیت) موجود ہوتے تو مجھے چوتھا پارٹنر بنایا جاتا تھا۔ نازکی صاحب کو شطرنج سے بھی شغف تھا اور جب کبھی ہم چار آدمی پورے ہوتے تھے تو وہ مجھے کہتے تھے 'ولہ سہ أسی ءگندو۔۔۔'' ''شطرنج تراو'' ۔ نازکی صاحب کے علاوہ صرف میں ہی شطرنج کا کھیل جانتا تھا، کبھی کبھی دیر ہوجاتی تو کہتے کہ تم کو پڑھنا بھی ہوگا۔ بہت دیر ہوگئی۔ اب میرا ایف ایس سی کا نتیجہ آیا۔ میں بہت اچھے نمبروں کے ساتھ فرسٹ ڈیویژن میں پاس ہوا تھا اور ساری ریاست میں شاید تیسرے نمبر پر آیا تھا۔ نازکی صاحب پہلے شخص تھے جو سرینگر سے مجھے مبارکباد دینے کے لئے پانپور پہنچ گئے۔ اُس

وقت اتفاق سے طاؤس صاحب اور والد صاحب دونوں میں سے کوئی گھر پر نہیں تھا۔ مجھے اُنہوں نے بہت پیار سے گلے سے لگایا اور کہا کہ میں نے دفتر میں یہ خبر سنی، مجھ سے نہ رہا گیا اور میں وہاں سے سیدھا تمہارے پاس چلا آیا۔ بہت اچھے نمبر لے آئے۔ اب تمہاری میڈیکل کی سیٹ سمجھو پکی ہوگئی۔ یہ تھا اُن کی والہانہ شفقت کا عالم۔

۱۹۴۷ء میں میری شادی ہوئی۔ میں ۱۹۴۶ء میں امرتسر میں فرسٹ ایئر ایم بی بی ایس میں داخل ہوا تھا۔ فسادات کے دوران وہاں سے بھاگ کر آیا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد لاہور میڈیکل کالج جانے والا تھا۔ شادی کے دنوں میں طاؤس صاحب بہت مصروف رہتے تھے اور اُن کے دوستوں کی دیکھ بھال میں نے خود اپنے ہی ذمے لی تھی۔ یہ لوگ شاید تین دن ہمارے گھر میں رہے۔ مسند نشینی کی دعوت (دوپہر کی) کے بعد سب لوگ چلے گئے۔ باقی لوگ برات لے جانے کے انتظامات میں مصروف ہو گئے۔ تو شامیانے میں صرف میں اور نازکی صاحب کا گروپ رہ گیا لیکن وہ کہیں بیٹھے رہنے کے بجائے شامیانے کے ایک سِرے سے دوسرے سِرے تک کا چکر لگاتے رہے اور کچھ گنگناتے رہے۔ پھر آ کر کہنے لگے ابھی آگے نہیں بڑھتا معاملہ اُنہیں کچھ آمد ہوئی تھی۔ شعر سناتے گئے۔ شاید کچھ اِس طرح تھے:

مرمر کے جیا، جی جی کے مرا، بجھ بجھ کے جلا جل جل کے بجھا
خورشیدِ منوّر پھر بھی مگر اُس کے بُت برابر ہو نہ سکا
جس قرب پہ نوری نازاں ہیں وہ قرب ہمیں بھی حاصل ہے
ہم قرب کو لے کر کیا کرتے جب غم ہی میسّر ہو نہ سکا

مجھے نہیں معلوم کہ اُن کی یہ غزل ہوئی کہ نہیں اور کہاں چھپی کیونکہ میں شادی کے کچھ دیر بعد ہی لاہور چلا گیا پھر پورے اٹھائیس سال کے بعد ہی آنا ہوا اور اُن سے مختصر ملاقات رہی جس روز میرا ولیمہ تھا۔ شام کے کھانے کے بعد۔ میں دیوان خانے میں شاید دوسرے "دَس پاک" (کھانا کھانے کے بعد مہمانوں کے ہاتھ دھلانا) کی نگرانی کر رہا تھا۔ ایک چھوٹا سا لڑکا میرے ہاتھ میں ایک چھوٹا پرچہ تھما گیا۔ نازکی صاحب کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ کہ اُنہوں نے دیا ہے، لکھا تھا۔ ہاتو مشقِ ناز کر، خونِ دو عالم میری گردن پر۔ یہ تھا اُس "لنگوٹیا یاری" کا ایک مظہر۔ جس کا میں ذکر کر چکا ہوں۔

آسمان اُن کی لحد پر شبنم افشانی کرے

..................☆☆☆..................

خان صفی اللہ قندھاری المعروف قوسنگیؔ

نازکی صاحب......میرے محسن

اپنے محسن کو یاد کرنا اللہ تعالیٰ کی قربت حاصل کرنے کا موجب ہے۔ اِس حصولِ قربت کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ احسان مندی کو چراغِ راہ کے طور عام کرنے کی غرض سے اِن احسانوں کا بار ہا اور بر ملا اظہار ہو کیوں کہ اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ مرحوم و مغفور جناب میر غلام رسول نازکی صاحب کی یاد بادِ نسیم کے ایک خوشگوار جھونکے کی طرح اُس وقت میرے دل و دماغ کو معطر کر گئی جب ایک روز اُستاد محمد عبداللہ تبت بقال کی یاد میں ایک پروگرام ٹیلی ویژن پر دیکھنے کا موقعہ ملا۔ دورانِ پروگرام میری آنکھوں کے سامنے نازکی کے ساتھ گزرا ہوا وقت جھلملانے لگا۔ یوں محسوس ہوا جیسے میں نازکی صاحب کی رہائش گاہ واقع کاٹھی دروازہ، رعناواری میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوں اور وہ اپنے مخصوص معلمانہ انداز میں اپنے دستِ شفقت سے مجھے نواز رہے ہیں۔ جیسے ریذیڈنسی روڑ کے اوپر دریائے جہلم کے کنارے بنڈ پر سیاہ رنگ کی اچکن، سر پر سیاہ قراقلی اور گلے میں سیاہ وسفید دھاریوں والا گلو بند ڈالے وہ میرے آگے آگے جا رہے ہیں اور دبلی پتلی چال ڈھال، نرم و نازک رفتار سے چلنے والی یہ شخصیت یہ کہتے ہوئے بار بار مڑ مڑ کے مجھ سے تحکمانہ انداز میں کہتے ہے کہ میرے قدم سے قدم ملا کر چلنے کی عادت

ڈالو، کیوں کہ پیچھے پیچھے چلنے والے پیچھے ہی رہ جاتے ہیں۔ پھر شو پورہ میں اُن کے ساتھ آخری مُلاقات سر جھکائے ہوئے' مراقبے کی حالت میں۔ سر پر شال رکھے، نحیف خفیف آواز میں۔ جیسے عرشِ عظیم کے ساتھ ہمکلام ہوں۔ دفعتاً میری جانب توجہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں'' جایئے۔ صفی اللہ صاحب، جایئے۔ دُعا فرمالیں''۔ وہاں تشریف فرما کئی لوگ یہ نہیں سمجھے کہ وہ کیوں مجھے جانے کو کہہ رہے ہیں۔ لیکن میں جانتا تھا کہ نازکی صاحب کیا کہنا چاہتے ہیں۔ یہ شخص جانتا ہے کہ احادیث کی روشنی میں بیمار کی عیادت کے آداب ہیں کہ قلیل وقت کے لئے بیمار کے پاس رہنا مسنون ہے اور میں وہاں قریب ایک گھنٹے سے بیٹھا ہوا تھا۔ لہذا اُنہوں نے اتباعِ سُنت کے پیشِ نظر مجھے وہاں سے جانے کا حُکم دیا...... اللہ اللہ...... کہاں ایسی فرشتہ صفت ہستیوں کی زیارت نصیب ہوتی ہے۔ پروردگار اُنہیں کروٹ کروٹ جنت الفردوس نصیب کرے۔ یہ اُن ہی ہی کی صحبت کا فیض ہے کہ میں کچھ اناپ شناپ لکھنے کی جسارت کرسکتا ہوں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اُستاد محمد عبد اللہ تبت بقال کی یاد ہی سے نازکی صاحب مرحوم کی یاد کیوں جُڑی ہے۔ اِس سوال کے جواب میں عرض ہے کہ 1960ء کے آس پاس کا زمانہ تھا۔ میں گرورہ کے پیروں کی وساطت سے خانیار میں رنگ ٹینگ والے پیر صاحب کے پاس آیا تھا کیوں کہ اُنہوں نے میرے والد مرحوم کی تجہیز و تکفین کے لئے کچھ قرضہ حسنہ دیا تھا اور میں رقم لوٹانے کا خواہاں تھا۔ پیر صاحب نے اِس میں سے کچھ روپے رکھ لئے اور باقی ماندہ واپس کر دیئے۔ اُستاد تبت بقال وہاں بیٹھے خاموشی سے اِس ساری روداد کا مشاہدہ کر رہے تھے۔

شاید اُنہوں نے بھانپ لیا تھا کہ لکھنے پڑھنے کا شوق ہونے کے باوجود یہ لڑکا کِس قدر بے بس اور لاچار ہے۔ جوں ہی میں پیر صاحب کے مکان سے باھر نِکلا تو بقال صاحب نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم ایک ایسے علاقے میں پہنچ گئے جہاں مٹی سے بنی دیواریں چاروں طرف نظر آ رہی تھیں۔ ایسی ہی ایک دیوار کے دوسری طرف ایک پُر سکون جگہ پر پہنچ گیا۔ یہ کوہِ ماران یا یوں کہیئے ہری پربت کا دامن تھا...... میں ابھی وسوسے اور اندیشے ہمیں مبتلا تھا کہ بقال صاحب مجھے ایک مکان کے اندر لے گئے جو کہ ایک فوجی بارک کی طرح سجا سجایا لگتا تھا۔ جس کے ایک طرف رسوئی اور دوسری طرف باغیچہ تھا۔ بقال صاحب مجھے سیدھے رسوئی میں لے گئے۔ وہاں دو خواتین تھیں۔ ایک درمیانہ قد کی موٹی سی لیکن مانوس اور وضع قطع کی خاتون...... اس کے ملنے کے انداز سے یوں لگا کہ یہ مجھے اَپنا بیٹا سمجھ رہی ہیں۔ اِسی اثنا میں استاد بقال، خاتون سے مخاطب ہوئے۔ ''بھابی جی۔ آپ نے بہت مرتبہ کہا تھا کہ کِسی لڑکے یا لڑکی کو ڈھونڈو جو کام میں ہاتھ بٹا سکے۔'' اسکے بعد بقال صاحب نے میری پوری داستان سُنائی جن کو سُن کر مذکورہ خاتون (نازکی صاحب کی رفیقہ حیات) نے بقال صاحب سے کہا کہ اِس کو نازکی صاحب کے پاس لے جاؤ۔ بقال صاحب مجھے اِس مکان کی دوسری جانب ایک سجے سجائے دیوان خانے میں لے گئے جہاں تین اشخاص بیٹھے ہوئے تھے۔

ایک نوجوان [1] لگ بھگ 19، 20 سال کی عُمر کا، خوبصورت، بڑی بڑی آنکھیں، چوڑا مُنھ، گورا سفید مائل گندمی رنگ بالکل ایسا جیسا کہ ہمارے علاقے میں چکوروں کا شکار کرنے کے لئے انگریز، ''صاحب جی لوگ'' آیا کرتے تھے۔ اِس نوجوان

---

[1] :۔ اغلب ہے کہ یہ فاروق صاحب تھے یعنی ابنِ نازکی۔

کے ہاتھ میں قلم اور کارڈ بورڈ پر سفید کاغذ رکھا ہوا ہے بڑی خوش خطی سے نستعلیق رسم الخط میں اردو لکھ رہا تھا۔ مجھے فارسی کی جلی قلم کے اُن حروف کی یاد آئی جو "کریما" نامی کتاب میں خوش خط لکھے ہوئے تھے۔ یہ نوجوان بڑے ادب واحترام سے اِس طرح سے بیٹھا ہوا ہے کہ جیسے ایک طالبِ علم اپنے استاد کے سامنے باادب اور تعظیم سے بیٹھتا ہے۔ اسکے سامنے دو آدمی بیٹھے ہیں۔ ایک دُور تکیہ کے ساتھ اِس طریقے سے جیسے مہمان ہو۔ یہ شخص تراشی ہوئی داڑھی لیکن ہنس مُکھ انداز میں کچھ باتیں کر رہا ہے اُس شخص کے ساتھ جو کہ نوجوان کو کچھ لکھا رہا ہے۔ یہ شخص دُبلا پتلا نحیف بڑا متین اور سہمی سہمی آواز سے دوطرفانہ باتیں کرتا ہوا یعنی مہمان کے ساتھ بھی اور اِس نوجوان کو لکھانے میں بھی ہمہ تن مشغول تھا۔ اِس شخص کے مُنھ پر بھی داڑھی تھی۔ اِس داڑھی میں اِس شخص کا متین چہرہ سیاہ بادلوں میں چودھویں کے چاند کا جلوہ نظر آتا اپنائیت اور رُعب سے مِلا جلا جلوہ اسکے چہرے سے شعلہ زن ہوتا نظر آتا تھا۔ اسکے سامنے کھڑے بقال صاحب نے حسبِ فرموداتِ خاتون بڑے ادب و احترام سے لب کشائی کرتے ہوئے کہا جناب یہ لڑکا میں نے لایا ہے تا کہ گھر میں می جی (یہ بات مجھے پوری یاد نہیں کہ کس نام سے پکارا) کا ہاتھ بٹا سکے۔ نازکی صاحب نے کچھ جواب نہیں دِیا البتہ نوجوان کو لکھوانے میں اور مہمان کے ساتھ باتیں کرنے میں محور ہے اور میں نوجوان کی لکھائی کی طرف بڑے انہماک سے دیکھ رہا تھا۔ نازکی صاحب اِس سے پہلے بیک وقت دو اشخاص کو اٹنڈ کر رہے تھے اب میرے مُنہمکانہ انداز سے لکھنے والے نوجوان کی طرف دیکھنے کے طریقۂ کار سے بقال صاحب بٹھائے ہوئے لڑکے کا مشاہدہ بھی کر رہے تھے۔ پھر جب لکھائی کے کام سے فارغ ہوئے تو مہمان نے کہا اردو کو کسی قسم کی پروا نہیں کیونکہ آپ جیسے لوگوں کے ہاتھ میں

ہونے کی وجہ سے یہ دِن بدن پھولتی جائے گی۔ نازکی صاحب نے درجواب کہا کہ اردو کو کافی خطرہ ہے وہ اِس طرح سے کہ اِس زبان کو مسلمانوں سے منسوب کیا جارہا ہے اور مسلمانوں نے بھی ایسی رَوش اختیار کی ہے کہ صرف عربی اور فارسی کے ثقیل الفاظ ہی استعمال کر کے اسکو بالکل عربی نمایا نیم، فارسی بنا دیا ہے اور اسکے برعکس ہندو اُدباء نے جو کہ دیا ناگری رسم الخط میں ہندی لکھتے ہیں، یہ ہندی، سنسکرت کے متروک لفظوں سے بنائی گئی ہے جو کہ عام ہندوستانی نہیں سمجھ سکتا ہے۔ تو اِس طرح سے اردو بھی سخت زبان ہوگئی ہے اور ہندی بھی عام ہونے کے بجائے موجودہ زمانے سے بہت دُور ہے۔ اِن دو اشخاص کی بات چیت بھی میں نے سُنی اور یہ بات چیت تقریباً 20،10 منٹ تک جاری رہی اور کچھ کشمیری شاعری پر بھی بحث ہوئی، یہ بھی سُنی۔ آخر پر نازکی صاحب نے بقال صاحب سے میرے بارے پوچھا اور بقال صاحب نے میری ساری حالتِ ناگُفتہ بیان کی اور اِس گھر میں لانے کا مقصد ومُدعا بھی بیان کیا۔ نازکی صاحب نے سرد آہ بھر کر کہا اِس کو یہاں ملازم نہیں رکھنا ہے۔ ایسے بچوں کو پڑھانا ہمارا فرض ہے۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا اچھا بیٹا تم پڑھنا چاہتے ہو یا کہ گھریلو نوکری۔ میں نے عرض کی کہ پڑھنے کا بہت شوق ہے لیکن کوئی وسیلہ نہیں۔ میں نے اِس بات کو ظاہر کرنے کے لئے کہا جناب میرا کوئی ہڑدل نہیں جو میری مدد کرتا۔ ''ہڑدل'' کی جب وضاحت چاہی تو میں نے جلدی جلدی کہا کہ جناب کشمیر میں ہم ایک ہی گھر ہیں، میرا پڑدادا حبیب اللہ خان ابن گلدین خاں قندھار سے ضلع ہزارہ تحصیل مانسہرہ آئے وہاں سے میرا دادا محمد خان 6 سال کی عُمر میں اپنے ننہال کے ساتھ کشمیر آیا۔ ہم ذات کے امازئی پٹھان ہیں اور یہاں ہم گجر ہیں۔ سیدھا کہو نا گجر لوگ ہو تم۔ اِس کا اعادہ کرتے ہوئے نازکی

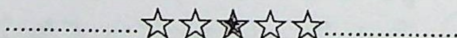
صاحب نے پوچھا یہ ''ہڑدل'' کیا ہوتا ہے۔ میں نے درجواب عرض کیا جناب باپ دادا کا رشتہ تو نازکی صاحب نے اسکو لکھ کر ''حسبی رشتہ'' اور ماں کی طرف سے پوچھا تو میں نے اُسکو'' دودھ دار رشتہ'' کہا اسکو موصوف نے ''نسبی'' لکھا پھر اُس مہمان کی طرف متوجہ ہوئے (سیف الدّین قاری صاحب) اُنہیں کہا کہ ذات پات کی جڑیں ہر جگہ مضبوط ہیں۔ ذات پات کے منحوس سائے ہر سوسائٹی میں بدرجہ اتم ہیں۔ پھر قاری صاحب نے کہا اسکو مٹانے کا واحد راستہ اسلامی تعلیم ہے۔ اُدھر نازکی صاحب گفتگو کے بعد میری طرف مُڑے تو فرمایا۔ میں تمہاری دِلی تمنا یعنی پڑھائی کا بندوبست انشاء اللہ ضرور کروں گا۔ پھر موصوف نے بقال صاحب کو کہا اسکو اپنے ساتھ لے جاؤ، یہ چھٹی فلاں شخص کو دکھاؤ وہاں سے میٹرک کی کتابیں جا کر لاؤ۔ بقال صاحب فوری طور وہاں سے نکلے اور مجھے ساتھ لیا اور کتابیں لے کر آئے۔ راستے میں کوئی بات نہیں کی، واپس جب گھر آئے تو کچن میں دو خواتین میں سے ایک نے کہا کہ اگر یہ پڑھنے والا لڑکا ہے تو ذرا بتائیے کہ پیدائش اور ریل کے ڈبے کو انگریزی میں کیا کہتے ہیں۔ میں نے درجواب کہا ''برتھ'' جب Spelling پوچھا تو میں نے دونوں کے لئے Birth کہا تو اُس خاتون نے بقال صاحب سے مخاطب ہو کر کہا اِس کو وہاں ہی لے جاؤ جہاں میں نے تم کو کہا ہے۔ یہ وہاں ہی ٹھیک رہے گا۔ روٹی کھانے کے بعد میں نازکی صاحب سے مِلا نازکی صاحب نے رخصت کرتے ہوئے ایک سو روپے نقدی دیئے اور ایک چھٹی بھی دی جس پر لکھا تھا ''نادرہ بیٹی'' میں نے اسکو بند لفافے میں پکڑا اور کتابوں میں رکھ لیا اور گھر کو چلا۔ بقال صاحب میرے ہمراہ ایک اور شخص کے ساتھ ہو لئے۔ ہم تینوں گاؤ کدل کے علاقے میں آئے۔ وہاں پر بقال صاحب میری ناگفتہ بہ حالت کے

پیش نظر ایک متمدن گھرانے میں لے گئے جہاں پر ایک بزرگ شخص کے پاس آئے اور کہا کہ فلاں لڑکی سے کہنا کہ تم اِسکو وہاں نوکر رکھو۔ میں وہاں ہکا بکا رہ گیا، کچھ نہ بولا البتہ بقال صاحب سے جب اُس بزرگ نے پوچھا کہ نازکی صاحب نے کیوں اسکو نہیں رکھا تو بقال صاحب نے سچ بیان کیا کہ ایسے بچوں کو پڑھانے کی حتی الامکان کوشش کرنی چاہیے۔ تو اِس بیان پر وہ بزرگ خشم آلود ہو گئے کہ نازکی صاحب نے جس بچے کو سیدھا راستہ دِکھایا ہو اُسکو میں اُلٹے راستے پر لگا دوں۔ چلو یہ سو روپے میری طرف سے امداد اور تم اسکو فوراً گاڑی پر چڑھاو۔ بقال صاحب نے نادم ہو کر دس روپے جیب سے نکالے اور سری نگر سے بانڈی پورہ تک کا گاڑی کرایہ سوا روپیہ (1.25) گاڑی کرایہ بھی ادا کیا۔ جب میں گرورہ پہنچا تو نادرہ جی (ٹاٹھی لالہ) نے چٹھی کو چُوما اور کھول کر پڑھی۔ پڑھنے کے بعد مجھے بزبانِ کشمیری یوں کہا" صفی اللہ، اللہ تعالیٰ چھوی سبٹھاہ فضل کرمُت ژیہہ پٹھ!! نازکی صائب چھوی ژیہہ پٹھ مہربان گومت"، اِس چٹھی کے حوالے سے مجھے حکم مِلا کہ میں سکول میں دوبارہ جوائن کروں اور اپنے والد کی وصیت یعنی اہل وعیال کو پالنے کی اس ذمہ داری سے بھی عہدہ برآ ہو سکوں۔ چٹھی کے مطابق ہر مہینے مجھے سری نگر آ کر گوجری پروگرام میں لوک گیت کا آئیٹم کرنا ہوگا۔ اِس طرح سے میری پڑھائی کا اور گھر کا خرچہ بھی پورا ہوگا۔ میں نے دو سال یعنی F.A تک یہ کام کیا۔ بعد میں جنید صاحب وغیرہ نے مخالفت کی کہ میری زبان گوجری نہیں بلکہ یہ "ھندقو" زبان ہے۔ پھر یہ پروگرام بند ہو گیا۔ میں اسکے بعد ملازمت کے چکر میں پڑھ گیا۔ میں نے نازکی صاحب سے یہ وعدہ کیا تھا کہ نوکری اگر کرونگا تو محکمۂ تعلیم میں۔ محکمۂ تعلیم میں بڑی مشکل سے بحیثیتِ

سائنس لیبارٹری اسسٹنٹ بھرتی ہوا اور آخر پر اِس محکمہ میں 1962ء سے بھرتی ہو کر 2001ء میں گورنمنٹ گرلز مڈل سکول دھوبی محلّہ بٹہ مالو سے سبکدوش ہوا۔ یہ ساری دین نازکی صاحب کی ہے جو کہ اللہ کی مہربانی ہے جسکی میں ہی نہیں بلکہ میرے آنے والی نسل بھی مرہون منت رہے گی۔

دُعا ہے کہ نازکی صاحب کو اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے آمین۔ اِس وقت ہزار مشکلات کے باوجود جو اطمینانِ قلب ہے یہ ان ہی کے طفیل ہے۔ یہ ایک Turning Point تھا کہ میں پڑھائی کی طرف متوجہ ہو سکا اور نازکی صاحب نے مجھے اِس مقام پر پہنچا دیا۔

بس یہ تھی ایک ''یاد'' جو کہ محمد عبداللہ تبت بقال مرحوم کی یاد کے وقت مجھے ''یاد'' آ گئی۔



پروفیسر بھوشن لال کول
ہندی سے ترجمہ: منوج شیری

میر غلام رسول نازکی...... میری نظر میں

میر غلام رسول نازکی کشمیری زبان کے اُن باصلاحیت ادبی شخصیات میں ایک ہیں جنہوں نے زندگی کے گہرے سچ کو سوچ کی آنچ پر رکھ کر مزے دار طنزیہ شاعری کے ذریعے پیش کرنے کی کوشش کی۔

منشی فاضل، منشی عالم اور ادیب فاضل کے امتحانات پاس کرنے کے بعد انہوں نے بی اے کا امتحان پاس کیا لیکن صرف امتحانات پاس کرنا اُن کا مقصد نہیں رہا۔ زندگی کے سکول میں ایک محقق کے طور پر اُنہوں نے زندگی کو تہہ بہ تہہ سمجھنے یا جاننے اور پرکھنے کی کوشش کی اور اسکو سادہ روپ میں اپنانے کی کوشش کی۔ یہ اُن کی پوری زندگی کی عبادت رہی ہے اور اس مشکل راستے پر چل کر وہ یکے بعد دیگرے انمول موتی ڈھونڈنے میں کامیاب ہوئے۔

عربی، فارسی اور اُردو زبانوں پر انہیں گہری نظر تھی۔ مگر سنسکرت اور

شاردا رسم الخط کی جانکاری قدرے کم تھی۔ کاش! اُنہیں کشمیر کی اس انمول تہذیبی ورثے کے بارے میں جانکاری ہوتی تو آج ہم اُن کی تخلیق میں نئے توقعات ڈھونڈنے میں محو ہوتے۔ سرینگر میں ریڈیو سٹیشن کے قائم ہونے کے بعد ۱۹۴۸ء میں اُن کی تقرری ایک اچھے عہدے پر ہوئی اور سبکدوش ہونے تک نشریات کے مختلف مراحل کے ساتھ جڑے رہے۔

نازکی صاحب نے زندگی کے سکول میں بہت کچھ دیکھا اور سہا یہی وجہ ہے کہ اُن کی رباعیوں میں نئے احساسوں کی تازگی کے ساتھ سوچ و فکر کی بلندی پائی جاتی ہے۔ اُنہیں ہم کسی خاص انقلاب کے ساتھ باندھ نہیں سکتے نہ انہوں نے روایات کی اندھی نقل ہی کی۔ آنکھیں موند کر نئی شاعری کے انقلاب کی رُو کے ساتھ چل کر اس سے بھی آگے بڑھ گئے۔ اُن کی سادہ زندگی میں اُونچی سوچ کا آشیانہ تھا۔

زندگی کی اور اُن کا نظریہ بہت ہی صحت مند اور لائقِ گفتگو تھا۔ نازکی صاحب کے ادبی کام کو دو حصوں میں بانٹا جاسکتا ہے۔ اردو زبان میں لکھی نازکی کی تحریریں اور کشمیری میں لکھی تحریریں۔ وہ نظم و نثر دونوں میں برابر لکھتے رہے۔ ''روحِ غنی'' نازکی کی ایک مشہور تحریر ہے جس میں غنی کشمیری کی چنندہ شاعری کا اُردو ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ شاعر عبدالاحد نادم کی نمائندہ تخلیقات کو اردو ترجمہ کے ساتھ ترتیب دیا اور اسکو جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز نے ۱۹۵۹ء میں شائع کیا۔

نازکی صاحب پہلے کشمیری زبان میں نہیں لکھتے تھے۔ ریڈیو میں آنے کے بعد اس طرف اُن کی دلچسپی ہوئی اور کشمیری میں غزل، رباعی اور قطعات لکھنے

لگے۔ شاعری کی ان خاص صنفوں کو اپناتے ہوئے بھی انہوں نے شاعری میں رباعیات پر خاص دھیان دیا اور کشمیری شاعری میں اس صنف کو خاص سمت عطا کی۔ دیکھنے میں چھوٹے لگے مگر زخم دے گہرا، اس مقصد سے انہوں نے رباعی کو اپنے خیالات کا ترجماں بنایا۔ ۱۹۶۴ء میں انہوں نے کشمیری میں 'نمرودنامہ' کے عنوان سے شعری مجموعہ شائع کیا۔ اس میں ۲۰۰ رباعیات و قطعات شامل کئے گئے۔ ان رباعیات اور قطعات کو عنوانات کے حساب سے کئی حصوں میں بانٹا جاسکتا ہے جس میں سادہ، آزاد شاعری تو کہیں آج کل کی زندگی' سماجی، سیاسی، مذہبی...... اپنی ساری الجھنوں، پریشانیوں، مشکلات کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ کہیں ان میں سوچ کی بلندی ہے تو کہیں ان میں خدا کی عبادت، سادگی اور اپنے آپ کو خدا کے حوالے کرنے کی اہمیت کو اُجاگر کیا ہے۔ کہیں نجی زندگی کے گہرے پن میں انکی سوچ آگے آتی ہے تو کہیں دلکشی، انسانی پیار و محبت' تو کہیں پیار بھرے دل کے تاروں کی جھنکار بکھیرتے ہیں۔ کہیں پر تیکھا، چبھتا طنز نیزے کی مانند دل کو چیرتا ہوا پار چلا جاتا ہے کہیں زندگی کی بے رس کڑواہٹ کو یہ رباعیات عیاں کرتیں ہیں۔ نازکی صاحب کی طنزیہ شاعری رباعیات کے کُل ہم اثر کو گہرانے میں بھی مدد کرتی ہے۔

عشقِ حقیقی اور عشقِ الٰہی کے زیرِ اثر نازکی صاحب نے کئی رباعیات لکھی ہیں جن میں اپنے مالک کو پھولوں کا نذرانہ پیش کرتے ہوئے وہ عشقِ الٰہی میں اپنی سد بدھ کھو کر اپنے مالک کی شخصیّت میں مل جانے کی کوشش کرتا ہے۔ فلسفۂ وحدانیت سے درس لیتے ہوئے شاعر نازکی اپنی ساری قوت اکٹھا کر کے مالکِ دو جہاں کو حوالے کرتا ہے۔ ان رباعیات میں شاعر کے صاف وشفاف جذبات

حوصلہ کن طریقہ سے پیش ہوئے ہیں۔

موت زندگی کی ایک لازوال حقیقت ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اسکی حقیقت کیا ہے۔ کوئی اسے جاننے کوشش کر کے علم اور سوچ وچار کے راستے پر چل کر اپنے احساسات کو دلائل کی کسوٹی پر کیسے پرکھتا ہے۔ دوست، رشتہ دار، کنبہ، خاندان سب کچھ اپنا ہوتے ہوئے بھی کچھ بھی اپنا نہیں ہے۔ اگر رہے گی تو صرف ایک...... سچی یاد ہی رہے گی۔ اسلئے ضروری ہے پیہم عبادت کی۔ کیونکہ موت اور زندگی کے فنا ہونے کا احساس ہمیں کوئی کام کرنے نہیں دے گا۔

زندگی کے فنا ہونے کا اور موت کے ڈر کا احساس اِن رباعیوں میں گہرانے لگتا ہے۔

مکانک بامہ رستوی پور دنیا
دویہہ اُدرو لبن ہو ند بور دنیا
ہتس ؤرِیس تہِ ہرگاہ زندٕ روزکھ
پتو لاکن چھُ وانٕج وور دنیا

طنز کار نازکی نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے۔ یہ اُن کی بطورِ شاعر زندگی کو بہت گہرائی سے دیکھنے سمجھنے اور محسوس کرنے کی سمت میں ہمیشہ پیش پیش نظر آئی ہے۔ جدید کشمیری طنز کاروں میں نازکی صفِ اوّل کے کلاکاروں میں گنے جاتے ہیں۔ ان تحریروں کو پڑھ کر یہ بہت صاف ہو جاتا ہے کہ نازکی نے زندگی کا مشاہدہ بہت نزدیکی سے ایمانداری اور فطرتی طور پر کیا ہے۔ جہاں ایک طرف خطرناک حالات کے خلاف آواز اٹھانے کی ہمت اُن میں ہے، وہاں دوسری طرف دنیاداری کی ننگی حقیقت کو طنز و مزاح کو باریکی سے پیش کرنے کی صلاحیت بھی اُن

میں موجود ہے۔ آج لوگ اپنے برتاؤ کا دِکھاوا کرتے ہیں اور آج ایسے ہی افراد کو صحیح مانا جاتا ہے۔ دوسرے کے خون سے تلک لگانے سے انسانیت رسوا ہوئی ہے۔ یہ حقیقت نہ صرف گھریلو سطح پر بلکہ قومی نیز بین الاقوامی سطح پر بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ بناوٹی دکھاوا آج کی زندگی کا سچ بن گیا ہے۔ دکھاوے کی دنیا کا ایک رنگ ہے۔

نام نہاد مذہبی پیشواوں کی چھینا جھپٹی اور چھچھورے برتاؤ کو دیکھ کر ناز کی غصہ ہو اُٹھتے ہیں۔ آج مادّی دنیا میں مذہب کی تجارت ہوتی ہے اور تہذیب کے ٹھیکہ دار نجی فائدے کیلئے دل کی خانقاہوں کو ویراں بنا کر عبادت گاہوں کو وسیع بناتے ہوئے انہیں سنگِ مرمر کی سجاوٹ دیتے ہیں۔ جب انسان کے ایماں کا کاروبار ہوسکتا ہے تو مذہب کے بکاؤ ہونے میں کیسی حیرانی۔

وچھتھ صاحبِ دلن چھوسپداں افسوس
ملن ہوند لوٗٹھ تہ پیٛمرن ہنٛد تھپل ہُوس
دِلن ہوٚند خانقاہ وأران گومت
مشیدن سنگِ مرمر جار فانوس

سیاست دانوں کے داؤ پیچ دیکھ کر اُن کا طنز اور تیکھا ہو جاتا ہے۔ اصل میں وہ اپنے اردگرد ماحول سے خبردار تھے۔ آزادی سے پہلے ہم نے اپنے مستقبل کے جو سنہرے خواب دیکھے تھے، آزادی کے بعد خواب خواب ہی رہے اور امیدؔ ناامیدی میں بدل گئی۔ شاعر جدید موقعہ پرست سیاست پر سخت طنز کرتے ہوئے اس کے کھوکھلے پن کو بین الاقوامی سطح پر دیکھتے ہیں۔ سیاست کے صحیح روپ کو دیکھنے کیلئے سفارت کاری کے داؤ پیچ سمجھنا ضروری ہے۔ بڑے بڑے تجربہ کار

کھلاڑی ہی یہ کھیل کھیل سکتے ہیں۔آج کے سیاست دانوں کے لئے مذہب، انصاف، خدا کا خوف، قانون، دلیل، سچ وغیرہ اصول پرست اقدار کی کوئی قیمت نہیں۔ اُس کے قول وفعل میں یکسانیت نہیں ہے۔ وہ فرشتے کے بھیس میں بے سہارا اور بھولے بھالے لوگوں کو ٹھگتے ہیں اور پُرامن چین بھرے ماحول میں بربادی کی داستان لکھ دیتے ہیں۔ اللہ آج کے سیاست داں سے ہر آدمی کو بچائے۔

نازکی صاحب نے اپنی رباعیوں میں دنیاوی محبت کا بھی دل لبھانے والی تصویر کھینچی ہے۔ اپنی شاعری میں رومانیات کی خوبصورتی ڈالنے میں نازکی صاحب بے مثال ہیں۔طویل شعروں کے مقابلے قدرے چھوٹے شعر لکھنے کی وجہ سے ان کو چھوٹی تصویروں کے شاعر کہنا غلط نہ ہوگا۔اُن کی ہر ایک تصویر اپنے آپ میں مکمل با اثر ہے۔ باہنر مصوّر کے برش کے ہلکے استعمال سے شاعر نے بہت ہی دلکش اور زندہ تصویروں کو جنم دیا ہے۔ جدائی کے غم میں کسی کے تڑپنے کو وہی سمجھ سکتے ہیں جنہوں نے کسی کے غم میں بلک بلک کر رویا ہو۔سخت دل عاشق کے سامنے معشوقہ کی بے بسی اور لاچاری کی کوئی قیمت نہیں ہے۔یہی کارن ہے کہ سلگتی چنگاری دہکتا اور انگارہ عاشق کا جینا حرام کر دیا ہے۔

صاف یہ کہ نازکی صاحب خوبصورتی کے مداح رہے ہیں۔خوبصورتی کا بیان نازکی صاحب نے اس طرح کیا ہے کہ ان کی شاعری متحرک ہو اُٹھی ہے۔ نازکی کے شاعری مجموعے میں قدرتی خوبصورتی کا بھی اپنا حصہ ہے۔ کہیں پر قدرت کا پسِ منظر اور کہیں پر ایک محرک کا کام کر کے مٹھاس چھلکاتی ہے۔ کشمیر کے بے مثال قدرتی حسن کے مناظر اُن کی رباعیوں میں زندہ وجاوید ہو اُٹھے

ہیں۔ نازکی قدرتی حسن کی نازکیت سے واقف تھے۔

نازکی صاحب کی رباعیوں میں عام زندگی کے خوش نما رنگ بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اُن کا بچپن صاف و پاک ماحول میں گذرا ہے۔ قدرت کے کئی رنگ انہوں نے نزدیکی سے دیکھے ہیں اور خوبصورتی سے بھری ہوئی قدرت کی لہر انہیں اپنی اور ہمیشہ کھینچتی رہی ہے۔ انہوں نے موسموں کی خاصیتوں کی خوبصورتی اور لوک خوبصورتی، ایک ہو کر دیکھ کر انسان اور قدرت کے درمیاں رشتے کو سمجھنے اور بیاں کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ نئی بہار کے آنے سے ہی فطرت نیا پوشاک پہنتی ہے۔ بہتی ندیوں کا کَل کَل اور پھل دار درختوں پر کھلا جوبن، معشوق کی میٹھی یادیں اور ملنے کی تڑپ اور اس پر بادام واری کا میلہ، یہی لوک رنگ کی اپنی خوبیاں ہیں۔

نازکی صاحب کی شخصیت با اثر تھی۔ انہیں کشمیر کی پرانی تواریخ، مختلف مذہبی انقلابوں، صوفی مت اور رِشی مت کے ساتھ ساتھ جدید دَور کی تمام ادبی سرگرمیوں کی پوری جانکاری تھی۔ اسلام اور فلسفے کا بھی انہوں نے گہرا مطالعہ کیا۔ اُن کی شخصیتؔ کی کشمیر میں مطالعے کا شوق اور علم حاصل کرنے کی خواہش کا خاص ہاتھ رہا ہے۔ انہوں نے زندگی کے سکول میں بہت کچھ پڑھا ہے اور بہت کچھ محسوس کیا ہے۔ بہت دیکھا اور سنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی رباعیوں میں احساس کی تازگی کے ساتھ ساتھ سوچ کی بلندی بھی پائی جاتی ہے۔ اُن کی سادہ اور بے باک زندگی میں اونچے خیالات بستے تھے۔ وہ اس حقیقت سے خوب واقف تھے کہ غزل کے ذریعے حسن وعشق کی داستاں کہتے، سننے سنانے اور دہرانے پر بہت وقت خرچ ہوا ہے۔ اب نئے انداز میں زندگی کو نئے

Contents کے پسِ منظر میں نئے بھروسوں اور پہچانوں کے ساتھ سمجھنے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے رباعی اور قطعات کو اپنے اظہار کا خاص ذریعہ بنایا۔ یہی وہ وقت تھا جب مرحوم دینا ناتھ نادم نے چوداں مصرعوں کی غزل اور آزاد نظم کو کشمیری زبان میں اظہار کیلئے اپنایا۔ نازکی صاحب کو روایتی صنفوں کی اور کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ یہ صنفیں کافی گھسی پٹی تھیں اور ضرورت اس بات کی تھی کہ بدلتے حالات کے مطابق اظہار میں نئے تجربے کیئے جائیں۔ بدلاؤ کے اس دور میں باہر اور اندر کے تصوّر میں تبدیلی ضروری ہے۔

نازکی کی رباعیوں میں رنگ برنگے تجربے ہیں۔ ان کی شاعری کے تجربے موافق اور اہم ہیں۔ یہاں احساس کی گہری، سوچ کی بلندئی تصوّر اور قوّت تخیّل کا میٹھا میل ہے۔ جدید کشمیری کی تواریخ میں رباعیوں کو ایک خاص سمت دینے میں نازکی صاحب کی دین تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ سچ ہے کہ عربی، فارسی، اردو کا گہرا اثر ان کے لفظوں اور اظہار میں ملتا ہے۔ توازن قائم رکھنے کیلئے اگرچہ وہ ہوشیار تھے، پھر بھی کہیں کہیں پر وہ اس کو برقرار نہ رکھ سکے۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ کاش نازکی صاحب کو سنسکرت زبان کی پوری جانکاری ہوتی تو رباعیوں کا رنگ کچھ اور ہی ہوتا۔ صدیوں تک غیر ملکی زبانوں کے چنگل میں پھنس کر کشمیری زبان کو بولی ہی سمجھا جاتا ہے، زبان نہیں؟ یہ ایک تواریخی حقیقت ہے جس سے ہم انکار نہیں کرسکتے۔ نازکی صاحب کو زندگی سے پیار ہے لیکن ساتھ ہی زندگی کے راز کو جاننے، سمجھنے اور بیان کرنے کی بے تابی بھی ہے۔ اس زندگی کے آگے بھی کچھ لاجواب اور راز ہیں جنکو جاننا ہی اصل میں زندگی کو پہچاننا ہے۔

اندر کا شاعر جب برجستہ گوئی میں پھوٹ پڑتا ہے تو زندگی اپنی کھٹی میٹھی

بنتے بگڑتے روپ میں مسلسل رواں دواں رکھتی ہے۔شاعر کی باہری خوبصورتی کا اندرونی خوبصورتی کا تال میل قائم کرتا ہے اور ہر ایک پل خوبصورتی کا کھوجی بن کر جینا چاہتا ہے۔ان کا نظریہ مثبت تھا منفی نہیں۔ان کو اصلی زندگی سے بے حد لگاؤ تھا اور رسمی برتاؤ سے نفرت تھی۔ وہ زندگی جینا چاہتے تھے۔ مشکلوں سے جھوجتے ہوئے اور آندھی طوفانوں کا سامنا کرتے ہوئے وہ منزل کی طرف بڑھتے رہے۔ وہ جانتے تھے کہ رونا ہنسنا، اٹھنا، گرنا، جیتنا ہارنا، کامیابی، ناکامیابی، خوشی، غم، دوستی، دشمنی، نیکی، بدی، اندھیرا، اجالا، مخالف عناصر کی جدوجہد کا نام ہی زندگی ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ زندگی کچھ پلوں کی ہے، عارضی اور فنا ہونے والی اور پل پل بدلتے والی ہے۔ وہ زندگی کے ہر پل کو پائیدار اور بیش قیمت سمجھ کر اس کو بامقصد بنانے کیلئے کوشاں ہے۔ لکھتے ہیں۔

مکانک بامہ رستوی پور دنیا
دو یہہ اودرُے لبن ہو ند بور دنیا
ہتس ؤرِیس تہِ ہرگاہ زندٕ روزکھ
پتو لاکن چھُ وانٕج وور دنیا

اس رباعی کو پڑھ کر یہ مطلب نکالنا غلط ہے کہ نازکی صاحب زندگی کی ناپائیداری سے ناامید نہیں تھے۔ وہ زندگی کی حقیقت سے آشنا تھے۔ باقی رہ جاتی ہے میٹھی یادیں۔ تخلیق کار اپنی تخلیق سے زندہ وجاوید ہو جاتے ہیں۔ موت ان کے جسم کو بے حرکت بنا دیتا ہے مگر اس کا قلم اس کو جاودانی بخشتی ہے۔ نازکی صاحب نے زندگی میں ہر حالت پر سوچا ہے لاقانونیت، رشوت، دھوکہ، رسم سماجی گراوٹ، خدا پر کم بھروسہ، بدلتے رشتے، ٹوٹتی امیدیں واقعات اور حادثات پر

سوچنے کیلئے مجبور کرتی ہے۔ شاعر دل کے رنگوں سے بھرے گیت کی تلاش میں ہے جس کے سامنے وہ اپنا دل کھول کر رکھ دینا چاہتا ہے۔ آج کی زندگی کی بے راہ روی (گمراہی) نے ان کو مایوس کر دیا تھا۔ کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ زندگی جی لینا ایک رسم نبھانا ہے۔ زمانہ ساز زندگی کے بناوٹی احساسات سے ناخوش شاعر اپنے دل کے غصے کو ظاہر کرتے ہوئے سماج کو گہری نیند سے جگانے کی کوشش کرتے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔

سخت جد و جہد والی زندگی جیتے ہوئے نازکی صاحب نے خاندانی فرض کو بخوبی نبھایا۔ نظم وضبط والی زندگی جینے کا درس دیتے ہوئے اپنی اولاد کو، مقصد کی حصولی کیلئے عمل کے میدان میں آگے بڑھنے کیلئے حوصلہ افزائی کی۔ ان کے بیٹے نے اونچی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بہت سارے کاموں میں عمدہ کارکردگی دکھائی ہے۔ بڑے بیٹے ریاض الاسلام ہارٹیکلچر محکمے سے ریٹائر ہوئے۔ نازکی کے خاندان میں شاعر فاروق نازکی، ہائی کورٹ جج بلال نازکی، ڈاکٹر نازکی نے اپنے اپنے شعبوں میں نام روشن کیا ہے۔

جموں و کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز نے نازکی صاحب کی صلاحیت کو تسلیم کرتے ہوئے ۱۹۷۴ء میں انہیں ایک بڑی محفل میں، ایک بڑے شاعر کے طور پر انعام سے نوازا گیا ہے۔

نازکی صاحب کی وفات ۱۶/اپریل ۱۹۹۸ء کو ۸۸ برس کی عمر میں سرینگر میں ہوا۔ وفات کی وجہ کوئی خاص بیماری نہیں تھی تاہم سفر کے راستے پر بوڑھے جسم نے ساتھ چھوڑ دیا۔

پنچھی چل خدا کے گھر

بھڑی اڑاں اوراپنوں نے آہ

شیش رہی کھٹی میٹھی یادیں

ٹپ ٹپ ٹپکے آنسو

بہہ چلی ویتھا

اکھشو سکت سمرتیاں

پوڈپ مالا میں

گوتھ رہا ہے

پرو رہا ہوں

پرو رہا ہوں

...☆☆☆.................

☆ اپنی نِگارشات صاف صاف، اور کاغذ کے ایک ہی طرف لکھیں۔تبدیلی پتہ/یا فون نمبر بدلنے کی صورت میں ہمیں مطلع کرنا نہ بھولیں۔ (ادارہ)

...........☆☆☆...........

سیّد لیاقت میر

دُھوپ تھی

......گئی آفتاب کے ساتھ

میں بچوں کو میر غلام رسول نازکی مرحومؒ پر نوٹ لکھوا رہا تھا۔ فاروق مضطر صاحب نے اِدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ آج کل انکے فرزند ارجمند اِن بستیوں میں ہیں اور بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی کے رجسٹرار ہیں۔ سنتے ہی دیدار کا شوق ہوا۔ ویسے بھی میں صحرانوردی و فاقہ مستی کر رہا ہوں اور اس میں مزا آرہا ہے۔ کیونکہ اِسی کی وجہ سے تماشائے اہلِ کرم دیکھنے کا موقعہ ملا۔ بس کیا ہوا۔ پاؤں زمیں پر نہ لگے۔ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ ان کے دورازے پر جا پہنچا۔ دربان سے علیک سلیک ہوئی۔ عزت سے بٹھایا۔ اچانک نازکی صاحب وارد ہوئے:

السلام علیکم

گلابی رنگ، کتابی چہرا، پرکشش آنکھیں، تابندہ پیشانی، اونچی ناک، اُردو غزل کی ناک، سفید چشمہ، ریش غالب، برون حاضر، لبوں پہ تبسم، میٹھے بول، چست بدن، نازک ہاتھ، لرزیدہ آواز، محبت شناس، مہمان نواز، وفا پرست، نفاست پسند، مجسمۂ

خلوص ومحبت، جس متحرک مجسمے کے یہ نقش ونگار ہیں، لوگ انہیں ایاز رسول نازکی کے نام سے جانتے ہیں۔ درددل سے باتیں کیں اور غزل کے کچھ اشعار سُنائے۔

یار مدت سے خفا ہیں کیوں نہیں
ہم بھی آتشِ زیرِ پا ہیں کیوں نہیں



ان سے ملیئے گا تو کہیئے کون ہیں
ہم سے وہ بھی آشنا ہیں کیوں نہیں



روح مومن، جسم کافر ہے آیاز
یہ تو کہیئے پارسا ہیں کیوں نہیں

مجھے خدا حافظ کہنے سے پہلے، میر غلام رسول نازکی مرحوم کا یہ شعر پڑھا گیا

آج حد درجہ اداسی ہے میرا ساتھ نہ چھوڑ
التجا ایک ذراسی ہے، میرا ساتھ نہ چھوڑ

بے حد اچھا لگا۔ میں نے عرض کی حضرت اس کے اور شعر فرمائیں۔ انہوں نے دوسرے کمرے سے 'متاعِ فقیر' لاکر، جو میر غلام رسول نازکی مرحوم ومغفور کا شعری مجموعہ ہے، مجھے عنایت کیا۔ گھر آتے ہی مطالعہ شروع کیا۔ زبان وبیان کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ نازکی مرحوم کے کلام میں عشق اور فن دونوں خوبیاں موجود ہیں۔ وہ ستاروں پر کمندیں ڈالنے والے شاعر تھے۔ انکے کلام میں احساس وجذبات کو اوّلیت کا شرف حاصل ہے۔ نازکی مرحوم اپنے آپ کو اپنے احساس اور جذبے کے والہانہ پن کے سپرد کردیتے ہیں۔ انہوں نے درد کی دوا بھی پائی

ہے اور درد کا دوا بھی پایا ہے۔ وہ سلگتی ہوئی آتشِ رفتہ کے شاعر ہیں۔ وہ لفظوں سے کھیلتے نہیں بلکہ لفظوں کے رشتوں کے باہمی تقدّس اور ان کے پیچھے نغموں اور رنگوں کے دروبست کے شیدائی ہیں۔ ناز کی مرحوم نے اپنے احساس کو اپنا رہنما بنایا ہے۔ وہ اس کے لئے اپنا مناسب اظہار پالیتے ہیں اور وہ شعر کے سانچے میں ادا ہو جاتا ہے۔ انہوں نے غزل اور نظم دونوں کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ بنیادی طور پر وہ غزل گو شاعر ہیں۔ فکر کے اعتبار سے نہیں۔ جذبے کے رچاؤں کے اعتبار سے۔ مثال کے طور پر:

گل بداماں، گل بکف، گل پیرہن کب آئے گا
وہ سراپا رونقِ صحنِ چمن کب آئے گا



انجمن کی انجمن سونی پڑی ہے ہر طرف
سوچتا ہوں وہ فروغِ انجمن کب آئے گا



زندگانی ہے قصیدہ یا رجز یا مرثیہ
دوستو! اس میں غزل کا بانکپن کب آئے گا

ناز کی مرحوم و مغفور کی شاعری کے موڑ دو مرحلوں سے شروع ہوتے ہیں۔ ایک طرف حسن کے نئے پرتو ـــــ سے، جس نے ان کی پوری شخصیت میں ایک ہی شمع روشن کی جو پل پل جلتی اور پگھلتی رہی نشاطِ زیست نہ ان کا مقدر تھا اور نہ مقصد۔

گو عمر کٹی مایوسی میں، دل غم سے مکدر ہو نہ سکا

ایماں میں تزلزل آنہ سکا، دامانِ وفا تر ہو نہ سکا

ان کی شاعری کا ہر رنگ اپنے ہم آہنگ رنگوں کے ساتھ رنگ دار نغمے برساتا نظر آتا ہے۔ ان کے کلام میں نغمگی اور محاکاتی اقدار کا پوری طرح احساس ہوتا ہے۔

کیا اب بھی یاد ہے تمہیں وہ خوش گوار شام
پورب سے ہولے ہولے جو اُبھرا مہہ تمام



دونوں تھے ہم خموش خدا جانے کتنے دور
تھا باغ کی روشِ عنادل کا اژدھام

لفظِ تازہ کی تلاش جو ایک نئی کیفیات کو جنم دے سکتی ہے، ان کی غزلوں میں جا بجا اور بڑے والہانہ انداز میں بکھری ہوئی ہے۔ حق تو یہ ہے کہ ناز کی مرحوم کو نئی تصویریں سجانے اور نئے رنگوں سے قوس قزح سجانے کا ہنر آتا ہے۔



آج پھر چھیڑی ہے تم نے میرے ارمانوں کی بات
کاوشِ زخم جگر کے تازہ انسانوں کی بات



زادۂ صحن چمن پروردہ آغوشِ گل
ہم بیاباں میں بھی کہہ دیں گے گلستانوں کی بات



اک ادائے خاص سے ہم نے کہی تم نے سنی

کون سنتا ہے جہاں میں ورنہ دیوانوں کی بات

ان کی عام غزلوں کے اشعار سے بھی اک خاص کردار کے عاشق کا عالم ہوتا ہے ۔ جیسے محبوب کے اپنے بنائے ہوئے معیادِ محبت اور اپنی جیسی بلندی فطرت کی طلب ہے اور اس تعلق سے محبوب کی شخصیت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ان کے خیال میں کوتاہ دستی میں محرومی ہے اور میناُ اسی کا ہے جو خود بڑھ کر ہاتھ میں اٹھالے۔ وہ اپنی خواہشوں کا مطالبہ اپنے محبوب سے یوں کرتے ہیں۔



آج حد درجہ اداسی ہے میرا ساتھ نہ چھوڑ
التجا ایک ذرا سی ہے میرا ساتھ نہ چھوڑ



آج کی رات بھیانک ہے میرے ساتھ رہو
اک قیامت بھی بپا سی ہے میرا ساتھ نہ چھوڑ



آسماں برسرِ پیکار ہے نظریں نہ چُرا
یہ زمیں خون کی پیاسی ہے میرا ساتھ نہ چھوڑ



آج اس شہر پہ نازل ہے خداؤں کا عتاب
تو بھی اس شہر کا باسی ہے میرا ساتھ نہ چھوڑ



کربلا آج بھی ہے دیکھ ادھر خونِ حسینؓ

وہ محمدؐ کی نوائی ہے میرا ساتھ نہ چھوڑ

غزلوں کے علاوہ انکی کئی نظمیں ہیں۔ لیکن ''ایک اندھی لڑکی کا گیت''
'مزارِ دوست'، گڈریئے کا گیت'، دیوالہ، کشمیر، یادگار، جاودانی وعرفانی نظمیں ہیں۔
نازکی مرحوم، حضرت علامہ اقبالؒ سے ضرور متاثر رہے ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ
ان کے کلام میں علامہ اقبال کا رنگ جابجا نمایاں ہے۔ علامہ اقبال کا خوب
مطالعہ کر لینے کے بعد انسان اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ دوہی مفہوم میں انہیں نہ تو
غزل گو شاعر کہا جاسکتا ہے اور نہ نظم کی ترقی یافتہ منطق پر انہیں محض نظم گو کا نام
دیا جاسکتا ہے۔ وہ مبالغہ آمیز حد تک سنجیدہ تھے۔ بے شک نازکی مرحوم پر انکا اثر
رہا ہو لیکن اقبال کی غزلوں اور نظموں میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ مگر نازکی مرحوم کی
غزل غزل ہے اور نظم نظم۔ یہ غزل کے میدان میں بہت ریزہ کار ہیں جبکہ ڈاکٹر
اقبال کے ہاں ایسا نہیں ہے۔

ان کے ہاں خود کفیل اور محتاط قسم کی انانیت ہے جو زندگی اور شاعری کے
ہر مرحلے پر ان کے کام آئی۔ شخصیت کی اسی ساخت میں ایک اور چیز کا اضافہ ہوا
اور وہ ہے ہر چیز کی طرف سے ایک قسم کی بے اطمینانی اور احساسِ فریب۔ جن
لوگوں کے سینے سوز سے خالی ہیں اور آنکھیں بھی نم نہیں۔ جنکا ہر عمل دکھاوا ہے
ایسے لوگوں پر لعنت کرتے ہیں۔

ٹھنڈے ٹھنڈے دل ہی ان کے گویا برف کی قاشیں ہیں
اجلی اجلی پوشاکوں میں چلتی پھرتی لاشیں ہیں



سینوں میں بیمار ارادے آنکھوں میں بے نور نظر

اسکے علاوہ جذبات کو برداشت کرنے کا ملکہ یعنی افسردگی ضبط غم بھی اور نشاطِ ضبطِ مسرّت بھی ایک ایسا رتبہ جو خود کو حادثات کی بھٹی میں تپانے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ میر غلام رسول نازکی مرحوم کے لفظ لفظ اسے ضبط و نظم، سلاست روی اور اعتدال پسندی بدرجہ اُتم ملتی ہے۔ ان کے کلام میں تمام کمالات اپنی خوبیوں کے ساتھ ملتے ہیں۔ حسن و عشق کے مضامین کے علاوہ تصوّف، فلسفہ، اخلاق، معرفتِ الٰہی، پند و نصائح، رموز حیات و ممات، سبھی خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ان کا غم عشق سوز و گداز ایک انفرادی تاثرات سے بلند ہو کر ایک دور کا اقدار بن جاتا ہے۔ ان کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے۔

رونا ہے کوئی لگتی ہے اپنے جگر پہ چوٹ
زخمِ جگر کہیں بھی ہو، مرہم رہا ہوں میں

شوخی ان کے کلام کی ایک اور نمایاں خوبی ہے جو جا بجا دکھائی پڑتی ہے۔ یہ شعر دیکھیے۔

جبیںِ ناز کو آلودۂ ملال نہ کر
میں بے ادب ہوں، میری بات کا خیال نہ کر



خدا بھی تجھ سے جو پوچھے تیری رضا کیا ہے
قلندری کا تقاضا ہے عرضِ حال نہ کر

اسی مقام پر نازکی مرحوم کی قلندری، ڈاکٹر اقبال کی خودی سے کئی قدم

آگے نکل جاتی ہے۔

انکے کلام کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ اس میں تصوّف کی بہترین مثالیں ملتی ہیں۔ مثال کے طور پر چار مصرعے دیکھئے کیا خوب فرماتے ہیں:

کبھی اک روز بھی سوچا ہے میں نے
کتنے دن گذارے میں نے تجھ بن



مجھے دنیا میں کیوں لایا گیا تھا
چھیاسی سال پہلے آج کے دن

ناز کی مرحوم کے دل میں وطن عزیز کے چپے چپے، ذرّے ذرّے کی محنت کوٹ کوٹ کے بھری ہوئی تھی۔ کشمیر اُن کی ایک یادگار نظم ہے۔ وہ وطن کی محبت کو جزوِ ایمان سمجھتے تھے۔ بقولِ شاعر؂

مرے کشمیر کی ہر شے حسیں ہے
یہاں کی ہر پہاڑی نازنیں ہے
فلک پر اِس زمین کی سرزمیں ہے
فلک خود جھیل ڈل میں تہہ نشیں ہے

ہمارے کشمیری شاعر نے بھی میرؔ و غالبؔ کی طرح ان مولویوں پر طنز کی ہے جن میں خلوص نہیں، جنکے سینے سوز سے خالی ہیں۔ جنکے پاس علم ہے، دین نہیں اور دلوں میں خوفِ خدا نہیں۔ ارشاد فرماتے ہیں؂

خدا دلوں سے دُور ہے، مہیب و ناصبور ہے
یہ مولوی کا فلسفہ نوشتۂ اَزل نہیں

انکے کلام میں نئی تہذیب پر بھی چوٹ ہے۔ جہاں اُستاد کا احترام نہیں رہا، بزرگوں کی عزت کم ہوگئی۔ پڑوسیوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں رہا۔ غریبوں بے کسوں، بے نواؤں اور یتیموں کی مدد و اعانت نہیں رہی۔ بے سہاروں کے سہارے ٹوٹ گئے۔ دردِ دل نہیں رہا اور احترامِ آدمی نہیں رہا۔

بن رہا ہے تانا بانا اک نئی تہذیب کا
اِسمیں حسُنِ صورتِ گنگ و جمن کب آئے گا
آدمی کرنے لگے گا آدمی کا احترام
ہاتھ یہ سرمایۂ عہدِ کہن کب آئے گا

علاوہ ازیں اِنکے کلام میں تلمیحات کی بہترین مثالیں موجود ہیں۔ جیسے:

طُور پر کیا چیز دیکھی تھی کلیم اللہ نے
اِسطرح بے ہوش ہو جانے کے ہم قائل نہیں

اور یہ شعر دیکھئے:

اِتنی بد نامی نہ ہو جاتی زلیخا کی اگر
چاک اُس نے کرلیا ہوتا گریبانِ عزیز

میر غلام رسول نازکی کا طرزِ تحریر رنگین، پرُ کیف اور شگفتہ ہے۔ اِن کے جمالیاتی ذوق کا حسین عکس ہر جگہ اِن کے اسلوب میں موجود ہے۔ انکے یہاں اسلوب کی ایک اور بڑی خصوصیت ایجاز واختصار ہے۔ ایجاز ان کے یہاں حُسن پیدا کرتا ہے۔ وہ بے ضرورت جزئیات کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور اطناب سے بچ جاتے ہیں۔ ان کا اسلوب اردو کا معیاری اسلوب ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ 'متاعِ فقیر' اک تازہ، شگفتہ اور ادبی اسلوب سے مالا مال

نظر آتا ہے۔

اسلام کے سچّے عاشق اور ملّت کے سوگوار میر غلام رسول نازکی آج ہم میں نہیں لیکن جس یقین و عمل سے انہوں نے ہمارے دلوں کو جگمگایا ہے، اسکی روشنی شک اور مایوسی کی تاریکی میں ہمیں صراطِ مستقیم دکھاتی رہے گی۔ نازکی مرحوم رسول اللہؐ کے عشق میں محو تھے۔ مستغرق تھے، سرکارِ مدینہ، سرورِ قلب وسینہؐ کا اسم مبارک زباں پر آتے ہی انکی آنکھیں چھلک جاتی تھی۔ وہ فنافی الرسولؐ کے مقام پر فائز ہو گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مرنے کے بعد بھی اَمر ہو گئے۔

راستے میں ایک بستی تھی وہاں کعبہ بھی تھا
میں نے دیکھا تھا مدینے کی طرف جاتے ہوئے
میرا کعبہ آپؐ ہیں، میرا قبلہ آپؐ ہیں
میرے سب کچھ آپؐ ہیں آتے ہوئے جاتے ہوئے

آخر میں نازکی مرحوم کی نذر یہ شعر اور اجازت:

کیا لوگ تھے جو راہِ وفا سے گزر گئے
جی چاہتا ہے ہر نقشِ قدم چومتا چلوں



فاروق نازکی

میر غلام رسول نازکی کیلئے ایک نظم

سبز علی سکوتی ۹۰ برس کا ہوا
اُس نے اَپنے ساتویں بیٹے کو اپنے پاس بلایا
شفقت سے اسکے سر پر ہاتھ رکھا
[اولادِ صالح سوال نہیں کرتی
حکم کا انتظار کرتی ہے]
سبز علی سکوتی زیرِ لب مسکرایا
اور پھر بول اٹھا
وتستا کی خاموشی پر مت جا
یہ خاموشی ایک بھیانک طوفان کا پیشِ خیمہ ہے
یہاں سے نقلِ مکانی حکم ہوا ہے۔
کوہِ ماراں پر میرے لئے ایک جھونپڑی ڈالدے
میں وہاں سے بستی کے ڈوبنے کا منظر دیکھونگا۔
جب ساری وادی پانی میں غرق ہو جائے گی

تب میں مراقبے میں جاؤنگا
اور پھر ویری ناگ سے وتستا دلہن بن کر
ولر کے راج کمار کے ساتھ جائے گی،
اولادِ صالح نے باپ کا حکم سنا......
وتستا کے کنارے پر واقع اسکی عمارت
''قیدِ حیات''......جو پگوڑا فنِ تعمیر کی
ایک دلاویز یادگار تھی
منہ مانگے داموں پر بیچ ڈالی

●

ہاری پربت سے سٹا ہوا ایک وسیع قطعہ زمین
خرید لیا
جس کی ایک حد سلطان العارفین شیخ حمزہؒ کی
درگاہ سے لگی ہوئی تھی
اسی قطعۂ زمین پر ایک جھونپڑی بنا دی گئی
جس میں سبز علی سکوتی فروکش ہوئے۔
وتستا آہستہ خرامی سے بہتی رہی۔
سوسنہ، جوہی، مشکِ بید، گلاب، یاسمن، اشرفی،
بادام کے شگوفے کھلتے گئے
پُروائی خوشبو خوشبو بکھرتی رہی۔
ہوائیں پھولوں کے پیرہن کی طرح لہک اٹھیں

سیلاب کے آثار کہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

●

وقت آدھی رات کا
اس سے کچھ کم
یا
اُس سے کچھ زیادہ
ساتواں بیٹا۔ جھونپڑی کے دروازے پر تیار بیٹھا تھا۔
سبز علی سکوتی تہجد کے لئے جھونپڑی سے باہر آئے
اور جنگل کی اور چل دیئے
بیٹا بھی باپ کے پیچھے پیچھے ہولیا
جنگل کی طرف جاتے جاتے، بیٹے کے من میں سوال آیا
کہیں میرا باپ اورنگ زیب کی طرح اضداد کا مجموعہ تو نہیں
''قیدِ حیات'' میں اسکے غسل خانوں میں دودھیا سنگ مرمر
کے فرش پر نظریں پھیل جاتی تھیں
اور اب
دو چٹانوں کے درمیان گھاس پھوس سے ڈھکا یہ بیت الخلاء
یہ لوٹا یہ چوپائی۔
چٹائی کا مصلیٰ
[بیٹے کو خیال آیا.......... بُرے خیال ابلیس کے
حملے کی دلیل ہوتے ہیں]

باپ کی تابعداری عبادت ہے

اسے یاد آیا۔ کہ چند لمحوں کے بعد وہ

درودِ حضورؐ کے بعد پڑھے گا

رَبِّ جعلنی مقیم صلوات ---رب استغفرلی

وللوالدین وللمومنین ---رب رُحمهما کمار بّینی............

کئی بار استغفار پڑھنے کے بعد بھی

ایک اور خیال بجلی کے کوندے کی طرح

اس کے ذہن کے آسمان کو چیر کر نکل گیا۔

خیال تھا۔

"کہیں میں نے لاکھوں کا کاروبار چھوڑ کر

عقل، فہم فراست، اور دنیاداری

کو جذبات کی چوکھٹ پر قربان

کر کے غلطی تو نہیں کی" --دوسروں کی مدد کرنے

کے بعد جو نشے کی حالت طاری ہوتی تھی، اُسے

ہمیشہ کے لئے خیر باد کہا۔

اپنے قلندر باپ کی خوشنودی کے لئے

اپنی اولاد کو تعلیم حاصل کرنے کے لئے

پردیس بھیج دیا۔

انہوں نے وجہ دریافت کی۔ تو میں نے

Email پر یہ عبادت

لکھ بھیجی ۔۔۔ ''اگر تعلیم پانے چین بھی جانا پڑے دریغ نہ کرو''

اس خیال کے چنگل سے آزاد ہوتے ہی

ایک اور خیال نے اُسے گھیر لیا

وہ سوچنے لگا ۔۔ کہ کئی ہفتوں سے

وہ اپنے باپ کا خرقہ اور اپنا جوڑا

اپنے ہاتھوں سے دھوتا ہے۔ وہ اس تیقری سے

دل برداشتہ ہوتے ہی والا تھا۔ کہ آواز آئی

''بیٹے۔ مٹی کی ایک ڈھلی لادے''

بیٹے کے باطل خیالوں کی ڈور ایک ہی جھٹکے میں

ایسے کٹ گئی۔ جیسے کوئی دلچسپ ٹی وی پروگرام

کرنٹ فیل ہونے سے دیکھنے والے

کو خواب سے نکال کر حقیقت کی پتھر زمین پر ٹپک

دیتا ہے

بیٹے کے منہ سے بے اختیار نکلا

''لایا، لایا بابا''

بیٹے نے ایک نوکدار پتھر اٹھایا، تا کہ ڈھلان سے مٹی

کی ایک دو ڈھلیاں توڑ سکے۔ اُس نے کئی جگہ سے

زمین کھرچنے کی کوشش کی۔ مگر ساری زمین سنگلاخ

ہو چکی تھی۔

اس نے حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھا۔

پربت کا رنگ سنہری ہو رہا تھا۔ پورے چاند کی
رات میں سارا پہاڑ جگ مگ کر رہا تھا۔
پیڑ، پتھر، جھاڑیاں ہر چیز سونے کی ہوگئی تھی۔
پھول پتی کو ہاتھ لگایا۔ تو یہ دیکھ کر کہ ہر شے سونے کی
ہوگئی ہے، بیٹے کے ہوش اُڑ گئے۔
اتنے میں باپ نے دوبارہ
آواز دی۔ نماز کا وقت قریب آرہا ہے
مٹی کا ڈھیلا... لا دے بیٹا......"
بیٹا سٹپٹاہٹ کے عالم میں چلایا۔
یہاں مٹی کا نام نشان بھی باقی نہیں ہے
سبز علی سکوتی نے پوچھا
مٹی نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟
بیٹا بولا ـــ ساری پہاڑی اسکے بیل بوٹے
مٹی پتھر سب، سونے کے ہو چکے ہیں
آواز آئی......تو سونے کی ہی ایک ڈھلی
لادے"
بیٹا بولا "سونا......تھوڑے ہی......کے کام
آتا ہے......آپ تو جانتے ہیں......"
سبز علی سکوتی اطمینان سے بولا۔ اگر اس کام کے
لائق نہیں۔ تو اس کے کھونے کا افسوس کیا معنی......"

بیٹے کو دوبارہ بجلی کی کرنٹ سی چھوگئی۔ وہ ایک

جھرجھری سے لیکر جیسے حرکت میں آ گیا۔ زمین

پر جھک گیا۔

کیا دیکھتا ہے۔ کہ ساری زمین مٹی میں بدل گئی ہے۔

●

سبز علی سکوتی نے تہجد کی نماز ادا کی

اس کا بیٹا جھونپڑی کے دروازے پر اونگھنے لگا

مگر چند لمحے بیشتر مٹی کو سونے میں بدلتے اور پھر

سونے کو مٹی میں تبدیل ہوتے دیکھنے کا واقعہ

اسکے ذہن پر گہرا نقش چھوڑ گیا تھا۔

اسکے سینے کی بندشیں ٹوٹ رہی تھیں

دل کی دھڑکنیں ایک خاص آہنگ اپنا رہی تھیں

ہر دھڑکن میں --- اللہ ہو

زیر و بم میں --- نامِ م ح م دؐ

●

رات کے سناٹے میں سبز علی سکوتی ٹھہر ٹھہر کر

کچھ گنگنا رہا تھا۔

یہ گنگناہٹ، یہ گنجار...... جیسے ہر شے کو چھو کر

گذر رہی تھی۔

سر بلند سفیدوں کی قطار جھوم رہی تھی۔

پُر وقار چنار کے پتے تالیاں بجا رہے تھے
دور...... بادام کے پیڑوں کے جھنڈ میں
شدتِ طلب کی ماری ایک فاختہ
اپنے جھنڈ سے الگ ہو کر نہایت ملائم اور
دل میں اترنے والی آواز میں گا رہی تھی
حق سرہ ہُو، حق سرَ ہُو،
بیٹے کے کان سماعت سے بے زار ہو رہے تھے
وہ اب آنکھوں سے سننے لگا تھا
یہ لمحہ کتنا مختصر، کتنا طویل تھا۔
وہ اب کانوں سے دیکھنے لگا تھا
اسکی رگوں میں عجیب طرح کا نور اُترنے لگا تھا
اسکے روئیں روئیں میں جگنو چمک رہے تھے
اسکے جوڑ جونہی ہلتے تو بدن سے چقماق کی چنگاریاں
نکلنے لگتیں۔
اسکے گوشت پوست سے نُور کے دھارے پھوٹ رہے تھے.
اچانک جھونپڑی کے اندر سے ہزاروں
سازوں کی آواز ایک شعلے کی طرح لپکنے لگی
بیٹا سن رہا تھا، سبز علی سکوتی کے لبوں پر
دعا تھی۔ شرح لی صدری
پھٹی آنکھوں سے بیٹے نے قریب کی مسجد

سے آنے والی اذان کی آواز سن لی۔

الصّلوٰت خیر من النوم

اسکی نیند کب کی خواب ہو چکی تھی، اور وہ

اب جاگتے میں خواب دیکھنے کا خوگر ہو گیا تھا،

آسمان پر صبحِ صادق کے آثار نمایاں تھے،

بیٹے کو لگا جیسے کوہِ ماران (ہاری پربت) کا پہاڑ

بیٹھے ہوئے اونٹ کی طرح ہے۔

اسکے کوہان چکریشوری مندر کا بھاری بھرکم

گول پتھر ہے۔

جس پر ہزار ہا سال پہلے کسی وِدوان نے

شری نیتر کا نقش کھود کے رکھا تھا

اونٹ کی بائیں پسلی پر شیخ حمزہ مخدومؒ کی

درگاہ ہے، جس کے دروازے پر لکھا ہے

ہر سحر خورشید می ساید جبیں

بر درِ محبوب رب العالمین

اونٹ کی بائیں پسلی پر گردوارہ چھٹی پادشاہی ہے

اور اونٹ کے قدموں میں جلال الدین محمد اکبر کا

کاٹھی دروازہ ہے......کاٹھی دروازہ

دیکھ کر اسے سیکری فتح پور کا بلند دروازہ

یاد آیا۔ جو اس نے ہنی مون کے دنوں بڑے چاؤ

سے اپنی بیوی کو دکھایا تھا۔

اسے پرانی عمارتوں، اور پرانے ساز و سامان سے بے حد لگاؤ تھا۔ وہ شوق سے کباڑی کی دکان سے کپڑے بھی خرید لیتا تھا، جب کوئی پوچھتا یہ پُرانے کپڑے پہننے میں کیا تک ہے، تو وہ پوری معصومیت اور شرارت کے ملے جلے، لہجے میں کہتا...... یہ کپڑے بڑے جہاں دیدہ ہوتے ہیں، سرد و گرم زمانہ سے واقف شاعر نے کہا ہے ؎

وہ بندھن ہی کیا بندھن ہے، نیا جو بندھن ہووے
پیر فقیر کی اترن، پہنے چیلا باون ہووے

بیٹا جھونپڑی پر دستک دینی والی صبح کی پہلی کرنوں کا منتظر تھا۔

گردوارے سے صدا آئی

یا پتھر پوجے ہری ملے تو پوجوں میں پہاڑ
وا سے تو چکی بھلی پیش کھاوے سنسار۔

الف اللہ نور اُپایا قدرت دے سب بندے
ایک نور سے سب جگ اپجایا کون بھلے کون مندے،

کوہِ ماران کے دامن سے صدائے ربّانی بلند ہوئی، معرفت کی ہوائیں رقص کرنے لگیں۔ ذرّہ ذرّہ عرفان کی خوشبو میں سرشار، اُفق تا اُفق

فضاؤں کو مہکانے لگا۔

کُل عالم تیری یاد کرے، تو صاحب کا سچا ہے

خوابیدہ مورتیوں کو کسی شردھالو نے دودھ سے نہلایا۔

مورتی تو نہیں بولی، شردھالو کے اندر اَن گنت

شنکھ بج اُٹھے۔ اور ہر طرف سے آواز آئی

شِو شنکر ہر ہر، شِو شمبھو، دکھیارن کو مکتی ونجو۔

اے باپ نوارک، اوم ہری، بھکتن پر اپنی دیا کجیو۔

سورج اپنی کرنیں ہر سُو بکھیرتا گیا۔ لوگوں کی تعداد

بڑھتی گئی۔ صوفی، سنت، گیانی، عقیدت مند، نوجوان

بوڑھے، بچے، زن و مرد، کیا خاص کیا عام۔ سبھی کوہِ ماراں

کے گرد چکر کاٹنے میں محو ہو گئے۔

صبح کی نوخیز کرنیں ابھی تک سبز علی سکوتی کی

جھونپڑی کے دروازے پر پوری طرح نہیں پڑی تھیں،

آمد آمد تھی، مہرِ تاباں کی

مرمریں، نازنین، پہاڑیوں کے ماتھے چمک رہے تھے،

ہر طرف سے ایک ہی صدا آ رہی تھی،

تو ہی تو۔ تو ہی تو،

اُسے یاد آیا،

جب اسکی ماں صبح کے بعد لوٹی تھی

تو اسنے کہا تھا،

"میں نے رب کا کوٹھا دیکھا۔ وہ بار بار
مجھے اپنے پاس بلاتا"......اور میں بار بار
کہتی......لبیک، لبیک......
اُسے خیال آیا......میری ماں تو پوری طرح اُمّی تھیں۔
اسنے پاسپورٹ پر بھی اپنا انگوٹھا چسپان کیا تھا،
اسنے نہ تو شہاب نامہ ہی پڑھا تھا۔
اور نہ ممتاز مفتی کی لبیک۔
پھر اسے صمد میر کا شعر یاد آیا......
پڑھ پڑھ کے ہوا پتھر، لکھ لکھ کے ہُوا چور
جس پڑھنے سے صاحب ملا وہ پڑھنا ہے، اور
اتنے میں سورج پورے جاہ وجلال کے ساتھ مغرب سے
طلوع ہوا۔
لوگوں کی بھیڑ جھونپڑی کے کھلے آنگن میں سمٹ
کر رہ گئی......بیٹا بھیڑ کو دیکھتا رہا۔
اتنے میں سبز علی سکوتی جھونپڑی سے باہر آیا
اور ایک گول پتھر سے ٹیک لگا کے بیٹھ گیا
لوگ آتے گئے، تقاضے کرتے گئے۔ گذارش
عرضداشتیں، مشکلوں میں آسانیوں کی دعا۔
جو مانگنے آئے تھے، مانگ رہے تھے
سبز علی سکوتی خاموشی سے ہاتھ ہلا ہلا کر سب کی

تسلّی کر رہا تھا۔ اسکی آنکھوں میں عجیب طرح کی

تلاش کی کیفیت تھی۔ وہ کسے ڈھونڈ رہا تھا

اُسے شاید کسی کا انتظار تھا۔ مگر کس کا

لوگ آتے گئے۔۔۔ اور مرادیں مانگ کر چلتے بنے۔

سبز علی سکوتی واپس جھونپڑی کے اندر چلا گیا

اچانک...... اچانک...... اچانک

جھونپڑی کے باہر کھلبلی سی مچ گئی

ہُو، ہُو، ہُو، کی رٹ لگاتا ہوا

ایک مادرزاد ننگا ملنگ

اُن لوگوں کے سامنے ظاہر ہوا،

جو ابھی تک جھونپڑی کے سامنے تھے......

یہ لوگ اُسے دیکھ کر، کچھ گھبرائے، کچھ شرمائے۔

اور کچھ سٹپٹائے۔ وہاں سے چلدیئے

ملنگ جھونپڑی کی طرف بڑھا۔

سبز علی سکوتی نے جھونپڑی کا

پھٹی ہوئی چٹائی کا بُنا ہوا برائے نام

دروازہ بند کیا۔

بیٹا۔ ملنگ اور دروازے کے درمیان کھڑا ہو گیا۔

ملنگ ہُو ہُو کرتا ہوا، زمین پر لوٹ پوٹ ہوا۔

اے سبز علی سکوتی ۔ کب آئے گا

کب آئے گا خوشبو کا قافلہ کب آئے گا

ملنگ کی آواز جیسے گلے میں جم گئی۔

وہ لمبی سانسیں لینے لگا۔

بیٹے نے محسوس کیا کہ

ہر طرف سے خوشبو کی لپٹیں آ رہی ہیں۔

سبز علی سکوتی۔ خاموش، پوری متانت کے

ساتھ کٹیا کے آنگن سے نکلا

اور ملنگ کے ساتھ اُونٹ جیسی پہاڑی کے

ٹیلے پر چڑھ گیا۔ جو کوہان کی طرح تھی

ملنگ نے آنِ واحد میں پہاڑی سے

چھلانگ لگا دی۔

کوہِ ماراں سے ایک چیخ ٹکرائی۔ اور

پھر کھو گئی

بیٹے نے دیکھا...... کٹیا کا دروازہ بند تھا،

زندگی کی ریل پیل شروع ہوئی تھی۔ سبز علی سکوتی

کا کہیں نام ونشان بھی نہ تھا۔

ظہر کی اذان ہوئی۔

نہ تو باڑھ آئی، اور نہ ہی شہر غرقاب ہوا۔

..................☆☆☆..................

ایاز رسول نازکی

ایازِ قدرِ خود بشناس

کئی روز سے میں

پریشان ہوں،

حیران ہوں

مراذہن جیسے

کہ ماؤف ہے

مرے ہاتھ کی انگلیاں

مفلوج ہیں

قلم سامنے رکھ کے

بیٹھا ہوا ہوں

میں کچھ بھی نہیں جانتا ہوں

میں کچھ بھی نہیں جانتا ہوں

خیالوں کے طائر

شکستہ پروں سے

کوئی سعی بھی نہیں کر رہے ہیں

جسارت، حماقت
کسی پر بھی جیسے
میرا بَس نہیں ہے
میں شاعر نہیں ہوں
میں تحریر کے فن سے
واقف نہیں ہوں
میں تقریر سے بھی
ابھی نابلد ہوں
مگر یہ بھی سچ ہے
کہ کچھ شعر میں نے کہے ہیں
کئی نقش میں نے گھڑے ہیں
یہاں پر کئی بار
تقریر کی ہے
میرے فن کی یاروں نے
تعریف کی ہے، توصیف کی ہے
تو پھر کئی روز پہلے
یہ پھر کیا ہوا تھا
کئی روز پہلے بس اتنا ہوا تھا
اسیرؔ صاحب نے مجھ سے کہا تھا

ہمالہ کی چوٹی پہ چڑھ کر
میں آکاش چُھولوں
دَمکتا چمکتا وہ سورج
ہتھیلی پہ رکھوں
اور اطراف واکناف میں
پھیلی ہوئی روشنی کو سمیٹوں
پہاڑوں کے اسرار جانوں
کہ میں ریگزاروں سے وسعت کے
امکان پوچھوں
میں شبنم کی بوندیں
نظر میں پرولوں
گُلوں کے چٹکنے کے اسرار کیا ہیں
اور بلبل کے نغمے کی آواز کیا ہے
اسیرؔ صاحب نے مجھ سے کہا ہے
کہ میں اپنے والد پہ مضمون لکھوں!!

..................☆☆☆..................

۱؎ : ولی محمد اسیرؔ کشتواڑی

اصل: میر غلام رسول نازکیؔ
کشمیری سے ترجمہ: غلام نبی آتشؔ

سفر نامہ حجاز

امین کاملؔ صاحب مُصرِ ہیں کہ میں سفر نامہ حجاز تحریر کروں میرے سامنے اس وقت دو مشکلیں ہیں۔ ایک یہ کہ آج تک بِلا مبالغہ ہزاروں ایسے سفر نامے تحریر کئے جا چکے ہوں گے۔ کشمیری زبان میں فاؔضل کشمیری نے ایک مُفصّل کتاب لکھی ہے ایسے اکثر سفر ناموں میں معلومات کو صرف حج تک محدود رکھا گیا ہے۔ دوسری مُشکل یہ ہے کہ حج کے لئے جانے والا اکیلا نہیں ہوتا، وہ بڑے قافلے کا فرد ہوتا ہے، اس لئے زیرِ قلم معلومات صرف میرا سفر نامہ حجاز نہیں رہے گا۔ بہر حال، میں اپنے تجربات وخیالات کو قلمبند کروں گا، وہ کاملؔ صاحب کو پسند آئیں یا نہ آئیں، اُن کا خدا جانے اور وہ جانیں!

ہم ۱۹۶۷ء میں جنوری کی پانچ تاریخ کو عازمینِ حج کے لئے مخصوص بسوں میں سوار ہو کر ٹورسٹ رسیپشن سینٹر سرینگر سے روانہ ہو گئے۔ یہاں رسیپشن سینٹر میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ البتہ کریوہٗ پانپور پر ایک جگہ چار گھنٹوں تک قافلہ روک دیا گیا۔ روکے جانے کی وجہ معلوم کرنے کی کوششوں کے باوجود کچھ معلوم نہ ہو سکا، چلہ کلان تھا کشمیر میں سردیوں کے سخت ترین

چالیس دن، چلہ کلاں کہلاتے ہیں۔ پانپور کی وسیع وعریض کھلی کریوہ پر سرد ہوائیں چل رہی تھیں، کٹرا کے کی سردی میں ہم ٹھٹھر رہے تھے، ان چار گھنٹوں کے دوران گویا چار قیامتیں سہنا پڑیں۔ دریں اثنا میں نے عازمین حج کو گروہ در گروہ بسوں سے اُترتے دیکھا، وہ کریوہ کے ایک طرف جا کر چھوٹی تھیلیوں میں کچھ بھر کر واپس آتے تھے۔ میں بھی بس سے اُتر کر یہ دیکھنے لگا کہ شاید وہ کچھ خاص چیز لے آئے اور میں محروم رہ گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ لوگ اِستنجاء کے لئے استعمال میں لانے کے واسطے مٹی کے چھوٹے ڈھیلے تھیلیوں میں بھر بھر کر لانے کا چانس گنوانا نہیں چاہتے تھے، اس لئے مٹی تھیلیوں میں بھر کر لائے تا کہ سارے سفر میں کام آسکے۔ یہاں سے روانہ ہو کر دیر رات گئے جموں پہنچ گئے۔ حکومت نے عازمینِ حج کے قیام وطعام کا انتظام رکھا تھا۔ ہم نے خود انتظام کروایا تھا اسلئے سیدھے اپنے ڈیرے پر چلے گئے۔ کل جمعہ تھا، نمازِ جمعہ ادا کرنے کے بعد پٹھانکوٹ کی اور روانہ ہو گئے، وہاں سپیشل ٹرین تیار تھی۔ پٹھانکوٹ پہنچ کر لگا کہ قیامت قریب ہے کیونکہ حجاج کرام نے جوں ہی ریل دیکھی تو اُچھل کود شروع ہوگئی۔ سامان پھینک پھینک کر وہ خالی جگہوں پر قابض ہوتے گئے۔ دھکم پیل کے دوران گالی گلوچ اور جھگڑے شروع ہوگئے۔ ناتوانوں کو پائیمال کر دیا گیا، میں نے یہ حال دیکھ کر اندازہ لگایا کہ آگے کیا کیا عذاب سہنا ہوں گے۔ میری شریکِ حیات بھی میرے ساتھ تھی، ہم ایک کونے میں چُپ سادھ کر بیٹھ گئے۔ ہمارے ساتھ سامان بھی زیادہ نہیں تھا، دو بستر اور دو صندوقیں، خدا خدا کر

کے ریل چلنے لگی، وہ ریل برائے نام سپیشل تھی۔ پٹھانکوٹ سے بمبئی تک پہنچنے میں بذریعہ ریل عام حالات میں صرف دو دن لگتے ہیں۔ برائے نام سپیشل ٹرین پانچ دنوں میں بمبئی پہنچ جاتی ہے۔ اس ریل کو ہر ایک اسٹیشن پر پہنچنے سے پہلے سگنل کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ ہم عذاب سہتے سہتے پانچویں روز بمبئی پہنچ گئے۔ دہلی میں قافلے کو کئی گھنٹوں کیلئے رُکنا پڑا۔ وہاں جناب محمد شفیع قریشی نے حجاجِ کرام کا استقبال کیا۔ اُن کے ساتھ سری کنٹھ رینہ اور غلام نبی طوری بھی تھے، وہاں دوپہر کے کھانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ حاجی صاحبان جس طرح کھانے پر ٹوٹ پڑے اور لوٹ مچا گئے، وہ نظارہ خدا کسی کو نہ دکھائے۔ بمبئی میں حاجیوں کے قیام کے لئے صابو صدیق مسافر خانہ ہے۔ اللہ تعالیٰ صدیق صاحب کو جنّت الفردوس عطا فرمائے۔ عظیم عمارت تعمیر کی ہے، جس میں بے شمار کمرے، برآمدے اور غسل خانے ہیں۔ اس بیت اللہ کے صحن میں ایک شاندار مسجد ہے۔ اس مسافر خانہ کا انتظام چلانے کے لئے ایک باقاعدہ تنظیم ہے مگر ہمارے ہاتھوں سے جو تباہی اور خرابی اس مسافر خانہ کو برداشت کرنا پڑتی ہے، وہ واقعی شرمناک بات ہے۔ حاجی صاحبان تمام قسم کی گندگی اور غلاظت سے مسافر خانہ اور اس کے پاس پڑوس کو آلودہ کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑتے ہیں۔ بیت الخلائ کے بجائے غسل خانہ اور غسل خانہ کے بجائے بیت الخلاُ استعمال کیا جاتا ہے۔ عام طور پر لڑنے جھگڑنے میں بھی مصروف رہتے ہیں۔ یہاں ایک ہنگامہ بپا رہتا ہے۔ پاسپورٹ وغیرہ حاصل کرنے میں یہاں کافی وقت لگتا ہے۔

بہر حال، کئی دنوں کے بعد وہ وقت آن پہنچا جب بعد دوپہر ہم لوگ

بحری جہاز میں سوار ہونے کے لئے نکل پڑے۔ سامان پہلے ہی باندھ کر رکھا تھا۔ قُلیوں نے اس سامان کو ہمارے پہنچنے سے پہلے جہازوں میں پہنچا دیا تھا۔ قُلی ہمارے منتظر تھے اور ہر ایک حاجی کو اپنی سیٹ دِکھاتے رہتے تھے۔ شام تک ہم اپنا سامان قرینے سے محفوظ رکھنے اور جہاز کا جغرافیہ معلوم کرنے کے کام سے فارغ ہوگئے، جہاز کے اوپر وسیع چھت ہوتی ہے۔ حاجی صاحبان اُس چھت پر بیٹھ کر وقت گذارتے ہیں۔ عام طور پر یہ جہاز سہ منزلہ ہوتے ہیں۔ ہر منزل میں ریل کی طرح برتھ (Berth) ہوتے ہیں۔ خوش قسمتی سے ہماری (Berth) پہلی منزل میں تھی۔ فسٹ کلاس میں سفر کرنے والوں کے کمرے چھت پر ہوتے ہیں۔ شام کو ہم سو گئے دورانِ شب جہاز نے سفر شروع کیا تھا۔ صبح جاگے تو ہر طرف پانی ہی پانی نظر آیا۔ وسیع و عریض سمندر، جس کے اوپر نیلا آسمان سرپوش کی طرح تھا۔ زندگی کے تمام آثار بہت دُور جا چکے تھے۔ ہمارے لئے اس نئے اور عجیب ماحول میں یہ نیا اور انوکھا تجربہ تھا۔ کہتے ہیں کہ سمندر میں دوران سفر مسافر کو اُلٹیاں ہوتی ہیں، سر چکرانے لگتا ہے۔ کچھ حاجی صاحبان کو ضرور تکلیف ہوگئی جن میں میری بیگم بھی شامل تھی، لیکن میں محفوظ رہا۔ بہ حیثیتِ مجموعی سب مسافر ٹھیک ٹھاک ہی رہے۔ جہاز کی چھت پر باری باری پانچوں نمازیں باجماعت ادا کی جاتی تھیں۔ بمبئی کا ایک سیٹھ بھی ہمارے ساتھ تھا۔ وہ عالیشان طریقے پر اذان دیتا تھا۔ فجر کی اُذان سمندر کے سکوت میں ملکوتی نغمے کی طرح گونجتی تھی۔ جہاز میں کھانے پینے کا سامان موجود رہتا ہے، حاجی صاحبان کو دو وقت کی چائے اور دو وقت کا کھانا دیا جاتا ہے۔ کشمیریوں کو کھانے کے لئے بھات

(بتہ) ملتا تھا۔ کبھی گوشت، کبھی مچھلی اور بعض اوقات دال سبزی دی جاتی تھی جس روز بھات کے ساتھ مچھلیاں دی گئیں تو کشمیریوں نے کھانا کھانے سے اِنکار کر دیا۔ مچھلیوں کے پیس اچھی طرح تل بھون کر نہیں تھے اس لئے کھانے کے لایق نہیں سمجھے گئے۔ کشمیری مچھلی کے ٹکڑے تیل میں بہت زیادہ تل بھون کر طرح طرح کے مصالحہ جات ڈال کر پکاتے ہیں۔ مچھلیوں کے پکانے کا یہ طریقہ دنیا میں کسی اور جگہ رائج نہیں ہے، بہر حال، جہاز کے کپتان نے انکار کرنے والوں سے معافی مانگی اور خدا خدا کر کے پریشانی اور بغاوت کے خوف سے چھٹکارا پالیا۔ پانچ دنوں تک نیچے دُور دور تک پانی اور اوپر نیلا آسمان دِکھتا تھا۔ پانچ دِن گذرنے کے بعد زندگی کے کچھ کچھ آثار دکھنے لگے۔ سر برہنہ پہاڑ کبھی دُور اور کبھی قریب سے دکھائی دینے لگتے ہیں۔ کبھی کبھی اُوپر پرندے بھی اُڑتے نظر آتے ہیں۔ یہ یَمَن کے پہاڑ ہیں عدن، یَمَن سے پہلے پڑتا ہے۔ کسی زمانے میں حاجی صاحبان عدن میں لنگر انداز ہو جاتے تھے۔ اب ایسا نہیں کرتے، البتہ یَمَن کے چمچماتے قمقمے دُور سے نظر آنے پر دل مسرور ہو جاتا ہے۔ سمندر میں دو منظر ناقابلِ فراموش ہیں ایک جب دورانِ شب مخالف سمت سے کوئی جہاز آ رہا ہو، سمندر میں محوِ سفر تمام جہاز ایک دوسرے کو سِگنل دے کر محفوظ رہنے کے لئے متنبہ کرتے ہیں یہ سِگنل بجلی کے ذریعے دئے جاتے ہیں۔ ٹیلیفون تار کے ذریعے زیادہ دُور تک پیغامات بھیجے جاتے ہیں۔ دوسرا ناقابلِ فراموش منظر ہے غروبِ آفتاب، میرے پاس الفاظ نہیں کہ غروبِ آفتاب کی حالت اور نظارے کو بیان کر سکوں، علامہ اقبال نے کشمیر میں غروبِ آفتاب کا منظر دیکھ کر فرمایا تھا:

من خدارا دیدم آنجا بے حجاب　　　کوہ و دریا و غروبِ آفتاب

علامہ اقبالؒ نے سمندری جہازوں کے ذریعے کئی بار یورپ کی سیر کی ہے، نہ جانے انہوں نے سمندر میں غروب آفتاب کی کیفیت اور حالت کو بیان کیوں نہیں کیا ہے۔ بحرِ ہند میں سفر پُرسکون رہتا ہے لیکن بحرِ احمر تقریباً ہر سال ناراض اور غصےّ میں ہوتا ہے۔ اس کو Angry Sea بھی کہتے ہیں ہمارا جہاز اِس بِلا وجہ ناراض ہونے والے سمندر میں پہنچ کر متلاطم ہونے لگا، جلدی سنبھل بھی گیا۔ حاجی صاحبان پریشانی کے عالم میں سر پیٹنے لگے۔ کپتان ہنس پڑا۔ اُس نے کہا، اگر یہ لوگ مُون سُون کے موسم میں جہاز میں سفر کریں، تو ایک بھی شخص بچ نہیں پائے گا۔ حاجی صاحبان جس حالت کو تلاطم کہتے تھے، کپتان نے بتایا یہ محض خوشگوار ہوا کے چند جھونکے ہیں۔ میں نے جب ایک کشمیری ہم سفر کو بتایا کہ کپتان کہتا ہے کہ یہ تلاطم نہیں خوشگوار ہوا کے جھونکے (Breeze) تھے، وہ غصیلا شخص بے ساختہ بول پڑا "ہاں ہاں، یہ اُس کے لئے آسمانی بجلی تھی"۔ جہاز میں پانی کا بڑا ذخیرہ موجود رہتا ہے، کھانے پینے اور وضو کرنے کے لئے پانی مہیا رکھا جاتا ہے لیکن کپڑے دھونے کے لئے پانی نہیں ملتا ہے، سمندر کے پانی میں کپڑے دھونے کا کوئی فایدہ نہیں، ایک تو کپڑوں سے میل نہیں نکل پاتا، دوسری بات یہ ہے کہ کپڑے خراب ہوجاتے ہیں۔ یلملم نامی مقام پر حاجی صاحبان احرام باندھ لیتے ہیں۔ دوسرے دن جدہ پہنچ جاتے ہیں۔ احرام باندھنے کے موقعے پر بڑی چہل پہل رہتی ہے۔ جدہ پہنچ کر اندازہ ہوجاتا ہے کہ سفر میں کتنی مُشکلات ہیں۔ جہاز پر سے سامان اُتارنے والے مزدور، جو عام طور پر

یمنی اور حبشی ہوتے ہیں ، بڑی بے دردی کے ساتھ جہاز کی چھت سے سامان نیچے اُتار پھینکتے ہیں ۔ نوے فیصد صندوقیں ٹوٹ پھوٹ جاتی ہیں ۔ بستروں کی رسیاں ڈھیلی پڑتی ہیں ، اکثر بستر کھل جاتے ہیں ۔ لوگوں کے جم غفیر میں اپنا ٹوٹا پھوٹا سامان تلاش کرنا اور دوبارہ سمیٹنا ، ٹوٹے پھوٹے صندوقوں کو ، اگر وہ دوبارہ ہاتھ آئیں ، رسیوں سے باندھ لینا اور ساتھیوں کا بچھڑ جانا چھٹی کا دودھ یاد دِلاتا ہے ۔ اس کے بعد کسٹم کا مرحلہ آتا ہے ۔ یہاں بھی بہت وقت لگتا ہے ۔ خدا خدا کر کے یہاں سے نکل کر حاجیوں کو ایک سرائے میں پہنچا دیا جاتا ہے ۔ جدہ میں موجود اُس عظیم الشان عمارت کو مدینۃ الحجاج کہا جاتا ہے ۔ ہندوستان کا سفیر حاجیوں کی خوش آمدید کے لئے پہلے ہی وہاں پہنچ چکا تھا ۔ اُس وقت سفیرِ کبیر جناب مدحت کامل قدوائی تھے ۔ آپ نیک نہاد اور فرشتہ صفت انسان ہیں ۔ ایک زمانے میں کشمیر میں پبلسٹی انچارج رہ چکے تھے ۔ اُسی زمانے میں اُس کے ساتھ میرے تعلقات قایم ہوئے تھے ۔ بعد میں آپ چیف سیکریٹری بن گئے اور ہماری دوستی مضبوط سے مضبوط تر ہوگئی ۔ جدہ پہنچ کر میں نے سلام کیا لیکن وہ مجھے پہچان نہ سکے ۔ میں احرام باندھے تھا ۔ اُس حالت میں کسی کو پہچاننا آسان کام نہیں ۔ میں نے اپنا تعارف کیا تو آپ پھولے نہ سمائے ۔ کشمیر کے حالات وغیرہ کے بارے میں بات چیت ہوئی ۔ کسٹم کی صعوبتوں سے آزاد ہو کر ہم مدینۃ الحجاج چلے آئے ۔ شام کو مجھے بتایا گیا کہ قدوائی صاحب ملنے آئے تھے ۔ میں ہندوستانی روپیوں کے بدلے ریال لانے کے لئے بنک میں تھا ۔ یہ روپے بمبئی میں باخذ رسید ڈپازٹ کئے جاتے ہیں اور جدہ میں رسید پیش کر کے

ریال حاصل کئے جاتے ہیں۔ شام دیر گئے قدوائی صاحب دوبارہ آ گئے۔ مجھ کو اور میری بیگم کو اپنے ساتھ گھر لے گئے۔ رات کا کھانا وہیں کھایا اور واپس آ گئے۔ جدہ میں اپنے معلم کا نام بتانا پڑتا ہے۔ اسی مقام پر سرکاری واجبات ادا کر کے حاجیوں کو معلموں کے حوالے کیا جاتا ہے۔ معلم نے بسوں کا انتظام کر رکھا تھا۔ دوسرے دن نماز فجر ادا کرنے کے بعد ہم مکہ شریف کی اور روانہ ہو گئے۔

مکہ شریف پہنچنے سے پہلے شُمیسیہ نام کا ایک مقام ہے۔ یہاں سے مکہ شریف تک سات یا آٹھ میل کی دوری ہے۔ اس مقام کا قدیم نام حدیبیہ ہے۔ یہ مقام اسلامی تواریخ میں صلحِ حدیبیہ کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ جس مخصوص جگہ پر صلح حدیبیہ کے عہد نامے پر حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دستخط کئے تھے، اس پر ایک مسجد تعمیر کی گئی ہے۔ حاجی صاحبان اس مقام پر رُک جاتے ہیں۔ ہم بھی رُک گئے اور دو رکعت نفل نماز ادا کر کے مکہ شریف کی راہ لی۔ دوپہر کو مکہ شریف پہنچ گئے۔ مسجد الحرام کے گنبد دور سے دکھائی دیتے ہیں۔ انسان دہشت اور خوف سا محسوس کرنے لگتا ہے، کیونکہ وہاں جلالِ کبریائی دیکھ کر لوگ مرعوب ہو جاتے ہیں۔ زبان سے بے ساختہ نکلتا ہے، لبیک اللھمُ لبیک۔ مکہ شریف پہاڑوں سے گھری ایک چھوٹی وادی ہے۔ اس وادی کا اکثر حصہ مسجد الحرام کے حصے میں آیا ہے۔ وادی کے باقی ماندہ تھوڑے حصے میں رہایشی مکانات اور دُکانیں ہیں۔ لوگ اب آس پاس کے پہاڑوں پر بسنے لگے ہیں۔ اب اس شہر میں عالیشان مکانات تعمیر کئے گئے ہیں۔ کچھ مکانات دس سے پندرہ منزلوں والے بھی ہیں۔ مسجد الحرام کے

احاطے سے باہر کھڑا اشو براہ ہوٹل فنِ تعمیر کا عظیم نمونہ ہے۔ قدیم زمانے کے مکانات شاذ و نادر ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ جدید آرام و آسایش کے سامان تقریباً ہر گھر میں موجود ہیں۔ مکہ شریف کا امتیاز کعبہ شریف ہے، جس کے گرِد ترکوں نے اپنے زمانے میں یک منزلہ مسجد تعمیر کی ہے۔ سعودی حکومت نے اب اس کے باہر سنگ مرمر کی تین منزلہ شاندار مسجد تعمیر کر کے جگہ کی کمی کو بھی دُور کر دیا ہے اور مکہ شریف کی شان کو بھی دوبالا کر دیا ہے۔ کعبہ شریف اور مسجد الحرام کے علاوہ مکہ شریف میں بہت سی مقدس اور تاریخی جگہیں ہیں ان میں سے کعبہ شریف کے بعد سب سے زیادہ قابلِ احترام وہ جگہ ہے جہاں حضرت محمد ﷺ تولدُ ہوئے ہیں۔ اس جگہ کو مولد النبی ﷺ کہتے ہیں، یہ جگہ شعب ابی طالب محلے میں ہے اور یہاں ایک عمارت اِستادہ ہے، جس میں ایک عظیم الشان لائبریری ہے۔ یہ عمارت قدیم ڈھانچے پر نئے سرے سے تعمیر کی گئی ہے، البتہ اُس مخصوص جگہ کو جہاں حضورؐ اکرم کی ولادت ہوئی ہے، محدود کر دیا گیا ہے، اِسی محلے میں ایک اور عمارت ہے، جسکو مولدِ علیؓ کہتے ہیں۔ مکہ شریف میں شہر سے ذرا دور ایک محدود علاقے کو جنت المعلےٰ کہتے ہیں۔ یہ قدیم قبرستان ہے جس میں اُمہات المومنین کے علاوہ بے شمار صحابی دفن ہیں مگر سعودیوں نے ان قبروں کے نام اور نشان باقی نہیں رکھے ہیں۔ ایک جانب ایک پہاڑ پر مسجد بلال حبشی رضی اللہ عنہ ہے۔ بتایا جاتا ہے یہی وہ کوہِ فاران ہے جس کے اوپر تشریف لے کر حضور نبیؐ اکرم نے پہلی بار دعوتِ اسلام مشتہر فرمایا۔ مکہ شریف کے قریب جبل نوُر ہے، جسمیں غارِ حرا موجود ہے، اسی غار میں حضورؐ انور پر پہلی وحی نازل ہوئی تھی، اکثر لوگ وہاں جاتے

ہیں۔ البتہ راستہ دشوار گذار ہے اور کمزور شخص وہاں تک نہیں جا پاتا ہے۔

مکہ شریف آجکل ایک ماڈرن شہر ہے۔ یہاں تجارت اور کاروبار اعلیٰ پیمانے پر ہوتا ہے۔ دوکانیں مختلف ممالک سے آئے ہوئے نوادرات اور مال واسباب سے بھری رہتی ہیں۔ عرب ایک بے آب وگیاہ ریگستان ہے، جہاں تیل، سیمنٹ اور سنگ مرمر کے سوا کچھ نہیں ہے، عربوں کو ہر چیز درآمد کرنا پڑتی ہے جس کی تلافی تیل سے کی جاتی ہے۔ عرب کے بازاروں پر غیر مُلکیوں کا مکمل تسلّط ہے، خاص کر امریکی، انگریزی، جاپانی، چینی اور پاکستانی مال سے بازار بھرے پڑے ہیں۔ اس ملک میں انکم ٹیکس نہیں لیا جاتا ہے بلکہ مال درآمد کرنے کے لئے حکومت تاجروں کو سب سڈِی دیتی ہے۔

مکہ شریف میں اکثر مُسلم ممالک کے تاجر ہیں، پاکستانی تاجروں کا زیادہ غلبہ ہے۔ پاکستانی سرکاری شعبوں پر بھی غالب ہیں۔ انجینئر، ڈاکٹر اور ماہرینِ مالیات اکثر پاکستانی ہیں۔ تاجر بالعموم کشمیری نمدہ سازوں کی طرح کسی چیز کی قیمت دوسو ریال لگا دیتے ہیں بعد میں یہی چیز بیس ریال میں فروخت کرتے ہیں۔ اب بھی عربوں میں دو خصوصیتیں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ وہ امانت کی خیانت نہیں کرتے ہیں اور زبردست مہمان نواز ہیں۔ معلموں کا طبقہ لین دین میں صاف نہیں ہے۔ بہت سے معلم پہلے ہی بمبئ آکر اسامیاں حاصل کرنے کی تگ ودو میں لگے رہتے ہیں۔ کچھ لوگ سرکاری طور پر جائز رقم کے علاوہ روپے اپنے ساتھ لینا چاہتے ہیں۔ یہ اضافی رقم بمبئ میں معلموں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ مکہ شریف پہنچ کر یہ رقم معلموں سے واپس حاصل کرنے میں مشکلات پیش آتی ہیں۔ اکثر اوقات معلموں

کے ساتھ جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔ اس سب کے باوجود سچائی یہ بھی ہے کہ عرب میں حاجی صاحبان اضافی رقم امانت کے طور پر معلموں کے سپرد کرتے ہیں۔ معلم حاجی صاحب کو ایک لفافہ دے کر کہتا ہے کہ رقم لفافے میں رکھ کر لفافے پر اپنا نام اور پتہ درج کریں۔ اِس کے بعد معلم یہ لفافہ سیف میں ڈالدیتا ہے۔ حاجی صاحب کے مانگنے پر لفافہ سیف سے نکالکر واپس کردیا جاتا ہے، اس میں کوئی خیانت نہیں کی جاتی ہے۔ خیانت کرنا اس ملک میں بہت بڑا جُرم ہے۔ کوئی شخص کسی عرب کے پاس ایک دن میں دس بار بھی جائے تو اُسے ہر بار بغیر کھلائے پلائے واپس جانے نہیں دیا جائیگا۔ عرب میں بڑی خطرناک گالیاں صرف دو ہیں، خائن اور بخیل، ان لوگوں کے لئے یہ دونوں الفاظ ناقابلِ برداشت ہیں۔

عرب میں جدید فیشن عام ہو چکا ہے۔ مکہ شریف اور مدینہ منورّہ میں سینما ہال نہیں ہیں لیکن اُمرا کے گھروں میں پروجیکٹر لگے ہوئے ہیں۔ پیرس اور نیویارک کا تازہ ترین فیشن یہاں پہنچتا رہتا ہے۔ عورتیں پردہ کرتی ہیں۔ وہ سر سے پیر تک بُرقعہ پہنتی ہیں۔ بُرقعے کے اندر وہ عورتیں جدید ترین فیشن والے کپڑوں میں ملبوس رہتی ہیں۔ عرب میں تکنیکی مہارت بہت کم ہے۔ تکنیکی کام غیر ملکی ماہرین کرتے ہیں۔ مکہ شریف میں کسی کی موٹر خراب ہو جاتی ہے تو مرمت کے لئے موٹر کو جدہ لے جانا پڑتا ہے۔ ایسے کام کرنا بے عزتی سمجھی جاتی ہے۔ سڑکوں کی صفائی کا کام یمنی اور حبشی مزدوروں سے لیا جاتا ہے۔ غیر ملکی مزدوروں اور تیکنیکی ماہروں کو موٹی رقمیں بطور تنخواہ دی جاتی ہیں مگر خود کام نہیں کرتے۔ عربوں میں نسلی برتری کا خبط ہمیشہ سے موجود رہا

ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے خلاف جہاد کیا، لیکن برتری کا یہ خبط آج بھی کسی نہ کسی صورت میں کبھی کبھی سر اُبھارتا رہتا ہے۔ وہ لوگ اپنی سماجی تقریبات جیسے شادی بیاہ وغیرہ میں غیر عربوں کو بُلانا پسند نہیں کرتے۔ اس وجہ سے اُن کے رسموں اور رواجوں کے بارے میں غیر عربوں کو بہت کم واقفیت ہوتی ہے۔ عرب تیل کی دولت سے مالا مال ہے۔ یہاں امارت اور دولت مندی کی اِنتہا نہیں۔ ایک زمانے میں حج اُن کے لئے ذریعہ معاش تھا۔ اب صورتِ حال بدل گئی ہے۔ ان میں اب کچھ لوگ دل ہی دل میں سوچتے ہیں کہ اس پر زیادہ وقت صرف ہو جاتا ہے۔ اسی لئے ایسے قوانین بننے لگے ہیں جن کے نتیجے میں ہر سال حج کے لئے آنے والوں کی تعداد میں کمی ہوتی جائے۔

حاجی صاحبان، خاص کر کشمیری حاجی، بازاروں میں آوارہ گردی کرتے رہتے ہیں۔ مکان حاصل کرنے میں بھی اُن کو دِقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ مکہ شریف میں تمام مکانات میں سینٹری فٹنگ کی ہوئی ہے اور ہمارے حاجی صاحبان کریوہٗ پانپور کی مٹی استعمال کر کے اس سسٹم کو تباہ کر دیتے ہیں۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ حج کا فریضہ ادا کرنے کے لئے جانے والے منتخبہ لوگوں کے لئے ہر سال ایک ماہ تک جاری رہنے والے تربیتی پروگرام کا اہتمام کیا جانا چاہیئے۔

مکہ شریف سے مدینہ منورہ تک ۶۰۰ کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ سرکاری انتظام کے تحت جانے والا حاجی وہاں دس روز تک قیام کر سکتا ہے۔ بعض حجاج سرکار کو آنے جانے کا کرایہ دیتے ہیں لیکن باقی انتظامات خود کر لیتے

ہیں۔ ایسے حجاج مدینہ منورہ میں جتنے دن چاہیں رہ سکتے ہیں۔ ہم نے اپنا انتظام کیا تھا، اس لئے ۲۸ روز تک مدینہ منورہ میں قیام پذیر رہے۔ ہماری دیکھا دیکھی اور تین حجاج کرام کو اسی طریقے پر مدینہ شریف آنے پر مائیل کر دیا لیکن وہاں صرف دس روز تک قیام کیا۔ انہوں نے ایک حاجی کو رحمتِ حق ہوتے دیکھ کر وہاں مزید قیام کرنے کا پروگرام بدل دیا اور مکہ شریف چلے گئے۔ مکہ شریف سے مدینہ منورّہ تک ایک اعلیٰ قسم کی سڑک ہے۔ خاص تاریخی مقام میدانِ بدر، جس میں کافروں اور مسلمانوں کے درمیان فیصلہ کُن جنگ لڑی گئی تھی، اسی سڑک سے سفر کرتے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔ یہ مقام سڑک کے ایک طرف تھوڑے فاصلے پر ہے۔ ہم نے ڈرائیور سے منت سماجت کر کے موٹر رُکوادی اور اُس جگہ تک چلے گئے۔ مدینہ منورّہ سے واپسی پر ایک جگہ، جسکا نام ذوالحلیفہ ہے، احرام باندھنا پڑتا ہے، اب اس مقام کو بیر علی کہتے ہیں۔ اس مقام سے گنبد خضرا پر نظر پڑتی ہے تو دل ایسی کیفیت سے سرشار و مالا مال ہو جاتا ہے کہ الفاظ اُس کے بیان سے قاصر ہے۔ شام ہوتے ہی ہم مدینہ منورہ پہنچ گئے۔ صبح ہوتے ہی دربارِ رسالت ﷺ میں حاضر ہو گئے۔ عرب ریگستان ہے مگر میدانِ بدر سے ہوتے ہوئے ماحول بدل جاتا ہے۔ نخلستان اور سبزہ زار شروع ہو جاتے ہیں۔ مدینہ منورّہ کا اکثر حصہ سرسبز ہے۔ کھجور، پُدینہ اور مہندی کے باغات بکثرت ہیں اس ریگستان میں باغات اور سبزی دیکھ کر یہ شعر یاد آتا ہے ؎

ازدم سیراب آں اُمّی لقب لالہ رُست از ریگ صحرائے عرب

مسجد نبوی ﷺ کے علاوہ وہاں مسجد قبا، وہ پہلی مسجد ہے جو حضورؐ انور

نے تعمیر کی ہے۔ یہ مسجد شہر سے سات آٹھ میل کی دوری پر ہے۔ مضافات میں مسجدِ احد، مسجد ذوالقبلتین اور مساجدِ سبع موجود ہیں۔ مساجدِ سبع میں مسجد ابوبکر، مسجد علیؓ مسجد فاطمہ، مسجد سلمان وغیرہ شامل ہیں۔ شہر میں مسجد غمامہ، مسجد عثمان اور مسجد انس بنِ انسان بھی ہے۔ مسجد نبویؐ کے قریب مزارِ بقیع ہے۔ یہاں تمام قبریں مسمار کر دی گئی ہیں اِس قبرستان میں اُمہات المومنین، حضرت سیدۃ النساء حضرت حلیمہ، حضرت عثمانؓ غنی، حضرت ابو سعید خدامی اور لاکھوں اولیاء اصفہاء، صلحاء اور شہداء مدفون ہیں۔ مسجد نبوی میں توسیع کر دی گئی ہے، اب اِس میں آسانی کے ساتھ لاکھوں مسلمان نماز ادا کر سکیں گے۔

عرب کے لوگ حُسن پرست اور موسیقی کے عاشق ہیں۔ امِ کلثوم، لیلیٰ مراد اور عبدالوہاب بہت مقبول ہیں۔ اُم کلثوم کا نام سنتے ہی وہ لوگ پریشان ہو جاتے ہیں۔ ریڈیو پر اُم کلثوم کی آواز سُن کر راہ گیر سڑکوں پر رُک جاتے ہیں اور دنیا و مافیہا کو بُھول جاتے ہیں۔

مدینہ شریف میں تقریباً ایک ماہ کے لئے قیام کے دوران معلوم ہوا کہ مکہ شریف اور مدینہ منورہ کے لوگوں کے عادات میں نمایاں فرق ہے۔ مدنی با اخلاق، شریف اور منکسر اُلمزاج ہیں۔ مکہ شریف کے لوگ معمولی باتوں پر غصہ کرنے لگتے ہیں۔ مدینہ منوّرہ مکہ شریف کی طرح زیادہ ماڈرن نہیں ہو گیا ہے۔ وہاں ابھی اکثر مکانات قدیم طرز کے ہیں۔ وہاں ہمارا معلم صالح کر دی تھا۔ میں نے آج تک اُس جیسا شریف اور خدا دوست آدمی نہیں دیکھا ہے۔ اُس نے ہم کو اپنے مکان میں ایک کمرہ دیا تھا۔ وہ

ہمارے لئے بازار سے چیزیں خرید کر لاتا تھا۔ اُس کی دو بیٹیاں سلیمہ اور فوزیہ گویا ہماری اپنی بیٹیاں تھیں ۔ ہم آج تک اُن کو نہیں بھولے اللہ تعالیٰ اُنہیں محفوظ رکھے۔ مدینہ منورّہ سے واپسی کا دن بہت صبر آزما ہوتا ہے آدمی کو بادِل خستہ و ناخواستہ اور باچشمِ نم رخصت ہونا پڑتا ہے مکہ شریف پہنچ کر حج کی تیاری ہونے لگی ۔ ذی الحج کی آٹھ تاریخ کو نمازِ فجر ادا کرنے کے بعد ہم منیٰ کی طرف چلدیئے ۔ وہاں نمازِ پنجگانہ ادا کرنے کے بعد نو تاریخ کی صبح کو عرفات کی اور جانا پڑتا ہے۔ حاجی کے لئے ضروری ہے کہ وہ قبل از دوپہر عرفات پہنچ جائے ۔ عرفات میں نمازِ ظہر اور نمازِ عصر ایک ساتھ ادا کر کے نمازِ مغرب سے قبل واپس نکلنا پڑتا ہے عرفات دس مربع میل وسیع میدان ہے جو خیموں کے عظیم الشان شہر میں تبدیل ہو جاتا ہے جبلِ رحمت ، جہاں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجتہ الوداع کے موقعے پر آخری لافانی خطبہ ارشاد فرمایا تھا ، یہیں پر ہے۔ یہ لافانی اعلان ہمیشہ کیلئے منشورِ آزادی ہے۔ ''کسی عرب کو کسی عجمی پر فضیلت نہیں ہے۔ کسی سفید فام انسان کو کسی سیاہ فام پر برتری نہیں ہے، آپ سب آدمؑ کی اولاد ہیں اور آدمؑ مٹی سے بنائے گئے تھے'' ۔

آجکل خطبہ جبلِ رحمت سے نہیں بلکہ مسجدِ نمرہ سے دیا جاتا ہے۔ صبح یہاں سے نکلے اور منیٰ پہنچ گئے ۔ یہاں قربانی کی ، بال کتروائے ، رمی جمرات کیا اُسی روز شام کے وقت مکہ شریف پہنچ گئے ۔ جہاں طواف افاصنہ کرنا تھا ۔ پھر واپس منیٰ چلے آئے ' اڑھائی دِن یہاں گذار کر حج مکمل ہو گیا اور مکہ شریف چلے آئے چار روز بعد جدہ کی طرف روانہ ہوئے ۔ یہاں بھی چار روز کیلئے رُکنا پڑا ۔ واپسی پر جدہ میں حاجیوں کے ہجوم کی وجہ سے قیام کیلئے

انتظام نہیں ہو پاتا۔ اکثر لوگ چار چار پانچ پانچ روز سڑکوں پر گذارتے ہیں سامان کے ساتھ بھی وہی پہلا جیسا سلوک کیا جاتا ہے۔ صندوقیں ٹوٹ جاتی ہیں، سامان تتّر بتّر ہو جاتا ہے جہاز کے اندر سامان کی تلاش میں سرگرداں ہونا پڑتا ہے، واپسی پر حاجی صاحبان میں نمازوں کیلئے زیادہ جوش و خروش نہیں ہوتا بلکہ سامان کی تلاش، کسٹم کی فکر اور تتّر بتّر شدہ سامان کی بازیابی کے بعد اُس کی پیکنگ اُن کو زبردست پریشان کر دیتی ہے۔ آرام و سکون کے ساتھ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے پاس زیادہ سامان نہیں ہوتا

خوش آں راہی کہ سامانے نگیرد

بمبئی پہنچ کر کسٹم کی کاروائی میں ایک دن صرف ہو گیا۔ یہاں سے فراغ پا کر ہم مسافر خانہ میں چلے گئے جہاں حسبِ مراد جگہ ملی۔ ایک دوست کی مہربانی سے ہم سارا بمبئی شہر دیکھ آئے، کیونکہ اُس کے پاس موٹر کار تھی، جو اُس نے ہمارے حوالے کر دی۔ سپیشل ٹرین حسبِ عادت پرانے انداز سے روانہ ہو گئی۔ اس بار جگہ کی زیادہ ہی تنگی تھی، کیونکہ حاجی صاحبان بہت سامان لائے تھے۔ جوں توں کر کے ہم جالندھر پہنچ گئے۔ وہاں برادرِ مکرم عبدالحق برقؔ منتظر تھا۔ ہم بھی آرام کے خواہاں تھے۔ وہ معہ عیال وہاں رہتے تھے، ہم چار روز تک اُن کے گھر میں آرام کرتے رہے۔ پھر جموں چلے آئے ۱۹/اپریل ۱۹۶۷ء کو ہم گھر پہنچ گئے۔

سعودی عرب میں قانونِ شریعت نافذ ہے۔ چور کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے۔ زانی کو سنگسار کیا جاتا ہے۔ پُولیس اور فوج گویا آج بھی ابتدائی حالت میں ہے جو تعزیراتِ شریعت کے دایرے میں نہیں آتے۔ اُن کے لئے الگ

عدالتیں قائیم ہیں۔اس قانون کو شُرط کہا جاتا ہے اور اس کے اہلکاروں کو شرطی۔اِسی قانون کے تحت کام کرنے والے سپاہی مغربی طرز کی وردی پہنتے ہیں۔

مدینہ منوّرہ میں مسجدِ نبویؐ کے قریب ایک چار منزلہ شاندار عمارت ہے جو رُباط کشمیری کے نام سے مشہور ہے۔رُباط کے معنی ہیں مُسافر خانہ، مدینہ منوّرہ میں بہت سے مسافر خانے ہیں مثلاً رُباطِ حیدر آباد، رُباط، بھوپال وغیرہ۔ان مسافر خاتون میں ان ریاستوں کے لوگ قیام کر سکتے ہیں۔لیکن رُباط کشمیری اِسطرح استعمال نہیں ہوتا، تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے ایک وزیر کا نام لعل دین تھا۔جب وہ فریضہ حج ادا کرنے کیلئے گیا تھا تو یہ عمارت درس گاہ کے طور استعمال کرنے کی غرض سے تعمیر کی تھی۔سنگ مرمر پر اس عمارت کی یہ تاریخ کندہ ہے:

هذا من فضلِ ربی

مدرسته نبيك عن يقين	فضل شهر مفرد رميں
وحبه المصطفىٰ الا میں	وفوذه يو فقها الميكن
لماارتقت قدد العليتين	ووُقفِتُ بالعزو التمكين
علىٰ اهالى بلدِ امين	بلده طاها ساطع الجبين
ارختها هدرة الُمبين	فى بيت شعرولفتح النبين

فے طالع السعد لعلم الدين

وفقها الوزير لعل الدين

(١٣٠١ھ)

کشمیریوں نے کئی بار کوشش کی تھی کہ اُنہیں یہ عمارت واپس مل جائے لیکن بے سوُد معلوم ہوا کہ اس پر کوئی بارسوخ شخص قابض ہے، اِس لئے واپس نہیں کردی جاتی ۔ ہم نے بھی بذریعہ سفیرِ کبیر حکومت ہندوستان تک التجا پہنچائی ، معلوم نہیں اُس کو کیوں ان سُنا کردیا گیا، شاید اسی لئے کہ جسکی لاٹھی اُس کی بھینس۔

(نوٹ: کشمیری زبان میں تحریر شُدہ یہ مختصر سفرنامہ ۱۹۷۵ء میں "سون اَدب" کشمیری میں شائع ہوا تھا۔)

..................☆☆☆..................

مکتوباتِ سفرِ محمود

والدِ محترم جنوری ۱۹۶۷ء میں سمندری راستے سے سفرِ محمود پر روانہ ہوئے
اُس بابرکت سفر کے دوران ہماری والدۂ محترمہ اُن کے ہمراہ تھیں۔ بمبئی
میں سمندری جہاز میں سوار ہونے کے بعد قبلہ نے اپنے عزیز واقارب کو کئی
خطوط لکھے، ان میں پانچ خطوط خوش بختی سے میرے پاس محفوظ ہوئے۔ پہلا
خط بحیرۂ عرب میں سمندری جہاز مظفری سے ۲۲ جنوری کو شروع کیا گیا اور مختلف
اوقات میں تحریر ہوتا ہوا ۲۷ جنوری کو مکہ مکرّمہ میں مکمل ہوا۔ یہ خاصا طویل خط ہے
اور سمندی سفر کے بارے میں کئی دل چسپ معلومات اور تجربات سے آگاہ کرتا
ہے۔ اس میں جدہ میں آمد، پھر کعبۃ اللہ میں حاضری دینے کے موضوعات شامل
ہیں۔ دوسرا خط ۳۰ جنوری کو مکہ مکرّمہ سے راقم الحروف کے نام لکھا گیا۔ اس میں
مکہ مکرّمہ اور کعبہ شریف کا ذکر ہے اور اپنے جذبات واحساسات کا دلنشیں
بیان۔ تیسرا خط محترم فاروق صاحب کے نام ہے اور یہ بھی مکہ مکرّمہ سے ہی تحریر
کیا گیا۔ یہ ۴ فروری کو تحریر کیا گیا۔ چوتھا خط دیارِ حبیبؐ سے ۹ فروری کو تحریر کیا
گیا ہے۔ اور اس میں جذبات کی وجدانی کیفیت ہر لفظ سے چھلک پڑتی ہے اور

عشقِ محمدی کی دلآویز جہتیں سامنے آتی ہیں، آخری خط یکم مارچ ۱۹۶۷ء کو مکہ شریف میں لکھا گیا اور یہ بھی برادرِ محترم فاروق صاحب کے نام ہے ۔

ان خطوط کو اپنی اصلی حالت اور اپنے اصلی متن کے ساتھ شائع کیا جارہا ہے۔ اگرچہ کہیں کہیں خالص ذاتی نوعیت کے موضوعات بھی آگئے ہیں مگر ایسے معاملات کو حذف کرنے سے نازکی صاحب کے ذہن کے کئی گوشے قارئین کی نظروں سے اوجھل ہو جاتے ۔ قارئین کرام کو ان خطوط کے مطالعے سے جہاں نازکی صاحب کی ذات کے کئی نہاں خانوں تک رسائی ہوگی وہاں آج سے چالیس سال پہلے سفرِ محمود کے حالات اور واقعات کا بھی کچھ اندازہ ہوگا۔

جب سفر اس قدر آسان نہیں ہوا کرتا تھا
جتنا کہ آج کل کے دور میں ہے۔

-*-

بحیرۂ عرب

۲۲ر جنوری ۱۹۶۷ء

۱۰ر شوال ۱۳۸۶ھ

عزیزانِ ارجمند...... سلمکم اللہ

اسلام علیکم ورحمتہ اللہ: محمد شفیع خان نے آپ کو تار سے آگاہ کیا ہوگا کہ ہم لوگ ۱۷ جنوری کو دن کے بارہ بجے مظفری جہاز میں اُترے ۔ شیڈول

کے مطابق اسے شام کے ساڑھے چھ بجے بمبئی کی بندرگاہ سے چلنا تھا مگر ہم الحمدللہ اپنے اصول پر ہمیشہ قایم رہنے کا عہد کر چکے ہیں اس لئے جہاز وقت مقررہ کے بجائے رات کے ڈھائی بجے روانہ ہوا۔ ہم اُس وقت سو رہے تھے، اس لئے روانگی کا علم نہ ہو سکا۔ صبح جاگے تو معلوم ہوا کہ ہم مصروفِ خرام ہیں۔ عرشۂ جہاز پر چڑھے تو دیکھا ہر طرف سے پانی ہی پانی ہے!اوپر آسمان اور اللہ جل شانہ کی ذات، سمندر کو دیکھ کر فوراً عظمتِ الٰہی کا سِکہ دل پر جم جاتا ہے، اور بے اختیار طور پر سبحان الملک الحی الذی لایموت کا ورد جاری ہو جاتا ہے۔ آج پانچ دن سے ہم چل رہے ہیں اور ہمارے ساتھ ایک پوری کائنات مصروفِ خرام ہے۔

ہر شے مسافر ہر چیز راہی، کیا چاند تارے کیا مرغ و ماہی،

اس جہاز میں عملہ جہاز کے سمیت ۲۱سو افراد ہیں۔ ایک پورا شہر ہے۔ اس کی روزانہ رفتار چودہ اور پندرہ میل سے زیادہ نہیں۔ اس وقت تک ہم پانچ ساڑھے پانچ سو میل طے کر آئے ہیں۔ کل مسافت بمبئی اور جدہ کے درمیان ساڑھے اکتیس سو میل کی ہے۔ آج شام تک ہم انشاءاللہ عدن پہنچیں گے مگر جہاز کے کپتان نے مجھے بتا دیا کہ اُسے عدن میں قیام کا کوئی ارادہ نہیں۔ اس لئے ہم اسے جہانِ گذراں کہہ کر دُور سے دیکھیں گے اور آگے بڑھیں گے۔ اس جہاز کا انتظام بہت اعلیٰ ہے۔ صبح نماز کے فوراً بعد میں ناشتہ دیا جاتا ہے جو عموماً چائے، اس کے ساتھ کبھی حلوہ کبھی بسکٹ، کبھی پھل، کبھی مکھن ٹوسٹ کبھی آلو بھجیا یا پکوڑا وغیرہ ہوتا ہے۔ دوپہر کے کھانے میں چاول، سبزی گوشت دال شامل ہوتی ہے، اور شام کو چپاتی، اس کے ساتھ بھی

ٹائیم ٹیبل کے مطابق مختلف اچھی چیزیں مہیا کی جاتی ہیں۔ ۳ بجے چائے اور اس کے ساتھ بسکٹ یا پھل وغیرہ ہوتا ہے۔ نمازیں باجماعت پڑھی جاتی ہیں، اور ایک سے زیادہ جماعتیں ہوتی ہیں، اللہ کا فضل ہے کہ اللہ کو یاد کرنے قرآن پڑھنے اور درود کا سرور قایم کرنے کا کافی وقت ملتا ہے، اور زندگی سکون سے گذر رہی ہے۔ البتہ ہمارے کشمیری حضرات کبھی کبھی حسب معمول لنگر والوں سے جھگڑا کرتے ہیں کہ انہیں پورا کھانا نہیں دیا جاتا۔ حالانکہ یہ حقیقت نہیں، ہر شخص کو اس کی ضرورت سے زیادہ کھانا مہیا کیا جاتا ہے، پرسوں ان لوگوں نے جلوس بھی نکالا اور کپتان کے کیبن کے باہر نعرہ تکبیر بلند کرتے رہے۔ کپتان ایک تجربہ کار انگریز ہے۔ اُس نے ان کے مطالبات سُنے، اور بولا کہ وہ جو کچھ کھانے کو دیتے ہیں، وہ مغل لائن کے پروگرام کے مطابق ہے۔ اگر آپ کو یہ انتظام منظور نہیں تو آپ اپنا وہ روپیہ واپس لیجیئے جو کھانے پینے کے لئے وصول کیا گیا ہے، اور اپنا انتظام خود کیجیئے۔ اس پر وہ لوگ اپنا سا مُنہ لے کر واپس آ گئے۔ اللہ ان لوگوں سے سمجھے، معلوم نہیں ہوتا انہیں کس ڈاکٹر نے یہ نسخہ دیا تھا کہ تم حج کو جاوٗ۔ بہرحال، یہاں جہاز کے افسران اور مسافروں کے درمیان رابطہ قایم رکھنے کیلئے ایک آدمی کو امیر الحج بنایا جاتا ہے۔ اس سال ہمارا امیر الحج طارق کا دوست ڈاکٹر شورا ہے۔ وہ اپنی ماں اور بھائی کے ساتھ آیا ہے۔ بچارا اکثر ہمارے پاس آتا ہے اور ضرورتیں دریافت کرتا ہے، جہاز میں اُترتے ہی مجھے سخت تشویش کا سامنا کرنا پڑا۔ اسلیئے کہ تمہاری والدہ سخت بیمار ہوئی، اُس کے پیٹ میں سخت شدید درد ہوا، اور وہ تڑپنے لگی۔ ابھی ہم بمبئی میں ہی تھے

کے مطابق اسے شام کے ساڑھے چھ بجے بمبئی کی بندرگاہ سے چلنا تھا مگر ہم الحمدللہ اپنے اصول پر ہمیشہ قایم رہنے کا عہد کر چکے ہیں اس لئے جہاز وقت مقررہ کے بجائے رات کے ڈھائی بجے روانہ ہوا۔ ہم اُس وقت سو رہے تھے، اس لئے روانگی کا علم نہ ہو سکا۔ صبح جاگے تو معلوم ہوا کہ ہم مصروفِ خرام ہیں۔ عرشئہ جہاز پر چڑھے تو دیکھا ہر طرف سے پانی ہی پانی ہے، اوپر آسمان اور اللہ جل شانہ کی ذات، سمندر کو دیکھ کر فوراً عظمتِ الٰہی کا سِکہ دل پر جم جاتا ہے، اور بے اختیار طور پر سبحان الملک الحے الذی لا یموت کا ورد جاری ہو جاتا ہے۔ آج پانچ دن سے ہم چل رہے ہیں اور ہمارے ساتھ ایک پوری کائنات مصروفِ خرام ہے۔

ہر شے مسافر ہر چیز راہی، کیا چاند تارے کیا مرغ و ماہی،

اس جہاز میں عملہ جہاز کے سمیت ۲۱ سو افراد ہیں۔ ایک پورا شہر ہے۔ اس کی روزانہ رفتار چودہ اور پندرہ میل سے زیادہ نہیں۔ اس وقت تک ہم پانچ ساڑھے پانچ سو میل طے کر آئے ہیں۔ کل مسافت بمبئ اور جدہ کے درمیان ساڑھے اکتیس سو میل کی ہے۔ آج شام تک ہم انشاء اللہ عدن پہنچیں گے مگر جہاز کے کپتان نے مجھے بتادیا کہ اُسے عدن میں قیام کا کوئی ارادہ نہیں۔ اس لئے ہم اسے جہانِ گذراں کہہ کر دُور سے دیکھیں گے اور آگے بڑھیں گے۔ اس جہاز کا انتظام بہت اعلیٰ ہے۔ صبح نماز کے فوراً بعد میں ناشتہ دیا جاتا ہے جو عموماً چائے، اس کے ساتھ کبھی حلوہ کبھی بسکٹ، کبھی پھل، کبھی مکھن ٹوسٹ کبھی آلو بجھیا یا پکوڑا وغیرہ ہوتا ہے۔ دوپہر کے کھانے میں چاول، سبزی گوشت دال شامل ہوتی ہے، اور شام کو چپاتی، اس کے ساتھ بھی

ٹائم ٹیبل کے مطابق مختلف اچھی چیزیں مہیا کی جاتی ہیں۔۳ بجے چائے اور اس کے ساتھ بسکٹ یا پھل وغیرہ ہوتا ہے۔نمازیں باجماعت پڑھی جاتی ہیں،اورایک سے زیادہ جماعتیں ہوتی ہیں،اللہ کا فضل ہے کہ اللہ کو یاد کرنے قرآن پڑھنے اور درود کا سرور قایم کرنے کا کافی وقت ملتا ہے، اور زندگی سکون سے گذر رہی ہے۔ البتہ ہمارے کشمیری حضرات کبھی کبھی حسب معمول لنگر والوں سے جھگڑا کرتے ہیں کہ انہیں پورا کھانا نہیں دیا جاتا۔ حالانکہ یہ حقیقت نہیں، ہر شخص کو اس کی ضرورت سے زیادہ کھانا مہیا کیا جاتا ہے، پرسوں ان لوگوں نے جلوس بھی نکالا اور کپتان کے کیبن کے باہر نعرہ تکبیر بلند کرتے رہے۔ کپتان ایک تجربہ کار انگریز ہے۔اُس نے ان کے مطالبات سُنے ، اور بولا کہ وہ جو کچھ کھانے کو دیتے ہیں، وہ مغل لائن کے پروگرام کے مطابق ہے۔اگر آپ کو یہ انتظام منظور نہیں تو آپ اپنا وہ روپیہ واپس لیجئے جو کھانے پینے کے لئے وصول کیا گیا ہے،اور اپنا انتظام خود کیجئے۔اس پر وہ لوگ اپنا سامُنہ لے کر واپس آ گئے۔اللہ ان لوگوں سے سمجھے، معلوم نہیں ہوتا انہیں کس ڈاکٹر نے یہ نسخہ دیا تھا کہ تم حج کو جاؤ۔ بہرحال، یہاں جہاز کے افسران اور مسافروں کے درمیان رابطہ قایم رکھنے کیلئے ایک آدمی کو امیر الحج بنایا جاتا ہے۔اس سال ہمارا امیر الحج طارق کا دوست ڈاکٹر شورا ہے۔وہ اپنی ماں اور بھائی کے ساتھ آیا ہے۔بچارا اکثر ہمارے پاس آتا ہے اور ضرورتیں دریافت کرتا ہے، جہاز میں اُترتے ہی مجھے سخت تشویش کا سامنا کرنا پڑا۔اسلئے کہ تمہاری والدہ سخت بیمار ہوئی، اُس کے پیٹ میں سخت شدید درد ہوا،اور وہ تڑپنے لگی۔ابھی ہم بمبئی میں ہی تھے

بہر حال محمد شفیع خان اور دوسرے احباب کی مدد سے ڈاکٹروں نے کافی دل چسپی لی، اور وہ دوسرے دن اچھی ہوئی، اب وہ بالکل آرام سے ہے، اور اپنی سیٹ پر بہت کم نظر آتی ہے، کبھی بنگالی عورتوں کے ساتھ ہوتی ہے، کبھی کیرالا کی خواتین کے جھرمٹ میں، سنا تھا کہ سمندری سفر میں قے، متلی • چکر، دورانِ سر وغیرہ قسم کے عوارض لگتے ہیں، مگر ہم نے اس قسم کی کوئی چیز نہ دیکھی، اور زندگی اتنے آرام سے گذر رہی ہے کہ بار بار الحمدللہ زبان پر آتا ہے۔ کپتان کے کہنے کے مطابق ہم ۲۵ جنوری کو دوپہر تک جدّہ پہنچیں گے، اور انشاء اللہ ۲۶ کو ہم مکہ مکرمّہ جائیں گے، اس خیال سے ہی جذبات میں تلاطم سا آجاتا ہے اور دل چاہتا ہے کہ اُڑ کر وہاں پہنچوں۔ کل یا پرسوں ہم یلملم پہنچیں گے، وہاں ہمارے سلے ہوئے کپڑے اُتر جائیں گے اور اللہ کی یہ ساری مخلوق احرام باندھ کر کفن پوش ہو جائے گی، اور ان کی زبانوں پر لبیک اللھم لبیک لاشریک لک لبیک ان الحمد والنعمۃ لک والملک لاشریکَ لکَ لبیکَ کا ملکوتی نغمہ بلند ہوگا۔ حرمِ پاک میں سب سے پہلے عمرہ کا طواف اور سعی وغیرہ ہوگا، اس کے بعد ہم احرام کھول دیں گئے اور معمول کے کپڑے پہنیں گے، طواف جاری رہے گا، ہفتہ بھر وہاں ٹھہرنے کے بعد ہم انشاء اللہ وہاں جائیں گے، جہاں ہمارا آقا و مولا ہمارا سردار اور ہمارا مالک و مختار، ہمارا ابدی سرمایہ آسودۂ خواب ہے، وہ دن کب آئے گا اور کیسے آئے گا، پھر ہم پر کیا گذرے گی، اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے، دیکھتے ہیں مولا کو کیا منظور ہے۔

آپ لوگوں کی طرف سے بالکل مطمئن ہوں کیونکہ سب کو اپنے مدنی آقا کے سُپرد کر آیا ہوں، یہ خط ظاہر ہے کہ ۲۵ یا ۲۶ تک پڑا رہے گا، اور اگر

وقت ملا تو جدّہ میں نہیں تو مکہ مکرمّہ میں پوسٹ کیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ تمہارا اور ہمارا حافظ و ناصر ہے ہم سب اُسی کی حفاظت اور نگہبانی میں ہیں ۔ اپنے حالات سے آگاہ کرتے رہیے، طارق سلمہ کی Posting کا کیا ہوا تھا۔ خدا حافظ۔

نادرہ اور عزیزم سعید صاحب کو میرا دعا و سلام کہیں، اُن سے کہیے کہ وہ دونوں اور اُن کے بچے روضۂ اقدس پر میرے سامنے اسی طرح ہوں گے جس طرح باقی بچے، اختر کہاں ہیں؟ والسلام۔

نیازمند

میر غلام رسول نازکی

بحر قلزم

۲۳/جنوری

واضح رہے کہ آپ کا وقت ہمارے وقت سے مختلف ہے، اور اس وقت تک ڈھائی گھنٹے کا فرق آگیا ہے۔ ہمارے یہاں اس وقت دن کے ڈھائی بجے ہیں اور آپ کے ہاں پانچ بجے ہوں گے۔ جہاز پہنچتے پہنچتے ایک اور گھنٹے کا فرق آجائے گا، ہم لوگ کل رات کے ساڑھے آٹھ بجے عدن سے گذرے، دور سے اس طویل و عریض شہر کو دیکھا، جو زبردست روشنیوں میں سمندر کے بیچوں بیچ نہلا رہا تھا، مگر ہم وہاں نہ رُکے۔ اس لئے کہ کپتان اُس دس گھنٹے کی Delay پوری کرنا چاہتا ہے، جو بمبئی میں روانگی کے وقت ہوئی ہے۔ بحر قلزم دنیا کے بدترین سمندروں میں سے ہے۔ اور جس سکون کے ہم

گذشتہ کئی روز سے عادی تھے، وہ کل شام سے ختم ہو گیا ہے۔ ہر طرف سے آسمان سے باتیں کرنے والی موجیں اُٹھ رہی ہیں، اور مظفری ان کو چیرتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے، اور زبردست ہچکولے کھا رہا ہے، تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ننگ دھڑنگ پہاڑ نظر آنے لگے ہیں، اور معلوم ہوا ہے کہ یہ افریقہ (سوڈان وغیرہ کا) سلسلۂ کوہ ہے۔ کل شام سے سمندر میں جہاز بڑے اور چھوٹے اور اکثر ان میں سے مال بردار بڑی کثرت سے نظر آ رہے ہیں، اور ہماری تنہائی کا احساس کم ہو گیا ہے۔ ان میں سے اکثر جدّہ اور دوسری بندرگاہوں سے عدن جاتے ہیں اور وہاں سے تیل لے آتے ہیں۔

آج دن کے ایک بجے اعلان ہوا کہ ہم لوگ انشاءاللہ کل دن کے چار بجے (آپ کے تقریباً سات بجے شام) یلملم پہنچیں گے، یہاں احرام بندھتا ہے۔ یہ حدودِ حرم ہے، یہاں گنہگار بندہ اپنے آقا و مولا کے سامنے اعلان کرتا ہے کہ:

بردر آمد بندہ بگریختہ......

اعلان ہوا ہے کہ کل سارا دن جہاز کے نلوں میں میٹھا پانی فراہم کیا جائے گا، چار بجے سائرن بجے گا، یعنی انتباہ ہوگا کہ نہا دھو کر احرام باندھ کر تیار ہو جاؤ۔ ۵ بجے دوسرا سائرن بجے گا کہ میقات کی حد ختم ہو گئی ہے مگر ابھی سے یہ مشکل آئی ہے کہ نہائیں کہاں؟ جہاز کے ڈیک کلاس میں جتنے غسل خانے ہیں اُن میں کشمیری حاجی صاحبان نجاست کرتے ہیں اور وہ سخت پلید ہیں، آپ لوگوں کی والدہ اس سے فارغ ہو گئی ہیں، انہوں نے ڈیلکس کلاس کے ایک غسل خانے میں آج غسل کیا، میں بھی انشاءاللہ کل وہیں یہ کام

کروں گا۔دوسری مشکل یہ ہے کہ پاسپورٹ اور دوسرے ضروری کاغذات کہاں رکھے جائیں، شاید ایک اٹیچی ہاتھ میں رکھنا پڑے گی جس میں یہ سارے کاغذات آجائیں کیونکہ جدّہ میں ان کی جانچ کے بغیر جہاز سے اُترنے کی اجازت نہیں ملتی۔ بہرحال جس طرح اللہ جل شانہ نے آج تک ساری مشکلیں آسان کردی ہیں، اسی طرح وہ آگے بھی دستگیری فرمائے گا۔

کل رات سے یعنی جب سے ہم بحرِ قلزم میں داخل ہو گئے ہیں، گرمی ہوگئی ہے، اکثر وقت عرشہ جہاز پر گذرتا ہے، جہاں ہوا چلتی ہے، مگر متلاطم سمندر کا خوف ہراسان کر دیتا ہے، یونس علیہ السلام پر آفت اِسی سمند میں آئی تھی اور اس نے مچھلی کے شکم میں دُعا کی تھی۔ لا الہ اِلاّ انت سبحانک انی کُنتُ مِن الظالمین۔ اللہ نے اس کی توبہ قبول کی تھی، اور اُسے غم سے نجات دینے کے علاوہ یہ وعدہ بھی فرمایا تھا، وکذالِک ننجی المومنین، اسی طرح ہم تمام مومنوں کو نجات دیتے ہیں۔ اللہ ہمیں بھی نجات دے اور ہم سب کو اپنے اَمن وامان میں رکھے۔آمین۔

رات کے نو بجے۔

اس وقت آپ کے ہاں رات کے بارہ بجے ہوں گے ہم لوگ ابھی عرشہ سے عشاء کی نماز پڑھ کر آئے ہیں، مگر بستر پر سونا محال ہو رہا ہے، سخت گرمی پڑ رہی ہے، آج تک بہت آرام سے راتیں بسر کیں، آج کی رات پہلی رات ہے جو کافی گرم ہے، معلوم ہوتا ہے دیارِ حبیبؐ میں ہمارا استقبال بھی گرم جوشی سے ہوگا، ہم لوگ یہاں جہاز میں ڈھائی بجے کے بعد کبھی نہیں سوئے، آج شاید اتنی نیند بھی نصیب نہ ہوگی۔ بمبئی میں ہم تہجد اور فجر کی نمازیں

جامع مسجد میں ادا کرنے جاتے تھے۔ پھر ہمارا وہاں جانا بند ہوا۔ اس لئے کہ کچھ کشمیری حضرات وہاں گئے اور وضو کرنے کے پانی کے صاف وشفاف سنگِ مرمر کے حوض میں نجاست کر آئے، وہ رنگے ہاتھوں پکڑے گئے، پٹے اور ویلفیئر افسر کے حوالے کر دئے گئے اس کے بعد ہم نے شرم کے مارے وہاں جانا چھوڑ دیا۔

۲۴۔جنوری۔

آج دن کے تین یا چار بجے ہم یل لملم پہنچیں گے اور کل انشااللہ جدّہ۔ رات بے خوابی میں گذری، کچھ اس لئے کہ گرمی تھی کچھ اس لئے کہ ایک کشمیری حاجی کا دماغ چل گیا۔ وہ بمبئ میں ہی پاگلوں کی سی حرکتیں کرتا تھا۔ کبھی نوٹوں کے بنڈل باہر پھینک دیتا تھا کبھی بیوی کو بے محابا گالیاں دیتا اور اُس کی پٹائی کرتا، پھر ذرا افاقہ ہوا تو اُسے آنے کی اجازت دی گئی۔ جہاز میں پھر پاگل ہو گیا ۔آج رات کے دو بجے اُسے ہسپتال والوں نے پکڑ کر مورفیا کا انجکشن دیا ہے، اور ذرا جان میں جان آئی ہے۔ اُس کی بیوی کو کوئی پریشانی نہیں اور وہ اطمینان سے حُقّہ پیتی رہتی ہے۔

سعید صاحب سے کہہ دیجئے کہ محمد سلیمان گوجر ہمارے ساتھ ہے۔ وہ سعید صاحب کو دعا وسلام بھیجتا ہے، یہ بڑا محنتی آدمی ہے، کئی دفعہ حج کر چکا ہے، اس لئے آدابِ حج سے واقف معلوم ہوتا ہے۔ شاید کام کا نکل آئے۔ ہمارے ساتھ اس جہاز میں محمد رجب صاحب بچھوارہ ان کی بیوی اور اُن کا بھائی ہے، ڈاکٹر حبیب اللہ اور حکیم غلام نبی اور اُن کی اہلیہ ہیں، یہ دو میاں بیوی فرسٹ کلاس میں سفر کرتے ہیں۔ مگر ہمارے سامنے بچھ بچھ جاتے ہیں،

اس کے علاوہ محمد امین بچھ صاحب کی والدہ اور اُن کے ساتھ غلام محمد گانی اُن کی اہلیہ اور والدہ بھی ہیں، یہ لوگ ڈیلکس کلاس میں سفر کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ غلام رسول زرو اور اُن کی اہلیہ بھی ہیں اور وہ بھی ڈیلکس کلاس میں ہیں۔ اُنھیں وہاں جو سہولتیں حاصل ہیں اُن میں وہ ہم کو برابر کا شریک کرنا چاہتے ہیں، مگر ہم تامّل کرتے ہیں۔ صرف تم لوگوں کی والدہ کو احرام سے پہلے کا غسل کرنے کے لئے وہاں جانا پڑا، ان لوگوں نے بڑے تپاک سے اس کا خیر مقدم کیا، اور مجھے ندامت ہوئی۔ ہمارے بستروں کے سامنے اُوڑی کے چار بزرگ ہیں، چاروں جوان ہیں، اور بڑے ہنس 'مکھ' کارآمد اور ہمدرد لوگ ہیں۔ غلام علی ناؤ جو بھی ہمارے ساتھ ہیں، عبدالمجید لون ویلفیئر اوفیسر بہت نیک شریف اور ہمدرد آدمی ہیں۔ پولیس کے افسر اور جوان ہونے کے باوجود کافی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ پچھلے سال احرام باندھنے کے ساتھ ہی سگریٹ چھوڑنے کا وعدہ کیا، اور اب تک اُس پر قائیم ہیں۔

۲۷/جنوری......

۲۵/جنوری کو ہمارا جہاز جدہ میں لنگر انداز ہوا، مگر جہاز چھوڑنے سے پیشتر تمام حاجیوں کو اللہ جل شانہ نے اپنی قدرت یاد دلائی، پہلے ایک سخت گرمی کی لہر آئی، اور اس کے بعد سمندر شدت سے متلاطم ہوا، اور الحمدللہ ہمارے بغیر تقریباً ہر مسافر فرع فرع (؟) کرنے لگا، اور زیست سے ناامید ہو گیا۔ بہر حال ۲۵/جنوری کو صبح کے وقت ہم جدہ پہنچے، اور ہمیں لاریوں میں بٹھا کر کسٹم ہاؤس پہنچا دیا گیا، اور یہ قیامت کا منظر تھا۔ مزدور سامان لالا کے اس وسیع وعریض احاطے میں اس بے دردی سے پھینکتے گئے کہ شاذ و نادر

کسی کا سامان سلامت پہنچا۔ ہمارے ایک ٹرنک کا خاتمہ ہوا اور شاید ہم کو سب سے کم نقصان ہوا ہے۔ لوگوں کا تیل پانی کی طرح بہا، گھی اُلٹ گیا، تالے اُڑ گئے، اور پھر اس ہنگامے میں سامان کی تلاش اور کسٹم والوں سے اس کی جانچ، اس قیامت خیز منظر سے ہم بعد شام فارغ ہوئے، اور وہاں سے دوبارہ سامان بسوں میں لادا گیا، اور جدہ کے مسافر خانے (مدینۃ الحجاج) میں لایا گیا۔ اور پھر اسی طرح پھینکا گیا جس طرح کسٹم ہاؤس میں تھا، اور پھر وہی دردسری شروع ہوئی، جو رات گیارہ بجے تک جاری رہی، سارا دن ہم بھوکے پیاسے تھے، شام کو کسی ہوٹل سے کئی لقمے زہر مار کیئے، اور لیٹ گئے، مگر سو نہ سکے۔ صبح اٹھ کر نماز پڑھی اور سامان پھر بسوں میں لادا جانے لگا۔ اس میں چار گھنٹے صرف ہوئے، اور ہم بیت الحرام کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ سرزمین عجیب ہے، اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کے علاوہ حضور رحمۃ العالمین کے وجودِ ذی جود کا معجزہ ہے کہ یہاں مبعوث ہوئے، یہاں آکر اندازہ ہوتا ہے کہ اگر یہ مؤلد النبی ہے، تو ابو جہل اور ابولہب کا وطن بھی ہے۔ رشوت کی گرم بازاری ہے، بس ڈرائیور ایک قدم نہیں چلتا جب تک اسے رشوت نہ دو۔ قلی سامان کو ہاتھ نہیں لگاتا جب تک اُسکی مٹھی گرم نہ کرو، ڈاک خانے کا ٹکٹ بیچنے والا بابو دو، دو گھنٹے تک کھڑا رکھتا ہے، اور سوال کا جواب نہیں دیتا۔ بہر حال یہ ایک طویل اور دردناک داستان ہے، ہم ۲۶ جنوری کو مکہ پہنچے، ڈرائیور کو رشوت دے کر اُس جگہ ٹھہرایا جہاں سے حدودِ حرم شروع ہوتا ہے۔ اس مقام کا اصلی نام حدیبیہ ہے، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہیں بیت الرضوان ایک درخت نیچے لی تھی، اُس خاص مقام پر ایک محراب سا ہے اور ہر مسلمان اس سرزمین پر دوگانہ ادا کرنا چاہتا

ہے، مگرڈرائیورنہیں رُکتا، ہم نے اُسے روکا اور جس زمین نے نبیؐ روحی فدا کے قدم چومے تھے وہاں اپنا سر رکھ دیا۔

بریگِ گرم اور آور سجودے
جبیں راسوزتا داغے بماند

اس کے بعد مسجدِ حرام کے پاس پہنچے وہاں ہمارا سامان اُترا اور معلم کے گھر کے باہر انبار رہوا۔ ہم نے یلملم میں احرام باندھا تھا۔ اس لئے ہم وضو کر کے فوراً عمرہ کے لئے گئے اور خدا کے اُس گھر کو اِن گناہ گار آنکھوں نے دیکھا، جو آج پانچ ہزار سال سے ابوالانبیا ابراہیمؑ نے تعمیر کیا ہے، کعبہ کا طواف کیا، صفا و مروہ کا سعی کیا، مقامِ ابراہیم میں نماز پڑھی، اور زمزم سے پانی پیا۔ حجرِ اسود کو چوما اور رُکنِ یمانی پر ہاتھ پھیرا۔ کعبہ کے دروازے کے نیچے جو دہلیز ہے، اُسے ملتزم کہتے ہیں۔ یہ وہ جگہ ہے جس سے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم مصیبت اور آفت کے وقت لپٹ جاتے تھے، اور دُعا فرماتے تھے۔ آپ نے فرمایا یہاں جو دعا مانگی جاتی ہے، وہ قبول ہوتی ہے۔ ہم دونوں میاں بیوی اس سے لپٹ گئے، اور تم لوگوں کے لئے، بہنوں بھائیوں کے لئے، متعلقین کے لئے الگ الگ دُعائیں مانگیں جو قبول ہوئیں، انشاء اللہ۔ تمہاری ماں کا حال حرمِ کعبہ کے پاس اور ملتزم کو پکڑ کر بہت بگڑا اور وہ ضبط نہ کر سکیں ڈھاڑیں مار مار کر روئیں۔ انشاء اللہ اُس کی دُعا قبول ہو گی، اپنی روسیاہی کو سامنے رکھکر اپنے متعلق اطمینان نہیں، اتنے میں ظہر کی نماز کی اذان ہوئی اور ہم نے کعبہ کے خُدا کے سامنے خود کعبہ کی دیوار کے سائے میں اپنا سر جُھکایا اور معلم کے گھر آئے جس نے کھانا تیار رکھا تھا، ہم لوگ

تھک کر چور ہو گئے تھے، کھانا کھایا اور مکان کی تلاش میں نکلے۔ بادشاہ نے یہاں حرمِ کعبہ کی وسعت کے لیے ہزاروں مکانات تڑوائے ہیں، اس لئے رہائشی مکانوں کی قلت ہو گئی ہے۔ ہمیں ۳۵۰ ریال پر ایک کمرہ ملا، سوپور کے غلام رسول ڈار صاحب اور اُن کی بیوی کو اپنے ساتھ لیا، اور پانچ آدمیوں کا یہ قافلہ عصر کے بعد اس کمرے میں آیا۔ یہ کمرہ حرمِ شریف سے ۵ منٹ کے فاصلے پر ہے، اب ہم نے پانچ نمازیں حرم میں پڑھی ہیں، آج صبح ہم تہجد کے وقت گئے، طواف کیا، اور ملتزم کو پکڑ کر پھر روئے اور تمہاری ماں پھر بے حال ہو گئیں، وہاں سے آکر چائے اور کھانا بنایا، ارادہ ہے کہ دو وقت کا کھانا ایک وقت بنا لیا جائے تاکہ ہم لوگ ظہر سے عشا تک مسجدِ حرام میں گذار سکیں، انشاء اللہ آج جمعہ ہے، اور ہم انشاء اللہ پہلی جمعہ کی نماز کعبہ میں پڑھیں گے۔

حرمِ کعبہ کی وسعت کا اندازہ کرنے کے لئے مجھے ایک مقالہ لکھنا پڑے گا جو انشاء اللہ اگر واپسی ہوئی تو لکھوں گا۔ کل یا پرسوں ہم عرفات منیٰ مزدلفہ اور...... غارِ ثور اور غارِ حرا دیکھنے جائیں گے، اور ہفتہ بھر کے بعد وہاں جہاں ہمارے تمہارے آقا و مولےٰ آرام فرما رہے ہیں۔

یہ خط طویل ہو گیا، انشاء اللہ مدینہ سے ایک اور خط لکھوں گا، آپ سب لوگ کعبہ خُدا کے سپرد ہیں، اور ہم بھی۔ وقت کم ہے اور داستان طویل،

فرصت کم و فسانہ من گفتگو طلب

خدا حافظ، واسلام علیکم۔ سب کو میرا سلام کہیے

نیاز مند

میر غلام رسول نازکی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مكة المكرمه زادها الله شرفاً وتعظيماً

۳۰ر جنوری ۱۹۶۷ء

نورِ بصر۔ ایاز اللہ تمہیں سلامت رکھے

تمہارا خط مجھے اُس وقت ملا جب میں ہر طرف سے مایوس ہوا تھا، سراب میں اچانک کسی کو پانی کا چشمہ مل جائے تو اُسے کتنی خوشی ہوگی، سمجھ لو اتنی ہی خوشی ہوئی، اور دل سے بے اختیار تمہارے لئے دُعائیں نکلیں، بہت غنیمت ہے۔ توقع تھی کہ سعید صاحب لکھیں گے، ریاض صاحب یاد فرمائیں گے، فاروق صاحب مہربانی کریں گے، طارق صاحب کرم فرمائیں گے، اقبال صاحب اور بلال صاحب دو چار سطریں لکھیں گے، مگر معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو اپنے مشاغل سے فرصت نہیں ملتی، اور وہ زیادہ مصروف ہونے کی وجہ سے کم اہم باتوں کی طرف توجہ نہیں دینا چاہتے، میں نے بمبئی سے بے شمار خط لکھے، تاکہ تم لوگوں کا دل بہلتا رہے، اور شاید تم میں سے کوئی لکھنا پسند فرمائے، مگر یہ سعادت تمہاری قسمت میں تھی اوروں کو شاید اِس کی ضرورت نہیں۔ میں یہاں آکر اگرچہ بالکل بے فکر بیٹھا ہوں، کیونکہ اپنا سب کچھ کعبہ کے رب کے سپرد کر چکا ہوں پھر بھی بشریت کے تقاضے سے خط کی توقع رہتی ہے۔ بہتر ہوگا اگر تم ذرا تفصیل سے لکھو۔

یہاں سے بھی میں نے ایک طویل خط تقریباً روزنامچے کی صورت میں ریاض صاحب کے نام بھیجا ہے۔ وہ کب کا پہنچ چکا ہوگا کیونکہ ہندوستان سے یہاں خط زیادہ سے زیادہ سات دن میں پہنچتا ہے۔ مجھے امید ہے تم نے اسے پڑھا ہوگا۔ ہم لوگ ۲۵ جنوری سے یہاں ہیں۔ ابھی تک ہم کعبہ شریف کے علاوہ کوئی اور مقام دیکھنے نہیں گئے۔ وجہ یہ ہے کہ کعبہ کی کشش وہاں سے ہلنے نہیں دیتی، یہ بہت عجیب جگہ ہے۔ شاید دنیا بلکہ کائنات میں اپنی نوع کی واحد چیز رات دن کا ایک لمحہ ایسا نہیں گذرتا جب اللہ کے دیوانے اس کے گرد طواف نہیں کرتے۔ میں آج سب کو سوتا چھوڑ کر آدھی رات کو طواف کے لئے گیا، خیال تھا کہ ہجوم کم ہوگا، مگر یہ خیال غلط نکلا، رات دن کے کسی حصے میں جاؤ، اور اللہ کے دیوانوں کا رقص دیکھو، لوگوں کی آہ و بکا سنو اور سر دھنو، تمام نبیوں کے باپ سیّدنا ابراھیمؑ کے پیغمبرانہ خلوص کا یہ جیتا جاگتا پیکر قیام قیامت تک قائم رہے گا۔ اس کے مناروں سے جب اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہوتی ہیں، تو عرش کانپتا ہے دلِ کہسار ہل جاتا ہے اور بخت جاگتے ہیں۔ اس دروازے کو چھوڑ کر جا نہیں سکتا بڑی مدت اور بڑی دل سوزی کے بعد یہ دروازہ ملا ہے۔ لوگ بھاگ کے مکہ کے بازاروں میں سرگرداں ہوتے ہیں اور مال خریدتے ہیں۔ میں اپنا مال بیچنے کی فکر میں ہوں، جس کا انبار اپنی پیٹھ پر اُٹھالایا ہوں، اور ساری کائنات میں میرے مال کا خریدار مکہ اور مدینہ کے سوا اور کہیں نہیں۔ اگر میرا مال بِک گیا تو میں ہلکا ہو جاؤں گا، اور رحمتِ بے پایاں کی دولت سے اپنی جھولیاں بھر دوں گا، پھر اسے ساری دنیا میں پھیلاتا چلا جاؤں گا، اگر خریدار مال لینے

پر راضی نہ ہوا، تو اسے واپس اپنی ٹوٹی ہوئی کمر پر لے آؤں گا، اور اپنے گوداموں میں بھر دوں گا، اور اپنی قسمت کا ماتم کروں گا۔ اندازہ کرو اگر خدا نخواستہ ایسی صورت ہوئی تو میرا ٹھکانا کہاں ہے، الھم انی اعوذبک مِن عذاب النار ۔ معاف کرنا ذرا جذباتی ہوگیا، اور آنکھوں سے پیشمانی ندامت اور شرمندگی کے آنسو بہہ نکلے۔

ہم دونوں بحمداللہ بخیریت ہیں۔ صبح تہجد سے پہلے ہم حرم شریف پہنچتے ہیں، طوافِ کعبہ کے بعد تہجد پڑھتے ہیں اور پھر نمازِ فجر ہوتی ہے۔ اس کے بعد ہم گھر آ کر دو وقت کے لئے چائے اور کھانا بنا کر ظہر سے پہلے واپس جاتے ہیں اور پھر عشاء کی نماز کے بعد وہاں سے نکلتے ہیں۔ ہمارے گھر سے کعبہ شریف تک چار منٹ کا راستہ ہے۔ اس میں ایک بازار پڑتا ہے اس بازار کے علاوہ اور کسی بازار کو دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا۔ اس بازار سے بھی گذرتا ہوں تو آنکھیں بند کرتا ہوں، کیونکہ کعبہ کے خدا نے ایک طرف رحمت کی دوکان کھولی ہے تو دوسری طرف شیطان نے بھی لاکھوں دوکانیں کھول دی ہیں جن میں امریکہ انگلستان جاپان سویز رلینڈ چین کی زرق برق چیزیں ہر راہ گیر کو اپنی طرف اسی طرح بلاتی ہیں جس طرح بنی سنوری بیسوائیں دکانوں پر بیٹھ کر گاہکوں کو اپنے عشوہ وغمزہ سے اپنی طرف مائل کرتی رہتی ہیں۔ اللہ شیطان کے شر سے نجات دے۔

کل ہم عرفات، منیٰ، مزدلفہ، غارِ حرا اور غارِ ثور دیکھنے جائیں گے۔ پرسوں انشاء اللہ مکہ شہر کے دوسرے مقامات مثلاً مولدالنبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسجد بلالؓ دیکھیں گے۔ مدینہ طیبہ جانے کے لئے دل بے چین ہے، مگر یہاں

آ کر شش و پنج میں پڑ گیا ہوں، اور جانے کی جرأت نہیں پڑتی۔ غالباً دس بارہ روز میں جائیں گے۔ معلوم ہوا ہے کہ وہاں سخت سردی پڑی ہے اور اکثر لوگ جو گئے ہیں بیمار ہو کر آئے ہیں۔ مکہ مکرمہ میں بھی صبح شام سردی ہوتی ہے اور ہم پورا لباس پہنے بغیر ان اوقات میں حرم شریف نہیں جا سکتے۔

امید ہے تم سب لوگ اچھے ہوں گے اور وہاں بہت زیادہ سردی ہو گی۔ آج چلہ کلان کا آخری دن ہے اور انشاء اللہ اب رفتہ رفتہ موسم ٹھیک ہونے لگے گا۔ عزیزہ مسعودہ اور بلقیس کو میرا دُعا و سلام پہنچا دیں، میرے ذہن سے کوئی غیر حاضر نہیں۔ کعبہ شریف۔ کے دروازے کے دہلیز (دروازہ داس) کو رسولِ مقبول ﷺ نے ملتزم، کا نام دیا ہے، حضور پر جب کوئی آفت آتی تو وہ اس دہلیز سے لپٹ جاتے اور اپنے رخسار اس پر رگڑتے اور رو رو کر دُعا مانگتے۔ پھر اعلان فرماتے کہ دُعا قبول ہو گئی۔ پھر آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ اس دہلیز سے لپٹ کر جو شخص دعا مانگے گا وہ لازماً قبول ہو گی، اس لئے اس کا نام ملتزم پڑ گیا۔ ملتزم کو ہم دونوں نے بیسوں مرتبہ گلے لگایا اور رو رو کر اپنے لئے اور تم سب کیلئے بھائیوں کے لئے، بہنوں کے لئے، بچوں کے بچوں کے لئے دوستوں کے لئے اور سب مسلمانوں کے لئے دعائیں مانگیں، اور یاد رہے کہ گُلہ بھی ہمارے ذہن سے دُور نہ ہوا۔ اور انشاء اللہ یہ دعائیں قبول ہو گئی ہیں۔

مدینہ مطہرہ ذرا دیر سے جانے میں یہ مصلحت بھی ہے کہ ابھی حجاج کا ہجوم کم ہے اور ہمیں آسانی سے طواف، حجرۂ اسود، مقامِ ابراھیمؑ پر نماز پڑھنے اور ملتزم سے لپٹنے کا موقع ملتا ہے۔ دس پندرہ روز میں یہاں ہجوم بڑھ جائے گا اور ہم جیسے ضعیفوں کیلئے یہاں پہنچنا محال ہو گا۔ اس لئے اس فرصت کو

غنیمت جانتے ہیں۔

خط ذرا طویل ہو گیا۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ طارق سلمہ کی Posting کا کیا ہوا تھا۔ باقی سب لوگ کس حال میں ہیں۔ نادرہ، سعید صاحب اور اُن کے بچوں کا کیا حال ہے، اختر میاں کہاں ہیں۔ اگر کسی کو توفیق ہوئی تو لکھ دے گا۔

میں تم سب کو اور اپنے آپ کو اللہ جل نشانہ کے امان میں دیتا ہوں۔ وہی ہمارا سچا محافظ مددگار اور حافظ و ناصر ہے، خدا حافظ۔

تمام حال پوچھنے والوں کو سلام کہہ دینا، غلام محمد بھٹ بخیر ہے اور سلام لکھواتا ہے۔ ماسٹر جی، بوبہ ٹاٹھی، مظفر صاحب، آفتاب احمد، مشفق، پیٹر اور ننھی کو اسلام علیکم اور دُعا۔ ہمسایوں خاص کر سعید صاحب، الطاف صاحب، اُن کی والدہ اور بہنوں، نبہ صاحب، طاہر صاحب، یعقوب صاحب، جان محمد، جبار صاحب، حبیب اللہ، اور دوسرے تمام دوستوں کو سلام کہنا اور اُن سے کہہ دینا کہ میں نے اُن سب کے لئے دُعا کی ہے، اور کرتا رہوں گا، اپنے چچا بہاالدین صاحب، سلیمہ، محمد سعید، اشرف، فردوس اور دیگر بچوں کو دعا و سلام، بانڈی پور والوں کا کیا حال ہے۔ خورشید کہاں ہے، وہ بدستور میرے دل میں موجود ہے۔ جیلانی صاحب کہاں ہیں، وہ لوگ ملیں تو میرا سلام کہنا، مامت والوں سے بھی سلام کہیں۔ سب کے لئے دعائیں کرتا ہوں، ہو سکے تو آمنہ کے پاس جانا چاہئے، بشیر احمد کو اللہ محفوظ رکھے۔

عصر کی نماز قریب ہے، اور ہم جا رہے ہیں۔ تمہاری والدہ کھڑی انتظار کر رہی ہے، خدا حافظ۔

نیازمند

میر غلام رسول نازکیؔ

میرے نام کے ساتھ حاجی کا لفظ لکھ کر مجھے ذلیل کرنے کی کوشش نہ کرو، اللہ قبول فرمائے گا تو اتنا کافی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکة المکرمه زادها الله شرفاً وتعظیماً

۴ر فروری ۶۷ء

نورِ بصر۔ سلمہ اللہ

آپ کا خط ملا، اس سے پہلے بمبئی میں عزیز ریاض صاحب کا اور یہاں مکہ میں ایاز صاحب کا خط موصول ہوا۔ ریاض صاحب کے نام بمبئی سے اور ایاز صاحب کے نام یہاں سے خط لکھا ہے، آپ کے اور ایاز کے خط سے قدرے سکون ہوا۔ اللہ تعالیٰ سب کو سکون عطا فرمائے۔

اب ہم یہاں گذشتہ دس روز سے ہیں۔ کعبہ شریف کی دیوار کے سائے میں ابھی تک ہم نے چوالیس فرض نمازیں ادا کی ہیں اور کم و بیش ہر نماز کے ساتھ کعبہ کا ایک طواف کیا ہے۔ اس عجیب و غریب اور دہشت ناک عمارت میں اللہ نے وہ کشش رکھی ہے کہ گھنٹوں دیکھتے جاؤ طبیعت سیر نہیں ہوتی، اور اللہ جل شانہ، کی عظمت کا سکہ دل پر بیٹھ جاتا ہے، ایک روز

ہم منیٰ مزدلفہ اور عرفات بھی دیکھ آئے، اور ان مقامات کی خاک کو آنکھوں سے لگایا جنہوں نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم چھوئے ہیں۔ عرفات میں جبلِ رحمت پر چڑھے اور سامنے کج مج پہاڑوں کے وسیع و عریض سلسلے میں عرفات کا لق و دق میدان نظر آیا۔ اسی جبلِ رحمت پر رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حجتہ الوداع میں آخری خطبہ ارشاد فرمایا تھا۔ عرفات کو دیکھ کر مجھے اس کا ہر ذرہ اپنا آشنا دکھائی دیا، کل ایک دوست کہہ رہے تھے کہ ہم یہاں کیا کر سکتے ہیں۔ مسافر ہم ہیں میں نے کہا یہاں ہم مقیم ہیں، یہ ہمارا اصلی گھر ہے۔ مسافر وہاں ہیں جہاں ہم حیاتِ مستعار کے دن پورے کرنے آئے ہیں اور عرفات کا میدان تو ہمارا ہمراز پانچ ہزار برس سے ہے۔

ہوائے دشت سے بوئے رفاقت آتی ہے

کل یا پرسوں غارِ حرا اور غارِ ثور دیکھیں گے، خاص مکہ میں مولد النبیؐ ہے، وہ گھر جس میں وہ اُجالا پیدا ہوا۔ جس کی جوت قیامت تک جگمگاتی رہے گی، اس گھر میں اب ایک لائبریری ہے۔ مگر اس کا احترام اسی طرح کیا جاتا ہے جس طرح ایک مسجد کا کیا جانا چاہیئے ، اس کے ساتھ مؤلدِ سیدنا علی کرم بھی ہے۔ وہاں ایک شبینہ سکول ہے، جنت مُعلّےٰ اور مسجدِ بلال بھی مکہ میں ہیں۔ انھیں بھی دیکھا ہے، تم جانتے ہو کہ حج مجھ پر فرض نہ تھا، اور میں اصل میں آیا بھی اس نیت سے نہ تھا۔ آیا میں آقائے نامدار کے آستانہ عالی پر سجدہ بکھیرنے کے لئے تھا۔ ساری عمر اس کی تمنا رہی، اب جب کہ یہ منزل مقصود ڈھائی سو میل دُور ہے دل عجیب شش و پنج اور پس و پیش میں گرفتار ہے اور جانے کی جرأت نہیں ہوتی۔

عینِ وصال میں مجھے حوصلہ نظر نہ تھا !

اگرچہ بہانہ جو رہی میری نگاہ بے ادب

بہر حال، اب ہم ۸ فروری کو دیارِ حبیب جانے کا پروگرام بنا چکے ہیں۔ مجھے معلوم نہیں وہاں مجھ پر کیا گذرے گی، وہاں سے انشاء اللہ خط لکھوں گا، تم سب لوگوں کے لئے ملتزم میں دُعائیں کر چکا ہوں، جو قبول ہو چکی ہیں کیونکہ رسولؐ کا ارشاد یہی ہے۔ تمہارے خط سے پہلے ہی میں نے دہلیزِ کعبہ کو تھام کر امین کی رہائی کی دُعائیں کی ہیں، انشاء اللہ وہ ضرور چھوٹ جائے گا۔ قدوائی صاحب یہاں ہندوستان کے سفیر ہیں۔ وہ میرے پرانے دوست اور مہربان ہیں، جدہ میں ملے، رات کو دیر تک مجھے تلاش کرتے رہے مگر میں ہاتھ نہ آیا۔ کل مکہ آئے تھے، بڑی مشکل سے مجھے حرم شریف سے ڈھونڈھ نکالا۔ گھر لے گئے اور میرے اعزاز میں دس پندرہ دوستوں کو بھی بُلایا اور تکلّف سے کھانا کھلایا اور کلام سنانے کی فرمائش کی۔ میں نے موقع کی مناسبت سے نعت پڑھی، جب یہ شعر پڑھا:

اک روسیاہ طالبِ سرمایۂ نجات

سرمایۂ نجات رسولِ خدا کی ذات

تو سب پر جنون سا سوار ہوا، اور سب اشکبار ہوئے۔ خالدِ عزیز انصاری صادق صاحب کے پرائیویٹ سیکریٹری ہیں، اُن کے بھائی حامد عزیز یہاں فسٹ سیکریٹری ہیں مگر آج کل تہران گئے ہوئے ہیں۔ ان کے والد صاحب بھی حج کے لئے آئے ہیں، وہ بھی موجود تھے اور بار بار اِس نعت کو سننے کی خواہش ظاہر کرتے رہے۔ اب انہوں نے پروگرام بنایا ہے کہ مدینہ منوّرہ

سے ہماری واپسی کے بعد جدہ میں ایک مشاعرہ کریں گئے۔ سفارت خانے کے عملے کو مامور کیا گیا ہے کہ وہ پاکستان سے آئے ہوئے شعراء کا پتہ لگائیں۔ امید ہے یہ اچھی سلجھی ہوئی نشست ہوگی، قدوائی صاحب نے میرے ساتھ جو کرم فرمایا ہے، میں اس کا بدلہ نہیں دے سکتا اللہ جزا دے گا۔ کشمیر سے جو حکام ہمارے ساتھ تھے، وہ اب کئی روز سے میرے پیچھے گھومنے لگے ہیں اور یہاں یہ حال ہے کہ دہلیز کعبہ کو ایک لمحہ کے لئے چھوڑنا گوارا نہیں۔ قدوائی کے کرم کو دیکھ کر یہ لوگ میری "عظمت" کے قائل ہو گئے اور یہ سب کچھ خدا کے گھر میں ہوا، اللہ کا شکر کیسے کروں جہاں جاتا ہوں میری عزت کی جاتی ہے۔ میں اس کے پیچھے نہیں بھاگتا، یہ میرا پیچھا کرتی ہے۔ اپنے تمام حالات سے آگاہ کرتے رہیئے، اور بچوں کو دُعائیں دیجیے، میں نے ہر جان پہچان کے آدمی کے نام خط لکھے، مگر جواب کسی نے نہ دیا۔

معلوم نہیں طارق صاحب کی Posting کا کیا ہوا تھا۔

ریاض صاحب کو روز آنے جانے سے تکلیف ہوتی ہوگی، مسعودہ کا کیا حال ہے۔ اُس سے کہیئے کہ میں نے اُس کے اور بے بی اور گاما کے لئے بلقیس روبی اور چھوٹی روبی کے لئے، آپ دونوں کے لئے طارق اور اختر کے لئے اقبال، بلال، ایاز، وقار نادرہ اختر صاحب پچی منی، ببری، میمی، سعید صاحب کے لئے دہلیز کعبہ کو تھام کر رو رو کر دُعائیں کی ہیں جو انشاء اللہ قبول ہوئی ہیں، کچھ کسر ہوگی، تو وہ دیارِ حبیبؐ میں پورا ہوگی۔

آپ اطمینان رکھیں، اللہ تعالیٰ آپ میں سے کسی کو بھی رسوائی اور عسرت کے عذاب میں گرفتار نہیں کرے گا۔ مجھے اس کا یقین دلایا گیا

ہے۔ البتہ صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق اللہ اسی صورت میں دے گا، جب آپ بھی اپنی سعی جاری رکھیں گے۔ دنیا کا قیام عارضی ہے، اصل چیز آخرت ہے۔ نمازوں کی پابندی کا عہد کیجئے۔ انشاءاللہ زندگی کا انجام بخیر ہوگا، اور زندگی بھی بااقبال گذرے گی، تمہاری والدہ پر سخت رقّت کا عالم طاری ہے کہ اور رات دن تم لوگوں کے لئے دُعائیں کرتی ہے، جو انشاءاللہ مقبول ہیں۔ غلام محمد بھٹ بخیر ہے کہ اُس کے گھر کی خبر گیری میں کوتاہی نہ کیجئے۔ گُلہ کو میری دُعائیں دیجئے، ربِ کعبہ کی قسم میں نے ملتزم میں اُس کے لئے اور احد کا وہ کے لئے بھی دُعا کی ہے، محلے والوں کو نام بنام سلام کہئے، خاص کر ماسٹر جی اور اُن کے گھر والوں کو، وہ لوگ بھی دُعاؤں میں شامل تھے۔ خدا حافظ۔

نیاز مند
میر غلام رسول نازکی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(محمد سیّد الاولین والآخرین وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ اجمعین)

دیارِ حبیبؐ

۹ رفروری ۱۹۶۷ء۔

یہ مدینہ ہے۔ مکہ کے ساتھ میں التزاماً زادھا شرفاً وتعظیماً لکھتا ہوں، مدینے کے لئے کیسے لکھوں، اس سے بڑھ کر شرف اور تعظیم کیا ہے، جو اِسے عطا کیا گیا ہے۔

چھُہ کعبس سنگِ اسود داغ سینس
عرق چھُس زمزمُک پشپان جبینس
ستھاہ ارمانِ چھُس بخشُس نہ ذاتن
شرف یُس تمیٚ عطا کوٚرمت مدینس،

میں وہ لفظ کہاں سے لاؤں، قلم میں وہ قدرت کہاں سے حاصل کروں، زبان و بیان میں وہ جودت کہاں سے مانگوں جو اس عرش مرتبت مقام کا حال بیان کروں۔ کل رات جب ہم لوگ یہاں پہنچے تو شام ڈھل چکی تھی۔ یہ مدینے کی شام تھی، جس پر لاکھوں صبح صادق نثار۔ ہم طویل سفر کے بعد تھکے تھے اس لئے حرمِ رسولؐ جانے کی جرأت نہ ہوئی۔ شام اور عشا کی نماز کسی دوسری مسجد میں پڑھی، آدھی رات کو اُٹھے، نہایا، کپڑے بدلے، عطر لگایا، خوب بنے سنورے اور بن ٹھن کر محبوب کے گھر چلے، درو دیوار پر نظر پڑتے ہی حواس گم، نظر سے آس پاس گم، گمان و قیاس گم، بڑی مشکل سے فجر کی نماز پڑھی۔ معلوم نہیں کیا پڑھا، جو منصوبے باندھ کر آئے تھے، سب دھرے کے دھرے رہ گئے۔ دل پھٹا جا رہا تھا، مگر آنکھوں میں آنسو نہ تھے، رونے اور چلانے کو جی چاہ رہا تھا مگر نفس گُم مبہوت حیران، ششدر اور پریشان، یہاں تک کہ لوگوں کی بھیڑ میں مواجہہ شریف پہنچا، اور خود کو وہاں پایا جہاں جبریلؑ کے پَر جلتے ہیں، اور جُنید و بایزید کے حواس باختہ ہو جاتے ہیں، سوچا یہ سب کیسے ہوا اور اعلی الحساب آنکھوں سے دریا اُمڈ آیا۔ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا ایک لفظ نہ کہہ سکا۔ مزوّر ساتھ تھا وہ سلام پڑھا تا تھا میں بھی پڑھتا تھا۔ وہ مقام پہ مقام دِکھاتا جاتا تھا، میں کچھ نہ سمجھ پاتا تھا، بڑی

مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا، اور بڑی دیر کے بعد تمہاری والدہ آئیں جس کو میں نے ایک مقام پر منتظر رہنے کو کہا تھا۔ وہاں گیا، اور اُسے پکڑ کر رحمتہ للعالمین کے سامنے کر دیا، اُس کی حالت بھی غیر ہوئی، پھر وہاں ٹھہرنا دشوار ہوا، اور ہم واپس آئے، مگر عالم یہی ہے کہ آنسو نہیں تھمتے۔ یہ خط لکھتے وقت بھی حالت غیر ہے۔ میرے عزیزو! میں کیا کہوں یہ کیا مقام ہے اور ہم کہاں ہیں، میرے لئے یہاں سے واپس جانا بہت مشکل ہے۔ میں ابھی اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا تھا کہ تم جاو حج کرو۔ عرفات منیٰ اور مزدلفہ میں مناسکِ حج ادا کرو میں یہاں انتظار کروں گا،

تو باش انجا و با خاصان بیامیز
کہ من دارم ہوائے منزل دوست

میرے لئے اس دنیا میں دلچسپی کا باعث اب کیا ہے، تم لوگوں کا ضامن تو خُدا اور اُس کا حبیبؐ ہے۔ میں نے ہوس کاری میں زندگی برباد کی، اب بھی یہاں نہ رہوں تو میرا ٹھکانا کہاں ہے

بہ این پیری رہِ یثرب گرفتم — نواخوان از نوائے عاشقانہ
چو آں مرغے کہ در صحرا سرِ شام — گشاید پر بفکرِ آشیانہ،

پرندہ سارا دن صحراوں اور میدانوں میں رزق تلاش کرنے میں وقت ضائع کرتا ہے، مگر شام ہوتے ہی آشیانے کی طرف پرواز کے لئے پر تولتا ہے۔ میں نے بھی زندگی کے دن تلاش روزگار میں ضائع کئے، دنیا طلبی میں برباد کئے۔ حصولِ مال کی ہوس میں تباہ کئے۔ اب شام ہوگئی ہے، تو کیا مجھے آشیانے اور رین بسیرے کی فکر نہ ہوگی، مجھے رین بسیرا ملا ہے، یقین جانو! جس طرح دُودھ

پیتے بچے کو ماں کی گود آغوشِ رحمت نظر آتی ہے، اسی طرح اس سیاہ کار کو سالہا سال کے بعد راحت کی منزل ملی ہے کہ یہ سامنے رحمتِ عالمؐ بیٹھے ہیں، اور میں تمہیں مخاطب کر کے لکھ رہا ہوں۔

یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مددگارم توئی

خفتہ ام در سایہ دیوار تو

یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم بخت بیدارم توئی

اک روسیاہ طالب سرمایہ نجات

سرمایہ نجات رسول صلی اللہ علیہ وسلم خُدا کی ذات،

صرف چند گھنٹے مدینے میں قیام ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پیدا ہوا یہیں جیا، اور انشاء اللہ یہیں مروں گا۔

میں موت چاہتا ہوں زمین حجاز میں

زمین حجاز میں بھی،

مرقدے در سایہ دیوار بخش،

مکہ میں خدا کا گھر ہے، مگر وہاں کی زمین سنگلاخ ہے، یہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا گھر ہے، اور یہاں کے دل نرم، آنکھیں نم، اور روحیں عرش پرواز ہیں، یہ مدینے والے کا گھر ہے۔ یہ رحمۃ للعالمین کا گھر ہے، یہ محمد مصطفےٰؐ کا گھر ہے جو میں نے مانگا تھا۔ اتنا دیا کہ مجھے اب شکوہ کوتاہیٔ داماں ہونے لگا ہے، میری روح، میرا بدن، میرا ایمان میرے ماں باپ، میری اولاد سب رسولؐ کے قدموں پر نثار، فیہہ العفاف وفیہہ الجود والکرم۔

پریشانی صرف یہی ہے کہ یہاں سے جاؤں کیسے۔ بہر حال دیکھئے

رحمت والے نے میرے لئے کیا فیصلہ کر رکھا ہے۔ مدینے میں زائرین سرکاری انتظام سے آتے ہیں اور آٹھ دن سے زیادہ ٹھہر نہیں سکتے۔ ہم نے سرکاری مواجبات ادا کئے اور اُن کی اجازت سے اپنے انتظام سے آئے۔ اس طرح ہم پر آٹھ دن کی پابندی نہیں۔ ہمارا ارادہ بیس بچیس دن ٹھہرنے کا ہے تاکہ جاتے ہی حج کے کام میں لگ جائیں اور مکہ میں زیادہ دن گذارنے کے بجائے رسول کے دیس میں رہنے کا شرف حاصل ہو۔ رسولؐ کے منبر و محراب کے درمیان ایک بورڈ لگا ہے۔ اس پر رسولؐ کی یہ حدیث ہے کہ ایمان مدینے والوں کی طرف اس طرح دوڑتا ہے جس طرح سانپ اپنے بل کی طرف دوڑتا ہے اور رسولؐ کے قدموں کی قسم، یہ واقعہ ہے کیا کہوں کیا لوگ ہیں، کیا شہر ہے۔

خاکِ یثرب از دو عالم خوشتر اَست
اے خنک شہرے کہ اَنجا دلبر اَست،

رسولؐ کے ساتھ جن لوگوں نے مکہ میں فوراً ایمان کی دولت کو قبول کیا تھا وہ سب کے سب حضورؐ کے ساتھ مدینے آئے، مکہ میں وہ مسلمان ہیں، جو فتح مکہ کے بعد ابوسفیان صاحب کے ساتھ مسلمان ہوئے، فرق ظاہر ہے اور اب تک موجود ہے،

یقین مانو ہماری راتیں شب براتیں، اور ہمارے دن عیدوں کے دن ہیں۔ میں نے اپنے رحمت والے آقا سے کہا کہ حضورؐ میرے تمام بچوں کو اپنی ملاقات کا شرف تو عطا فرمائیے۔ انشاء اللہ میری یہ دُعا قبول ہوئی، اور حضورؐ نے مان لیا۔ تم سب آؤ گے، سعید صاحب اور نادرہ اور اختر، ریاض صاحب

اور مسعودہ، فاروق صاحب اور بلقیس، طارق صاحب اور اختر اقبال صاحب، بلال صاحب ، ایاز صاحب، وقار صاحب اور ان کی بیویاں، میرے بھائیوں کے بچے خورشید صاحب بہنوں کے بچے اور دوسرے تمام متعلقین انشاءاللہ ضرور آئیں گے۔ اسلم صاحب، مشتاق صاحب آئیں گے حق صاحب اور بوبہ آئیں گی، سب آئیں گے، نہ آئیں گے تو کیا کریں گے، یہ تمام سیاہ کاروں اور تباہ حالوں کی جائے پناہ ہے،

من ہم از تو پناہ مے جویم

اے پناہِ من و پناہِ ہمہ،

مواجہہ شریف پر جانے کی جرأت ایک آدھ مرتبہ ہوئی۔ تمہاری والدہ بھی وہاں آئیں لیکن اس کے بعد ہم نے وہاں نہ جانے کا فیصلہ کیا ہے کس مُنہ سے جائیں اور یہ روسیاہ لے کر رسولؐ کے روبرو کیسے ہو جائیں۔ قدموں میں ہماری جائے پناہ ہے، اور وہاں لوگ بھی کم جاتے ہیں۔ وہیں رسولؐ کے عرش پیما قدم سیدّنا ابوبکر و عمر کے وہ قدم جو قدم بقدم رسولؐ کے نقشِ قدم پر چلتے رہے، ہمارے لئے پناہ ہیں۔ وہیں بی بی فاطمہ کا گھر ہے، جو سکون اور اطمینان کی جنّت المعلّےٰ ہے، اور وہیں دائیں طرف صفہ کے درویشوں کا وہ چبوترہ ہے جو رات اور دن رسولؐ کی زیارت سے فیضاب اور حضورؐ کے خوانِ کرم سے ریزہ چین رہتے تھے۔ یہ بڑے اطمینان کی جگہ ہے اور میں نے کل دیکھا عصر اور مغرب کے درمیان رسولؐ کے قدموں سے ایک بہشتی خوشبو نکلتی ہے، جو وہاں بیٹھنے والوں کو نہ معلوم کہاں پہنچا دیتی ہے۔ میں کیا کہوں یہ کونسا مقام ہے۔ سامنے رسولؐ محوِ خواب ہیں، میں نے

عرض کی تھی،

اے بسرا پردۂ یثرب بخواب
خیز، کہ شُد مشرق و مغرب خراب،
رسولؐ کے دہلیز پر نظر پڑی۔ لکھا دیکھا۔

روحی فدا لِقبرِ اَنتَ ساکِنہ،
فیہ العفاف وفیہ الجودُ و الکرم

میری روح اس قبر پر فدا جس میں آپؐ آسودہ خواب ہیں۔ اس قبر میں عفاف ہے، جود ہے اور کرم ہے کہ پائینتی میں بیٹھ کر مجھ پر جود و کرم کی بارش ہوئی، اور میں کل عشا کی نماز پڑھنے اصحابِ صفہ کی جگہ پر گیا۔ یہاں سامنے رسولؐ کی تہجد کی جگہ اور بی بی فاطمہ کے گھر کی دیوار ہے، اس پر کوفی خط میں یہ شعر درج ہے۔ اس کو پڑھنے میں مجھے کافی وقت لگا۔

سبحان اللہ اس ربِ والا صفات کا خالق تو رِب جمال ہے۔ اس کا مثیل مخلوقاتِ عالم ہیں کہاں ملتا ہے اور مل بھی کیسے سکتا ہے۔

عزیز فاروق نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ سرورِ کونینؐ کی خدمت میں اُن کیلئے کچھ مانگوں میں نے اپنے لئے اور تم سب کے لئے اس سے بہت زیادہ مانگا اور دینے والے نے مجھ پر کرم کیا اور اس سے زیادہ دیا۔

................☆☆☆................

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکہ مکرمہ،

یکم مارچ ۱۹۶۷ء

عزیز ارجمند

اسلام علیکم۔

آپ کا مفصل اور دلچسپ خط ملا اور کئی بار پڑھا۔ اللہ تعالےٰ تمام عزیزوں کو محفوظ رکھے۔ مدینہ منورّہ سے واپسی کے بعد دل بُجھ سا گیا ہے اور سوائے مدینہ کے اور کوئی نقش ذہن میں نہیں بیٹھتا، دُور تھا تو ایک تڑپ تھی، نزدیک آیا، تو ختم ہو گیا معلوم نہیں اب کیا کروں گا۔ سچ کہا دنیا کے بہت بڑے عاشق نے:

عالمِ سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق،
وصل میں مرگِ آرزو ہجر میں لذتِ طلب

اگر پھر ایک مرتبہ مدینے جانے کی کوئی صورت نہ نکل آئی تو زندگی چکی کا پاٹ بن کر گردن میں لٹک جائے گی اور دن کاٹنا حرام ہوگا۔ شاید مدینے والا میری اس صورت کو برداشت نہیں کرے گا،

وہاں سے ایک خط لکھ چکا ہوں ۔ واپسی پر ریاض صاحب، طارق صاحب، اقبال صاحب، سعید صاحب اور بلال صاحب اور ایاز صاحب کے خطوط ملے۔ سب کا جواب ایک ہی خط میں دے چکا ہوں، اس کے بعد شاید کچھ لکھنا ممکن نہیں۔ ایک توجّ کی تیاری کا کام ہے دوسرا میرا ذہن رات دن مدینے کے تصور میں محو رہتا ہے اور کچھ لکھا نہیں جاتا۔ آپ کو تفصیلی خط لکھنے کا

ارادہ تھا، مگر اب لکھنے کی ہمت نہیں ہے،

اللہ تعالےٰ سب کو اپنے امن وامان میں رکھے سعید صاحب کو الگ خط لکھ چکا ہوں، اس سے پہلے بھی لکھتا رہا ہوں مگر وہ کہتے ہیں اُنہیں کوئی خط نہیں ملا، اور سخت ناراض معلوم ہوتے ہیں، ظہیر کے ساتھ آپ کی ملاقات کا حال پڑھا، اور دل خوش ہوا، میں پہلے لکھا چکا ہوں کہ اُس کے جواب کا انتظار کیجئے، وہ جو کچھ تجویز کرے گا، اُس پر غور کریں گے۔ انشاء اللہ اللہ اور اس کا رسول ﷺ کوئی ایسی صورت نکالیں گے، جس میں ہماری بہتری ہوگی۔

اس خط سے آپ محظوظ نہیں ہوں گے کیونکہ میں خود تسلسل قایم نہیں رکھ سکتا معلوم نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے۔

اعلان کے مطابق ہم ۲۹/مارچ کو یہاں سے انشاء اللہ روانہ ہوں گے۔

اگر برادرم غلام محمد بیگ صاحب اور قاری سیف الدین صاحب ملیں تو انہیں میرا اسلام کہہ دیجئے اور اُن کے ذریعہ حکیم غلام نبی صاحب کو سلام بھجوا دیں۔ وہ لوگ انشاء اللہ دربارِ رسالت میں حاضر ہو جائیں گے۔ سب عزیزوں رشتہ داروں اور دوستوں کو سلام عرض کریں۔ والسلام

نیاز مند

غلام رسول نازکی

............☆★☆............

غلام احمد بُلبل کا خط۔ فاروق نازکی کے نام

لندن

12-11- 83

عزیزِ مکرم فاروق نازکی...... السلام علیکم ورحمتہ اللہ

برخوردار ہوتے ہوئے بھی آپ بابائے ''معلومات نشرواشاعت'' ہیں۔ اسی موزونیت سے آپ کے سپرد ایک اہم کام کرنے آیا ہوں۔ یہ کام آپنے اُسی رفتار سے کرنا ہے جس رفتار سے آپ کار چلاتے ہیں۔ آپ کی کار کے ٹائر کبھی کبھار پنکچر ہوجاتے ہیں۔ یا ان کے پہیوں سے ہوا نکل جاتی ہے (جیسا کہ بانڈی پور میں ہوا تھا) اور اگر اس اہم کام کے پہیوں سے ہوا نکل جائے تو دوبارہ بھروا دیجئے۔ پھٹ جائیں تو بدل دیجئے۔

کام کی نوعیت کیا ہوگی۔ یہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔ پہلے اس کام کا ''پسِ منظر'' بیان کرتا جاؤں۔

حفیظ جالندھری نے اپنے متعلق لکھا تھا۔

تشکیل و تکمیلِ فن میں جو بھی حفیظؔ کا حصہ ہے
یہ نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں

یہ شعر قبلہ نازکی صاحب پر سو فیصدی صادق آتا ہے۔ نازکی صاحب نصف صدی سے (بلکہ اس سے بھی زیادہ عرصے سے) آسمانِ ادب پر ایک درخشندہ ستارے کی طرح جگمگا رہے ہیں۔ انہوں نے شاعری کے گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کیا ہے۔ کشمیر کے مناظر پر ان کے اشعار لافانی ہیں صحافت۔ کالم نویسی۔ مزاح۔ فنِ تاریخ گوئی۔ اور ریڈیائی تقاریر کے محاذوں پر انہوں نے اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ اسوقت نازکی صاحب کشمیر کی ایک معتبر اور معزز ترین ادبی ہستی ہیں۔ علم وادب کے اس ڈل لیک میں شعروسخن کے سیاح کشتی بانی کرتے رہے ہیں اور اِسی لیکؔ سے ان کے شاگردوں کا دریائے جہلم بہہ نکلا ہے۔ نازکی صاحب اس وقت زندگی کی آخری منزلیں طے کررہے ہیں اور بقائے دوام کی دہلیز پر ہیں۔ میں نازکی صاحب کے فرزندوں۔ عزیزوں، شاگردوں، قدر دانوں اور مداحوں کی ترجمانی کرتے ہوئے یہ تجویز کرتا ہوں کہ ہم سب مل کر نازکی صاحب کی خدمت میں ایک یادگار ''نذرانۂ عقیدت''، ایک کتابی صورت میں پیش کریں، جو بقول صہبا لکھنوی آئندہ ادبی تاریخ کا حصہ بن جائے۔ اس کتاب میں سَو سے زیادہ اہلِ قلم (کشمیر اور بیرون کشمیر) کے مضامین۔ نظمیں اور تاثرات شامل ہوں گے۔ یہ کتاب کم سے کم ۵۰۰ صفحات پر مشتمل ہوگی اور زیادہ سے زیادہ ۸۰۰ صفحات پر۔ ہر عقیدتمند کا مضمون بڑے شوق سے چھاپا جائیگا۔ (ایڈیٹنگ کے بعد کم معیاری مضمون بھی معیاری بن سکتا ہے)۔ نازکی صاحب سے بھی درخواست کی جائیگی کہ وہ اپنے متعلق کچھ نہ کچھ لکھدیں اور اپنی زندگی کے تاریک گوشوں پر روشنی ڈالیں۔ مثلاً یہ کہ انہوں نے کسطرح تنگدستی کے زمانے میں بھی کھلے دِل سے اپنے عزیزوں کو پالا پوسا اور اعلیٰ تعلیم دلوادی۔ کاش اسوقت آپ کی والدہ محترمہ زندہ

ہوتیں۔ ناز کی صاحب کے متعلق اُن کے تاثرات ایک ''متاعِ بے بہا'' ہوتے۔

سنا ہے کہ سرینگر میں اسوقت تین چار ادبی رسالے چھپ رہے، آپ کے سپرد یہ کام کیا جارہا ہے کہ آپ کسی ایک ادبی رسالے سے رابطہ قائم کرتے ہیں اُس کو ''ناز کی نمبر'' چھپوانے پر آمادہ کرلیں۔ ''ناز کی نمبر'' کا اشتہار اس رسالے میں مسلسل چھپتا رہیگا۔ ابتدائی خرچ جو زیادہ نہیں ہوگا، اگر رسالہ برداشت نہ کرسکے تو ناز کی صاحب کے فرزند۔ شاگرد۔ مداح اور قدرداں خندہ پیشانی سے اپنے عطیات کے ذریعہ پورا کرلیں گے۔ اس نمبر کیلئے پرائیویٹ کمپنیوں، اداروں اور دکانداروں سے اشتہارات وصول کرنے کے انتظامات بھی کرنے ہوں گے۔ کتاب چھپنے کے بعد ساری آمدنی ''ناز کی نمبر'' چھاپنے والے رسالے کو جائیگی۔ صرف اہلِ قلم حضرات کو اس نمبر کی کاپیاں مفت دی جائیں گی۔ کوششیں کی جائیں گی کہ یہ کتاب سرکاری لائبریریوں کے لئے منظور ہوجائے۔ اس سے کتاب فروشی کا مسئلہ حل ہوجائیگا۔ رسالے کے ساتھ سب شرطیں طے کی جائیں گی...... قبل از وقت۔ یہ پروجیکٹ (منصوبہ)۔ ماہنامہ کراچی کے ''جوش نمبر'' اور حفیظ نمبر کی طرح کم از کم تین سال میں مکمل ہوگا اور یہ سارا کام، موزونیت کے لحاظ سے آپ کی نگرانی میں ہوگا۔ ہمارا قلمی اور مالی تعاون آپ کے ساتھ رہے گا۔ اس کارِ خیر میں اگر آپ کوئی بہانہ تراشنے کی کوشش کریں گے تو وہ قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ میں کشمیر میں ہوتا تو سارا ''بارِ امانت'' اپنے کندھوں پر اٹھالیتا۔ لندن میں اُردو کی کتابت کے وسائل موجود نہیں۔ اخباروں اور روزناموں کی کتابت باہر کی جاتی ہے۔ اسی لئے ایک چھوٹا سا کتابچہ چھاپنے کے لئے میں دو سال سے راولپنڈی اور لندن کے درمیان لٹک رہا ہوں۔

اس خط کی نقول میں عزیزاں طارق اور بلال کو بھیج رہا ہوں۔

اپنی بیگم صاحبہ تک میرا اور میری بیوی بچوں کا سلام پہنچا دیجئے۔

جواب کے لئے سراپا انتظار رہوں گا۔

نیاز آگیں

جی۔اے۔بلبل



ڈاکٹر ایاز رسول نازکی

ایک پرانی بیاض کے اَوراق

ابھی حال ہی میں یعنی قبلہ نازکی صاحب کی وفات کے لگ بھگ نو دس سال کے بعد ان کی ایک بہت پرانی بیاض کی بازیافت ہوئی ہے۔ یہ بیاض نازکی صاحب کے تیس (۱۹۳۰) کی دہائی تک کے کلام کا ایک انتخاب ہے۔ بیاض کا جو حصہ ہاتھ لگا ہے وہ صفحہ نمبر ۱۵ سے شروع ہو کر صفحہ نمبر ۱۱۲ پر ختم ہو جاتا ہے۔ بیچ میں دو اَوراق یعنی چار صفحے غائب ہیں۔ (صفحہ نمبر ۳۷، ۳۸، ۴۷ اور ۴۸) پہلے چودہ صفحات پر کیا تحریر تھا اس بات کا فیصلہ کرنا مشکل ہے مگر لگتا ہے کہ ان اَوراق پر شاعری کا انتخاب نہیں تھا کیوں کہ صفحہ نمبر ۱۸ پر نازکی صاحب نے انگریزی میں یہ سطور درج کی ہیں:

From page 19th, the selection of my poems is commenced. It is not all what is said by me, but this is the better portion of that, and that is the fact.

G.R. Nazki
Munshi Fazil
Madar Village, P.O. Bandipora, Kmr.

اسی صفحے پر "تقریظہ از نیاز کامراجی۔ بمقام مظفر آباد" تحریر کی گئی ہے۔ یہ نازکی صاحب کے ہاتھ کی لکھی تحریر سے مختلف ہے اور بظاہر خود نیاز کامراجی صاحب نے اپنے ہاتھ سے مسودہ پڑھنے کے بعد تحریر فرمائی ہے۔ اس تقریظہ کا پورا متن یوں ہے:

؎ تیری فرقت نے مرے پیارے ہلالِ شامِ عید
میرے حق میں آفتابِ صبحِ محشر کر دیا

نازکی

پیارے نازکی شکر بدہانت:۔ اس مسافرِ حزیں کے دل کی کلی آپ نے اس غمزدگی کے عالم میں کھلادی۔ میں شاعری سے توبہ کرچکا تھا اور چاہتا تھا کہ عمر بھر اس سودائے خام پختن سے باز رہوں۔ مگر تڑپ گیا ہوں۔ یہ شعر آپ کی بیاض میں دیکھ کر پھڑک گیا ہوں۔ اے نارمنڈی کے رہنے والے میرے ہمنوا! سراسر بینوا ہو۔ مگر یہ درد بھرا دل کہاں سے لائے ہو۔ کہ طبیعت عش عش کر رہی ہے۔ تکیہ سنگ کار کھنے والے۔ بستر اٹاٹ کا۔ کمبل کا کلاہ اور چادری تمام دنیا کے روغنیات سے بسی ہوئی اوڑھنے والے۔ مجھے آپ کی طبیعت وحشت زا سے اتنی امید نہ تھی۔ کیوں کہ یہ تمام باتیں رنگین طبیعت کے خلاف ہیں۔ مگر کسی استاد کا کلام ہے۔ ؎

ناراستی بھی حُسن ہے اپنے مقام پر
کاکل کا اور حسن بڑھا پیچ و تاب میں

قسم بخدا اِس پایے کا کوئی شعر میں نے آج تک تصنیف نہیں کیا۔ اور اپنی بے مائیگی پر بہت شرمندہ ہوں۔ اپنی توبہ توڑتا ہوں اور آئندہ کیلئے میدانِ رشک

میں قدم رکھتا ہوں۔ خدا مجھے تمہاری سبز بہار دکھائے۔ آمین

دیکھو بھئی دردِ دل بڑی دولت ہے۔ انسان کو کیمیا بنادیتی ہے، مگر ناپاک خواہش اچھی نہیں ہوا کرتی۔ جس پر انسان گرکر دین ودنیا سے جاتا ہے۔ دیکھو خدا نے اس کی شکل بہت بری بنائی ہے کہ دیکھنے کو دل نہیں کرتا۔ پھر روحانی جذبات فنا کرنے اور چوں مگس غرق انگبیں ہونے سے کیا فائدہ۔ امید ہے کہ آپ نیچرل سینریوں سے کاریگرِ حقیقی کی پہچان حاصل کریں گے۔ اور نظارہ حسن سے اپنا دردِ دل بڑھائیں گے، نہ کہ کسی غلط راستے پر پڑ کر اپنے پاؤں کلہاڑا ماریں گے .... آئندہ احتیاط۔ نیاز اپنے دیوانہ کو وہ نہ جانو جو تم دیکھ رہے ہو بلکہ اس کا کہا مانو اور اعتبار کرو کہ وہ کچھ اور ہی درد کی پڑیا ہے۔ جس پر دنیا بارِ گراں ہے۔

آپ کا صادق

نیاز کامراجی

یہ تو ہوا صفحہ نمبر ۱۸۔ صفحہ ۱۷ پر کچھ صورت حساب درج ہے، صفحہ نمبر ۱۶ خالی ہے اور صفحہ نمبر ۱۵ پر اوپر دو سطور میں صورتِ حساب خواجہ خیرہ جو صاحب درج کیا گیا ہے۔ مگر اس کے نیچے ایک خط تحریر ہے، جو حضرت محترم ' مخدوم بندہ۔ مدظلہ تعالیٰ' اور پھر السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہٗ ، سے شروع ہوتا ہے، خط کا پورے کا پورا متن موجود نہیں لیکن جتنا بھی ہے کافی دلچسپ ہے اور تحریر کے متن سے یہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ حضرت محترم مخدوم بندہ' کی ذات دراصل خواجہ غلام السیدین ناظمِ تعلیمات حکومت جموں وکشمیر سے مراد ہے، جہاں اس خط کے ذریعے خود کو خواجہ صاحب سے متعارف کرانا مقصد رہا ہے وہاں خواجہ صاحب کے بارے میں بھی کئی باتیں سامنے آجاتی ہیں۔ نامکمل خط کا متن یوں درج ہے:

"قبل اس کے کہ اصل مدعا کی طرف جناب کو متوجہ کروں میں ضروری سمجھتا ہوں کہ جناب کو اپنی ناچیز ذات سے مختصر طور پر روشناس کرالوں جو میرے لئے دوگونہ اعزاز اور فخر کا موجب ہوگا۔

میں ریاست کشمیر کے دارالخلافہ سرینگر سے ۳۵ میل کے فاصلہ پر ایک گمنام گاؤں یعنی بانڈی پورہ (کاغذ ضائع ہوگیا) ہوں۔ مجھے حضرت میر نازک قادریؒ کے نام لیواؤں سے نسبت کا فخر حاصل ہے۔ میرے والدِ مرحوم علم وادب کے دلدادہ اور مشرقی وضع کے مکمل انسان تھے۔ انہوں نے رواج زمانہ کے مطابق میری تعلیم کی ابتداء قرآنِ پاک اور حدیثِ نبویؐ سے کراکر مجھے فارسی تعلیم سے روشناس کرایا اور رنگ زمانہ سے متاثر ہوکر اپنی استعداد کے مطابق مجھے مڈل تک مروّجہ تعلیم بھی دلوادی۔ اس کے بعد میرے ذاتی شوق نے مجھے خاموش نہ رہنے دیا اور میں نے الترتیب امتحانات انٹرنس، منشی فاضل اور ادیب فاضل پاس کرلئے۔ اس اجمال کی تفصیل بتانے سے میرا مطلب یہ ہے کہ میں آج تک علمی اور ادبی ماحول کس قدر بیگانہ...... یوں تو کشمیر بھر میں وہ لوازم ناپید ہیں جن سے کشمیر کے دارالخلافت پر بھی ادبی یا علمی مرکز کا اطلاق ہوسکے۔ گو زمانہ قدیم میں کشمیر نے غنی جیسے شاعر اور کلہن جیسے مورّخ پیدا کئے لیکن وہ قدردانی کا زمانہ اور تھا۔ گھر گھر علم وفضل کی گنگا بہہ رہی تھی۔ لیکن اب صدہا برس کے جمود وتعطل نے جس طرح ہمارے خدوخال مسخ کردیئے اس کی نسبت جناب کے سامنے کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے۔

مجھے یاد ہے کہ گزشتہ دنوں جب جناب والا نے مجھے Basic School کی اردو مدرسی کے سلسلہ میں انٹرویو پر بلائے جانے کا شرف بخشا تھا۔

جناب کا ایک سوال تھا کہ کیا وجہ ہے کشمیر میں تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ لوگوں کے تلفّظ کی خرابی نے ایک عمومی صورت اختیار کر لی ہے۔ ان حالات کے تحت کشمیر کی سرزمین سے کسی ادیب، شاعر یا مصنّف کا پیدا ہونا یقیناً حیران کن ہے۔ اور اس سنگلاخ زمین سے کسی ایک شگوفہ کا پھوٹنا ممکن اگر نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ بہر حال میرا علمی شغف گزشتہ سات آٹھ سال سے شروع ہوتا ہے۔ کسی نامور استاد نے مجھے اپنی شاگردی میں لینے کا شرف نہ بخشا۔ ذاتی شوق نے خضرِ راہ بن کر مجھے اس لق و دق بیاباں میں ڈال دیا جہاں میں آج گزشتہ آٹھ سال سے بادیہ پیمائی کر رہا ہوں اور اس کد و کاوش...... ''

....خط یہاں پر آ کر رُک جاتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ جو آغاز کے ۱۴ صفحات غائب ہیں ان ہی میں کہیں اس خط کو مکمل کیا گیا ہو۔ بہر کیف اس خط کا جتنا بھی متن بچ گیا اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ خواجہ غلام السیّدین نے اُوائل میں ہی نازکی صاحب میں جوہرِ قابل دیکھا تھا اور انٹرویو کے دوران ان کے کلمات کا حوالہ دے کر نازکی صاحب نے اس رشتے کا آغاز ہمارے سامنے رکھ دیا جو آنے والے دنوں میں نازکی صاحب اور خواجہ غلام السیّدین کے درمیان قائم ہونے والا تھا اور جس کے بارے میں تفصیلات ویسے بھی شائع ہوئی ہیں۔

صفحہ نمبر ۱۹ سے بیاض کا آغاز ہو جاتا ہے، اس میں غزلیں، نظمیں، قطعات، تینوں اصناف میں نازکی صاحب کی تخلیقات موجود ہیں، نعت اور مناجات کی تعداد تین ہے جب کہ غزلیں لگ بھگ پچاس ہیں اور نظمیں، چھوٹی نظمیں، اور قطعات کل ملا کر ساٹھ کے قریب ہیں۔ تین چار نگارشات فارسی میں ہیں، ساری کی ساری بیاض نازکی صاحب کے اپنے ہاتھ سے لکھی

ہوئی ہے اور بیشتر مقامات پر اندراج کے ساتھ تخلیق ہونے کا سال بکرمی میں لکھا گیا ہے۔ سال کے حساب سے اوّلین تخلیق ۱۹۸۲ اور آخری تخلیق ۱۹۹۴ بکرمی کی ہے۔ اس طرح یہ بیاض لگ بھگ دس بارہ سال کی شاعری کے انتخاب پر مشتمل ہے۔ اس بیاض میں شامل غزلیات اور منظومات میں سے بہت کم نازکی صاحب کی ۱۹۴۸ء میں شائع ہوئی پہلی کتاب 'دیدۂ تر' میں شامل ہوئیں۔ ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے ۱۹۴۸ء میں دیدۂ تر کو ترتیب دیتے وقت نہایت ہی کڑا انتخاب کیا تھا اور کئی ایک معیاری چیزیں بھی دیدۂ تر میں شامل ہونے سے رہ گئیں۔ دوسرے یہ بھی ممکن ہے کہ دیدۂ تر کی بیشتر شاعری ۱۹۳۸ء کے بعد کی شاعری پر مشتمل تھی۔ بہرکیف چند مشہور نگارشات جو دیدۂ تر میں بھی شامل ہوئیں اور اس بیاض میں بھی موجود ہیں، گنتی کی ہیں اور ان میں 'ایک اندھی لڑکی دعا' 'گڈریا'، 'بانگِ درا' کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ اس بیاض کو سامنے رکھ کر بھی ایک انتخاب ترتیب دیا گیا تھا اور جابجا غزلوں اور نظموں کے ساتھ کسی نے entered رقم کیا ہے اور آخر پر نازکی صاحب نے اپنے قلم سے پھر ایک بار انگریزی میں درج کیا ہے۔

All the selected poems have been re-written in another book. That has been received by Khwaja Ghulam-u Sayidin, MA, M.Ed, Dircetor Education J&K and now sent to theAdabi Duniya Lahore.

اسی تحریر کے بالکل ساتھ میں ایک اور اندراج ہے،

The selected poems entered in another bayaz named " Rash-hati-takhayyul"

یہاں پر تاریخ بھی ڈال دی گئی ہے، 18-8-95۔ ظاہر ہے یہ تاریخ

بکرمی ہے جو عیسوی کے حساب سے 30-11-1938 ہے۔

بیاض میں شامل غزلوں اور نظموں پر جا بجا مطبوعہ بھی لکھدیا گیا ہے، اور کئی ایک مقام پر مطبوعہ کے ساتھ رسالے یا اخبار کا نام بھی ہے اور کبھی کبھار تاریخ بھی درج کی گئی ہے۔ تاریخ کے اعتبار سے سب سے اوّلین تخلیق جو اِس بیاض میں شامل ہے ۱۹۸۲ بکرمی میں لکھی گئی غزل ہے۔ یہ عیسوی کے حساب سے لگ بھگ ۱۹۲۶ بنتا ہے، پس یہ غزل جب لکھی گئی تب نازکی صاحب کی عمر سولہ سال کی تھی کیوں کہ ان کی پیدائش ۱۹۱۰ء کی ہے۔ اسی سال میں وہ مدّرس بھی ہو گئے تھے تو کہا جاسکتا ہے کہ یہ غزل ان کی اوّلین غزل ہے۔ غزل کے پانچ اشعار میں دوسرے شعر کا دوسرا مصرعہ پڑھا نہیں جاتا۔ غزل یوں ہے

۱۔

دل تڑپتا ہے ترے ہی عشق میں اے نازنیں
گرچہ دنیا میں بہت سارے ہیں تجھ سے مہ جبیں

۲۔

لو لگی ہے مجھ کو تیرے عشق کی روزِ ازل
....

۳۔

ہے تمنا دیکھ لوں تجھ کو کسی دم خوش خصال
ہر گھڑی ہو منہ چڑھے ماتھے پہ بل ابرو پہ چیں

۴۔

تن بدن میں لگ رہی ہے روز و شب اِک آگ سی
جب سے مجھ سے دور ہے اس بت کا روئے آتشیں

۵۔

خوش رہو نازکؔ کہ ہے نزدیک وصلِ دلربا
لیکن کہہ دو ان یشاء اللہ رب العالمین

یہ بیاض لگ بھگ ۱۹۳۸ء تک کہے گئے کلام کا انتخاب ہے۔ ۱۹۳۸ء میں نازکی صاحب کی عمر ۲۸ سال کی تھی۔ بظاہر یہ سارا کلام نہایت ہی کم عمری کا ہے اور اس میں فنّی اور فکری پختگی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ مگر حیران کن بات یہ ہے کہ لگ بھگ سوسوا سو چھوٹی بڑی نگارشات میں کہیں ایک آدھ جگہ بھی بحر اور اوزان کے مسائل نظر نہیں آتے۔ اس لحاظ سے نازکی صاحب کی ابتدائی کاوشیں بھی خامیوں سے پاک ہیں اور جیسا کہ بعد کے دِنوں میں نواب جعفر علی خان اثرؔ لکھنوی نے 'جوارُدو زبان کے اسرار و رموز سے نہ صرف واقف ہی تھے بلکہ استادانہ نظر بھی رکھتے تھے کہا تھا کہ ''کلامِ نازکی اغلاط سے پاک ہوتا ہے''۔ بہر کیف نازکی صاحب کے اِن ابتدائی ایام کی شاعری میں فنی اعتبار سے جو پختگی اور مہارت نظر آتی ہے، ہو نہ ہو، یہ ان کے فارسی شاعری سے بچپن کے دنوں سے ہی متعارف ہونے سے پیدا ہوئی ہو۔ انہوں نے اپنے بچپن کے ابتدائی ایام میں ہی خمسہ نظامی از بر کیا تھا، وہ دس سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے اپنے والدِ محترم کے سامنے بیٹھے بیٹھے لگ بھگ فارغ التحصیل ہو گئے تھے۔ رومیؒ، سعدیؒ اور دوسرے اساتذہ کے کلام کے ساتھ وہ ان ہی ایام میں پوری طرح مانوس تھے اور فارسی شاعری اور ادب کے ساتھ ان کا عشق ساری زندگی باقی رہا۔ مجھے یاد ہے اُسی (۸۰) کے عشرے کے دوران ایک بار ایران سے ایرانی سفارت خانے اور ایرانی ٹیلی ویژن کے کچھ لوگ کشمیر آئے اور نازکی صاحب سے بھی ملاقی ہوئے۔ مجھے پوری طرح یاد ہے کہ اس ٹیم کے سربراہ نے جاتے جاتے اعتراف کیا کہ نازکی

صاحب جیسا فارسی علم وادب جاننے والا شخص شاید اُس وقت کے ایران میں بھی موجود نہیں تھا۔ انہوں نے اپنے ابتدائی ایام میں فارسی شاعری سے ہی آغاز کیا تھا مگر جیسا کہ انہوں نے خود کئی مرتبہ اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ جب وہ سولہ سال کی عمر میں مدّرس کے عہدے پر تعینات ہوئے اور وڈی پورہ ہندوارہ کے پرائمری سکول کے لنگویج ٹیچر بنائے گئے تو وہاں انہوں نے سکول کی چھوٹی سی لائبریری میں کئی اردو کی کتابیں پائیں جن میں محمد حسین آزاد کی آبِ حیات بھی تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ 'آبِ حیات' نے انہیں اردو زبان کی چاشنی سے متعارف کرایا اور یہ کتاب انہوں نے مزے لے لے کے بار بار پڑھی۔ یہاں سے ہی یعنی سولہ یا سترہ سال کی عمر سے ہی نازکی صاحب کے اردو زبان وادب کے ساتھ رشتے استوار ہونے لگے۔ زیرِ نظر بیاض ان ہی ابتدائی ایام کی بیاض ہے۔ یعنی وڈی پورہ سکول میں 'آبِ حیات' کے ساتھ جو اردو کا دور شروع ہوا، اس کے ابتدائی دس بارہ سال کے کلام کا انتخاب ہمارے سامنے ہے۔ اس دور کا بیشتر حصہ نازکی صاحب نے اپنے گاؤں ماڈر بانڈی پورہ میں گزارا۔ کچھ عرصہ وہ وڈی پورہ ہندوارہ میں رہے اور پھر سال بھر مظفر آباد میں ٹیچرس ٹریننگ سکول میں تربیّت کے دوران بھی قیام رہا۔ کچھ عرصہ مڈل سکول بانڈی پورہ میں بھی تعینات رہے، مظفر آباد کے قیام کے دوران جو غالباً ۱۹۳۲ء ہے، انہوں نے اس بیاض میں شامل کئی منظومات تحریر کی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ مظفر آباد میں قیام کے دوران گھر سے دوری، اپنوں کی فرقت کے علاوہ اس بات سے بھی پریشان تھے کہ یہ کورس جو تب تک ایک سال کا ہوا کرتا تھا، اب کی بار دو سال کا کر دیا گیا تھا۔ پہلے با تنخواہ ہوتا تھا، اب کی بار بِلا اجرت کر دیا گیا تھا۔ انسپکٹر مدارس کے نام ایک اپیل مظفر

آباد میں ہی لکھی گئی اور وہاں کے موسم، ماحول اور دیگر وجوہات کا ذکر کیا گیا اور گزارش کی گئی کہ ٹریننگ کلاس کو سوپور منتقل کیا جائے اور ایک سال کا ہی رہنے دیا جائے۔ بات بڑی ہی دلچسپ پیرائے میں کہی گئی...... ملاحظہ ہو:

انسپکٹر مدراس کے نام اپیل

حدتِ آب وہوا حرِ تموزِ آفتاب — دیگدانِ اندروں را جوش آرد سرسری
پوچھتے حالِ زبوں ہو ماسٹر صاحب کا کیا — کیا کریں گے دس روپیہ میں وہ اپنی بہتری
شدتِ گرمی کوہِ خشک و کشمیری نژاد — وائے ایسی زندگی اے وائے یو ایل ٹیچرس
کیا کرے لنکا کا باشندہ عرب کی ریت میں — کیا کرے صحرا میں کوہ قاف کی نیلم پری
اے سکولوں کے انسپکٹر زبس شوقِ تمام — خوشہ چینی کر رہی ہے آپ سے دانشوری
کیجیے سوپور میں تبدیل اب ٹریننگ کلاس — آپ کو اللہ دے دونوں جہاں میں برتری
اور بھی اک التجا ہے کیجیے اس کو قبول — کیجیے دو سال کی تکلیف سے ہم کو بری
امتحاں ایل پی کا اس کے سامنے کیا چیز ہے — جو رہا ہو فارسی اردو میں میر وانوری
اسکے بدلے ہم دعا کرتے رہیں گے روز و شب — آپ کو تفویض ہو تعلیم کی ڈائریکٹری

التماس اس واسطے کرتے ہیں تم سے ہم اسیر
قدرِ زر زرگر بداند، قدرِ جوہر جوہری

نازکی صاحب نے فارسی اور عربی کی تعلیم اپنے والدِ محترم میر غلام مصطفیٰ نازکی سے حاصل کی اور وہ نازکی صاحب کے کہنے کے مطابق "علم وادب کے دلدادہ اور مشرقی وضع کے مکمل انسان تھے"۔ اپنے والد صاحب سے تلامذہ حاصل کرنے کے علاوہ اس زمانے کے بانڈی پورہ پر اگر نظر ڈالیں تو نازکی صاحب کے اپنے ہمعصرین اور بعد میں شاگردوں میں کئی ایک نام سامنے آتے ہیں اور

اس بیاض کے تعلق سے بھی ان حضرات کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ نجم الدین دیوانی عشرتؔ نازکی صاحب کے ہم عمر بھی تھے، ہم عصر بھی تھے اور کہتے ہیں کہ ان کے ساتھ نازکی صاحب کی معاصرانہ چشمک بھی رہتی تھی۔ مگر دونوں حضرات ایک دوسرے کا بے حد احترام کرتے تھے۔ عشرتؔ خود بہت پڑھے لکھے صاحب تھے، محکمہ تعلیم سے وابستہ رہے اور ساری زندگی اپنے آبائی گاؤں کونن بانڈی پورہ میں گزاری۔ اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ نہیں کر پائے۔ عشرتؔ مظفر آباد میں نازکی صاحب کے ہم پیالہ وہم نوالہ رہے۔ اس بات کا اظہار ایک غزل میں کیا گیا جو مظفر آباد میں کہی گئی۔

گن رہا ہوں ہجر میں گردوں کے تارے رات بھر
مجھ کو تجھ بن نیند بھی آئی نہ پیارے رات بھر

لوگ سوتے ہیں ہم آغوشوں کو لے آغوش میں
ہم پلک جھپتے نہیں فرقت کے مارے رات بھر

نازکی جن کے گلے میں بندگی کا طوق ہے
وہ اسی رحمت میں ہیں سارے کے سارے رات بھر

دیکھ لو ان میں سے حال عشرتؔ و مسٹر قدیر
وہ بھی آہ و نالہ کرتے ہیں بچارے رات بھر

اے غم و رنج والم کے ہم نشیں آ بیٹھ جا
نغمہ سن لیں کشن گنگا کے کنارے رات بھر

۱۷۸۸ بکرمی

عشرتؔ کے ساتھ جو مسٹر قدیر ہیں وہ دراصل علاقہ بانڈی پورہ کے مشہور ومعروف استاد عبدالقدیر فاضلی مرحوم ہیں۔ قدیر صاحب کا نازکی صاحب کی سسرال سے تعلق تھا۔ گامرو بانڈی پورہ کے رہنے والے تھے اور عوام الناس میں سماجی شعور جگانے میں بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ لگ بھگ ایک سو سال کی عمر پائی۔ علی محمد کنولؔ بھی فاضلی خاندان سے تھے۔ نازکی صاحب سے عمر میں چھوٹے تھے۔ تقسیم کے وقت مسلم کانفرنس کے حامی ہونے کی پاداش میں مظفر آباد میں پناہ

لینے پر مجبور ہو گئے۔ تمام عمر وہیں کٹی۔ سیاست میں سرگرم رہے اور کچھ سال پہلے مظفر آباد میں ہی کشمیر لوٹنے کی حسرت دل میں لئے اس جہاں سے رخصت ہو گئے۔ راقم الحروف کے ساتھ ۲۰۰۰ عیسوی میں مظفر آباد میں کئی ملاقاتیں رہیں۔ نازکی صاحب کا بے حد احترام کرتے تھے اور ان کی شفقت کا ذکر کرتے نہیں تھکتے۔ ایک واقعہ جو انہوں نے بار بار دہرایا تھا وہ یوں تھا کہ ایک دن نازکی صاحب بانڈی پورہ مڈل سکول سے اپنے گھر ماڈر آرہے تھے۔ راستے میں کہیں پر کچھ لڑکے جن میں علی محمد کنول کو بلایا اور کہا 'فٹ بال ننگے پیروں نہیں کھیلتے۔ یہ لو میں نے تمہارے لئے فٹ بال کھیلنے کے جوتے لائے ہیں۔ بانڈی پورہ میں نازکی صاحب کے دو اور شعراء معاصرین میں مادھو جو رینہ زار اور وید لال راز کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ یہ دونوں حضرات شعر و ادب پر خاصی نظر رکھتے تھے۔ اس علاقے میں شاعروں اور ادیبوں کی کہکشاں میں ایک اور چمکتا ستارہ علامہ غلام احمد کشفیؔ کے نام سے جانا جاتا تھا۔ کشفیؔ شاعر نہیں تھے مگر بحیثیت صحافی پہلے کشمیر اور بعد میں پاکستان میں اپنا لوہا منوا چکے۔ کشفیؔ خدمت کے ایڈیٹر ہوا کرتے تھے اور ایک دلچسپ واقعہ سننے میں آتا ہے کہ نازکی صاحب کے شاگردِ رشید غلام علی بلبلؔ نے خدمت کیلئے ایک مضمون قلم بند کیا "میں مرنا نہیں چاہتا"۔ اس کے جواب میں تنہا انصاری نے جو خود نازکی صاحب کے حلقۂ احباب میں تھے جواباً ایک مضمون لکھ ڈالا۔ "میں مرنا چاہتا ہوں"۔ اس کے شائع ہوتے ہی نازکی صاحب کے شاگرد رشید غلام علی بُلبُلؔ نے اس کے جواب میں ایک اور مضمون تحریر کیا جس کا عنوان تھا "آپ مر کیوں نہیں جاتے؟" آخر کار کشفیؔ کو خود اس میدان میں کودنا پڑا اور انہوں نے اپنے اس مضمون سے یہ بحث بند کرادی جس عنوان تھا "چند دوست

موت وحیات کی کشمکش میں''۔ کشفی صاحب کے صاحبزادے مسعود کشفی ۲۰۰۰ء میں مظفر آباد میں ریڈیو کے ڈائریکٹر تھے۔ ایک ملاقات کے دوران انہوں نے انکشاف کیا تھا کہ علامہ کشفی کی خودنوشت سوانح حیات (جو تب تک غیر مطبوعہ تھی) میں کشفی اور ناز کی صاحب کے تعلقات اور اس زمانے کی نسبت کافی معلومات تحریر کی گئی ہیں۔

ابتدائی ایام میں ہی ناز کی صاحب کا ایک چھوٹا سا مجموعہ 'نزاکت' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس کا پیشِ لفظ نند لال کول طالبؔ نے لکھا تھا۔ اس کی کوئی کاپی کہیں دستیاب نہیں ہو سکی۔ اس ابتدائی دَور میں جس شخصیّت نے ناز کی صاحب کے فنِ شعر پر سب سے زیادہ اثرات مرتّب کیے وہ تھے ملک محی الدین قمرؔ۔ قمرؔ ناز کی صاحب سے عمر میں بڑے تھے۔ محکمہ مال میں اس زمانے میں تحصیلدار کے عہدۂ جلیلہ پر فائز تھے۔ اصل میں ہندوارہ کے رہنے والے تھے مگر ناز کی صاحب کے گاؤں ماڈر میں ایک باغ خریدا تھا۔ ایک خوبصورت مکان بنوایا تھا اور کبھی کبھار وہاں آ کر رہ لیتے تھے۔ کہتے ہیں کہ اس زمانے میں علاقہ بانڈی پورہ میں صرف قمرؔ کی ہی اپنی موٹر کار ہوتی تھی۔ قمرؔ کی یاری دوستی کا سلسلہ بھی دور دراز تک تھا اور ان کے حلقۂ احباب میں سید ضمیر جعفری بھی شامل تھے اور قمرؔ کی ہی دعوت پر سیّد ضمیر جعفری ناز کی صاحب کے گاؤں ماڈر بانڈی پورہ تشریف لائے تھے۔ ناز کی صاحب کے ساتھ ان کی ملاقاتیں رہیں اور ان ہی کا نتیجہ وہ خوبصورت نظم تھی جو دیدۂ تر میں شامل ہوئی اور جس کا عنوان ہے "سید ضمیر جعفری۔ ملاقاتِ اوّل کے تاثرات"۔ وقت نے کروٹ لی۔ ملک محی الدین قمرؔ پاکستان چلے گئے۔ ٹھاٹھ باٹھ جاتا رہا اور نسبتاً کم خوشگوار حالات میں زندگی کٹ

گئی۔ ان کی اولاد آج کل کہاں ہے، اس بارے میں کچھ علم نہیں۔ قمرؔ کا تذکرہ اس بیاض میں اس پیرائے میں آیا ہے۔

صفحہ نمبر ۶۸

غزل:۔

جناب ملک محی الدین احمد صاحب قمرؔ سب ڈویژنل مجسٹریٹ ہو کر استور جا رہے تھے۔ رات انہوں نے ماڈر میں قیام فرمایا۔ منجملہ دیگر لاجواب کلام کے انہوں نے ایک پھڑکتا ہوا شعر بھی سنایا اور وہی شعر اس غزل کے لکھنے کا موجب بنا۔ شعر یہ ہے

دلکش نہ تھی حسیں نہ تھی نازنیں نہ تھی
بخت سیاہ قیس تھا لیلیٰ کہیں جسے

قمرؔ

لطفِ شبِ وصال ہے جینا کہیں جسے — روز فراق یار ہے مرنا کہیں جسے
وہ کوچہ نگار ہے بس کوچہ نگار — جائے پناہ وملجا و ماویٰ کہیں جسے
اہلِ نظر کے دل میں ہے راسخ یہ اعتقاد — اک خوشنما فریب ہے دنیا کہیں جسے
خواب وخیال ہے جسے کہتے ہیں ہم وصال — مکرو فریب وعدہ فردا کہیں جسے
رفتارِ یار ہے جسے کہتے ہیں سلسبیل — اور قامت نگار ہے طوبیٰ کہیں جسے
لطفِ خدائے پاک کسی کی نگاہ ناز — قہرِ خدا ہے قامتِ زیبا کہیں جسے
کچھ بھی نہیں ہے عکس عذار گلاب پاش — باغِ نشاط کا گلِ رعنا کہیں جسے
اے ہم نشیں نہ پوچھ مرے ضعف دل کا حال — ہے دل پہ بوجھ خال سویدا کہیں جسے
ہے ابتدائے عشق ہوس جس کا نام ہے — دیوانگی کی حد ہے تمنا کہیں جسے

اپنا ہے نازکی یہ عقیدہ کہ دہر میں

....

بھادون ۱۹۹۴ بکرمی

نازکی صاحب اور سید ضمیر جعفری کی ملاقات اوّل لگ بھگ پچاس سال کے بعد لندن میں ملاقات دوم تک پہنچ گئی۔ جب نازکی صاحب ......۱۹ میں لندن تشریف لے گئے تو ان سے ملنے والوں میں سید ضمیر جعفری بھی تھے۔ سید صاحب نے نازکی کی ایک غزل 'زندگی معمول پر آئی ہے ہڑتالوں کے بعد' اپنے مجلّے میں شائع کی۔ ان کے اعزاز میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا جس میں ضمیر جعفری کے علاوہ ان دو اصحاب کی درمیان محفوظ ایک کڑی یعنی شیخ غلام علی بلبلؔ بھی موجود تھے۔ شیخ غلام علی بلبلؔ علاقہ بانڈی پورہ کے ایک باغ و بہار شخص تھے جو آگے چل کر اردو مزاحیہ شاعری میں ایک منفرد مقام پانے والے تھے۔ نازکی صاحب کے شاگردوں میں اوّل یا دوم نمبر پر رہنے والے دوسرے صاحب تھے غلام محمد میر طاؤسؔ۔ بلبلؔ بھی چونکہ تقسیم کے بعد پاکستان کے ہو گئے اس لئے نازکی صاحب کے ساتھ ان کے روابط نہیں رہ پائے مگر انہوں نے اپنے شعری مجموعے میں نازکی صاحب یعنی استادِ محترم کا تفصیلی ذکر کیا اور بلبلؔ اور طاؤسؔ تخلص چُنے جانے کا واقعہ بھی بیان کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک بار ہم یعنی طاؤسؔ اور بلبلؔ نازکی صاحب کے منتظر تھے۔ جوں ہی وہ آئے انہوں نے علامہؒ اقبالؔ کا یہ شعر پڑھا۔

کر اِن دونوں کی تقلید سے توبہ

بلبل فقط آواز ہے، طاؤس فقط رنگ

اور وہیں پر غلام محمد میر، طاؤس ہو گئے اور شیخ غلام علی، نے اپنے لئے بلبلؔ تخلص قبول کیا۔ طاؤسؔ اور بلبلؔ دونوں کے ساتھ نازکی صاحب کے مشفقانہ

اور برادرانہ تعلقات تھے۔ بلبلؔ کے نام ان کی ایک نظم اس بیاض میں بھی موجود ہے۔ نظم یوں ہے:

۱۱ بھاون ۱۹۹۳ بکرمی

شکوۂ یار

مجھ سے کیا تقصیر سرزد ہوگئی	بندہ پرور ظلم کی حد ہوگئی
ڈاکئے کا راستہ کب تک تکوں	تو ہی کہہ دے صبر کتنا کرسکوں
اس سے پہلے یہ تری عادت نہ تھی	کیا میں سمجھوں آپ کو الفت* نہ تھی
بہہ گئے طوفان موج ورنگ میں	جلوۂ حُسن و سرودو چنگ میں
منتظر رہتا ہوں ہر دم ڈاک کا	صبر رخصت ہے دلِ صد چاک کا
دل کو دیتا ہوں تسلی کہہ کے جھوٹ	کیوں لیا تو نے متاعِ صبرلوٹ
رحم فرما میرے حالِ زار پر	میری جانب کر محبت کی نظر
ایک خط لکھ کر مجھے دل شاد کر	میرے ویراں خانے کو آباد کر

نازکی دیدم نثار بلبل است
حیف! بلبل کشتۂ ناز گل است

مطبوعہ پرتاپ میگزین
آخری نمبر ۱۹۳۶ء

☆......'الفت' لفظ کے بدلے بلبلؔ نے اپنے ہاتھ سے اور دستخط کے ساتھ حاشیے پر 'فرصت' تجویز کیا ہے۔

تقسیم کے وقت بلبل فوج میں تھے اور راولپنڈی میں قیام تھا۔ پھر وہیں کے ہوکر رہ گئے۔ ان کا ایک پوسٹ کارڈ ان ہی دنوں کا راقم الحروف کے پاس

محفوظ ہے۔ پوسٹ کارڈ کا مضمون یوں ہے

مقدر میں جو سختی تھی وہ مر کر بھی نہیں نکلی
لحد کھودی گئی میری تو پتھر کی زمین نکلی

آپ کا کیس ابھی follow تک نہ کر سکا تھا کہ میں سرینگر انسپکٹری میں اپنے سفر خرچ کی تفصیلات بہم کرنے گیا۔ وہاں انڈین آرمی میں داخل ہونے کا آرڈر ملا۔ وقت بہت کم تھا۔ میں بن پوچھے چلا آیا اور ۳۰ر جولائی کو آرسنل راولپنڈی میں داخل ہوا۔ مجھے انتہا درجے کا افسوس ہے کہ میں آپ کے کام نہ آسکا۔ معذرت خواہ ہوں۔ کچھ خاص واقعات رونما ہوئے ہوں تو لکھ دیں۔ میں جواب کیلئے سراپا انتظار ہوں۔ اگلے خط میں تفصیلات لکھ دوں گا۔

بھائی غلام محمد نازکی سے عرض کر دیں کہ جو غلطی اس کے دوست مسٹر 'چونچ' نے کی کہیں وہ اس سے بھی نہ ہو جائے۔ چھوٹوں کو پیار۔ بڑوں کو سلام۔ پیر نجم الدین صاحب کی خدمت میں آداب و نیاز۔

نیاز آگیں

G.A. Bulbul B.A Kashmiri
Main Office
Indent Branch
Arsenal Rawalpindi

نوٹ:۔ یورہ چھ تہ تورہ چھ ساری چِھٹھ چھ ییتہ یوان وُچھنہ، لہذا گژھنہ اورک یورک لیکھن !!!

بشرفِ نگاہ

حضرت علامہ غلام رسول صاحب نازکی

استاد۔ مڈل سکول بانڈی پورہ کشمیر
پوسٹ آفس۔ بانڈی پورہ کشمیر

اب پھر بیاض کی طرف آتے ہیں۔ تاریخ کے لحاظ سے سب سے پہلی غزل جس پر مطبوعہ درج ہے ۱۹۸۵ بکرمی کی ہے یعنی ۱۹۲۹ء

غزل

اے گلِ باغِ ملاحت، مسکراہٹ سے تری
خندۂ گل مثلِ شبنم شرم سے ہے آب آب
چہرۂ عاشق پہ ظاہر ہیں علاماتِ سرور
غالباً آیا ہے اس کو یار سے خط کا جواب
عاشقِ ناداں گلہ کرتے ہو بدخو یار ہے
یہ تو بدخوئی نہیں ہے، ہے تقاضائے شباب
غسل فرمایا ہے میرے یار نے شاید ابھی
ہر جگہ آتی ہے پانی سے مجھے بوئے گلاب
باز آ ظلم و جفا سے اے ستمگر باز آ
آتشِ فرقت سے چھالے دل کے ہیں مثلِ حباب

جس شعر کا نیاز کامراجی صاحب نے اپنی تقریظ میں تذکرہ کیا، وہ غزل ۱۹۸۷ بکرمی یعنی ۱۹۳۱ء کی ہے اور 'مطبوعہ' ہے۔ اس غزل کے ۷ اشعار ہیں۔

اس تری زلف دوتا نے دل کا محشر کردیا
اور کماں اُبرو نے میرا حال ابتر کردیا

مت خفا ہو عرضِ مطلب کی طوالت دیکھ کر
انتہائے شوق نے چٹھی کو دفتر کردیا

سورۂ والیل ہے تفسیر گیسوئے دراز
جس نے نازک سا بدن

دور ساغر چل رہا تھا غیر تھے سب ہم نشیں
اف مری قسمت کہ بیدردی سے باہر کردیا

تم گئے لیکن مرے دل پر قیامت ڈھا گئے
ایک پل کو مجھ پہ صدیوں کے برابر کردیا

اس تری ضد کا برا ہو جس نے تم کو غیر سے
باچنیں فہم وفراست شیر و شکر کردیا

تیری فرقت نے مرے پیارے ہلال شام عید
میرے حق میں آفتاب صبح محشر کردیا

'مطبوعہ'

بیاض کے مطالعے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ نازکی صاحب کا کلام لگاتار شائع ہوتا رہا۔ سب جانتے ہیں کہ نازکی صاحب کی پہلی نظم جس کے شائع ہونے کے ساتھ ہی وہ برِ صغیر کی دنیائے ادب میں متعارف ہوئے تھے، ایک اندھی لڑکی کی دعا تھی جو پہلے پہل 'کلیم' دہلی میں چھپی۔ نازکی صاحب نے کئی موقعوں پر اس واقع کے بارے میں تفصیل سے لکھا اور کہا ہے کہ کیسے ان کی یہ نظم 'ادبی دنیا' لاہور نے واپس کر دی تھی اور پھر جوشؔ ملیح آبادی کے کلیم دہلی میں نمایاں طور پر شائع ہوئی تھی۔ کلیم میں شائع ہونے کے بعد 'ادبی دنیا' لاہور نے اپنی غلطی کی تلافی کرتے ہوئے اس نظم کو از خود شائع کیا۔ زیر مطالعہ بیاض میں اس حوالے سے کئی ایک باتیں سامنے آتی ہیں۔ اوّل یہ کہ یہ نظم یعنی 'ایک اندھی لڑکی کی دعا' ۱۹۳۷ء میں تخلیق ہوئی اور اسی سال پہلے ہمدرد سرینگر میں چھپی، پھر 'کلیم' دہلی کے اپریل ۱۹۳۷ء کے شمارے میں شائع ہوئی اور اگلے ہی مہینے یعنی مئی ۱۹۳۷ء کو ادبی دنیا لاہور کے صفحات کی زینت بنی۔ اس کے بارے میں اس بیاض میں خود نازکی صاحب کے ہاتھ کے اندراجات موجود ہیں۔ اس بیاض میں

ایک اور نظم 'گڈریا' کے عنوان سے درج ہے۔ یہ نظم بھی دیدۂ تر میں شامل تھی۔ نازکی صاحب نے یہ تخلیق ہونے کی تاریخ ۲۷رمئی ۱۹۳۵ء ڈالی ہے اور اس کے ساتھ بھی مطبوعہ ہمدرد سرینگر اور ادبی دنیا لاہور تحریر کیا ہے۔ لیکن شمارے یا مہینے کا ذکر نہیں کیا۔ مگر جو بھی ہو گڈریا نظم ادبی دنیا لاہور میں ظاہر ہے۔ مئی ۱۹۳۷ء کے بعد ہی شائع ہوئی ہوگی۔ 'ایک اندھی لڑکی کی دعا' اور 'گڈریا' ملاحظہ ہوں۔

ایک اندھی لڑکی کی دُعا

تو نے سورج کو ضیا بخشی ہے تاروں کو جمال
بارشِ انوار سے دنیا کی کھیتی ہے نہال
نور پاشی میں قمر ہے آپ ہی اپنی مثال
مجھ کو ان چیزوں کی کچھ خواہش نہیں اے ذوالجلال
یہ تمنا ہے کہ اپنی ماں کی صورت دیکھ لوں

لوگ کہتے ہیں کہ رنگوں کے کئی اقسام ہیں
سرخ ہیں کالے ہیں اور نیلی فام ہیں
اور ان رنگوں سے وابستہ ہزاروں کام ہیں
مجھ کو کیا یہ آنکھ والوں کیلئے انعام ہیں
یہ تمنا ہے کہ اپنی ماں کی صورت دیکھ لوں

سنتی آئی ہوں کہ کھلتے ہیں چمن میں لالہ زار
رنگ وبو میں جوش بھر دیتی ہے ساون کی پھوار

تازگی سی روح میں بھرتا ہے کلیوں کا نکھار
میں نہیں کہتی کہ یہ سب دیکھ لوں پروردگار
یہ تمنا ہے کہ اپنی ماں کی صورت دیکھ لوں

میری آنکھوں کو بصارت کی ہوس اصلا نہیں
بے بصر ہوں میں مگر اس کی مجھے پروا نہیں
تو نے سمجھا ہے میں عاجز ہوں مگر ایسا نہیں
مجھ کو ہرگز آرزوئے دیدۂ بینا نہیں
یہ تمنا ہے کہ اپنی ماں کی صورت دیکھ لوں

بیاض سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ یہ نظم 1993-10-10 بکرمی یعنی ۲۲؍جنوری ۱۹۳۷ء جمعہ کے روز لکھی گئی۔

گڈریا

جب چاند چمکتا ہے خاموش فضاؤں میں — جب جان سی پڑتی ہے افسردہ ہواؤں میں
جب خلقِ خدا بے خود سو جاتی ہے گاؤں میں — میں گھاس پہ سوتا ہے دیودار کی چھاؤں میں
میں ساز بجاتا ہوں بنسی کی صداؤں میں

بے فکر نہیں کوئی مجھ سا بھی زمانے میں — میں دولتِ تسکیں کو رکھتا ہوں خزانے میں
لذت سی میں پاتا ہوں ریوڑ کو چرانے میں — بے لوث تخیل ہے فطرت کے فسانے میں
یہ بات کہاں ممکن دولت کے گھرانے میں

شاہوں کو مبارک ہو دنیا کی جہانبانی — ہو طالبِ دولت کو دولت کی فراوانی
آرام کے پتلے کو حاصل ہو تن آسانی — اور ہندو مسلمان کو رندی و مسلمانی
میں اور میرا ریوڑ ریوڑ کی نگہبانی

شہروں کی فضاؤں میں ہے ذوقِ شہہ کاری — ظاہر میں سبکدوشی باطن میں گرانباری

تکمیلِ تمدن ہے معراجِ جفاکاری دولت کی سرافرازی غربت کی نگونساری

لیکن مرا مسلک ہے تہذیبِ وفاداری

آلودگیوں سے ہو ہر شخص کو بیزاری کرنے نہ کوئی کوئی پائے آپس میں دلآزاری

اخلاق وہ ہوں جن سے ہو دل کی خریداری جو قوم کے سینوں کو دے جذبۂ بیداری

مولیٰ! مری بنسی کی لے میں ہو وہ چنگاری

یہ نظم بروزِ جمعہ مطابق ۲۷ر مئی ۱۹۳۵ء یعنی 15-2-1994 بکرمی کو لکھی گئی 'کلیم' دہلی اور ادبی دنیا لاہور کے علاوہ 'ہمدرد' سرینگر اور 'پرتاپ میگزین' کے حوالے کئی کئی نگارشات کے ساتھ دیئے گئے ہیں۔ لگتا ہے کہ ہمدرد سرینگر میں سب سے پہلے ۱۲ر دسمبر ۱۹۳۶ء کے شمارے میں ناز کی صاحب کی پہلی نظم 'عالمِ اضطراب' شائع ہوئی۔ آٹھ بند پر مشتمل یہ نظم اس طرح ہے۔

عالمِ اضطراب

کبھی آسمان کی طرف دیکھتا ہوں زمیں پر گیاہ و علف دیکھتا ہوں

سمندر میں دو صدف دیکھتا ہوں بیاباں میں ریگ و خذف دیکھتا ہوں

مگر دل یہ نا آشنائے سکوں ہے

حریمِ حرم میں کبھی جبہ سا ہوں بتوں کو کبھی دیر میں پوجتا ہوں

کلیسا میں جاکر کبھی رو رہا ہوں حسینوں کا بنتا کبھی خاک پا ہوں

مگر دل یہ نا آشنائے سکوں ہے

کبھی سوچنے میں گزرتی ہیں راتیں خیالی حبیبوں سے کرتا ہوں باتیں

کبھی بھول جاتا ہوں سب التفاتیں کبھی یاد ہیں عشق کی وارداتیں

مگر دل یہ نا آشنائے سکوں ہے

کبھی میں امیروں کی محفل میں آیا کبھی شمع گورِ غریباں جلایا

کبھی راہبوں کا نشیمن بسایا — کبھی بن کے ظالم دلوں کو دکھایا

مگر دل یہ نا آشنائے سکوں ہے

گلستاں میں جاکر پھر اجار سو میں — رہا مدتوں مائلِ رنگ وبو میں

کئی دن بسر کردیئے جستجو میں — بہت دیر تک رہا ہائے وہو میں

مگر دل یہ نا آشنائے سکوں ہے

میسّر کبھی دل کو آزادیاں تھیں — نگہ میں کبھی خانہ آبادیاں تھیں

کبھی حسن والوں کی صیادیاں تھیں — کبھی گھر کی رونق پری زادیاں تھیں

مگر دل یہ نا آشنائے سکوں ہے

کبھی شعر میں کی نکات آفرینی — کبھی زاہدوں کی لکھی نکتہ چینی

حسینوں کی دیکھی کبھی نازنینی — کبھی عشق تھا اور کبھی دور بینی

مگر دل یہ نا آشنائے سکوں ہے

بھلایا تھا انجامِ دنیائے فانی — کبھی بزمِ ماتم میں کی سوز خوانی

کبھی سر میں تھا زور و جوشِ جوانی — کبھی کی مجالس میں رنگیں بیانی

مگر دل یہ نا آشنائے سکوں ہے

ہمدرد سرینگر کے ۴ر جنوری ۱۹۳۷ء کے شمارے میں ''آہ! ریحانہ تمہاری یاد آتی ہے مجھے'' ایک نظم شائع ہوئی۔ پانچ بند اور کل دس اشعار پر مشتمل اس نظم میں ایک بند خالص اور خوبصورت فارسی میں موزوں ہوا۔

آہ! ریحانہ تمہاری یاد آتی ہے مجھے

جب میں ہوتا ہوں زمین و آسماں سے بے خبر

جب الجھتی ہے نگہ کی تار میں میری نظر

جب مری تیمارداری کیلئے شام وسحر
صفحۂ گیتی پہ رہتا ہی نہیں کوئی بشر
آہ! ریحانہ تمہاری یاد آتی ہے مجھے

جب مرے احباب ہو جاتے ہیں مجھ سے بدگماں
جب مرے دشمن کسا کرتے ہیں مجھ پر پھبتیاں
تیرے بدلے رنج وغم ہوتے ہیں گھر کے مہماں
برسر پیکار ہوتا ہے زمیں وآسماں
آہ! ریحانہ تمہاری یاد آتی ہے مجھے

چھین لیتا ہے زمانہ دل سے جب آزادیاں
جب کیا کرتا ہے دور آسماں صیادیاں
بھول جاتی ہیں مجھے جب حُسن کی شہزادیاں
بنتی ہیں سنسان بن جب دل کی دلکش وادیاں
آہ! ریحانہ تمہاری یاد آتی ہے مجھے

خار گیسو مے خلد چوں دیدۂ خونبار را
درکمندآرد نگاہم آہوئے تاتار را
سدراہ خود نہ دانم وادی وکہسار را
وقف درد تو ہمے سازم دل بیمار را
آہ! ریحانہ تمہاری یاد آتی ہے مجھے

ناچتی پھرتی ہے جب آنکھوں میں تصویرِ جمال
طرز ماند و بود انداز و ادا اورچال ڈھال

کوہ کی مانند عزو تمکنت میں بے مثال
زندگانی جب مجھے معلوم ہوتی ہے وبال
آہ! ریحانہ تمہاری یاد آتی ہے مجھے

جب بہار آتی ہے کھلتے ہیں چمن میں لالہ زار
بارشِ انوار برساتا ہے اَبرِ نو بہار
فرشِ مخمل پر قدم رکھتا ہے سرو جو ئبار
چاک ہوتا ہے گریباں خود بخود بے اختیار
آہ! ریحانہ تمہاری یاد آتی ہے مجھے

تخلیق ہوئی 2-4-1994 بکرمی مطابق ۱۷ر جولائی ۱۹۳۷ء بروز سنیچر

نازکی صاحب کی ایک مشہور نظم 'بانگِ درا' جو دیدۂ تر میں شامل ہے، پہلے پہل 'ہمدرد' سرینگر میں ۱۹۳۷ء کے دوران ہی شائع ہوئی۔ اس نظم کو نازکی صاحب کی سیاسی اور سماجی شاعری کی ایک عمدہ مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

بانگِ درا

پو پھٹنے لگی دور ہوئی شب کی سیاہی
دینے لگے مرغانِ چمن حق کی گواہی
کرنے لگے پیرانِ حرم یادِ الٰہی
میدان میں آیا ہے کمر بستہ سپاہی
جاگ اٹھو! کہ ہے منزلِ مقصود بہت دور
دشوارئ منزل ہے عزیزوں کی نظر میں

لٹ جاتے ہیں احباب اسی راہگذر میں
ہر وقت ہے اندیشہ لٹیروں کا سفر میں
لٹکا کے چلو خنجر و شمشیر کمر میں
جاگ اٹھو! کہ ہے منزلِ مقصود بہت دور

منزل پہ پہنچ بھی گئے یارانِ سبک پے
جو راستے دشوار تھے ہمت نے کیے طے
پیچھے نہ رہو۔ راہ خطرناک بہت ہے
ہے قافلۂ سالار کی آواز پیاپے
جاگ اٹھو! کہ ہے منزلِ مقصود بہت دور

دیتی ہے یہ پیغام تمہیں بادِ بہاری
یہ نگہتِ گل مشرق و مغرب میں ہے جاری
اک لمحہ بھی بیکار نہیں اس کی سواری
سب مل کے اٹھو! کوچ کی کرلیں گے تیاری
جاگ اٹھو! کہ ہے منزل مقصود بہت دور

مجھے یاد ہے کہ ناز کی صاحب نے یہ نظم ۷۰ کے عشرے میں کسی مشاعرے میں پھر ایک بار پڑھی تھی مگر' جاگ اٹھو! کہ ہے منزل مقصود بہت دور' میں ایک لفظ تبدیل کیا تھا اور یہ مصرعہ یوں تھا' جاگ اٹھو! کہ ہے منزل مقصود ابھی دور'۔

ایک اور نظم جو ہمدرد کے صفحات کی زینت بنی 'تاثرات' کے عنوان سے تھی۔ یہ نظم دیدۂ تر میں شامل نہیں، کشمیر کے تئیں نازکی صاحب کی محبت اس نظم میں جا بجا دیکھنے کو ملتی ہے۔

سرمایۂ آزادی افکار ہے حاضر
خود مملکت دل کا جہاندار ہے حاضر
یہ جانِ حزیں اِک نہیں سو بار ہے حاضر
دولت کی تمنا نہیں گھر بار ہے حاضر
پیچ و خم گیسوئے گرہ گیر کے آگے

بل کھاتی ہوئی پانی کی ندی کی روانی
عشّاق کی الجھی ہوئی الفت کی کہانی
خم دار ییئے بے راہیٔ ایام جوانی
نیرنگیٔ مدہوش کنی عالمِ فانی
کچھ بھی نہیں اک حلقۂ زنجیر کے آگے

واعظ کے جگر دوز فسانوں کا ترانہ
عابد کی جہاں سوز دعا ہائے شبانہ
زہاد کا راتوں کی عبادت کا زمانہ
آہ اس کی جو ہو تیرِ حوادث کا نشانہ
سب ہیچ ہے اک آہ کی تاثیر کے آگے

میں جنّتِ رضواں کا طلبگار نہیں ہوں
حوروں کی اداؤں کا خریدار نہیں ہوں
بازی گہہ جنّت کا اداکار نہیں ہوں
فردوس کے آزار سے بیمار نہیں ہوں
کیا چیز ہیں یہ جنتِ کشمیر کے آگے

کشمیر اسے کہتے ہیں فردوسِ بریں ہے

ہر فردِ بشر خطۂ کشمیر حسیں ہے

اور ساکنِ فردوس ہے جو اس کا مکیں ہے

اور ساتھ ہی زاہد بھی ہے اور خاک نشیں ہے

سینہ بھی سپر کرتا ہے شمشیر کے آگے

کہتے ہیں وہ جو کچھ ہمیں انکار نہیں ہے

تسلیم ہے وہ ملک کا غدار نہیں ہے

فرمانِ خداوند سے بے زار نہیں ہے

افسوس کہ آزادیٔ افکار نہیں ہے

مجبور ہے ہر صاحبِ تدبیر کے آگے

اے لالہ رخو! جنّت آفاق کی بھیڑو

اے نیک و بد عالمِ سفلی کے بکھیڑو

کیا تم کو پڑی اور کی تم اپنی نبیڑو

تم سب سے ہوں بیزار مجھے آ کے نہ چھیڑو

مت آؤ کسی عاجز و دلگیر کے آگے

'کشمیر کی کہانی' کے عنوان سے ایک آٹھ بند والی نظم 'خاص' ہمدرد کے سپیشل نمبر کیلئے ۸/جون ۱۹۳۸ء کو لکھی گئی۔ کہتے ہیں کہ یہ نظم اپنے زمانے میں خوب مشہور ہوئی۔

کشمیر کی کہانی

داستاں رستم و سہراب کی ، افسانہ ہے

قصہ قیس نہ چھیڑو کہ وہ دیوانہ ہے
ہمنوا! اب وہ ساقی نہ وہ پیمانہ ہے
وقفِ آلام مرے دل کا نہاں خانہ ہے
دل مرا لیلیٰ کشمیر کا دیوانہ ہے

لوگ کہتے ہیں کہ فردوسِ بریں ہے کشمیر
سطحِ آفاق پہ حوروں کی بہشتی جاگیر
منظر صبح ہے آئینہ رخوں کی تصویر
ظلمتِ شام میں زلفوں کی پریشاں تحریر
الغرض خطۂ کشمیر ہے جنّت کی نظیر

ابر آلود فلک نیم درخشاں مہتاب
نہر پانی کی رواں خجلت جوئے سیماب
ساز اشجار پہ ہے بادِ خنک کی مضراب
اس طرح شان سے ہے باغ کی کیاری میں گلاب
جس طرح ہوتی ہے ڈولی میں دلہن زیرِ نقاب

وہ سمجھتے ہیں یہاں عیش کی ارزانی ہے
میں یہ کہتا ہوں یہاں غم کی فراوانی ہے
غمِ ایام ہے، تشویش ہے، حیرانی ہے
گھر کا کیا حال لکھوں بات بہت پرانی ہے
قولِ غالبؔ 'کوئی ویرانی سی ویرانی ہے'

تلخ اس دیس میں اوقات ہیں بے کاروں کے

نام بدنام ہیں اس ملک میں ناداروں کے
ظلم ہیں حد سے سوا ملک پہ زرداروں کے
دن گزرتے ہیں مصیبت میں یہاں یاروں کے
مبتلا غم میں ہیں محتاج ہیں غمخواروں کے

یوں پڑے رہتے ہیں راتوں کے غریبوں کے لال
روشِ باغ پہ جس طرح ہو سبزہ پامال
آکے خود دیکھ کسانوں کو پریشاں احوال
کوئی ہمدرد نہیں ان کا کہ ہیں بے پرو بال
زندگی ان کی بنی ان کیلئے وجہٗ ملال

پیٹ کی فکر میں بندوں کو خدایاد نہیں
قیدِ افلاس سے اک شخص بھی آزاد نہیں
فیصدی ایک بھی اس ملک میں آباد نہیں
سب کے سب پیکرِ افسوس، کوئی شاد نہیں
کون سا فرد ہے جو مائلِ فریاد نہیں

اے خدا مطلعِ تاریک درخشاں کردے
اک خزف ریزہ کو پھر لعلِ بدخشاں کردے
اپنے بندوں پہ عنایت کو فراواں کردے
عیش و آرام سے کشمیر کو شاداں کردے
رخِ راعی و رعایا کو فروزاں کردے

(۸رجون ۱۹۳۸ء)

پرتاپ میگزین میں ۱۹۳۶ء میں دو نظمیں چھپیں۔ ایک شکوۂ یار کے عنوان سے تھی اور دوسری 'حسینوں کا رتبہ خدا جانتا ہے' کے نام سے تھی۔ شکوۂ یار کا ذکر ان ہی صفحات میں پہلے ہی ہو چکا اور حسینوں کا رتبہ خدا جانتا ہے والی نظم خالصتاً ایک ہلکی پھلکی رومانی نظم ہے۔

حسینوں کا رتبہ خدا جانتا ہے

میں کل رات مصروفِ سیرِ چمن تھا　　تصوّر میں اک حوروش کا چلن تھا
تخیل تھا اور اس میں وہ سیم تن تھا　　کسی شاخ پر یوں کوئی نعرہ زن تھا
حسینوں کا رتبہ خدا جانتا ہے

مغنی نے پُر کیف اِک راگ گائی　　نئی زندگی جس کو سنتے ہی آئی
میں بھولا خدا اور خدا کی خدائی　　کہیں سے یکایک یہ آواز آئی
حسینوں کا رتبہ خدا جانتا ہے

مجھے کل میسّر تھا دیدارِ جاناں　　مرے گھر میں تھا شورِ محشر کا ساماں
میں ان کا فدائی تھا وہ میرے مہماں　　وہ یوں کہہ رہے تھے خراماں خراماں
حسینوں کا رتبہ خدا جانتا ہے

کسی نے کہا آہ لیلیٰ حسیں تھی　　کسی نے کہا ہیر کیا نازنیں تھی
کسی نے کہا سوہنی مہہ جبیں تھی　　یہ آواز آئی جو زیرِ زمیں تھی
حسینوں کا رتبہ خدا جانتا ہے

فلک پر نکل آئے جب چاند تارے　　سدھارے گھروں کی طرف لوگ سارے
میں تنہا تھا دریا کے دائیں کنارے　　قمر کہہ رہا تھا عطارد سے پیارے
حسینوں کا رتبہ خدا جانتا ہے

نظموں کا ذکر چل رہا ہے تو اس بیاض میں دیگر چھوٹی بڑی نظموں میں ایک ۲۶ بندوں والی نظم 'حُسنِ فطرت' بھی شامل ہے۔ یہ نظم ۲۰/اگست ۱۹۳۸ء کو

تحریر ہوئی اور ہو نہ ہو یہ 'تراگہ بل' میں ہی لکھی گئی ہو جس کا ذکر پہلے ہی بند میں آیا ہے۔ فطرت کے مظاہر کا مشاہدہ کرتے کرتے نظم انسانی سماج میں پھیلی تباہی، بربادی، کشت و خون اور خاص طور پر امیری غریبی اور مذہبی منافرت کے موضوعات سے لوہا لیتی ہے اور عالمِ انسانیت کو فطرت کے اندر رواں دواں یکجہتی اور یگانگت سے سبق لینے کا مشورہ دیتی ہے۔ یہ نظم اُپنے دَور کے سیاسی اور سماجی پسِ منظر میں لکھے جانے کے باوجود آج بھی اسی قدر relevant لگتی ہے کہ جس قدر یہ شخصی راج کے زمانے میں لگتی ہوگی، حق تو یہ ہے کہ اس نظم میں پیش کئے گئے کئی ایک تصوّرات بیسویں صدی کے اختتام اور اب اکیسویں صدی کے آغاز میں فیشنیبل بن گئے ہیں۔

حُسنِ فطرت

دل میں اطمیناں سا ہے وقت ہے ساون کی شام
ہلکی ہلکی چاندنی ، سبزہ کی چادر سبز فام
دامنِ کہسار میں ندی کا بے قابو خرام
جھانکتا ہے چاندیوں جیسے پری بالائے بام
تراگہ بل کی خوشنما چوٹی پہ ہے میرا مقام
ہے شبِ خاموش میں ساری خدائی محوِ خواب
چھیڑتا ہے بے خودی کا نغمہ فطرت کا رباب
آسمان نیلگوں اور دھان کی کھیتی پُر آب

خوب ہے ہمرنگیٔ ارض وسما کا انقلاب
کالے کالے بادلوں میں چھُپ رہا ہے ماہتاب
بن میں گاتا ہے مسرّت سے پپیہا پی کے راگ
رن کا منظر پیش کرتی ہے ہرن کی دوڑ بھاگ
ساری دنیا سورہی ہے اے مرے دل تو تو جاگ
جاگ اور ہاتھوں سے مت دے صبر کے گھوڑے کی باگ
تیز مت کرأپنے اوپر اس طرح دوزخ کی آگ
ڈوب جا فطرت میں اور معلوم کر راز حیات
حُسنِ فطرت سے دوبالا ہے جمالِ کائنات
دیکھ! حُسنِ ظاہری ہرگز نہیں قائم بہ ذات
منسلک ہے حُسنِ فطرت اور حُسنِ شش جہات
جس طرح خورشید سے وابستہ ہے تاروں کی ذات
حُسنِ فطرت ہے تری آرائشوں سے بے نیاز
رنگ و خو سے رہ کے بالا تر ہر اِک کی دلنواز
بے تعصب ، بے تنفر مطلقاً بے امتیاز
صلحِ کل بن جا اگر دل ہے ترا دانائے راز
جا حقیقت کی طرف اور چھوڑ دے رنگِ مجاز
آہ غافل! خدمت مخلوق کر اپنا شعار
یہ مصیبت اور تری آنکھیں نہیں ہیں اشکبار
غمزدہ بن غمزدوں کے ساتھ ہوجا ہمکنار

نوعِ انساں کی غلامی دیکھ ہوجا بے قرار

حسنِ فطرت یہ سبق دیتا ہے تم کو بار بار

خوں رلاتا ہے مجھے شیخ و برہمن کا تضاد

یہ حسدو شنارپن، وہ فی سبیل اللہ فساد

حُسنِ فطرت ہوگیا آلودۂ بغض وعناد

آؤ پھر پی لیں شراب اتفاق و اتحاد

مادرِ کشمیر سب مل کر کہیں گے زندہ باد

قوم کے ارباب حل و عقد سن لیں انتباہ

جاؤ سب مل کر کرو پیدا عمل کی شاہراہ

چوم لو تعظیم سے اک دوسرے کی بارگاہ

چھوڑ دو بے اعتمادی بے ضمیری ، اشتباہ

ایک ہو پرماتما۔ اللہ ۔مندر خانقاہ

آج بھی لندن میں رہتے ہیں نصاران ویہود

اتحاد ہر دو میں مضمر ہے رازِ ہست و بود

مسلم و ہندو ردائے ملک کے ہیں تاروپود

قیمتی ہے ملک میں اے دوست دونوں کا وجود

وہ بھی مل کر مشترک پیدا کریں نقصان وسود

اور پھر زردار بھی کرلیں غریبوں کا خیال

ان کے ہاں ہے مفلسوں کا زخم دل کا اندمال

پھول سے شاداب ، بچے اورفاقوں سے نڈھال

زندگی مزدور کی ہے پیکرِ حزن وملال
ورطۂ افلاس میں ڈوبا ہے ان کا بال بال

کچھ نہ پوچھو مجھ سے تم مزدور کی بدحالیاں
بیویاں بنتی ہیں ان کی اہلِ زر کی سالیاں
ان کا زیور کیا ہے بس پیتل کی دودوبالیاں
دن کی محنت کا صلہ ملتا ہے ان کو گالیاں
جب وہ روتا ہے، بجاتے ہیں تونگر تالیاں

اہل دنیا بھول بیٹھے ہیں مروّت کا اصول
یہ نہیں ہوتے غریبوں کی غریبی سے ملول
زیست کا مقصد یہ سمجھے ہیں کہ کچھ کرلیں وصول
بیکسوں کی معذرت کو کر نہیں سکتے قبول
بے زروں کو خار اور اپنے تئیں سمجھا ہے پھول

میں تونگر کو بتادوں گا یہ سادہ سی مثال
جس کی چالوں نے کیا مزدور کو آشفتہ حال
جس کے دھوکوں سے بنی ہے زندگی ان کی محال
جس کی روباہی نے ان شیروں کی کھچوائی ہے کھال
جس کے ہاتھوں میں قضا مزدور کی ہے لامحال

دیکھ آنکھیں کھول کر فطرت کا یہ فیضانِ عام
ہر کسی کا واجبی حق ہے یہ لُطفِ صبح وشام
ایک ہی آکاش کے نیچے ہیں آقا اورغلام

نوعِ انساں کی غلامی دیکھ ہوجا بے قرار
حسنِ فطرت یہ سبق دیتا ہے تم کو بار بار
خوں رلاتا ہے مجھے شیخ و برہمن کا تضاد
یہ حسدو شنارپن، وہ فی سبیل اللہ فساد
حسنِ فطرت ہوگیا آلودۂ بغض وعناد
آؤ پھر پی لیں شراب اتفاق و اتحاد
مادرِ کشمیر سب مل کر کہیں گے زندہ باد
قوم کے ارباب حل و عقد سن لیں انتباہ
جاؤ سب مل کر کرو پیدا عمل کی شاہراہ
چوم لو تعظیم سے اک دوسرے کی بارگاہ
چھوڑ دو بے اعتمادی بے ضمیری ، اشتباہ
ایک ہو پرماتما۔اللہ ۔مندر خانقاہ
آج بھی لندن میں رہتے ہیں نصاران ویہود
اتحاد ہر دو میں مضمر ہے رازِ ہست و بود
مسلم و ہندو ردائے ملک کے ہیں تارو پود
قیمتی ہے ملک میں اے دوست دونوں کا وجود
وہ بھی مل کر مشترک پیدا کریں نقصان وسود
اور پھر زردار بھی کرلیں غریبوں کا خیال
ان کے ہاں ہے مفلسوں کا زخم دل کا اندمال
پھول سے شاداب ، بچے اور فاقوں سے نڈھال

زندگی مزدور کی ہے پیکرِ حزن وملال
ورطۂ افلاس میں ڈوبا ہے ان کا بال بال
کچھ نہ پوچھو مجھ سے تم مزدور کی بدحالیاں
بیویاں بنتی ہیں ان کی اہلِ زر کی سالیاں
ان کا زیور کیا ہے بس پیتل کی دودوبالیاں
دن کی محنت کا صلہ ملتا ہے ان کو گالیاں
جب وہ روتا ہے، بجاتے ہیں تونگر تالیاں
اہل دنیا بھول بیٹھے ہیں مروّت کا اصول
یہ نہیں ہوتے غریبوں کی غریبی سے ملول
زیست کا مقصد یہ سمجھے ہیں کہ کچھ کرلیں وصول
بیکسوں کی معذرت کو کر نہیں سکتے قبول
بے زروں کو خار اور اپنے تئیں سمجھا ہے پھول
میں تو نگر کو بتادوں گا یہ سادہ سی مثال
جس کی چالوں نے کیا مزدور کو آشفتہ حال
جس کے دھوکوں سے بنی ہے زندگی ان کی محال
جس کی روباہی نے ان شیروں کی کھچوائی ہے کھال
جس کے ہاتھوں میں قضا مزدور کی ہے لامحال
دیکھ آنکھیں کھول کر فطرت کا یہ فیضانِ عام
ہر کسی کا واجبی حق ہے یہ لُطفِ صبح وشام
ایک ہی آکاش کے نیچے ہیں آقا اورغلام

گورے کالے ایک ہی دھرتی پہ رہتے ہیں تمام

ایک ہی دریا سے پانی پی رہے ہیں خاص و عام

گر یہی ہے پھر یہ بیماری کہاں سے آگئی

یہ امیری اور ناداری کہاں سے آگئی

اس کی منت اسکی بیزاری کہاں سے آگئی

برسرکاری و بے کاری کہاں سے آگئی

یہ غریبوں کی دلآزاری کہاں سے آگئی

تو وہ ہے جس کا نہ ملتا تھا زمانے میں جواب

انقلابِ دہر نے آکر کیا تجھ کو خراب

نام تیرا مٹ گیا دنیا سے مانندِ حباب

تیرے رونے پر کیا قدرت نے میرا انتخاب

آہ غافل! تیری یہ حالت ہے تو خود محوِ خواب

تازہ کر دنیا میں پھر اٹھ کر روایاتِ کہن

ایک ہی محفل میں بیٹھیں مل کے شیخ و برہمن

آج پھر پرویز ہو تیمار دارِ کوہکن

کل یہ خارستاں بنے گا خوبصورت سا چمن

پھر اسے آباد کر ویراں پڑی ہے انجمن

قوم کا شاعر ہوں میرے دل میں قومی درد ہے

وائے بدبختی لہو تیری رگوں میں سرد ہے

تو شجاعت کیلئے مشہورِ عالم فرد ہے

اے بہادر! کون کہتا ہے کہ تو نامرد ہے
رستم و سہراب تیرے کارواں کی گرد ہے

میں تمہیں کیا کیا کہوں کیا کیا کرو اہلِ وطن
بے وسیلوں کو تو َنگر، خارزاروں کو چمن
لاش لاوارث ہے جو اس کو پہنادو کفن
فاش کہہ دوں گا نہیں تیرا وطن تیرا وطن
تو نہ جب تک زندہ کرلے گا روایاتِ کہن

دیدیا ہے میں نے فطرت کو ترا رہبر قرار
یہ تری رہبر بنے گی تو ذرا ہوجا تیار
دیکھ فطرت کو یہ رسموں کی نہیں ہے زیرِ بار
فصلِ گل میں سر سے پاؤں تک ہے یہ نقش ونگار
پھر خزاں میں ایک مفلس کی طرح بے برگ وبار

یہ خزاں میں مائل آرائشِ زیبا نہیں
اس کو عشرت میں خیالِ اطلس و دیبا نہیں
اس کو دولت میں رعونت کا مرض اصلا نہیں
خوش ہے ہر حالت میں رنج و عیش کی پروا نہیں
اس کی اس حالت سے غافل دیدۂ بینا نہیں

شادیٔ و غم کا اگر کرنا ہے تجھ کو کوئی کام
مانگ کر لوگوں سے کرلوگے ہزاروں انتظام
سود دے دو۔گے مگر ہرگز نہ چھوٹے دھوم دھام

مفت خوروں کا رہے گا تیرے ہاں انبوہِ عام
تیری رسمیں موت کا پیغام لاتی ہیں تمام

تم اگر بے ہودہ رسموں سے کروگے اجتناب
چھوٹ جاؤگے مصیبت سے فنا ہوگا عذاب
ان رواجوں کا اگر کرتے نہیں تم سدِّباب
جوش میں آئے گا تیرے حق میں قدرت کا عتاب
تم فنا ہوجاؤ گے دنیا سے مانندِ حباب

کیوں تیرے اعمال ہیں قانونِ فطرت کے خلاف
جارہے ہو کس لئے منشائے قدرت کے خلاف
یہ تیرے اعمال ہیں سب آدمیت کے خلاف
میں بہت کہتا رہوں گا تیری عادت کے خلاف
گو مرا حملہ نہیں ہے تیری نیّت کے خلاف

ہے ترا مذہب تمہاری اپنی ذاتی جائیداد
یہ نہیں کہتا تمہیں بن پیکرِ بغض و عناد
مذہب آیا تھا سکھانے تم کو درسِ اتحاد
اس نے واضح کردیئے تھے تم پہ اسرار وداد
تو نے مذہب کو بنایا مایۂ شر و فساد

مجھ سے ابنائے وطن ناخوش ہیں کچھ پروا نہیں
میں خوشامد کے مرض میں مبتلا اتنا نہیں
اس لئے میری نصیحت میں اثر اس کا نہیں

میری باتوں میں حلاوت کا اثر اصلاً نہیں
لوگ کہتے ہیں کہ سچ کڑوا ہے اور میٹھا نہیں

علاوہ ازیں نظموں میں چھوٹی چھوٹی نظمیں بھی ہیں۔ جیسے حضرت غالبؔ سے ملاقات، ایثار، غالبؔ اور ذوقؔ، ایک خط کے جواب میں، پریتم کی یاد میں، محبوب کی یاد میں، قطعۂ تاریخ وفات غلام محمود فاضلی (یہ نازکی صاحب کے سسر تھے) ان کا ایک مرثیہ بھی لکھا گیا۔ علامہ اقبالؔ کا قطعۂ تاریخِ وفات اور مرثیہ کے انداز میں کئی اشعار، خدمت قوم، نمازِ باحضور، ایک تصویر کو دیکھ کر، تصویر اور مصوّر، کسی کو دیکھ کر یادِ ایامِ عیش و آزادی، یادِ انیس حیات، پہاڑی، غریب الوطن کی عید، بورڈنگ ہاؤس، شیخ محمد عبداللہ سے خطاب، عبداللہ وکیل کی آپ بیتی، وغیرہ

ایک دلچسپ بات کا اظہار اس سے ہوتا ہے کہ نازکی صاحب کے منشی محمد دین فوقؔ کے صاحبزادے بابو ظفر الحق سے مراسم تھے کیوں کہ نازکی صاحب ایک قطعۂ تاریخ تولدِ فرزند بابو ظفر الحق خلف منشی محمد دین فوقؔ، تحریر کیا اور یہ اس بیاض میں شامل ہے۔

نیرّ اقبال کا مطلع ترا گھر ہوگیا	از ظفر سارا ظفر منزل منوّر ہوگیا
حسنِ یوسف کی طرح ہے دہر میں یکتا	لاڈلا ماں باپ کا دادا کا......ہوگیا
میں نے دیکھے تھے بہت اسمائے تاریخی مگر	سوچنے پر بس ظفر مسلم برابر ہوگیا

یا خدا وہ دن دکھادے جبکہ 'کشمیری' مجھے
آکے کہدے گا 'ظفر مسلم' کلکٹر ہوگیا

......صاف پڑھا نہیں جاتا۔ اور 'کشمیری' کون ہے اس کا سراغ نہیں ملتا۔

کیا پتہ فرزند فوقؔ کو کشمیری کہتے ہوں گے؟

نظموں کے تذکرے کو اس مختصر مگر بڑی خوبصورت نظم پر ختم کرتے ہیں۔

اس کا عنوان ہے 'ایک خط کے جواب میں'

بعد مدت سلام لکھتا ہوں حسرتوں کا پیام لکھتا ہوں
شبِ فرقت میں جو عذاب رہا اس کا قصہ تمام لکھتا ہوں

کیا سناؤں کہ مدتوں سے دل یار کا موردِ عتاب رہا
عرض کیا کرسکوں میں اے بھائی شبِ فرقت میں کیا عذاب رہا
جب ہوا ان سے سامنا میرا بت کی مانند لاجواب رہا
وصل کی رات صبح تک لب پر شکوۂ جور و آفتاب رہا
ان کی محفل میں میرا خونِ جگر جانشیں شرابِ ناب رہا
یہ دل اب ناز جس پہ ہے مجھ کو مدتوں خانۂ خراب رہا

اب وہ دل ہی نہیں رہا جس میں آرزو صبح و شام رہتی تھی
یار کے آگے روئیدادِ قفس شرم سے ناتمام رہتی تھی
آہ وہ دن کہاں ہوئے رخصت جب تمنّا غلام رہتی تھی
اب میں جینے کی نقل کرتا ہوں
موت کی آرزو میں مرتا ہوں

۶ ساون ۱۹۹۳ بکرمی

نازکی صاحب کی یہ نظمیں پڑھتے ان کی روانی، اپنی طرف کھینچ لیتی ہے، افسوس کہ انہوں نے اس صنف کا ساتھ چھوڑ دیا اور 'دیدۂ تر' کے بعد سنجیدگی سے نظمیں لکھنے کی طرف دھیان نہیں دیا۔ کشمیر کی کہانی، حُسنِ فطرت اور بزم انجم ایسی تین نسبتاً طویل نظمیں ہیں جن میں سماجی اور سیاسی شعور بولتا ہے۔

ان اور ایسی کئی اور نظموں میں ایک کمیٹمنٹ صاف صاف دکھائی دیتی ہے اور ظاہر ہے یہ ترقی پسندی کی برپا ہونے والی تحریک کے اثرات رہے ہوں۔ کسی

موڑ پر نازکی صاحب ترقی پسندی اور کسی حد تک رومان پرور شاعری دونوں سے اپنا دامن بچا کر نکل گئے اور اپنی ایک الگ راہ تلاش کرنے میں لگ گئے۔ بیاض کے یہ اوراق اس موضوع پر کام کرنے والے محققین کیلئے کئی کڑیاں ملانے کا کام کریں گے۔

اب ذرا نازکی صاحب کی اس بیاض میں شامل غزلوں کی طرف ایک نگاہ ڈالتے چلیں۔ نازکی صاحب بالآخر غزل کے ہی شاعر ہو گئے اور ان کا ایک اپنا سٹائل قائم ہوا۔ اس سٹائل کی ابتداء بھی ان ہی اوراق میں ہوتی نظر آتی ہے، بعد میں دیکھی جانے والی قادر الکلامی اور ایک مخصوص دلنشیں انداز جو نازکی صاحب کی آخری تصنیف 'متاعِ فقیر' کی غزلوں کی پہچان ہیں ان ابتدائی غزلوں میں بھی کہیں کہیں جھلکتی دکھائی دیتی ہیں۔ سب سے پہلی غزل کا تذکرہ گزشتہ صفحات میں ہو چکا۔ اب دیکھئے جس غزل نے بزمِ اخوان الصفا کے اہتمام سے علامہ فطرتؔ کشمیری کے دولت خانے پر منعقد مشاعرے میں موجود حضرت روشؔ صدیقی احسانؔ دانش اور حفیظ جالندھری کی توجہ اپنی جانب کھینچی تھی وہ بھی اس بیاض میں موجود ہے۔ اگرچہ اس کے ساتھ تاریخ درج نہیں کی گئی مگر اس غزل سے پہلے اور بعد کی غزلوں پر ۱۹۹۳ بکرمی درج ہوا ہے، تو اغلب امکان یہی ہے کہ یہ غزل ۱۹۹۳ بکرمی یعنی ۱۹۳۷ء کے آس پاس معرضِ وجود میں آ گئی ہو۔ اس غزل کا جو شعر کہنہ مشق حضرات کی فوری توجہ کا باعث بنا یہ تھا:

جہاں جاتا ہوں پہلے حال کہتا ہوں حسینوں کا
ادب کرتا ہوں ان کا شانۂ دل کے مکینوں کا

اور غزل کے بقیہ اشعار یہ نقل ہوئے ہیں۔

پرستش حسن کی کرتا ہو دل اس کا فدائی ہے
رہا ہو تابع فرمان جو دل سے مہ جبینوں کا
کہاں پر سایہ گستر ہے وہ سروِ باغِ محبوبی
کہاں پر ناچتا پھرتا ہے جھرمٹ نازنینوں کا
یہ تم نے آسماں پر چودھویں کا چاند دیکھا ہے
اِسی صورت میں وہ بھی زیب و زینت ہے زمینوں کا
میں اس رشکِ قمر کے ہجر میں روتا رہا راتوں
نہ پوچھو حال، میری گریہ سے تر آستینوں کا
جو کوئی شعر کہتا ہوں تو اِک لذّت سی پاتا ہوں
ستائش کی تمنا ہے، نہ ڈر ہے نکتہ چینوں کا

دیگر غزلوں کے چیدہ چیدہ اشعار یوں ہیں

کوشش کرو ہزار تم اخفائے راز کی — الفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا
اے سنگ دل، یہ دل میرا عادی ہے ظلم کا — اس کو ستائیو تو ستایا نہ جائے گا
نازک سا نکتہ دان غنیمت ہے آج کل — ایسا ظریف طبع بھی پایا نہ جائے گا

قطعہ

عاشقوں کا رہنما ہے جذبۂ شوقِ حبیب
ورنہ طاقت کیا ہے عاشق کی بچارا ہے غریب
عشق کی علت یہاں پائی گئی ہے لاعلاج
ازسر بالین من برخیز اے ناداں طبیب

۱۹۸۷ بکرمی

میں نے ان سے لئے ہیں جو بوسے
ان کا ہر دم حساب ہوتا ہے
غیر لوگوں کا آنا اور جانا
ان کے ہاں بے حساب ہوتا ہے

۱۹۸۶ بکرمی

فکر وصل صنم ہے میرا انیس
ذکر دلبر مدام ہوتا ہے
قولِ نازک کو دیکھ لو یارو
خوب میٹھا کلام ہوتا ہے

۱۹۸۶ بکرمی

تذکرہ مت چھیڑ مجھ سے سیرِ گلشن کا کبھی
کام کیا ہے دل شکستوں کو میانِ باغ و راغ
چھوڑ دے نازکؔ غزلخوانی خدا کے واسطے
ہم نے جانا تجھ سا اب کوئی نہیں روشن دماغ



طبیبِ بے خبر اٹھ جا ہے علت لادوا میری
رہوں میں مبتلائے درد ہجراں ہے دعا میری
رخِ زیبائے گل پر اشک شبنم کا ترشح ہے
قفس میں آج کیوں ہے عندلیب خوشنوا میری

۱۹۸۶ بکرمی

گن رہا ہوں ہجر میں گردوں کے تارے رات بھر

مجھ کو تجھ بن نیند بھی آئی نہ پیارے رات بھر

دیکھ لو ان میں سے حال عشرت و مسٹر قدیر

وہ بھی آہ و نالہ کرتے ہیں بچارے رات بھر

اے غم و رنج و الم کے ہم نشیں آ بیٹھ جا

نغمہ سن لیں کشن گنگا کے کنارے رات بھر

۱۹۸۸ بکرمی

عشرتؔ سے مراد نجم الدین دیوانی عشرتؔ اور قدیرؔ سے مراد عبدالقدیر فاضلی ۔ یہ دونوں حضرات نازکی صاحب کے ساتھ محکمہ تعلیم میں مدرّس تھے، دونوں کا تعلق بانڈی پورہ سے تھا اور دونوں مظفر آباد میں نازکی صاحب کے ساتھی تھے جب وہ مدرس کی ٹریننگ کر رہے تھے۔ ان کا تذکرہ پہلے صفحات میں آچکا ہے۔

دِن گن رہا ہوں ہجر کے اب بار بار میں

ایسا نہ ہو کہ سہو کہیں ہو شمار میں

مرنا تو ہر کسی کیلئے لازمی ہے پر

یارب نہ موت آئے پرائے دیار میں

۱۹۸۹ بکرمی

میں تمہارے روئے پُر انوار پر پروانہ وار

جان دیدوں گا کروں گا زندگی اپنی نثار

کیا خبر اس کشمکش کا کس طرح انجام ہو

وہ تغافل کا مجسم، میں سراپا انتظار

۱۹۹۰ بکرمی

مضطرب ہوں تیرے در کی پاسبانی کیلئے
جیسا پیاسا چشمہ کوثر کے پانی کیلئے
اس قدر کافی سمجھ رکھا ہے حق نے نازکیؔ
چار دن کی زندگی دنیائے فانی کیلئے

۱۹۸۷ بکرمی

آج قاتل نے مری گردن پہ خنجر رکھ دیا
بارِ احسان وتشکر میرے سر پر رکھ دیا
دل سے بڑھ کر قیمتی کیا شے ہے دلداروں کے پاس
تیرے آگے میں نے اس کو بھی میتسر رکھ دیا
نازکیؔ نے تیرے خوش کرنے کو تیرے سامنے
تیرنے کے واسطے دل کا سمندر رکھ دیا

۱۹۸۸ بکرمی

کبھی وعدۂ وصل جھوٹا نہ کرنا
بڑے دھن کے پکے ہو ایسا نہ کرنا
مجھے یار نے آج نوٹس دیا ہے
خبردار! میرا نظارہ نہ کرنا

۱۹۸۸ بکرمی

ملی ہے کون سی دولت تمہیں ستا کے مجھے
بنے کہاں کے شہنشاہ تم رُلا کے مجھے

۱۹۸۸ بکرمی

نازکی کرتا ہے جاں اپنی نثارِ گُلرخاں
مہوشانِ ناز اس کی عقل تک بھی کھا گئے

۱۹۸۸ بکرمی

زیست کی امید چھوڑی دیکھ کر تیرا شباب
اک نگہ سے عقل کا پیرِ کہن مارا گیا
عاشقوں کی انجمن کا صدر ٹھہرا نازکی
کون ٹھہرے جب کہ صدرِ انجمن مارا گیا

چل دیا چشمے کی جانب لے کے میں تصویرِ یاس
دل کی الجھن جا کے سطحِ آب پر کائی ہوئی
طائرِ عقل و خرد پھر مایل پرواز ہے
فصلِ گل میں پھر جنوں کی کار فرمائی ہوئی

۱۹۹۳ بکرمی

ہے ازل سے واعظ و ناصح سے مجھ کو اختلاف
میری صحبت میں ہمیشہ ساغر و مینا رہے
اب رخِ روشن کی نوبت ہے منادی کیجیے
گوشہ ظلمت میں سکندر کا آئینہ رہے
دیدۂ بدخواہ محبوبانِ فردوسی نژاد
چشمِ نرگس کی طرح حیران و نابینا رہے
مال و دولت کی تمنا سے گیا گذرا ہوں میں
میرے قبضے میں سخندانی کا گنجینہ رہے

۱۹۹۴ بکرمی

قیمتی دل کو تجھے سونپا مگر قیمت نہ لی
میں بنا گندم فروشِ جو نما تیرے لئے
تم نے میرے حال کی پرسش گوارا تک نہ کی
میں نے جھیلیں آفتیں بے انتہا تیرے لئے
کرچکا تقسیم قسام ازل روزِ ازل
عاشقی میرے لئے نازو ادا تیرے لئے
رنج وغم میں نے سہے درد والم میں نے سہے
خوار وا بتر میں ہوا اے دلربا تیرے لئے
عید کے دن میں ترے دربار میں جب آ گیا
عیش کا دن بن گیا بزمِ عزا تیرے لئے
کام کتنے ہوسکیں میرے جگر کے خون سے
ہو غذا میرے لئے رنگ حنا تیرے لئے
جانتے ہو کیوں دھڑکتا ہے مرا دل اِس قدر
......کمسن ہو یہ ہے جھنجھنا تیرے لئے
ہو نصیبِ دشمناں تکلیف میری موت
میرے مرنے کی خبر ہے جانفزا تیرے لئے

۱۹۸۹ بکرمی

نو بہاریں دیکھ لی ہیں اِس چمن نے سینکڑوں
بلبلیں دیکھی ہیں اب تک نسترن نے سینکڑوں

تیری دوری میں مری آنکھوں کے دو دریا بہے
گھر بہائے اس مرے گنگ وجمن نے سینکڑوں
تیرِ مژگاں خنجر بنی ، کماں ابرو بکف
صف الٹ ڈالے ہیں، میرے صف شکن نے سینکڑوں



کبھی ہنس ہنس کے تم کرتے ہو زخموں پر نمک پاشی
نہ آنا شاد ہو کر تم کسی ناشاد کے آگے
نسیمِ صبح کو لانے بھی دو پیغامِ آزادی
قفس کی تیلیوں کو نوچ دوں صیاد کے آگے



زندگی میری مثالِ ساز پر آہنگ ہے
میرے دل کے سامنے ساکت رباب و چنگ ہے
نظمِ عالم دیکھ کر سب فلسفی حیران ہیں
زمرۂ اربابِ دانش کا تدبّر دنگ ہے
نازکی نے عزم غوصی کیا اِس بحر میں
قافیہ جس کا مثالِ غنچۂ دل تنگ ہے



بہار آئی ہوئی تھی صحنِ گلشن عنبر افشاں تھا
قفس کی چار دیواری نہایت سخت جاں نکلی
میں سمجھا تھا کہ بلبل عشق گل میں جان دیتی ہے

مگر یہ بھی ہماری حسرتوں کی نوحہ خواں نکلی
خیال آیا تھا دل اپنا کسی کی نذر کردیں گے
مگر دیکھا تو تیری یاد اسکی پاسباں نکلی
مجھے دھوکہ رہا نازک بدن میں دل بھی نازک ہے
مگر پوشیدہ اس دیبائے چینی میں چٹاں نکلی

☆☆☆

"شیرازہ" میں کشمیری، ڈوگری، پنجابی، لداخی اور بلتی کی منظومات شائع ہوتی ہیں بشرطیکہ اُن کے ساتھ اُردو ترجمہ بھی شامل ہو۔ (ایڈیٹر)

☆☆

تحفۂ دَرویش

(میر غلام رسول نازکی کے اَدب پاروں سے انتخاب)

میر غلام رسول نازکی کاشمیری

غبارِ کارواں

شہنشاہ اکبر جلال الدین سے بہت پہلے کشمیر کے سلطان زین العابدین کے دربار میں نَورتن تھے، ان میں سے ایک میر علی محمد بخاری تھے، جو سلطان کی درخواست پر ترکِ وطن کر کے بخارا سے کشمیر آئے اور یہاں قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز رہے۔ میر علی محمد بخاری کا خاندان اپنی نجابت و شرافتِ اور علمی فضیلت کی بناء پر کشمیر میں ہمیشہ مرجع خلائق رہا اور ان کی اولادِ صالح نے اپنا آبائی پیشہ بدستور اپنائے رکھا۔ ان میں سے قاضی محمد موسیٰ شہید اور میر نازک قادریؒ نے علم و فضل کے علاوہ عالمِ روحانی میں بھی نام پایا اور تاریخِ کشمیر کے اوراق اِن کے ذکر سے منوّر ہیں۔ میر نازک قادریؒ کی وفات ۱۰۲۲ ہجری میں ہوئی۔ وہ کشمیر میں سلسلۂ قادریہ کے بانی تھے۔ حضرت اسماعیل شامیؒ غیبی ارشاد پا کر کشمیر آئے تھے اور حضرت میر نازک قادریؒ کو سلسلۂ قادریہ میں بیعت فرما گئے تھے۔
یہی میر نازک قادریؒ اس نامہ سیاہ کے مورثِ اعلیٰ ہیں اور انہی کی نسبت سے ہمارا خاندان نازکی کہلاتا ہے۔ حضرت میر نازک قادری کا مزار پُرانوار سری نگر کے محلّہ

کادی کدل میں آج بھی ہزاروں تشنگانِ فیض کو سیراب کرتا ہے اور صبح وشام لاتعداد زائرین کا ہجوم اس خرمنِ فیض سے خوشہ چینی کرتا رہتا ہے۔ میری ولادت اسی محلے میں ۴ ربیع الاول ۱۳۲۸ھ یوم چہار شنبہ، مطابق ۱۶ / مارچ ۱۹۱۰ء بوقتِ صبح صادق ہوئی تھی۔ میری ولادت کے دو برس بعد میرے والدِ بزرگوار میر غلام مصطفیٰ نازکی نے سرینگر سے ہجرت فرمائی اور سرینگر سے ۳۴ میل دور بانڈی پور کے نزدیک ایک چھوٹے سے گاؤں میں سکونت اختیار فرمائی۔ بانڈی پور کا علاقہ بڑا مردم خیز ہے۔ یہ قصبہ ایشیا کی سب سے بڑی جھیل ولر کے کنارے آباد ہے اور سیاحوں کی کشش کا مرکز ہے۔ اس علاقے نے بڑے اصحابِ علم و فضل پیدا کئے ہیں جن میں حسن شاہ مورّخِ کشمیر اور ان کے بھانجے عبدالاحد نادمؔ، کشمیر کی تاریخ میں رہتی دنیا تک یاد رہیں گے۔ عبدالاحد نادمؔ نے کشمیری زبان میں نعتیں لکھی ہیں، جو ہر گھر میں پڑھی جاتی ہیں اور انہیں بجا طور پر حسانِ کشمیر کا لقب دیا گیا ہے۔ میرے والدِ بزرگوار فارسی اور عربی کے بڑے جیّد عالم تھے، نماز روزہ اور تہجد کے عمر بھر پابند رہے۔ گھر میں سوائے دولتِ علم اور کوئی چیز نہ تھی۔ اکثر اوقات فقر وفاقہ رہتا تھا۔ مگر توکّل کا یہ عالم تھا کہ کسی کے سامنے اپنی حاجت بیان نہ کرتے۔ ساری عمر تبلیغِ دین اور درسِ قرآن وحدیث میں مصروف کی۔ بانڈی پور جا کر ان کی صحبتیں عبدالاحد نادمؔ سے رہیں اور یہ دونوں یارِ غار بنے۔ میں نے جب آنکھ کھولی، تو اپنے گرد کتابوں کے انبار کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ رات دن علمی چرچا رہتا۔ اور جب ذرا شعور بالغ ہوا تو والد مرحوم و مغفور نے بڑی دل سوزی اور توجہ سے پڑھانا شروع کیا۔ ابتداء میں حسب رواج کلام اللہ پڑھایا، ان کا ارادہ مجھے کلام اللہ حفظ کرانے کا تھا، مگر ابتدائے عمر میں میری صحت اچھی نہیں رہتی

تھی۔اس لئے یہ ارادہ چھوڑ دیا مگر قرآنِ حکیم کی ناظرہ تلاوت اس سختی سے کرائی کہ آج تک اس سے لذّت یاب ہوں اور ہر روز ایک دو پارے پڑھے بغیر چین نہیں آتا۔قرآنِ کریم کے بعد صرف ونحو،عربی کے ابتدائی رسائل اور فارسی کی ابتدائی کتابیں شروع کیں۔اللہ کے فضل سے ذہین تھا اور جو بات ایک دفعہ کان میں پڑ جاتی تھی ، وہ نقش ہو کر رہ جاتی۔بارہ برس کی عمر میں قرانِ حکیم کا ترجمہ صرف ونحو کی بہت سی کتابیں اور فارسی میں پنج گنج نظامی کی تحصیل سے فارغ ہو چکا تھا اور اَب والدِ بزرگوار نے مجھے اوروں کو پڑھانے پر مامور فرمایا تھا۔ان کا ارادہ مجھے مرّوجہ تعلیم دلانے کا ہرگز نہ تھا۔اتفاق سے اس زمانے میں سری نگر کے محلّہ نوشہرہ کے ایک استاد غلام محی الدین صاحب بانڈی پور کے سکول میں تبدیل ہو کر آئے۔یہ صاحب عقیدتاً احمدی تھے اور اربابِ علم کی تلاش میں رہتے تھے تاکہ مناظرہ کر سکیں۔بانڈی پور میں میرے والد بزرگوار،علماء کے سرتاج تھے۔ان کے پاس بھی آنے جانے لگے۔مجھے یہ یاد نہیں کہ ان سے کوئی مناظرہ ہوا یا نہیں۔مگر انہوں نے مجھے اس چھوٹی سی عمر میں فارسی کا فارغ التحصیل دیکھا تو حیران ہوئے۔اور میرے والد بزرگوار سے کہا کہ آپ اتنے ذہین بچے کو مرجہ تعلیم نہ دلا کر بڑا ظلم کر رہے ہیں۔کئی ماہ کے ردوقدح کے بعد میرے والد مجھے سکول بھیجنے پر آمادہ ہوئے اور میں پہلی دفعہ سکول گیا تو مجھے چوتھی جماعت میں داخل کر دیا گیا۔اردو زبان کے ساتھ اس سے پہلے مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی۔بانڈی پور میں اس زمانے میں لوئر مڈل سکول تھا۔میں نے چھٹی جماعت کا امتحان پاس کیا تو تعلیم کو جاری رکھنے کا مسئلہ درپیش آیا۔آخر کار میں سرینگر آیا اور اپنے قدیم آبائی محلے کادی کدل میں اپنے بنی اعمام کے ہاں فروکش ہوا۔نصرۃ الاسلام ہائی

سکول میں داخل ہوا اور ۱۹۲۶ء میں مڈل اور پنجاب یونیورسٹی سے منشی کے امتحانات بیک وقت پاس کئے۔ گھر میں سخت افلاس تھا۔ تعلیم کو جاری رکھنا ممکن نہ تھا۔ اس لئے تلاشِ معاش کی فکر ہوئی تاکہ والد صاحب کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔ بانڈی پور جا کر بیٹھا رہا۔ ایک روز بیٹھے بٹھائے اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس کے نام نوکری کیلئے درخواست بھیج دی۔ ان کا دفتر سوپور میں تھا۔ انہوں نے مجھے بلایا۔ مڈل اور منشی کے سرٹیفکیٹ دیکھے تو کچھ حیران سے ہوئے۔ بولے۔ اتنی چھوٹی عمر میں تم نے منشی کا امتحان پاس کیا ہے۔ مگر کسی سکول میں جا کر کیا کرو گے۔ بہر صورت انہوں نے مجھے اپنے گھر سے چالیس میل دور آٹھ روپے مہینے پر استاد مقرر کر کے بھیج دیا۔ یہ چالیس میل مجھے پیدل طے کرنا تھا۔ اور دو روز میں میں منزل مقصود پر پہنچا۔ یہ ایک پرائمری سکول تھا۔ اس میں ایک چھوٹی سی لائبریری تھی۔ جو میرے چارج میں تھی۔ سکول میں کافی کام رہتا تھا۔ میں نے لائبریری کی کتابیں ایک ایک کر کے نکالیں اور گھر میں انہیں پڑھتا رہا۔ مجھے یہ معلوم نہیں کہ یہ کتابیں اس گاؤں کے سکول کی لائبریری میں کس نے رکھی تھیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ میری زندگی میں جو نیا موڑ آیا وہ اسی لائبریری نے دیا۔ اس لائبریری میں مولوی نذیر احمد کی کتابیں توبۃ النصوح، ابن الوقت، فسانۂ مبتلا، رتن ناتھ سرشار کا فسانۂ آزاد، مولوی محمد حسین کی آبِ حیات وغیرہ اعلیٰ پائے کی کتابیں تھیں اور ان کتابوں نے مجھ پر اپنی گرفت اتنی مضبوط کر دی کہ میں نے انہیں کئی کئی مرتبہ پڑھ ڈالا اور طبیعت پھر بھی سیر نہ ہوئی۔ مجھے اب بھی یاد ہے کہ مولوی محمد حسین آزاد کی آبِ حیات میرا روز کا وظیفہ بن گئی اور میں کم و بیش اس کا حافظ بنا۔ اور اسی کتاب نے میرے اندر اردو ادب کا ذوق پیدا کیا۔ اور اسی زمانے میں نے اردو

میں شاعری شروع کی۔ ابتداء میں غزلیں لکھتا رہا اور اس دور کی تمام غزلوں کو میں نے ضائع کردیا ہے اور اب مجھے ان میں سے کوئی غزل یا کسی غزل کا کوئی شعر بھی یاد نہیں۔ کچھ عرصے کے بعد میں بانڈی پور کے لوئر مڈل اسکول میں تبدیل ہو کر آیا اور یہاں میں نے اپنے والد بزرگوار کو اردو کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی، مگر ان کی طبیعت اردو کی طرف راغب نہ ہوسکی۔ بانڈی پور سکول کی لائبریری میں مجھے پہلی دفعہ اقبال کی بانگِ درا پڑھنے کو ملی اور اس نے مجھے تمام کتابوں سے برگشتہ خاطر کردیا۔ رات دن اس کا مطالعہ جاری رہا تو ایک روز والد بزرگوار نے مجھ سے پوچھا یہ کونسی کتاب ہے۔ میں نے حاضر کردی اور وہ اسے پڑھنے لگے اور دس بارہ روز تک صرف اسی کے مطالعے میں مشغول رہے۔ اسی کتاب نے انہیں بھی میری طرح اقبؔال کا پرستار بنادیا۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے اور میں نے اقبؔال کا فارسی کلام بھی پڑھا۔ اور ہماری نظریں کھل گئیں۔ اقبال کا ایک شعر تو والدِ مرحوم کو اتنا عزیز تھا کہ موت سے پہلے اکثر اسے پڑھتے رہتے تھے۔

اگر سیاہ دلم داغ لالہ زار توام
وگر کشادہ جبینم گل بہارِ توام

اس دوران میں نے اپنی تعلیم سرگرمیاں بھی جاری رکھیں اور پنجاب یونیورسٹی لاہور سے منشی عالم، منشی فاضل، ادیب عالم اور ادیب فاضل، میٹرک اور ایف اے کے امتحانات پاس کئے۔ بی اے کا امتحان میں نے کشمیر یونیورسٹی سے حصول آزادی کے بعد پاس کیا۔ محکمہ تعلیم میں کوئی قدر افزائی نہ ہوئی۔ ۱۹۳۸ء میں خواجہ غلام السیدین ناظم تعلیمات بن کر آئے، تو استادوں کی ذرا قدر ہونے لگی۔ میں اس زمانے میں سری نگر کے ایک سکول میں استاد تھا۔ مجھے انکی

بچیوں کو پڑھانے پر مامور کیا گیا۔ کچھ عرصے بعد انہوں نے مجھے اپنا لیٹریری اسسٹنٹ بنادیا۔ محکمہ تعلیم کی طرف سے ایک رسالہ تعلیم جدید کے نام سے نکلتا تھا۔ میں اس کا ایڈیٹر مقرر رہا۔ اس کے بعد میں ٹیچرز ٹریننگ سکول میں استادِ زبان کے عہدے پر فائز ہوا۔ پھر اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر بنا۔ ۱۹۴۷ء میں کشمیر پر قبائلی حملہ ہوا اور سارا انظام کچھ دیر کے لئے درہم برہم ہوا۔ ۱۹۴۸ء میں زمام اختیار جناب شیخ محمد عبداللہ کے ہاتھ میں آگئی اور انہوں نے مجھے محکمۂ تعلیم سے نکال کر پہلے جموں اور پھر سرینگر کے ریڈیو سٹیشن میں پروگرام اسسٹنٹ مقرر کیا۔ سرینگر ریڈیو سٹیشن کا افتتاح یکم جولائی ۱۹۴۸ء کو ہوا اور اس کا پہلا اعلان میں نے کیا۔ ۱۹۵۴ء میں سرینگر ریڈیو آل انڈیا ریڈیو کے ساتھ مدغم ہوا۔ اور ۱۹۶۴ء میں تقریباً چالیس سال کی ملازمت کے بعد میں ریٹائر ہوا۔ ریڈیو کشمیر میں انتھک محنت کے باوجود میں کوئی قابلِ قدر ترقی نہ کر سکا اس لئے کہ میں بخشی غلام محمد صاحب کو خوش نہ کر سکا۔ ریٹائر ہونے کے بعد خواجہ غلام محمد صادق مرحوم نے ایک کشمیری ہفتہ وار ''چمن'' کی ادارت میرے سپرد کی جو اب تک جاری ہے۔

۱۹۳۸ء کا سال کشمیر میں بڑا صبر آزما وقت تھا۔ اسی سال مسلم کانفرنس کو توڑ کر اسے نیشنل کانفرنس بنادیا گیا۔ اس کا آفیشل آرگن ہمدرد تھا اور میں اسکا معاون خصوصی تھا۔ میری قومی نظمیں اس میں قلمی ناموں سے چھپتی تھیں۔ پنڈت کشپ بندھو کے اخبار دیش میں بھی میں 'غنی' کے نام سے انقلابی نظمیں لکھتا تھا۔ خالد ایک اور پرچہ تھا جس کی ادارت درپردہ میرے ذمے تھی۔ مولانا محمد سعید مسعودی نے اخبار خدمت سنبھالا تو اس کی ترتیب کا سارا کام مجھ پر چھوڑ دیا اور یہ سارا کام میں اس لئے درپردہ کر رہا تھا کہ گلے میں ملازمت کا طوق تھا۔ اس

زمانے میں کشمیر میں موسم گرما میں ہندوستان کے ہر حصے سے شعراء کرام آتے اور کشمیر میں ہر روز کوئی نہ کوئی نشست یا مشاعرہ ضرور ہوتا۔ میں ان مشاعروں میں شرکت کرنے سے گھبراتا تھا۔ آخر ایک روز سید مبارک شاہ صاحب فطرتؔ گیلانی کے دولت خانے پر ایک نشست ہوئی جس میں احسان دانش، روش صدیقی، حفیظ جالندھری کے علاوہ بے شمار شعراء موجود تھے۔ مجھے بھی مجبور کردیا گیا کہ کچھ پڑھوں۔ میں نے ڈرتے ڈرتے غزل پڑھی۔ مطلع تھا۔

جہاں جاتا ہوں پہلے حال کہتا ہوں حسینوں کا
اَدب کرتا ہوں اِن کا شانۂ دل کے مکینوں کا

یہ مطلع سن کر سارا مجمع پھڑک اٹھا اور ہر طرف سے مجھ پر داد و تحسین کے پھول برسنے لگے۔ محفل میں حضرت مولانا محمد سعید مسعودی بھی تھے، جو مجھے جانتے تھے مگر میری شاعرانہ صلاحیتوں کا علم انہیں ابھی نہ تھا۔ انہوں نے میرا حوصلہ بڑھایا اور اس کے بعد میری جھجک دور ہوئی اور میں اعتماد کے ساتھ مشاعروں میں پڑھنے لگا، مقامی اخبارات میں میرے کلام کی مانگ ہوئی۔ اب میں یہ تمنا کرنے لگا کہ میرا کلام ریاست سے باہر کے رسائل میں چھپ جائے۔ اس سلسلے میں میں نے ادبِ لطیف، لاہور اور ادبی دنیا کے ساتھ خط و کتابت کی، مگر کافی عرصے تک انہوں نے میرے کلام کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ ایک روز میں نے تنگ آکر اپنی ایک نظم جوشؔ ملیح آبادی کو بھیج دی۔ انہوں نے یہ نظم بلا ترمیم اپنے رسالہ کلیم میں نمایاں طور پر چھاپ دی اور اس کے بعد کلیم سے یہ نظم ادبِ لطیف لاہور اور ادبی دنیا نے بھی نقل کردی۔ حالانکہ وہ اس سے پہلے اس نظم کو رد کرچکے تھے۔ اب میرا کلام ادب لطیف، ادبی دنیا کے علاوہ ہمایوں میں

بھی چھپنے لگا۔ مجھے یاد ہے کہ میری سب سے پہلی غزل میاں بشیر احمد نے ہمایوں میں ایک نوٹ کے ساتھ شائع کی تھی۔ اس غزل کے دو شعر یہ ہیں:

اس شوخ کو کیا دیکھا آنکھوں میں سمٹ آئی
کشمیر کی شادابی، شیراز کی رعنائی
ہر شے کی حضوری میں جھکوا دیا سر میرا
اے ذوقِ جبیں سائی، اے لذّتِ رسوائی

اب میں نے ادبی دنیا میں اپنے لئے جگہ بنائی تھی۔ ملک کی آزادی کے بعد علم و ادب کے افق اور روشن ہونے لگے۔ کشمیر کے علاوہ جموں، دلی، جودھپور، جے پور، اندور، ناگپور، بٹالہ، جالندھر، لکھنو وغیرہ شہروں میں مشاعرے ہوئے اور میں نے ان میں شرکت کی۔ میرے اردو کلام کا مجموعہ دیدۂ تر کے عنوان سے ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد کا کلام ابھی منتشر حالت میں ہے اور غیر مطبوعہ ہے۔

نثر کے سلسلے میں میرا خاص موضوع تصوّف اور کشمیر میں فارسی کا مقام رہا ہے۔ اس وقت تک کم و بیش دو سو مضامین ملک کے مختلف رسالوں میں شائع ہوئے ہیں۔ آجکل میں ان کی تسوید کر رہا ہوں اور انہیں کتابی صورت میں چھاپنے کا ارادہ ہے۔

نظمیں میں نے بہت کم لکھی ہیں۔ البتہ غزل، قطعات اور نعتیں اکثر لکھتا ہوں۔ ۱۹۵۳ء تک میں صرف اردو اور کبھی کبھی فارسی میں لکھتا رہا۔ اس کے بعد کشمیری میں بھی لکھنے لگا۔ کشمیری میں میں نے زیادہ تر قطعات لکھے ہیں اور ایک مجموعہ نمرودنامہ کے نام سے شائع ہوا ہے۔ کچھ غزلیں بھی لکھی ہیں۔ انشاء اللہ

انہیں بھی شائع کر دیا جائے گا۔

فارسی میں جو کچھ لکھا ہے بہت کم ہے۔ مگر یہ کہنا شاید خودستائی نہ ہوگا کہ اس کا معیار بہت اونچا ہے۔ ماسکو میں مشاعرہ کے نام سے فارسی نمائندہ ادب کا ایک مجموعہ شائع ہوا ہے۔ اس میں میری ایک فارسی غزل شامل کردی گئی ہے۔ وہ غزل یہ ہے،

از تو قائم گرمے ہنگامہ بود ونبود | خیز وکم کن شکوہ ہائے گردش چرخ کبود

روزگارے درخم ابروے دلبر باختم | زاں سبب پیش خداوندے نیا وردم سجود

مرغکے دیشب بگلزارے بشاخ می سرود | شاہد گل را ثباتے نیست دل دادن چہ سود

ہر کہ راحسنے عطا کردند او قاتش کم است | بلبل از گل، گل ز شبنم، شبنم از انجم شنود

جنتِ کشمیر رانازم کہ حسن ایں دیار

عشوہ کرد و دل ایرانیاں باخود ربود

بیوی اور اولاد کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے خوش نصیب واقع ہوا ہوں۔ عائشہ گزشتہ اڑتالیس سال سے میری شریک سفر ہے۔ اس نے میرے ساتھ رہ کر شیرینیاں کم اور تلخیاں زیادہ برداشت کی ہیں اور کبھی اس کے ماتھے پر شکن نہیں آئی ہے۔ وہ فطرتاً فیاض واقع ہوئی ہے اور اس کی فیاضی نے مجھے ہمیشہ تنگدست رکھا ہے۔ درجنوں نادار یتیم اور مفلس بچوں کی پرورش اور تعلیم کا انتظام اس نے کیا جو آج اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ صوم وصلواۃ کی سختی سے پابند ہے اور سفرِ حج میں بھی میرے ساتھ تھی۔ آج بھی جب اس کی عمر ساٹھ برس سے تجاوز ہے۔ صبح چار بجے اٹھتی اور رات کے بارہ بجے تک مصروف رہتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس نے اپنے وجود کو میرے اور بچوں کے وجود میں گم کردیا ہے۔ میری

ایک بیٹی اور سات بیٹے ہیں۔ بیٹی ایک خوشحال سادات کے گھرانے میں ہے۔ بچے سب کے سب اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ کچھ ان میں سے اچھے اچھے منصبوں پر فائز ہیں اور کچھ ابھی زیرِ تعلیم ہیں۔ الحمد اللہ دین سے بدظن نہیں ہیں، اگرچہ بے عمل ہیں جس کا مجھے رنج ہے۔

میری زندگی جیسی بھی ہے وہ سب سے پہلے اپنے والد بزرگوار سے متاثر ہوئی ہے۔ ان کے بعد اقبالؔ، سعدیؔ، رومیؔ، ابن یمین، غالبؔ، میرؔ اور میر دردؔ نے مجھے بہت کچھ دیا ہے۔ عہدِ حاضر کے لکھنے والوں میں سے مولانا عبدالماجد دریابادی سے بہت متاثر ہوں اور انہی کی وساطت سے حکیمِ امت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے افکار سے روشناس ہوا اور تمنا ہے کہ حشر کے دن ان کا دامن تھام سکوں۔ بہت گئی تھوڑی رہی، اپنے اعمال کو دیکھتا ہوں، تو حیران ہو جاتا ہوں کہ مجھ پر عنایات کا یہ دروازہ کیسے کھلا۔ داغ کا یہ شعر کتنا خوبصورت ہے۔

کیا کہوں میں کہ کیا کیا میں نے   کیا کہوں میں کہ کیا دیا تو نے

جاہلیت کے زمانے میں لغزشیں بھی ہوتی ہیں اور شاید کوئی بشر ان سے خالی نہیں۔ ان کی یاد اس پیرانہ سالی میں بھی آتی ہے اور ظاہر ہے کہ عہدِ گزشتہ کی ہر یاد حسین ہوتی ہے۔

باوجود اِدعائے اتقا حسرت مجھے
آج تک عہدِ ہوس کا وہ فسانہ یاد ہے



(غیر مطبوعہ)

(ادارہ پروفیسر غلام رسول ملک کا بے حد ممنون ہے جن کے پاس نازکی مرحوم کا یہ مضمون محفوظ ہے اور انہوں نے شیرازہ کو یہ مضمون بطورِ خاص مرحمت کیا۔)

میر غلام رسول نازکی

قرآن مجید اور نعتِ رسولؐ

سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف کبریتِ احمر کی صورت میں رشد وہدایت کا ایک بیش بہانسخہ ترتیب دیا ہے۔ یہ کتابچہ بیک وقت مناجات، نعت، درود اور دعا کا ایک لاجواب امتزاج ہے۔ حضورؐ کے مراتب بیان کرتے وقت ایک جگہ اللہ جل شانہٗ کی اس عنایت کا ذکر ہے جس سے اس نے حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو فیض یاب کیا ہے۔ فرمایا المتخلق باعلیٰ رتبة العبودیة یعنی حضورؐ پرنور کو اللہ تعالیٰ نے عبودیت اور بندگی کے اعلیٰ ترین منصب پر فائز کیا ہے۔ اس محفل میں اور باتوں کے علاوہ تھوڑی دیر اس کا جائزہ لیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون.، ہم نے جن و انسان کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں۔ یعنی جن وانسان کی تخلیق کا مقصد ہی عبادت الٰہی ہے۔ اب اس عبادت الٰہی کے طور طریقے مختلف ہیں۔ قرآن وحدیث میں اس اجمال کی تفصیل دی گئی ہے کہ حقیقی عبادت کیا ہے اور اس کا ماحصل یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کو اپنے قول، فعل اور سوچ

میں محتاط رہنا ہوگا اور ہر قول و فعل اور سوچ سے پہلے دیکھنا ہوگا کہ کہیں اس میں اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا امکان تو نہیں۔ اللہ سمیع و بصیر ہے۔ وہ ہمارے ہر کام سے واقف ہے، وہ ہمارے دلوں کا حال جانتا ہے اور اس سے ہمارا کوئی فعل پوشیدہ نہیں۔ اس لئے ہر قول اور ہر فعل اور ہر ارادے کو اللہ کی مرضی کے تابع بنانا ہوگا۔ اور یہ اعتقاد راسخ کرنا ہوگا کہ ایک دن مجھے اپنے قول و عمل اور نیت کے بارے میں اللہ کے سامنے جواب دہ ہونا ہے۔ یہی عبادت کا ماحصل ہے اور جہاں تک عبادت کا تعلق ہے وہ ہم پر اس کا ایک حق ہے۔ جو ہماری بشری کمزوریوں کی وجہ سے ہم سے پورا نہیں ہوسکتا۔ یہ حق اگر پورا کیا جائے تو اس ذات مولیٰ صفات نے جو خدا کے رسول ہونے سے پہلے خدا کے بندے ہیں۔ محمداً عبدہٗ و رسولہٗ۔ رسالت اسی صورت میں مل سکتی ہے جب عبودیت کا حق پورا پورا ادا ہو جائے۔ یہ حق صرف انہوں نے پورا کیا اور اس کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں کہیں بھی کسی پیغمبر کا ذکر آیا ہے تو اس کے نام کے ساتھ عبدنا بھی ہے۔ مثلاً عبدنا ایوب، عبدنا ذکریا وغیرہ لیکن جہاں حضور رسالت مآب سید العابدین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہے وہاں صرف عبدنا ہے نام نہیں، یعنی محمدؐ عبدِ خالص ہیں اور جس طرح اللہ تعالیٰ معبود مطلق ہے اسی طرح محمدؐ عبدِ مطلق ہیں۔ ہم سب اللہ کے بندے ہیں۔ ان میں انبیا، اولیاء، اصفیا، اتقیا، علماء و ملجا سب شامل ہیں۔ مگر خاص بندہ عبد مطلق محمدؐ رسول اللہ ہیں اور اسی لئے قرآن مجید میں جہاں جہاں حضورؐ کا ذکر آیا ہے وہاں خالص لفظ عبد استعمال فرمایا گیا ہے۔ سبحان الذی اسریٰ بعبدہٖ لیلاً من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ. سبحان الذی انزل علیٰ عبدہٖ الکتاب و اوحیٰ

الیٰ عبدہٖ مااوحیٰ . وغیرہ وغیرہ۔ یہاں صرف عبد کا استعمال ہوا ہے۔ عبدنا محمد نہیں فرمایا گیا۔ اس لئے کہ وہ اسی طرح عبد مطلق ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ معبود مطلق ہیں اور اسی کے معنی ہیں کہ عبدیت خالص کا حق اگر کسی نے ادا کیا ہے تو وہ محمدؐ ہیں اور یہی وہ بندگی ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے:

''مقام بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی''

اور اسی عبدیت خالص کا یہ انعام ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو دنیا کے لوگوں کے سامنے نت نئے اوصاف کے ساتھ متعارف فرماتے ہیں۔ یا ایھا النبی انا ارسلنا لکٗ شاھداً و مبشراً و نذیراً و داعیاً الی اللہ باذنہٖ وسراجاً منیرا۔

''اے نبیؐ ہم نے آپ کو لوگوں کی طرف شاہد، بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے۔ آپ اللہ کے حکم سے ان کو اللہ کی طرف بلاتے ہیں اور آپ ایک روشن چراغ ہیں''۔ ایسے روشن چراغ جو کہ کفر کی ظلمتوں اور جہالت کے اندھیروں کو ہدایت کے اجالوں میں بدل دیتے ہیں۔ جو لوگوں کو اللہ کی طرف بلا کر اس کے احکام کی تعمیل کرنے کی ہدایت کر کے ان کو آنیوالی زندگی میں جنت اور مغفرت کی بشارت دیتے ہیں۔ جو غلط راہ پر چل کر عالمِ انسانیت کو گمراہی کے غار میں دھکیل دیتے ہیں انہیں خبردار کرتے ہیں کہ تم اپنے اُن اعمال کی پاداش میں دوزخ کا ایندھن بن جاؤ گے، ان حرکتوں سے باز آؤ اور ڈرو اس سے جو وقت ہے آنے والا۔

قرآنِ مجید اسی عبد مطلق کی تعریف و توصیف سے بھرا پڑا ہے۔ اس مختصر سی مجلس میں صرف چند مثالوں پر ہی اکتفا کیا جاسکتا ہے۔ فرمایا:

لقد جاء کم رسولٌ من انفسکم عزیزٌ علیہ ما عنتم حریص

علیکم و بالمومنین رؤف رحیم.

''بے شک تمہاری طرف تم ہی میں سے ایک رسول آیا ہے وہ جب تم کو تکلیف میں دیکھتا ہے تو کڑھتا ہے اور وہ تمہارا دلدادہ ہے اور تمام مومنین کیلئے رحمت وراحت کا پیکر بن کر آیا ہے''۔اور یہ عبد مطلق اپنے معبودِ مطلق کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے اپنے اوپر راتوں کا آرام حرام کرتا اور غارِ حرا میں خلوت گزیں ہوکر اپنے محبوب کے ساتھ راز و نیاز میں مصروف ہو جاتا ہے۔تو ریاضت کی کثرت کی وجہ سے آپؐ کے پائے مبارک میں ورم ہوتا ہے اور آپؐ کی صحت بگڑنے لگتی ہے۔صاحب قصیدۂ بردہ نے فرمایا:

ظلمت سنة من احیٰ الظلام الیٰ اَن اشتکت قدماہ الضر من ورمه

راتوں کو بیدار رہ کر حضورؐ کی صحت پر اثر پڑنے لگا تو آپؐ کے پائے متورم ہو گئے تو محبوب یعنی معبود مطلق کو اپنے حبیب یعنی عبدِ مطلق کی طرف سے فکر ہوئی اور ارشاد ہوا کہ اتنی ریاضت شاقہ نہ فرمائیے۔

یا ایها المزمل قم اللیل الاقلیلا، نصفهٗ او انقص منهٗ قلیلاً.

''اے کالی کملی اوڑھنے والا ساری رات جاگا نہ کر۔تھوڑے سے حصے میں جاگتے رہ۔آدھی رات یا اس سے بھی کچھ کم یا کچھ زیادہ۔ساری رات نہیں''۔ فرمائیے اتنی ناز برداری کی مثال آپ کو اور کہاں ملے گی۔ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں، جب سجدے کے احکام نازل ہوئے، تو کئی مرتبہ حضورؐ اتنے طویل سجدے کرتے کہ میرے دل میں وسوسے اور اندیشے پیدا ہو جاتے۔میں ان کو حرکت دیتی۔وہ سجدے سے سرِ مبارک اٹھاتے تو وہ آفتاب عالمتاب کی طرح درخشاں نظر آتے۔میں کہتی یارسول اللہ کیا آپ کو بشارت نہیں دی گئی ہے۔

لیغفر لک اللہ ما تقدم من ذنبک وماتاخر. ویتم نعمتہٗ علیلک ویھدیک صراط مستقیما............

''اللہ آپ کی گزشتہ اور آنے والی لغزشوں کو معاف فرماتا ہے۔ اپنی نعمتیں آپ پر پوری فرماتا ہے۔ آپ کو سیدھی راہ دکھاتا ہے اور آپ کو دشمنوں پر فتحِ مبین عطا فرماتا ہے''۔ تو پھر آپ کو اتنے طویل سجدے دینے کی کیا ضرورت ہے۔ تو حضورؐ فرماتے عائشہؓ کیا تو نہیں چاہتی کہ میں خدا کا شکر گذار بندہ بنوں۔ کیا میں اپنے محبوب کی توجہات اور عنایات کو بھول جاؤں۔ کیا مجھے عبداً مشکوراً نہیں کہا گیا ہے۔ آقا اپنے غلام سے خوش ہوتا ہے تو اشارات وکنایات میں اپنی مسرّت اور اطمینان کا اظہار کر کے غلام کی حوصلہ افزائی کرتا ہے مگر اس مالک اور اس بندے کی بات ہی دوسری ہے۔ یہاں مالک اور بندہ میں محبوب اور حبیب کا رشتہ بھی ہے۔ اس لئے اشارات وکنایات سے کام نہیں لیا جاتا۔ جو کچھ کہنا ہوتا ہے واضح الفاظ اور صراحاً فرمایا جاتا ہے۔ اور اعلان کیا جاتا ہے

ومآارسلنٰک اِلا رحمةً للعالمین.

''ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر عالمین کیلئے رحمت بنا کر''۔ عالَم ایک ہی نہیں، اللہ بہتر جانتا ہے کہ عالموں کی تعداد کیا ہے۔ کائنات کی حدودِ اربعہ کیا ہے۔ اس کی وسعتوں کا عالم کیا ہے اور ان تمام پہنائیوں اور وسعتوں کیلئے اگر پیغام رحمت لے کر کوئی آیا ہے تو وہ رسالت پناہ شفاعت دستگاہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکت ہے۔ یہ وہ بندۂ مولیٰ صفات ہے جس کی بارگاہ میں جنید وبایزید ہی دم سادھ کر نہیں آتے بلکہ ان کے مقامِ بلند کو دیکھنے کیلئے بڑے بڑے اولوالعزم پیغمبروں کو بھی اپنی پگڑیاں سنبھالنی پڑتی ہیں۔ ذرا غور تو فرمایئے لوگوں کو

ابھی مقامِ رسالت سے کماحقہ آگاہی نہیں۔ انہیں حضورؐ سے ملنا ہوتا ہے تو آکر گھر کے باہر پکارنے لگتے ہیں، تو خالق کائنات کی طرف سے تہدید اور تنبیہ ہوتی ہے۔

ان الذین ینادونک من وراء الھجرات اکثر ھم لا یعقلون، ولو انھم صبرو حتیٰ تخرجھم لکان خیر لھم و اللہ غفور الرحیم۔

''جو لوگ آپ کو آپ کے گھر کے باہر سے پکارتے ہیں ان میں سے اکثر نادان اور بے وقوف ہیں۔ اگر یہ لوگ اس وقت تک صبر کرتے جب تک آپ خود اپنے گھر سے باہر تشریف نہ لاتے تو وہ ان کیلئے باعثِ خیر ہوتا۔ بہر حال اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے''۔ حضورؐ کی محفلِ مبارک میں یہی لوگ کبھی کبھی زور زور سے بولنے لگتے ہیں اور انہیں اندازہ نہیں کہ وہ کہاں ہیں اور کس محفل میں ہیں، تو ارشاد ہوتا ہے۔

یا ایھاالذین آمنو لاترفعوا صواتکم فوق صوۃ النبی و لاتجھرو لہٗ باالقول کجھر بعضکم بعض ان تحبط اعمالکم و انتم لا تشعرون۔

''اے ایمان والو! اپنی آواز رسولؐ کی آواز سے اونچی نہ رکھو۔ اور ان کے ساتھ اس طرح بڑھ چڑھ کر نہ بولا کرو جس طرح تم آپس میں چیخ چیخ کر بولتے ہو۔ کیا تمہیں معلوم نہیں یہ سوء ادب ہے اور اس سے تمہارے اعمال غارت ہو جائیں گے اور تم کو خبر تک نہیں ہوگی''۔ سبحان اللہ تعالیٰ العظیم۔ خالقِ کائنات کو یہ منظور نہیں کہ کوئی حضورؐ کے سامنے اپنی اونچی آواز میں بولے اور خبردار کرتا ہے کہ ایسے لوگوں کے تمام اعمال غارت ہو جائیں گے۔ ضابطہ اخلاق کا یہ عظیم الشان منشور جو ربِ کائنات نے عطا فرمایا ہے۔ اس بات کی شہادت ہے کہ حضورِ پُرنور کی ذات بابرکات کے متعلق معمولی سی کوتاہی بھی خالق کائنات کو منظور نہیں۔ اور اسے ایسا گستاخانہ عمل قرار دیتا ہے جس کی سزا تمام اعمال کی غارت گری ہے۔

وقت ایک لامتناہی اور غیر منقسم اکائی ہے۔ مگر ہمارے کرۂ ارض کا وقت نظامِ شمسی سے وابستہ ہونے کی وجہ سے رات دن میں بٹ گیا ہے اور پھر سسٹم ایسا ہے کہ اسی کرۂ ارض پہ کہیں دن ہوتا ہے اور اسی وقت کہیں رات ہوتی ہے۔ ہر ملک کے ہر حصے میں وقت میں تفاوت ہے۔ اگر یہاں شام کے ساڑھے آٹھ بجے ہیں تو انگلستان میں دن کے تین بجے ہوں گے۔ اسی اعتبار سے کرۂ ارض کا کوئی حصہ ایسا نہیں جہاں کسی نہ کسی وقت نماز کا وقت نہ ہو۔ گویا دن رات کے چوبیس گھنٹے میں کوئی لمحہ ایسا نہیں جب ربِ کعبہ کے پرستار رکوع وسجود میں مصروف نہ ہوں اور ظاہر ہے کہ ہر نماز سے پہلے اذان ہوگی۔ اور اذان میں اشھد ان لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ اشھد ان محمد رّسول اللہ کا اعلان بھی ہوگا۔ اور ہر لمحہ ہر سیکنڈ اور ہر منٹ پر بلند میناروں سے یہ آواز گونجتی رہے گی۔ فرمایئے ورفعنا لک ذِکرک کی اس سے بہتر تفسیر ممکن ہے کہ ہم نے آپ کے ذکر اور آپ کی یاد کو ارفع واعلیٰ بنا دیا۔ رات دن کے چوبیس گھنٹے کے ہر سیکنڈ میں دنیا کے کسی نہ کسی حصے میں اشھد اَن محمد رسول اللہ کی گونج اور پکار ہوگی۔ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت اس سے بڑھ کر کیا ہوگی۔ خالق ومخلوق، عبدو معبود و حبیب ومحبوب کا یہ عظیم الشان امتزاج قرآنِ مجید کی تقریباً تمام آیات سے ظاہر ہوگا۔ اس کیلئے علم قرآن میں تدبر کی ضرورت ہے۔ ہم ایسے کم سواد اور بے علم کیا جانیں، چند موٹی موٹی باتوں کا ذکر کر کے خریدارانِ یوسف میں اپنا نام شامل کرنے کی جسارت ہے۔ پھر اس بات کا خیال رکھئے کہ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر میں لعلِ بدخشان ہوگا تو وہ لعلِ بدخشان ہی ہوگا۔ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر کو نظر انداز کر کے لعلِ بدخشان کو اٹھایا اور سنبھال کر رکھا جاتا ہے۔ سچی اور معرفت کی بات کم سواد بھی بتایئے تو اس کو

گرہ میں باندھیئے۔ عربی کا مقولہ ہے!

انظر الیٰ ماقال ولا تنظر الیٰ من قال

یہ دیکھو کہ کیا کہا جارہا ہے۔ یہ نہ دیکھو کہ کون کہہ رہا ہے۔ محبّ اور حبیب کا راز و نیاز محبّ اور حبیب کے سوا اور کون جانتا ہے۔ منوّر لکھنوی نے بجا فرمایا!

وہ خدا نہیں بخدا نہیں وہ مگر خدا سے جدا نہیں

وہ ہے کیا مگر وہ ہے کیا نہیں یہ محبِّ حبیب کی بات ہے

لاالـلـه الا الله کے ساتھ جب تک محمد رسول اللہ نہ ہو کلمہ طیبہ مکمل نہیں۔ اللہ کے فضل کے ساتھ جب تک رسول کا فضل بھی شامل نہ ہو وہ مکمل نہیں۔ اس پر قرآن مجید کے سورۃ التوبہ کی یہ آیت کریمہ گواہ ہے

ولو انهم رضو اما آتا هم الله و رسولهٗ وقالو حسبنا الله سيؤتينا الله من فضلهٖ ورسولهٗ انا الیٰ الله راغبون.

اور وہ جو اس پر راضی ہو گئے جو ان کو اللہ اور اس کے رسول نے عطا کیا اور بولے اللہ ہمارے لئے کافی ہے۔ بے شک اللہ ہم کو اپنے فضل اور اس کے رسول کے فضل سے نوازے گا۔ اور بے شک ہم اللہ کی طرف راغب ہونے والے ہیں۔

خدا کا فضل اور اسکے رسول کا فضل ساتھ ساتھ ہونا چاہیئے اور جس طرح اللہ کی اطاعت اس وقت کافی نہیں جب تک اس میں اطاعت رسول بھی شامل نہ ہو۔

من يطع الرسول فقد اطاع الله

بلکہ جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اسی نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندۂ خاص کے طفیل ہم سب کو صراطِ مستقیم پر قائم رکھے۔ آمین!

۷/اگست ۱۹۹۵ء۔ تقریر بتقریب عید میلاد النبیؐ۔ ٹیلی ویژن سری نگر ☆☆☆

میر غلام رسول نازکیؔ

سیرتِ رسول ﷺ ..... دُعاؤں کی روشنی میں

دُعا کے بارے میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَۃِ یعنے دُعا عبادت کا مغز ہے۔ ایک اور ارشاد میں فرمایا گیا ہے

• اَلدُّعَاءُ ھُوَ الْعِبَادَۃُ یعنے دُعا ہی عبادت ہے۔ دُعا کی اہمیت اس بات سے اور بھی واضح ہو جاتی ہے جب خود اللہ جلّ شانہ، ارشاد فرماتے ہیں

• اُدْعُونِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ "مجھ سے مانگو میں ہی تمہاری دُعا قبول کروں گا۔" قابلِ غور بات یہ ہے کہ خود اللہ شانہ، نے قرآن حکیم یعنی وحی جلی کے ذریعے سے بے شمار دُعائیں سکھائی ہیں۔ ظاہر ہے کہ قرآن مجید اور احادیثِ رسول ﷺ میں جو دُعائیں موجود ہیں وہ صرف ہماری رہنمائی کے لئے کی گئی ہیں نہیں تو اللہ تعالیٰ کو دُعا کرنے کی ضرورت کیا ہے۔ العیاذ باللہ کیا وہ ہمارے محتاج ہیں اور اسی طرح رسولِ مقبول ﷺ نے جو دُعائیں ارشاد کی ہیں وہ ہماری ضروریات کو سامنے رکھ کر ہماری ہدایت اور رہبری کے لئے کی ہیں۔ مولانا روم قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ انسان کی ہر دُعا قبول ہو جاتی ہے کیونکہ دُعا کرنے کی توفیق اللہ جل شانہ، عطا فرماتے ہیں اور وہ یہ توفیق

اُسی وقت بندے کو دیتے ہیں جب اس کی قبولیت اللہ تعالیٰ کی مشیت میں ہوتی ہے، یہ الگ بات ہے کہ بعض دُعاؤں کی قبولیت کا اثر فوری طور پر ہوتا ہے اور بعض کا دیر سے۔ بلکہ یہ بھی ہے کہ جو دُعائیں دنیا میں قبول نہیں ہوتیں وہ اللہ تعالیٰ کے پاس محفوظ رہتی ہیں اور وہ اپنے فضل وکرم سے ان دُعاؤں کو بندے کے حسنات میں شامل فرماتا ہے۔ قیامت کے دن جب بندہ ان دعاؤں کا ذخیرہ اپنے نیک اعمال میں دیکھے گا تو اسے افسوس ہوگا کہ اُس کی بعض دُعائیں دنیا میں کیوں قبول ہوئی تھیں، نہیں تو آج وہ بھی میرے ذخیرۂ حسنات میں ہوتیں اور میزان میں میرا پلہ اور بھی بھاری ہوتا۔ اسی لئے ارشاد ہوا ہے کہ دُعا ہی عبادت ہے، بلکہ دُعا عبادت کا مغز ہے۔

دُعا واقعی عجب چیز ہے کہ یہ عبد اور معبود کو ملانے کا براہِ راست ذریعہ ہے۔ کوئی نماز اُس وقت تک نماز نہیں ہوگی جب تک اس میں سورۂ فاتحہ کی تلاوت نہ کی جائے، اور سورہ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ کی تحمید و تمجید کے فوراً بعد دُعا شروع ہوتی ہے...... اھدنا الصراط المستقیم ''بتلا دیجئے ہم کو رستہ سیدھا'' اس طرح سے بندہ و مولےٰ کا براہِ راست رابطہ قائم ہو جاتا ہے۔

ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ بندہ اپنی ضرورتوں سے بخوبی واقف ہوتا ہے اور وہ اپنی ضرورتوں کے پیش نظر دُعائیں بھی کرتا ہے تو پھر اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمیں یہ دُعائیں سکھانے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی، اس کا جواب یہ ہے کہ بندے کی نظر محدود ہے اور وہ بعض دفعہ خیر سمجھ کر شر کی دُعا کرتا ہے۔ بزرگوں نے ایک خوبصورت مثال دے کر اس بات کو سمجھایا ہے۔ ایک ضرورت مند آدمی ایک بااختیار افسر کے پاس جا کر اپنی حاجت

بیان کرتا ہے۔ افسر اس بات سے متاثر ہوتا ہے اور سوچتا ہے کہ اس کی مدد کرنی چاہیئے۔ وہ اس سے کہتا ہے کہ جاؤ درخواست لکھ لاؤ، سائل جانے لگتا ہے تو افسر اُسے واپس بُلاتا ہے اور کہتا ہے بیٹھو، قلم ہاتھ میں لو۔ میں درخواست کا مضمون تمہیں خود Dictate کروں گا، افسر ایسا اس لئے کرتا ہے کہ وہ اس کی مدد کرنا چاہتا ہے اور اُسے اندیشہ ہے کہ نہ معلوم یہ آدمی اپنی درخواست میں کیا لکھ لائے گا۔ ہوسکتا ہے کہ اُس میں کوئی قانونی سقم ہو اور میں اس کی مدد نہ کرسکوں اسی لئے وہ اسے درخواست کا مضمون خود Dictate کراتا ہے تاکہ اُس میں کوئی سقم نہ رہے اور وہ اس کی عرضداشت کو بلا دِقت منظور کرسکے۔ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعاؤں کا راز یہی ہے۔ اللہ تعالیٰ بندے کی دُعا قبول کرنا چاہتے ہیں اور درخواست ایسی ہے جو انہوں نے خود یا اُن کے رسول برحق صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو Dictate کرادی ہیں۔ اس لئے ان دُعاؤں کی قبولیت میں ذرا بھر شبہ نہیں رہتا۔ ہر وہ دُعا جو بندے کے دل سے نکلتی ہے اور اُن الفاظ میں نکلتی ہے جو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے سکھائے ہیں مستجاب اور مقبول ہے، اس میں شک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔

اس مقالے میں قرآنی دُعاؤں کا نہیں بلکہ حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی سکھائی ہوئی دُعاؤں کا جائزہ لینا مقصود ہے تاکہ ان دُعاؤں کی اہمیت کے ساتھ ساتھ سیرتِ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ انسانی پہلو بھی اُجاگر ہو جائے جو سارے عالمِ انسانیت کے لئے مشعل طور اور چراغِ راہ کا کام دیتا ہے کہ ظاہر ہے کہ ایک مختصر سے مقالے میں اُن ساری دُعاؤں کا تجزیہ تو نہیں ہوسکتا جو

حضور ﷺ نے فرمائی ہیں۔ صرف چیدہ چیدہ دُعاؤں کا ذکر کیا جائے گا جس سے ایک طرف ہماری رہنمائی ہوگی، دوسری سیرت رسول ﷺ کا روشن ترین پہلو سامنے آئے گا۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ یہ ساری دُعائیں حضور ﷺ نے ہمیں سکھانے اور ہماری رہنمائی فرمانے کے لئے کی ہیں۔ خود حضور ﷺ اجابت اور قبولیت کا مجسمہ تھے اور آپ سے اللہ جل شانہ، نے صاف لفظوں میں فرمایا تھا وَلَسوفَ يُعطِيكَ رَبُّكَ فترضیٰ بے شک اللہ تعالیٰ آپ کو وہ سب کچھ عطا فرمائیں گے جس کو پا کر آپ راضی ہو جائیں۔ آپ کی شان میں خود عہد رسالت کے مایہ ناز نعت خوان حسان بن ثابت نے کہا تھا۔

خَلِقتَ مُنزّهاً مِن کُلِّ عَیب کا نَكَ قَد خُلِقتَ کَما تَشاء،

آپ کو تمام نقصوں اور عیبوں سے پاک پیدا کیا گیا۔ ایسا لگتا ہے کہ آپ کو آپ کی منشأ کے مطابق پیدا کیا گیا ہے۔ آیئے اِس انسانِ کامل ﷺ کی چند دُعاؤں کا جائزہ لیں اور دیکھیں وہ اپنے لئے کیا چاہتے تھے اور وہ ہم کو کیا مانگنا سکھا گئے ہیں۔

آپ اس دنیا میں آ کر کیسی زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ سے یہ سوال کیا جائے تو آپ ضرور شش و پنج میں پڑیں گے۔ آیئے ہم آپ کو اس شش و پنج سے نکال دیں اور بتا دیں کہ حضور ﷺ نے آپ کو کیسی زندگی گزارنے کی آرزو سکھائی ہے۔ فرمایا

الٰہی میں مانگتا ہوں ایک بے داغ اور پاکباز، صاف ستھری زندگی،

ہموار موت اور اس دنیا سے واپسی جس میں نہ کوئی رسوائی ہو نہ کوئی فضیحت' بے داغ اور پاکباز زندگی میں وہ سب باتیں آ گئیں' جو انسان کو انسان بنانے والی ہیں۔ ایسی پاکباز زندگی جس میں جھوٹ' فریب' دغا' جعلسازی' قتل وغارت' لڑائی جھگڑا' بدکلامی' بدزبانی اور بداخلاقی نہ ہو۔ جس میں کسی کو اذیت رسانی کا پہلو شامل نہ ہو۔ جس میں ہر وقت یہ تصوّر رہے کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں' اسے میرا مالک دیکھ رہا ہے اور مجھے اپنے ہر فعل اور عمل کے لئے ایک روز اس کے سامنے جواب دینا ہوگا اور پھر دعا کی گئی کہ مجھے ہموار موت نصیب ہو' کسی حادثے کا شکار نہ ہو جاؤں' مرض الموت کی طوالت اور شدّت نہ ہو۔ موت سے پہلے اللہ جل شانہ، کے وجود کا اعتقاد راسخ ہو جائے اور اِرجعی اِلیٰ رَبِک رَاضِیَتہً مَّرضِیہ کی روشنی عطا ہو' اور میرے اس دنیا سے جانے کے بعد لوگ مجھے اچھی طرح یاد کریں' میرے لئے مغفرت کی دعا کریں اور کوئی ایسی بات سرزد نہ ہو جس سے مرنے کے بعد میری فضیحت اور رسوائی ہو۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک قدرے مفصّل دُعا کا ترجمہ سناتا ہوں۔

''الٰہی میری مغفرت فرما' میرے حال پر رحم کر' مجھے امن وامان میں رکھ' میرے رزق میں برکت دے' الٰہی میں تیری پناہ نگتا ہوں' کم ہمتی سے' سُستی اور کاہلی سے' بزدلی اور بہت زیادہ بڑھاپے سے' قرضداری اور گناہگاری سے' دوزخ اور قبر کے عذاب کے فتنے سے' مالداری اور افلاس کی آزمائش سے' زندگی اور موت کے فتنوں سے' تیری پناہ مانگتا ہوں سنگدلی اور غفلت سے' تنگدستی اور ذلت

سے، خواری اور کفر سے، بدکاری اور بداخلاقی سے، سننے اور دیکھنے کے
فتنوں سے، بہرے پن اور گونگے پن سے، دیوانگی اور کوڑھ کے
مرض سے، صبر آزما اور شدید بیماریوں سے، قرضے کے بوجھ سے، فکر،
تشویش، غم اور کنجوسی سے، لوگوں کی درازدستی سے، ایسے علم سے جو نہ
مجھے فائدہ پہنچائے نہ دوسروں کو، ایسے دل سے جس میں خدا کا خوف
نہ ہو، ایسے شکم سے جو کبھی سیر نہ ہو اور ایسی دُعا سے جو قبول نہ ہو"۔

یہ مفصّل دُعا ظاہر ہے کہ حضور رسالت مآب ﷺ کے حق میں بلاشبہ قبول ہوئی ہے۔ آپ کی زبان فیض ترجمان سے نکلی ہوئی یہ دُعا اگر ہم بھی کریں، تو کیا عجب کہ قبول ہو جائے، اور اگر قبول ہو جائے، تو اور کیا چاہئے۔

ہم میں سے بہت سے لوگوں کو اس کا تجربہ ہے کہ ایک آدمی ایک بستی میں رہتا ہے اور بدقسمتی سے اس کا ہمسایہ بُرا آدمی ہے، جھگڑالو ہے بلاوجہ فساد برپا کرنے کا عادی ہے، آپ کے آرام و آسائش کو اپنے لئے عذاب سمجھتا ہے، ہم جانتے ہیں کہ ایسی صورت میں زندگی جہنم بن جاتی ہے۔ یہ بھی تجربہ ہے کہ کوئی شخص چوری اور خیانت کا عادی ہے، ظاہر ہے کہ وہ اپنی اس بُری حرکت کو راز میں رکھتا ہے اور نہیں چاہتا کہ کوئی اور اس کی اس عادت سے واقف ہو جائے اور یہی راز میں رکھنے کی خواہش اس کیلئے وبالِ جان بن جاتی ہے اور ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کسی کو پتہ نہ چلے کہ یہ چور اور خاین ہے۔ یہ بھی تجربہ ہے کہ زندگی کو اجیرن بنانے والی چیز بھوک کے برابر اور کوئی نہیں۔ قرار چھین لیتی ہے، نیند حرام کرتی ہے۔ بقولِ مولانا روم آدمی سخت بھوک کی حالت میں کتا بن جاتا ہے اور ہر کسی کو کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔ ان تین

باتوں کو ذہن میں رکھ کر دعائے رسول ﷺ کا مفہوم پڑھیے۔

"الٰہی میں تیری پناہ مانگتا ہوں، اپنی مستقل رہائش کی جگہ بُرے ہمسایہ سے، سفر کی حالت میں ایک دوروز کے لئے اگر بُرا ہمسایہ ملے بھی تو خیر، کیوں کہ صبح ہوتے ہی وہ اپنی راہ لے گا اور میں اپنی......اور تیری پناہ مانگتا ہوں خیانت سے کیونکہ وہ بری ہمراز ہے اور کسی نہ کسی وقت بھانڈا پھوڑتی ہے، اور تیری پناہ مانگتا ہوں بھوک سے، جو بہت بُری ہم خواب ہے۔"

خوشگوار زندگی بسر کرنے کے لئے انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ اُسے آرام دہ گھر ملے، نیک سیرت اور خدا پرست بیوی ملے۔ مال و جائیداد حاصل ہو، اور انسان اولاد کی نعمت سے مالا مال ہو۔ غور سے دیکھیں تو متاعِ دنیا یہی تین چیزیں ہیں۔ اور پھر ذرا سوچیں تو بعض دفعہ یہی تین چیزیں انسان کی زندگی کو وبال بنا دیتی ہیں۔ رسول مقبول ﷺ کی دُعا کا ترجمہ یوں ہے۔

"الٰہی میں تیری پناہ مانگتا ہوں ایک ایسی عورت سے جو مجھے بوڑھا ہونے سے پہلے ہی بوڑھا بنا دے، پناہ مانگتا ہوں ایسی اولاد سے جو میرے لیے جان کا وبال بن جائے، پناہ مانگتا ہوں ایسی دولت سے اور ایسے مال سے جو میرے لئے عذاب جان بن جائے"۔

ہم سب نے دیکھا ہے کہ بعض بد قسمت لوگوں کو ایسی بد زبان، بد تمیز اور جنگجو عورتوں سے پالا پڑتا ہے جو اُن کو آرام و راحت پہنچانے کے بجائے اُن کے گلے کا طوق بن جاتی ہیں۔ اور اُن کی زندگی جہنم کا نمونہ بن جاتی ہیں۔ منتوں اور دُعاوں سے حاصل کی ہوئی اولاد بدراہ نکلتی ہے اور ماں باپ کے لئے عذابِ جان بن جاتی ہے۔ محنت سے حاصل کی ہوئی دولت

اور مال ایسا عذاب بن جاتا ہے کہ انسان کی نیند اُڑ جاتی ہے اور وہ رات دن ننانوے کے پھیر میں زندگی کا سارا مزہ کھو بیٹھتا ہے۔ رسول مقبول ﷺ کی دور بین نگاہوں سے ایسی کوئی چیز چُھپ نہ سکی، جو انسان کی زندگی کو حرام کر دے اور اسی لئے آپ نے ہماری رہنمائی کے لئے ان مکروہات سے اللہ کی پناہ مانگی ہے۔

زندگی کے دن جیسے تیسے گزر جاتے ہیں۔ جوانی میں آفات کا سامنا ہو تو ان کا مقابلہ کرنے کی اُس میں ہمت بھی ہوتی ہے اور مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ افلاس ہو تو اس کا مقابلہ بھی کرتا ہے، رات دن محنت کر کے اس پر قابو پا لیتا ہے مگر ایک وقت آتا ہے جب قویٰ مضمحل ہو جاتے ہیں اور عناصر میں اعتدال نہیں رہتا۔ کسی مصیبت کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رہتی۔ یہ بڑھاپا ہے اور عمر کا وہ مرحلہ جب اسے اطمینان اور فراغت نصیب ہونی چاہیئے۔ انہی باتوں پر نظر کرتے ہوئے میرے آقا مولیٰ مجتبیٰ ﷺ نے یہ خوبصورت اور جامع دُعا فرمائی ہے، ترجمہ یوں ہے۔

"الٰہی جب میرا بڑھاپا آجائے اور زندگی کے دن قریب آئیں، تو اس وقت میرے رزق میں بہت کشادگی دے، اور مجھے افلاس میں مبتلا نہ کر، اور میری زندگی کا آخری حصہ میری زندگی کا بہترین حصہ ہو، اور میرا بہترین عمل وہ ہو جس کا انجام بخیر ہو، میرا بہترین دن وہ ہو، جب مجھے آپ سے ملانے کے لئے واپس بلا لیا جائے۔ ان جواہر پاروں پر مجھ ایسا نا اہل اور کم سواد آدمی کیا اظہار رائے کرے۔ آپ سب دانا اور سمجھ دار ہیں ان ارشادات پر غور فرمائے اور سوچئے کہ ہمارے حضور نے ہماری زندگی کے کن کن گوشوں پر نظر ڈالی ہے اور ہمیں ہدایت

فرمائی کہ اللہ جل شانہ، سے گڑگڑا کر دُعا مانگیں کہ وہ ہمیں مکروہاتِ دنیا سے نجات دے کر حسنات کی راہ پر ڈال دے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے طائف تشریف لے جاتے ہیں تا کہ وہاں کے لوگوں کو اللہ کی طرف بلائیں۔ طائف کے لوگ بڑی بدتمیزی سے پیش آتے ہیں۔ اُن پر پتھر برساتے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم لہولہان ہوجاتے ہیں۔ اس حال میں بھی آپ اُن کے لئے کوئی بددُعا نہیں کرتے بلکہ اللہ جل شانہ، کے حضور اپنی بپتا بیان کرتے ہیں اور اسی سے مدد مانگتے ہیں۔ یہ دُعا اظہارِ عبودیت اور تفویض الی اللہ کا ایک ایسا نمونہ ہے جس کی نظیر کہیں اور نہیں ملتی۔ اسکے آخری حصے کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

''یا اللہ تجھی سے شکوہ کرتا ہوں اپنے ضعیف القوۃ ہونے کا، اپنی بے سروسامانی کا اور لوگوں کی نظروں میں اپنی کم وقعتی کا، اے ارحم الرحمین! تو مجھے کس کے سپرد کرتا ہے، کیا کسی دشمن کے، جو مجھ پر سینہ زوری کرے یا تو مجھے کسی عزیز کے قبضے میں دنیا چاہتا ہے جو میرے سیاہ وسفید کا مالک ہے، بہرحال اگر تو مجھ سے ناراض نہیں تو مجھے اس کی ذرّہ بھر پروا نہیں، اسلئے کہ تیرے امن کی دنیا میں میرے لئے بہت زیادہ گنجائش ہے،،

یہ اس دُعا کا آخری حصہ ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضور سخت قسم کی آزمائش میں بھی کس قدر صابر اور متوکل علی اللہ تھے اور ہمیں کیسی تعلیم دے گئے۔ ایک اور دُعا کا ترجمہ!

''الٰہی مجھے تکلیف اور رنج میں صابر، راحت وآسائش میں شکر گزار بندہ بنادے، مجھے میری نظروں میں حقیر اور اوروں کی نظروں میں عظیم بنادے۔،،

اب ایک اور جامع الکلم دُعا کا مفہوم

"الٰہی میری خبر گیری اور نگہبانی اسی طرح سے کر جس طرح ایک نوزائیدہ بچے کی کی جاتی ہے"۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اس دُعا کو طبِ نبوی ﷺ کا ایک لاجواب نسخہ قرار دیا ہے۔

"الٰہی مجھے اپنے فیصلے پر راضی برضا رکھ اور جو کچھ تو نے میرے لئے مقدر کیا ہے، اس میں برکت دے، یہاں تک کہ جس چیز میں تو نے درنگی کی ہے، اس میں تعجیل نہ چاہوں، اور جس معاملے میں تو نے تعجیل سے کام لیا ہے، اس میں درنگی کا طالب نہ ہوں"۔

یہ ہے وہ ذات والا صفا، سرور کائنات فخر موجودات محمد عربی ﷺ جس کا رتبہ ثُمَّ دَنیٰ فَتَدلّٰی فکَانَ قَابَ قَوسَینَ اَوْ اَدنی ہے، جو ان بلندیوں سے بھی اللہ کی سرزمین پر رہنے والی مخلوق کو بھلا نہ سکے اور ان کے رشد و ہدایت کے لئے اپنی دُعاؤں کی صورت میں ایک ایسا خزانہ چھوڑ گئے، جس کی چمک دمک سے دلوں کی ظلمتیں دُور ہو جاتی ہیں۔ نور کے فوارے پھوٹتے ہیں اور سارا ماحول جگمگا اُٹھتا ہے۔

..................☆☆☆..................

میر غلام رسول نازکی

اِسلام میں تصّورِ جمال

اسلام کے ساتھ ہی بانیٔ اسلام علیہ السّلام کا تصوّر آنا ناگزیر ہے کیونکہ اسلام کے تصوّر کا خالق اگرچہ خالقِ کائنات ہے لیکن حضورِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اس کو دنیا میں عام کرنے کا ذریعہ بن گئے۔ حضور کو اِس معنی میں بانیٔ اسلام کہنا درست نہیں بلکہ پیغمبرِ اسلام کہنا زیادہ صحیح ہے لیکن حضورؐ کے نامِ مبارک کے ساتھ یہ اصطلاح بھی چل پڑی ہے۔ اس لئے اسے استعمال کرنے میں حرج بھی نہیں۔ جب ہم اسلام کے کسی پیغام یا کسی پہلو پر نقد و نظر کریں گے تو ظاہر ہے کہ پیغمبرِ اسلام کی ذاتِ بابرکات ضرور سامنے آئے گی۔ اسلام میں تصوّرِ جمال کا تفصیلی جائزہ لینے سے پیشتر اس لئے ہمیں خود پیغمبر اسلامؐ کے جمال و تصوّرِ جمال کو سمجھنا ہوگا۔

تاریخ اس بات پر متفق الرائے کہ حضورؐ مردانہ حُسن کا کامل نمونہ تھے۔ بے داغ، بے عیب اور ماہِ کامل کی طرح بے کم و کاست۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں...... ایک روز چاندنی رات میں حضورؐ سرخ رنگ کا حلہ پہنے بیٹھے تھے۔ ہم ایک نظر ان کو

ایک نظر چاند کو دیکھتے تھے۔ مگر خدا کی قسم حضورؐ چاند سے زیادہ حسین، دل فریب اور خوب صورت تھے۔ واللہ مارائینا مثلۂ قبلۂ و بعدۂ ۔ آپؐ ہی کا فرمان ہے، حضورؐ کی چہیتی زوجہ اُمّ المومنین حضرت عائشہؓ صدیقہ ایک شام کوئی کپڑا سی رہی تھیں۔ گھر میں اندھیرا تھا۔ سوئی ہاتھ سے گری۔ اتنے میں حضورؐ تشریف لائے آپ کے جمالِ جہاں آرا سے سوئی چمک اٹھی۔ حضرت عائشہ بداہتاً بول اٹھیں......

لو امیٰ زلیخا لور این جبینۂ لاٰ ثرن بالقطع القلوب علی الایدیٖ

حضرت یوسفؑ کی عاشق زادز لیخا کا عشق بدنام ہوا تو مصر کی عورتوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ سب نے زلیخا کو ملامت کی کہ وہ ایک زرخرید غلام کی زلفِ گرہ گیر میں اسیر ہوگئی۔ زلیخا نے ان سب کو کھانے پر بلایا۔ کھانے کے بعد ان کے سامنے پھل رکھے گئے اور ان کو کاٹنے کیلئے چھریاں موجود تھیں۔ جب ان خواتین نے چھریاں ہاتھ میں لیں تو یوسفؑ ان کے سامنے آگئے۔ ان کے ہوش اُڑ گئے اور وہ پھل کاٹنے کے بجائے اپنے ہاتھ کاٹنے لگیں۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں، کاش وہ میرے اس یوسف کو دیکھتیں۔ تب انہوں نے ہاتھ کاٹے تھے، اب اپنے دل کاٹ دیتیں۔ حضورؐ کے جمال کی تکمیل ان عادت واوصاف سے ہوئی جو اللہ کی طرف سے ان کو عطا ہوئے تھے۔ وہ باحیا دوشیزہ سے زیادہ شرمیلے، قادرالکلام شاعروں اور ادیبوں سے زیادہ خوش گفتار، بادِ صبا سے زیادہ خوش رفتار اور عادات واطوار کے اعتبار سے دل پذیر تھے۔ مکہ سے مدینہ ہجرت فرمائی تو مدینے کی لڑکیاں ان کیلئے استقبالیہ گیت گا رہی تھیں۔

اشرق البدر علینا من ثینات الوداع

رخصت کی پہاڑیوں کے پیچھے سے ہم پر چاند طلوع ہوا۔ ظاہر ہے کہ جس

انسان کو اللہ کی قدرتِ کاملہ نے اپنے بے پایاں حسن کی دولت سے اس حد تک مالامال کر دیا ہو، اس کی اپنی حسن پسندی اور جمال نوازی کیا ہوگی۔ ایک روایت سے یہ حدیث ہے۔ اللہ جمیل و یحب الجمال۔ اس کا مفہوم ہے کہ خدا حسین ہے اور وہ حسن کو دوست رکھتا اور پسند کرتا ہے۔ مجھے حدیثوں کی جرح و تعدیل کا علم نہیں۔ لیکن یہ عام اصول میرے سامنے ہے کہ جو حدیث حضورؐ کی طرف منسوب کی گئی ہے اگر وہ قرآن حکیم کے ارشادات کے مطابق ہے اور راوی بھی ثقہ ہے تو وہ سچی حدیث ہے۔ اس عام اصول کے پیش نظر مجھے ذاتی طور پر اللہ جمیل ویحب الجمال بالکل صحیح حدیث نظر آتی ہے۔ اوّل اس لئے کہ یہ حدیث اسی نبیؐ کی طرف منسوب ہے جو خود حسن و جمال کا بے نظیر نمونہ ہے اور جس نے حسن کی ہمیشہ قدر فرمائی۔ اللہ جمیل و یحب الجمال چار لفظوں کا جملہ ہے اور نہ صرف اپنی ترکیب سے خود حسن و جمال کا مرقع ہے بلکہ معنوی اعتبار سے انسان کیلئے ایک روشن کتاب اور شمع مبین سے زیادہ ہے۔ اللہ جل شانہٗ کے جمیل ہونے میں کیا کلام ہو سکتا ہے۔ کشمیر کے پہاڑ، جھیلیں، باغات اور وادیاں دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ ان کا بنانے والا جمیل نہیں ہوگا۔ اقبال نے فرمایا۔

کوہ ہائے جنگ سار او نگر	آتشیں دست چنار او نگر
لکہ ہائے ابر در کوہ و دمن	پنبہ پراں از کمان پنبہ زن
کوہ و دریا و غروبِ آفتاب	من خدا را دیدم آنجا بے حجاب

ہم کشمیر میں رہتے ہیں، اس لئے ہم کشمیر کے حسن و جمال کے شیدائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی اتنی بڑی کائنات ہے۔ وہ کتنی حسین ہوگی، شاید اس ساری کائنات میں جس کا کہیں اندازہ بھی نہیں۔ کروڑوں مقامات اور کروڑوں مناظر

ایسے ہوں گے جن کے سامنے کشمیر کی شادابی ہیچ ہوگی۔ اس سارے حسن وجمال کے خالق کے اپنے حُسن کا اندازہ کون کرسکتا ہے اور اس کے جمال جہاں آرا کا معمولی سا اندازہ بھی کیسے ہوسکتا ہے۔ اللہ کے جمیل ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ اللہ بے شک جمیل ہے، اس کو دوبدو کسی نے نہیں دیکھا۔ لیکن اس کی صنعت گری کو دیکھ کر ہر دل اقرار کرتا ہے کہ وہ جمیل ہے جس کا نقش اتنا حسین اور دلفریب ہے۔ وہ خود کیا ہوگا۔ بدصورت آرٹسٹ حسین آرٹ کی تخلیق نہیں کرسکتا، برا آدمی اچھا شاعر نہیں بن سکتا۔ کمینہ فطرت کا انسان اعلیٰ قسم کا کہانی کار نہیں ہوسکتا۔ اچھا آدمی اچھی تخلیق کرے گا۔ اچھے اور حسین خدا نے اچھی اور حسین تخلیق کی، جو پہاڑوں اور دریاؤں کی صورت میں جلوہ گر ہوئی، چشموں اور گھاٹیوں کی شکل میں ظہور پذیر ہوئی، طلوعِ قمر اور غروبِ شمس کے روپ میں نظر نواز ہوئی۔ اس دنیا کا حال یہ ہے کہ جہاں نظر پڑتی ہے وہاں حسن کی کارفرمائی ہے۔

ز فرق تابقدم ہر کجا کہ مے نگرم
کرشمہ دامن دل مے کشد کہ جا اینجاست

شرط اس کے لئے یہ ہے کہ انسان میں شرافت زیادہ ہو۔ وہ رب المشرق والمغرب کی تخلیقات میں حُسن کی تلاش کرے۔ بری چیزوں کی تلاش میں اپنی شرافت انسانی کو محل نظر نہ بنائے۔ لطیفہ یہ ہے کہ جانسن نے جب اپنی ضخیم ڈکشنری تیار کی تو ان کے پاس ایک عورت آئی اور بولی...... "ڈکشنری تو آپ نے بڑی عظیم بنالی ہے لیکن اس میں ایک بڑا نقص یہ ہے کہ آپ نے اس میں فحش الفاظ کثرت سے جمع کئے ہیں۔ جانسن نے جواب دیا۔ "محترمہ! اس میں میرا قصور نہیں۔ آپ نے تلاش ہی وہ لفظ کئے ہیں جو فحش ہیں۔" اس قسم کی سپرٹ ہو

تو حسین چیز بھی بدصورت نظر آئے گی۔ نفسِ انسانی میں شرافت کا عنصر غالب ہو، تو ہر چیز میں حسن نظر آئے گا۔

برگِ درختان سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقے دفترے است معرفت کردگار

اللہ جمیل کے اصول کو ذہن نشین کرنے کے بعد اس حدیث کا دوسرا ٹکڑا ویحب الجمال خود بخود ثابت ہو جاتا ہے۔ خدا جمال پسند نہ ہوتا تو حسین و جمیل چیزوں کی تخلیق ہی کیوں کرتا؟ ظاہر ہے کہ اس قدر جمال پسندی کے بعد اس کا محبوب بندہ وہی بن سکتا ہے جو خود حسین ہو۔ حسین کا لفظ میں وسیع معنوں میں استعمال کر رہا ہوں۔ جس انسان کو اللہ نے اخلاقِ حسنہ کے زیور سے آراستہ کیا ہے وہ بھی حسین ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے...... انک لعلیٰ خلق عظیم ۔ آپ کے اخلاق بے شک بہت بڑے ہیں جس کو اللہ نے علم و فضل کی دولت سے مالا مال کیا ہے وہ بھی حسین ہے۔ کیونکہ علم بھی حسن ہے جس کو خدائے بزرگ و برتر نے نوع انسانی کی ہمدردی اور دوستی کے جذبات سے سرفراز فرمایا ہے، وہ بھی حسین ہے جس انسان کو خدا نے قبول عام بخشا ہے، وہ بھی حسین ہے جس کو وطن اور ملک کی خدمت میں توفیق ارزانی ہوتی ہے وہ بھی حسین ہے، اور ظاہر ہے کہ خدا ان سارے حسینوں کو دوست رکھتا ہے۔ قرآن اسلام کی بنیاد ہے اور ظاہر ہے کہ قرآنِ حکیم کے ارشادات ہی سب سے زیادہ موثق اور قابلِ اعتبار ہیں۔ آیئے اس بحرِ بے کنار سے ہم اپنی محدود استعداد کے مطابق چند قطرے نکال کر آپ کو دکھا دیں کہ قرآن کے فرمودات کے مطابق حسن و جمال کا تصور کیا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے

قولو اللناس حسنا

لوگو! جب لوگوں سے بات کروتو دل لبھانے والی بات کرو۔ حسن و جمال سے بولو، سلیقے سے بولو۔ میں ذاتی طور پر اس تین لفظ کی آیت سے اس قدر متاثر ہوں کہ اس پر بڑے سے بڑا لٹریچر قربان کرنا چاہتا ہوں۔ اس کی شیرینی کو صرف محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اس کا صحیح ترجمہ بھی نہیں ہوسکتا صرف اسے حسنِ مذاق سے ہی سمجھا جاسکتا ہے۔

پھر فرمایا :

الذین یذکرون اللہ قیاماً و قعوداً و علیٰ جنوبھم و یتفکرون فی خلق السموات والارض ، ربنا ما خلقت ھذا باطلاً۔

(وہ لوگ جو اللہ کو اٹھتے بیٹھے اور سوتے جاگتے یاد کرتے ہیں، اس زمین وآسمان کی پیدائش پر غور کرتے ہیں اور اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اے ہمارے رب تم نے جو کچھ پیدا کیا، وہ بے معنی اور باطل نہیں)۔

زمین وآسمان کی پیدائش پر غور کرنے کا مطلب ہی یہی ہے کہ اس کے جمالیاتی اور افادی پہلوؤں کا جائزہ لیا جائے۔ جب انسان پورے خلوص اور شوق سے ایسا کرے گا تو اسے دنیا کی ہر شے حسین نظر آئے گی۔ وہ اسے شکست خوردہ ذہنیت کے بجائے پُر امید نگاہوں سے دیکھنے لگے گا، اسے دنیا و مافیہا کا حُسن لازوال نظر آئے گا۔ اور یہی حسن شناسی اسے نفس کی طرف رہنمائی کرے گی اور وہ بے اختیار ہو کر پکار اٹھے گا کہ تو نے یہ سب کچھ بلا وجہ پیدا نہیں کیا۔ یہ سب کچھ حسین ہے اور حسین چیز بے معنی، ناکارہ، رائیگاں اور باطل نہیں ہوتی۔ اس کا بدیہی اور لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان کا دل صانعِ ازل کی یاد سے ایک لمحہ کیلئے بھی

خالی نہ رہے گا۔

اور پھر فرمایا......

قل ارایتم ان جعل اللہ علیکم اللیل سرمداً الیٰ یوم القیٰمۃ. من الٰہ غیر اللہ یاتیکم بضیاءٍ افلاتسمعون. قل ارایتم ان جعل اللہ علیکم النہار سرمداً الیٰ یوم القیٰمۃ من الٰہ غیر اللہ یاتیکم باللیل تسکنون فیہ افلا تبصرون......

(آپ کہیے بھلا یہ تو بتلاؤ کہ اگر اللہ تعالیٰ تم پر ہمیشہ کیلئے قیامت تک رات ہی رہنے دے تو خدا کے سوا وہ کون سا معبود ہے جو تمہارے لئے روشنی کو لے آوے، تو کیا تم نہیں سنتے؟ آپ کہیے بھلا یہ تو بتلاؤ کہ اگر اللہ تعالیٰ تم پر ہمیشہ کیلئے قیامت تک دن ہی دن رہنے دے۔ تو خدا کے سوا کون وہ معبود ہے جو تمہارے لئے رات لے آئے، جس میں تم سکون پاؤ۔ کیا تم دیکھتے نہیں؟)

ذرا سا غور فرمائیے تو حسن و جمال کا صحیح اور بنیادی فلسفہ اس آیتِ کریمہ کو سمجھنے سے آئینے کی طرح صاف ہو جائے گا۔ ارشاد ہوا کہ اگر تمہاری زندگی میں رات ہی رات ہوتی تو تم روشنی کو پالینے کیلئے کتنے پریشان ہو جاتے۔ دن ہی دن ہوتا تو تم رات کے نظر نواز حُسن اور سکون کیلئے کہا کرتے؟ واقعہ یہ ہے کہ اس آیت میں حُسن و جمال کا بنیادی فلسفہ بیان فرمایا گیا ہے۔ حُسن کے لئے تنوّع ضروری ہے۔ یکسانیت اور یک رنگی میں حُسن نہیں ہوتا۔ اگر ایک باغ میں ایک ہی رنگ کے پھول ہوں گے تو وہ پھول خار کی طرح کھٹک جائیں گے۔ اگر ساری زمین کفِ دست اور ہموار ہو تو زندگی ناہموار ہو جائے۔ اسی لئے حسین و جمیل خدا نے کہیں خوبصورت وادیاں بنا دیں تو کہیں سر بفلک پہاڑ کھڑے کئے۔

افلا ینظرون الی االابل کیف خلقت و الی السماء کیف رفعت والی الجبال کیف نصبت و الی الارض کیف سطحت.

"کیاتم نہیں دیکھتے کہ اونٹ کو کیسے پیدا کیا گیا۔ آسمان کو کیسے اونچا کردیا گیا۔ پہاڑ کس طرح نصب کردیئے گئے اورزمین کس طرح ہموار بنادی گئی"۔ یہی رنگارنگی اور بوقلمونی حسن کی جان اور جمال کی اساس ہے۔اقبال کے الفاظ میں حُسن کی تصویر میں تغیر کا رنگ بھردیا گیا ہے۔ یہ تغیر نہ ہوتو حسُن بھی نہ ہو۔اِسی تصوّر کوسادے اور بلیغ الفاظ میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم خوداندازہ کرسکتے ہو کہ اگر قیامت تک ایک مسلسل دن ہوتا تو تمہاری زندگی اجیرن ہوجاتی۔ یا قیامت تک ایک لگاتار رات ہوتی تو تم ایک لمحہ زندگی رہنا پسند نہ کرتے۔وہ اکتاہٹ ہوتی جو جان لیوا ثابت ہوتی۔اب صورت یہ ہے کہ دن کا جمال جہاں آرا زندگی کا پیغام دیتا ہے اور آدمی تازہ دم ہوکر کارزارِ حیات میں جُٹ جاتا ہے۔شام تک اس کشمکش میں تھک جاتا ہے تو رات سکون اور اطمینان کا پیام لاتی ہے۔محرم راز بن کر انسان کی محرومی کو دُور کرتی ہے۔غریب ہو یا امیر، بڑا ہو یا چھوٹا، اِسی طلسم دوش وفردا اور حیرت خانۂ شب وروز میں اسیر ہے اور اسی تغیّر کے سہارے زندہ رہتا ہے۔کیا اس سے بڑھ کر جمال کا تصوّر کوئی اور ہوسکتا ہے۔کیا اس سے بہتر حُسن کی عکاسی کسی اور طرح سے ہوسکتی ہے؟ یہی تغیر ہے جو جمال کو جنم دیتا ہے۔نشیب وفراز کی پیچیدگیوں سے حُسن پیدا ہوجاتا ہے۔ خیر وشر کی کشمکش میں جمال پروان چڑھتا ہے۔حق وباطل کی آویزش میں خوب صورتی کی دیوی جلوہ افروز ہوکر نکلتی ہے۔ نیک وبد کی چپقلش میں حُسن پرورش پاتا ہے اور خدائے جمیل کی حسین تخلیق یعنی انسان اس جمال لازوال سے ازل سے

مستفید ہوتا آیا ہے اور ابد تک مستفید ہوتا رہے گا۔

اس سے زیادہ واضح الفاظ میں حُسن و جمال کی قرآن حکیم کی ان آیات میں موجود ہے۔ والانعام خلقها لکم فیادفٔ و منافع ومنها تاکلون. ولکم فیها جمال حین تریحون و حین تسرحون ، وتحمل اثقالکم الیٰ بلدٍلم تکونو ابلغیه الا بشق الانفس ان ربکم لرئوف رحیم. والخیل والبغال ولحمیر لترکبو ها وزینة و یخلق مالا تعلمون.

(اسی خدائے جمیل نے تمہارے لئے مویشیوں اور چوپاہوں کو بنایا۔ ان سے تمہیں جاڑوں کا مقابلہ کرنے کا سامان ملتا ہے ۔ اس کے علاوہ اور بھی فائدے ہیں۔ تم انہیں کھاتے بھی ہو، ذرا اندازہ کرو، صبح جب تم اپنے ریوڑ کو گھر سے نکالتے ہو اور جنگل لے جاتے ہو اور شام کو یہ ریوڑ لے کر گھر واپس آتے ہو تو یہ منظر کتنا حسین اور دلکش ہوتا ہے ۔ یہی جانور تمہارے بوجھ بھی ڈھوتے ہیں اور مشکل سفر میں تمہاری سہولیت کا سامان بنتے ہیں ۔ یہ گھوڑے، خچر اور گدھے، یہ تمہارے لئے سواری اور زینت کا سامان ہیں۔ اس کے علاوہ بھی اللہ تمہارے لئے اور چیزیں پیدا کرتا ہے جن کو تم ابھی جانتے نہیں)

قرآن حکیم میں حسن و دلکشی کا جو یہ منظر بیان فرمایا گیا ہے، اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو مال مویشی کے مالک ہیں اور صبح کے وقت جب چرواہا اپنے ریوڑ لے کر جنگل کی طرف انہیں گھاس چرانے لے جاتا ہے اور شام کے دھندلکے میں تانیں اڑاتا، بانسری بجاتا واپس آتا ہے تو یہ نظارہ واقعی حسن و جمال کا مرقع ہوتا ہے ۔ اس کا تعلق انسان کی معاشی زندگی سے ہے اور معاشی زندگی کی خوش حالی بذات خود ایک حسن ہے جس کو قرآن نے بہت اہمیت دی ہے ۔ اسی

سورۂ شریفہ میں آگے چل کر حسین و جمیل زندگی کا ایک مرقع پیش فرمایا گیا ہے۔

هو الذی انزل من السماء ماءً لکم منهُ شراب و منه شجرٌ فیهِ تسیمون بنبت لکم به الزرع و الزیتون و النخیل وا لاعناب و من کل الثمرات . ان فی ذالک لاٰیةٍ لقوم یتفکرون

(اللہ آسمان سے پانی برستا ہے۔ یہ تمہارے پینے کے کام آتا ہے اور تمہیں زندگی عطا کرتا ہے۔ درخت اور گھاس اگاتا ہے جس پر تمہارے مویشی پلتے ہیں۔ کھیتیاں لہلہانے لگتی ہیں۔ زیتون اور انگور اور سیب کے باغ نظر فریب ہوجاتے ہیں۔ ہر قسم کے پھل کے درخت دیدہ و دل کیلئے نور کا سامان پیدا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان تمام خوبصورت، دلکش اور دلآویز مناظر میں سمجھ دار لوگوں کے لئے بہت سے اشارات ہیں)

آگے چل کر فرمایا ہے......

وسخر لکم اللیل و النهار والشمس وا لقمر والنجوم مسخرهات بامرهٖ ان فی ذالک لایةٍ لقوم یعقلون

اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے دن اور رات کا حسن و جمال پیدا کیا۔ چاند اور سورج کی ضیاپاشی تمہارے لئے مہیا کی۔ تاروں کو ایک خاص نظام کا تابع کردیا تا کہ یہ تمہارے ذوق جمال کی تسکین کا باعث بن سکیں۔ اس میں بھی ان لوگوں کیلئے اشارات ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔)

و ذر الکم فی الارض مختلفاً الوانهٗ ، اللہ نے ہر چیز جو زمین پر پیدا کی، اسے اس طور پیدا کیا کہ ان کی مختلف اقسام ہیں۔ ان کے رنگ مختلف ہیں تا کہ تم اکتا نہ جاؤ......

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

والقی فی الارض رواسی ان تمیدیکم و انھٰراً وسبلا

(زمین پر سر بفلک پہاڑ موجود ہیں، پھر ان سے بل کھاتی، دوڑتی، گرتی سنبھلتی نہریں جاری ہیں۔ سانپ کی طرح کھاتے ہوئے راستے موجود ہیں۔)

قرآن کے ان ارشادات کو پڑھیئے اور پھر دیکھئے کہ اسلام میں تصوّرِ جمال کیا ہے۔ خدائے حسین وجمیل نے نبی جمیلؐ کے ذریعہ کتنا جمیل تصورِ حسؐن کا بیان فرمایا ہے اور انسان کو اسی زندگی میں جن چیزوں سے سابقہ پڑتا ہے ان کے جمیل پہلوؤں کو کس طرح آشکارا فرمایا ہے۔ پہاڑ پر چڑھنے سے انسان کی زندگی خطرے میں بھی پڑ سکتی ہے۔ اس کا کہیں تذکرہ نہیں کیونکہ یہ اس کا حسین پہلو نہیں۔ دریاؤں اور ندیوں سے طغیانی بھی آتی ہے، اس کا کہیں مذکور نہیں۔ کیونکہ یہ اس کا بدصورت پہلو ہے۔ خدائے بزرگ وجمیل حُسن و جمال کا دلدادہ اور اس کا خالق ہے۔ اس لئے وہ اسی کا ذکر فرماتا ہے۔

نہ شبنم نہ شب پرستم کہ حدیثِ خواب گویم

چو غلامِ آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

اللہ تعالیٰ کے جو مختلف نام ہیں ان کو اسمائے حسنیٰ کہتے ہیں۔ حسنیٰ بھی حسن سے مشتق۔ اس کی دو قسمیں ہیں، جلالی اور جمالی۔ ۹۹ اسمائے حسنیٰ میں سے ۱۵ جلالی ہیں اور باقی جمالی۔ کیوں نہ ہو **اللہ جمیل و یحب الجمال۔**



میر غلام رسول نازکی

نعتیہ اَدب

نعت اس مدحیہ اَدب کا نام ہے جو رسولِ مقبولؐ کیلئے مخصوص ہے۔ نعتیہ ادب میں حضور کی تعریف وتمجید کے علاوہ التجاؤں اور آرزوؤں کا اظہار بھی کیا جاتا ہے۔ نعت دنیا کی ان تمام زبانوں میں موجود ہے، جہاں مسلمان آباد ہیں۔ اس کی ابتداء خود قرآن مجید سے ہوتی ہے۔ چنانچہ اکثر مقامات پر قرآن حکیم میں بصراحت رسول کریمؐ کی تعریف موجود ہانا ارسلناک شاھد او مبشر او نذیر او داعیاً الی اللہ باذنہٖ و سراجاً منیرا (الاحزاب)۔ بے شک ہم نے آپ کو شاہد، خوش خبری دینے والا بنا کر بھیجا، آپ اللہ کے حکم سے لوگوں کو اللہ کی طرف بلانے والے ہیں اور آپ ایک نورانی چراغ ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے، وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین ۔ (الانبیاء) بے شک ہم نے آپؐ کو عالمین کیلئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔) وما انت بنعمتہ ربک بمجنون ۔ القلم (آپ، اللہ کے فضل سے دیوانے نہیں ہیں۔) وما علمناہ الشعر وما ینبغی لہٗ (یاسین)۔ ہم نے رسول کریمؐ کو شاعری نہیں سکھائی ہے، کیونکہ شاعری ان کی شان کے شایان نہیں۔) ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ العمرک کا لفظ استعمال فرماتے ہیں، جس کے

معنی ہیں مجھے آپ کی جان کی قسم ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نعتیہ ادب کا سرچشمہ خود قرآن مجید ہے۔

ان چند مثالوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مختلف زبانوں کے ادیبوں اور شاعروں کی توجہ نعت کی طرف اس لئے ہوئی کہ نعت کی ابتداء خود خدائے بزرگ و برتر نے فرمائی ہے۔ طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا تو قرآن حکیم سے سینکڑوں مثالیں پیش کی جاسکتی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خود حضورؐ کے زمانہ میں ہی شاعروں نے حضور کی تعریف و توصیف میں شاعری کرنا شروع کی۔ کعب بن زہیرؓ دورِ رسالت کا مایہ ناز شاعر تھا۔ وہ دیر تک حضور کی مخالفت کرتا رہا اور اپنی آتش نوائی سے مختلف قبائل قریش کو حضورؐ کے خلاف بھڑکاتا رہا۔ آخر کار اس کا دل نورِ ایمان سے بھر گیا اور وہ ایک معذرت نامہ لے کر حضورؐ کی خدمتِ بابرکت میں حاضر ہوا۔ یہ معذرت نامہ ''قصیدہ بانت سعاد'' کے نام سے مشہور ہے۔ بعض لوگ اسے قصیدۂ بُردہ بھی کہتے ہیں اسلئے کہ حضورؐ نے جب اس قصیدے کو سنا تو بہت پسند فرمایا اور اظہار پسندیدگی کے طور پر اپنی ردائے مبارک بھی کعب بن زبیر کو عطا فرمائی۔ اسکا یہ شعر سارے قصیدے کے مرکزی خیال کو ظاہر کرتا ہے۔

اتیت عند رسول اللہ معذرۃ
والعذر عند رسول اللہ مقبول

(میں عذر خواہی کیلئے رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں، اور حضور معذرت کو قبول فرماتے ہیں۔)

قصیدہ بانت سعاد کا عربی ادب میں بڑا درجہ ہے کہ قصائد کی جو خصوصیات ہوتی ہیں وہ اس میں بدرجہ اتم موجود ہیں، چنانچہ فلسفہ اور ادب کی بہت سی

تاریکیوں کو بھی اس قصیدے میں واضح کیا گیا ہے۔ انسان کے انجام یعنی موت کے بارے میں اس قصیدے میں ایک بہت ہی خوبصورت شعر ہے۔

کل ابن انثیٰ وان طالت سلامتہٗ

یوماً علیٰ الۃٍ حد باء محمول

(ہر ماں کا بیٹا ایک روز ایک مستطیل صندوق میں کاندھوں پر اٹھالیا جائیگا، چاہے وہ طویل ترین دور بھی زندہ رہ چکا ہو)

ہجرت کے موقع پر جب حضورؐ مکہ سے مدینہ تشریف لے گئے، تو مدینہ کی لڑکیاں مسّرت سے جھوم اٹھیں' حضور کی تشریف آوری کی خوشی میں یہ استقبالیہ گیت گاتی تھیں،

طلع البدر علینا من ثنیات الوداع

(یعنی وداع کی گھاٹیوں سے ہم پر بدرِ کامل طلوع ہوا)۔ ثنیات ثنیہ کی جمع ہے، ثنیہ عربی میں ٹیلے کو کہتے ہیں، ثینتہ الودعا کا ٹیلہ قبا کے جنوب میں ہے اور اہلِ مدینہ دوستوں کو یہاں تک چھوڑنے اور الوداع کہنے آیا کرتے تھے۔ اسی لئے ان کا نام ثنیات الوداع پڑ گیا تھا۔)

ان معصوم لڑکیوں میں قبیلہٗ بنی نجار کی لڑکیاں خاص طور پر زیادہ سرگرم تھیں، کیونکہ رسول اللہ کی والدہ حضرت آمنہ اسی قبیلے سے تعلق رکھتی تھیں، ان کا اپنا استقبالیہ گیت تھا،

نحن بنات من بنی نجار

(ہم قبیلہ بنی نجار کی لڑکیاں ہیں وغیرہ۔)

عربی ادب کا بڑا ذخیرہ نعتِ رسول پر مشتمل ہے، ایک بہت مقبول و

معروف قصیدہ، قصیدۂ بردہ ہے، اس کے مصنّف حضرت امام صالح شرف الدّین ابو عبداللہ محمد بن الحسن البصیری ہیں۔ علامہ بوصیری طویل مدت تک فالج کے مرض میں مبتلا رہے جب سارے ذرائع ناکام ہوئے، اور علامہ اپنی زندگی اور صحت سے مایوس ہوئے، تو انہوں نے پورے خلوص سے یہ نعتیہ قصیدہ لکھا۔ اللہ کی شان جس روز علامہ اس کی تصنیف سے فارغ ہوئے اسی شب انہوں نے خواب میں حضرت رسولِ کریمؐ کو دیکھا۔ حضورؐ نے قصیدہ سننے کی خواہش ظاہر فرمائی اور علامہ بصیری نے خواب ہی میں قصیدہ سنا ڈالا، قصیدہ پڑھتے وقت وہ کانپ رہے تھے، حضورؐ نے سبّب دریافت فرمایا تو بولے سردی محسوس کرتا ہوں، حضورؐ نے اپنی ردائے مبارک عنایت کی، نیند سے جاگنے پر بوصیریؒ نہ صرف کلیتاً صحت یاب ہو چکے تھے بلکہ انہوں نے حضور کی عطا کردہ ردائے مبارک بھی موجود پائی اِسی اعتبار سے اس قصیدے کا نام قصیدۂ بردہ ہے اور بعض لوگ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، کعب بن زہیرؓ کے قصیدے کو بھی قصیدہ بردہ کہتے ہیں۔

بوصیری کا قصیدۂ بردہ ادب کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے اس کا ایک ایک لفظ محبت وعقیدت کے جذبات سے معمور ہے۔ ایک شعر ملاحظہ فرمائیے:۔

کالزھر ترفٍ والبدرِ فی شرفٍ

والبحر فی کرمٍ والدھر فی ھمم

(حضور تر و تازگی کے اعتبار سے شگوفہ کی مانند، یکتائی جمال میں بدرِ کامل، جود و سخا میں سمندر اور علو ہمت کے اعتبار سے زمانہ کی طرح ہیں۔)

اس قصیدے کے بعض اشعار میں ایک عجیب اور دل چسپ استدلال ہے مثلاً حضورؐ کی دنیا بیزاری کا جواز بوصیریؒ اس طرح دیتے ہیں۔

وکیف تدعو الی الدنیا ضرورۃ من
لولاہٗ لم تخرج الدنیا من العدم

(رسول کریمؐ کو دنیا اپنی طرف کیونکہ متوجہ کرسکتی؟ اے دنیا تو وہ ہے جو اگر حضورؐ نہ ہوتے تو کتمِ عدم سے کبھی باہر نہ نکلتی!)

اور پھر جہاں التجاؤں کا سلسلہ شروع ہوا ہے، یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ التجائیں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے نکلی ہیں۔ چند اشعار آپ بھی سنئے:

یا اکرم الخلق مالی من الوذبہ	سواک عند حلول الحادث العمم
یا نفس لا تقنطی من ذلتہ ا عظمت	ان الکبار یرفی الغفران کاللمم
ولن یصنیق رسول اللہ جاھک بی	اذا الکریم تجلی باسم منتقسم
ھوالحبیب الذی ترجیٰ شفاعتہ	لکل قولٍ من الا ھوال مقتحم

(اے خلاصۂ آفرینش! میرے پاس کوئی اور نہیں آپ کے سِوا، جو میرا سہارا بن سکے۔ اس وقت جب مجھ پر ہر طرف سے مصائب کی یورش ہو جائے، اے میرے نفس تو مایوس نہ ہو جا، کہ تیرے گناہوں کا شمار نہیں بُڑے بڑے گناہ رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلّم کی رحمت کے سامنے تو کچھ بھی نہیں ہیں، اور یقین رکھ کہ جس وقت اللہ جل شانہ منتقم بن کر بندوں سے حساب لینے لگے گا تو رسول اللہؐ کی شفقت کا دروازہ بدستور کھلا رہے گا۔ حضورؐ وہ محبوب ہیں جن کی شفاعت کی امید ہر اُس وقت رکھی جاسکتی ہے، جب (ہوال و آلام کا ہجوم ہو جائے)۔

عربی زبان میں ایک اور نعتیہ ادب دلائل الخیرات کے نام سے مشہور ہے، قرآن حکیم کا ارشاد ہے: ان اللہ وملئکتہٗ یصلون علی النبی یا ایھاالذین اٰمنو صلو اعلیہ وسلمو تسلیماً۔ (بے شک اللہ اور اس کے فرشتے رسول

پر درود بھیجتے ہیں، اے ایمان والو تم بھی رسول پر درود وسلام بھیجتے رہو۔)

اس حکیم کی رُو سے درود ہر مسلمان پر فرض ہے، دلائل الخیرات اس حکم کی تعمیل کی طرف ایک بہت بڑا اقدم ہے، درود وسلام کی کوئی صورت نہیں ہوسکتی، جو اس کتاب میں بڑے خوبصورت اور حسین انداز میں پیش نہیں کی گئی ہے، اور کہیں کہیں تو حضورِ پرنور کی نعت کا اسلوب اتنا پیارا ہوگیا ہے کہ انسان کا مذاقِ سلیم دیر تک اس سے لطف اندوز ہوتا رہتا ہے یہ کتاب نثر کی ہے، مگر یہ نثر بہت سے لوگوں کی شاعری سے بدر جہا بہتر ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

اللھم صل علے سید نا محمد ن الذی ھو قطب الجلا لة وشمس النبوة والرسالة والھادی من الضلالة، والمنقذِ من الجھا لة صلے اللہ علیہ وسلم صلوٰة دائمة الاتصال والتو الی، متعاقبةً تبعاقب الایام واللیالی ۔ خداوند درود بھیج محمدؐ پر جو بزرگی اور جلالت کے مدارِ اعظم ہیں، جو نبوّت کے آفتاب اور رسالت کے سورج ہیں۔ جو گمراہی سے نکال کر ہدایت بخشنے والے ہیں۔ جو جہالت سے نجات دلانے والے ہیں، ایسا درود جو علی التواتر اور پے در پے ہو، جو ایک دوسرے کے پیچھے اس طرح ہو جس طرح رات کے بعد دن اور دن کے بعد رات آتی ہے، (اس بات کو ضرور نوٹ فرمائیے کہ ترجمے سے اصل عبارت کا حسن ہمیشہ مجروح ہوجاتا ہے۔)

ایک اور جگہ ملاحظہ فرمائیے:

اللھم صل علی سیدنا محمد ن نبی الاصیل، السید البنیل الذی جاء بالوحی والتنزیل واوضھ بیان التاویل و جاء ہ الامین جبریل بالکرامة والتفصیل و اسریٰ بہ الملک الجلیل فی اللیل

وکیف تدعو الی الدنیا ضرورۃ من
لولاہٗ لم تخرج الدنیا من العدم

(رسول کریمؐ کو دنیا اپنی طرف کیونکہ متوجہ کر سکتی؟ اے دنیا تو وہ ہے جو اگر حضورؐ نہ ہوتے تو کتمِ عدم سے کبھی باہر نہ نکلتی!)

اور پھر جہاں التجاؤں کا سلسلہ شروع ہوا ہے، یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ التجائیں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے نکلی ہیں۔ چند اشعار آپ بھی سنئے:

یا اکرم الخلق مالی من الوذبہ	سواک عند حلول الحادث العمم
یا نفس لا تقنطی من ذلتہ ا عظمت	ان الکبار یرفی الغفران کاللمم
ولن یصنیق رسول اللہ جاھک بی	اذا الکریم تجلی باسم منتقسم
ھو الحبیب الذی ترجیٰ شفاعتہ	لکل قولِ من الا ھوال مقتحم

(اے خلاصۂ آفرینش! میرے پاس کوئی اور نہیں آپ کے سوا، جو میرا سہارا بن سکے۔ اس وقت جب مجھپر ہر طرف سے مصائب کی یورش ہو جائے، اے میرے نفس تو مایوس نہ ہو جا، کہ تیرے گناہوں کا شمار نہیں بڑے بڑے گناہ رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلّم کی رحمت کے سامنے تو کچھ بھی نہیں ہیں، اور یقین رکھ کہ جس وقت اللہ جل شانہٗ منتقم بن کر بندوں سے حساب لینے لگے گا تو رسول اللہؐ کی شفقت کا دروازہ بدستور کھلا رہے گا۔ حضورؐ وہ محبوب ہیں جن کی شفاعت کی امید ہر اُس وقت رکھی جا سکتی ہے، جب (ہوال و آلام کا ہجوم ہو جائے)۔

عربی زبان میں ایک اور نعتیہ ادب دلائل الخیرات کے نام سے مشہور ہے، قرآن حکیم کا ارشاد ہے: ان اللہ وملئکتہٗ یصلون علی النبی یا ایھا الذین امنو صلو اعلیہ وسلمو تسلیماً۔ (بے شک اللہ اور اس کے فرشتے رسول

پر درود بھیجتے ہیں، اے ایمان والوتم بھی رسول پر درود وسلام بھیجتے رہو۔)

اس حکیم کی رُو سے درود ہر مسلمان پر فرض ہے، دلائل الخیرات اس حکم کی تعمیل کی طرف ایک بہت بڑا اقدم ہے، درود وسلام کی کوئی صورت نہیں ہوسکتی، جو اس کتاب میں بڑے خوبصورت اور حسین انداز میں پیش نہیں کی گئی ہے، اور کہیں کہیں تو حضورِ پرنور کی نعت کا اسلوب اتنا پیارا ہوگیا ہے کہ انسان کا مذاقِ سلیم دیر تک اس سے لطف اندوز ہوتا رہتا ہے یہ کتاب نثر کی ہے، مگر یہ نثر بہت سے لوگوں کی شاعری سے بدر جہا بہتر ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

اللھم صل علے سید نا محمد ن الذی ھو قطب الجلا لة وشمس النبوة والرسالة والھادی من الضلالة، والمنقذِ من الجھا لة صلے اللہ علیہ وسلم صلوٰة دائمة الاتصال والتو الی، متعاقبةً تبعاقب الایام واللیالی ۔خداوند درود بھیج محمدؐ پر جو بزرگی اور جلالت کے مدارِ اعظم ہیں، جو نبوّت کے آفتاب اور رسالت کے سورج ہیں۔ جو گمراہی سے نکال کر ہدایت بخشنے والے ہیں۔ جو جہالت سے نجات دلانے والے ہیں، ایسا درود جو علی التواتر اور پے در پے ہو، جو ایک دوسرے کے پیچھے اس طرح ہو جس طرح رات کے بعد دن اور دن کے بعد رات آتی ہے، (اس بات کو ضرور نوٹ فرمائیے کہ ترجمے سے اصل عبارت کا حسن ہمیشہ مجروح ہوجاتا ہے۔)

ایک اور جگہ ملاحظہ فرمائیے:

اللھم صل علی سیدنا محمد ن نبی الاصیل، السید البنیل الذی جاء بالوحی والتنزیل واوضھ بیان التاویل و جاء ہ الامین جبریل بالکرامة والتفصیل و اسرٰ بہ الملک الجلیل فی اللیل

البھیم الطویل۔

(خداوند درود بھیج محمدؐ پر جو ایک شریف پیغمبر ہیں، جو ایک بزرگ سردار ہیں، جو وحی وقرآن کو ساتھ لے کر آئے ہیں، جنہوں نے قرآن حکیم کی تفسیر و تاویل صفائی سے بیان فرمائی، جن کے پاس جبریلِ امین عزت وحرمت کے ساتھ آئے، جن کو اللہ نے معراج کی رات میں جو بابرکت اور طویل تھی سیر کرائی اور اپنے دیدار سے مشرف فرمایا)

صاحبِ دلائل الخیرات کا اسم گرامی ابوعبداللہ محمد بن سلمان الجزولی رحمتہ اللہ علیہ ہے، وہ صحیح النسب سیّدزادے ہیں، بہت بڑے عالم، محقق، عارف اور ولیٔ کامل گذرے ہیں آپ کا طریقہ شاذلیہ ہے، آپ کی تصانیف کا اکثر حصہ تصوّف کے موضوع پر ہے، آپ کے شاگردوں کی تعداد بیس ہزار سے زیادہ ہے، آپ کے والد قبیلۂ جزولہ کے امراء میں شمار کئے جاتے تھے۔ آپ سوسواقصائے ملک بربر کے رہنے والے تھے، مراکش کے شہر فاس میں آپ نے علم حاصل کیا اور ایک عرصہ تک وہاں تفسیر وقرآن پڑھاتے رہے۔ پھر ریف چلے آئے اور یہاں ان کی ملاقات شیخ محمد بن عبداللہ سے ہوئی۔ آن سے آپ نے علومِ باطنی حاصل کئے چودہ برس تک خلوت نشین رہے، روایت ہے کہ بارہ ہزار چھ سو پینسٹھ آدمیوں نے آپ کے دستِ حق پرست پر بیعت کی اور منکرات سے تائب ہوئے۔ کتاب اللہ اور سنتِ رسول کے سختی سے پابند تھے اور درود آپ کی غذا تھی، اس کے بغیر آپ کا ایک لمحہ بھی نہ گذرتا تھا۔ دلائل الخیرات کو اللہ نے قبولِ عام بخشا ہے اور آج تک حرمین شریفین میں اس کا ورد جاری ہے۔ ایک دو مثالیں اوپر دے چکا ہوں بخوفِ طوالت صرف ایک اور مثال دوں گا جو ادبی اعتبار سے بہت بلند ہے۔

الھم صل علی سیدنا محمدن النبی الامی وعلیٰ آل محمدن الذی ھو ابھیٰ شموس الھدی نوراً وابھر ھا، واسیرالانباء فخرً واشھرھا ونورۃ ازھر انوار الانبیاء واشرقھا واوضحھا، وازکی الخلیقہ اخلاقاً وا طھرھا، واکرمھا کلقا واعدلھا،

الٰہی رحمت نازل فرما ہمارے سردار حضرت محمد پر جو نبیٔ اُمی ہیں اوران کی اولاد پر جو ہدایت کے تمام آفتابوں سے زیادہ تابناک ہیں نُور کے اعتبار سے اوران سب پر غالب بھی ہیں، تمام پیغمبروں میں زیادہ فلک سیر اور زیادہ نامور ہیں، ان کا نُور تمام انبیاء کے نوُر سے زیادہ درخشاں ہے، ان کے اخلاق تمام مخلوق کے اخلاق سے اعلیٰ اور پاکیزہ تر، اوران کا وجود تمام آفرینش سے بزرگ تر اور حسین تر ہے......عربی اَدب میں نعتِ رسول کا ایک اورشاہکار حضرت سیّدنا شیخ عبدالقادر الجیلانیؒ کی مشہور آفاق تصنیف کبریتِ احمر ہے جواگرچہ حجم میں زیادہ نہیں مگر معنویت کے اعتبار سے سب پر بھاری ہے۔

کبریتِ احمر بھی اگرچہ نثر میں ہے مگراس کی دلکشی اور جاذبیت کا یہ عالم ہے کہ دوچار مرتبہ اسے پڑھیے تو ایک اچھے شعر کی طرح ذہن پر مرتسم ہوکر رہ جاتا ہے۔ابتداء ہی دیکھئے کس آن بان سے ہوتی ہے

اللھم اجعل افضل صلوتک عدداً وانمیٰ برکاتک سرمداً وازکیٰ تحیاتک فضلاً ومدراً، علی اشرف الحقاق الانسانیہ، ومعدن الدقایق الایمانیہ، و طور التجلیات الا حسانیہ. ومھبط الاسرار الرحمانیہ. واسطتة عقد النبیین ومقدم جیش المرسلین وافضل الخلایق اجمعین.

(خداوند اپنی بہترین رحمت بھیج اور بار بار بھیج، اپنی لافانی برکتیں نچھار کر، اپنے پاکیزہ تحائف فضیلت کے طور پر عنایت کر اُس ذات گرامی کو، جو حقائقِ انسانیت کا خلاصہ ہے جو ایمان کے نکات کی کان ہے، جو تجلیاتِ احسانی کے کوہِ طور ہیں، جو اسرارِ الٰہی کے آماجگاہ ہیں، جو رسولوں کے ہار میں درمیانی جواہر ہیں، جو پیغمبروں کے سرِ لشکر ہیں، اور جو تمام مخلوق سے افضل و برتر ہیں۔)

اَوصافِ محمدی کا یہی سلسلہ ہے جو تابناک ہیروں کی ایک مالا کی طرح چمک رہا ہے۔ فرماتے ہیں۔

المتخلق باعلیٰ رتبه العبودیة، المتحقق باسرار المقامات الا صطفائیه، میدالاشراف، وجامع الاوصاف، الخلیل الاعظم، الحبیب الاکرم المخصوس باعلی المراتب والمقامات، والموید باوضح البراهین والدلالات المنصور بالرعب والمعجزات الجوهر الشریف الابدی والنور القدیم السرمدی، سیدنا محمدن المحمود فی الایجاد والوجود، الفاتح لکل شاهدٍ ومشهود،

(وہ ذاتِ گرامی جو عبودیت کے اعلیٰ مراتب پر فائز ہے، جو برگزیدگی کے مقامات کے اسرار سے واقف ہے، جو تمام شرفاء کا سردار ہے، جو اَوصافِ حمیدہ کا مجموعہ ہے، جو سب سے بڑا دوست ہے، جو معزز و مکرم محبوب ہے، جو مقامات اور مراتب کی بلندی کی وجہ سے مخصوص ہے، جو براہین ودلالات کے اسلحہ سے لیس ہے، جن کو رعب اور معجزات اس لئے عطا کئے گئے کہ وہ اپنے مشن میں منصور ہوں۔ وہ دائمی جوہر شریف اور وہ سرمدی نوُرِ قدیم، جن کا اسمِ گرامی محمدؐ ہے جو محمود و مقبول ہے ایجاد اور موجود دونوں میں، جو شاہد و مشہور دونوں کا فاتح ہے۔)

کبریتِ احمر میں جہاں درود وسلام کا مقام آتا ہے وہاں سیّدنا حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے اپنا تمام فکر وفن صرف کیا ہے اور کوشش اس بات کی فرمائی ہے کہ درود جامع و مانع ہو۔ چنانچہ ایک درود یہ ہے:

اللھم صل علی سیدنا محمد عددماشاھد تہٗ الابصار و سمعتہ الأذان، وصل وسلم علیہ عددمن صلے علیہ. وصل وسلم علیہ عددمن لم یصل علیہ . وصل وسلم علیہ کما تحب و ترضیٰ ان یصلی علیہ. وصل وسلم علیہ کما امرتنا ان نصلی علیہ، وصل وسلم علیہ کما ینبغی ان یصلی علیہ.

(الٰہی ہمارے سردار حضرت محمدؐ پر درود وسلام اِتنے بھیج جتنا کہ آنکھوں نے دیکھا اور کانوں نے سنا ہے، ان پر اتنے درود وسلام بھیج جتنا اُن پر آج تک نہیں بھیجا گیا ہے، ان پر اتنا درود سلام بھیج جس سے تو راضی اور مطمئن ہو جائے اُن پر اتنا درود وسلام بھیج جتنا ان پر بھیجنا لازمی اور سزادار ہے۔

اس سے زیادہ جامع درود کا تصوّر مشکل ہے۔ پھر الفاظ کی نشست اور بلاغت کا کمال بھی ساتھ ساتھ ملاحظہ فرماتے جائیے۔ یہ سب کچھ اس لئے ممکن ہوا ہے کہ ممدوح وہ ہے جس کی ہر ادا پر دل وجان قربان کیا جاسکتا ہے، اور جس پر خود حُسنِ ازل قربان ہے جو باعثِ تکوینِ روزگار ہے، جو دعائے خلیل ونوید مسیحا ہے۔

عربی ادب نعتِ رسول سے بھرا پڑا ہے، اس مقالے میں اس کا جائزہ لینا مشکل ہے۔

عہدِ حاضر نے جہاں سائنس اور جدید علوم کو عروج پر پہنچایا ہے وہاں اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آج کا انسان عناصرِ قدرت پر فتح پانے کی دھن میں اس قدر گرم خرام ہے کہ وہ خود اپنے مقام کو بھول چکا ہے۔ اسے یہ بھی یاد

نہ رہا کہ وہ کہاں سے چلا تھا اور اسے جانا کہاں ہے۔ یعنی وہ اپنی ہی حکمت کے خم و پیچ میں، اس طرح الجھ گیا ہے کہ وہ نفع وضرر کا فیصلہ کرنے سے قاصر ہے۔ اسی ماحول میں اقبالؔ کا پیدا ہونا کچھ کم تعجب خیز نہیں، جس کی آنکھوں کو جلوۂ دانش فرنگ، خیرہ نہ کرسکا جو ’خاکِ مدینہ ونجف‘ کو بدستور اپنی آنکھوں کا سرمہ سمجھتا رہا۔

اس مقالے میں اقبالؔ پر رائے زنی مقصود نہیں بلکہ یہ کہنا ہے کہ عصرِ حاضر میں سب سے بڑا نعت خواں شاعر اقبالؔ ہے۔ اقبالؔ صرف علوم مشرقی پر حاوی نہ تھا بلکہ وہ علومِ مغربی میں بھی منتہی تھا۔ اس طرح وہ مشرق و مغرب کا ایک دلچسپ امتزاج تھا۔ اس نے یورپ کے علماء کے اذکار کو خوب سمجھا تھا۔ مشرق کے علماء کے رشحاتِ فکر سے بھی بخوبی مستفید ہوا تھا۔ علماء یورپ میں سے اسے نطشے کا تصوّر مافوق البشر نظر آیا جس سے اگرچہ وہ متاثر ضرور ہوا لیکن وہ اسے بالکل قبول نہ کرسکا۔ کیونکہ نطشے بشر سے مایوس ہوکر مافوق البشر کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ اقبالؔ بشر سے مایوس نہ تھا۔ وہ بشر کو خلیفتہ اللہ کہتا اور سمجھتا تھا، لیکن وہ یہ بھی جاننا چاہتا تھا کہ بشر میں وہ کون سی صفات ہونی چاہیں جن سے وہ خلیفتہ اللہ کے مرتبۂ عظیم پر فائز ہوسکتا ہے۔ کافی تفتیش و تحقیق کے بعد سے ایک ذاتِ گرامی نظر آئی جو بہمہ صفت موصوف تھی۔ جس میں خلافتِ الٰہی کے منصب پر فائز ہونے کی ساری صلاحیتیں موجود تھیں اور یہ ذاتِ بابرکات خیر البشرؐ کی تھی۔ اسی ذاتِ گرامی کا نام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ جن کے بارے میں بالکل بجا طور پر کہا گیا ہے:

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

مقامِ محمدؐ کو سمجھنا کوئی آسان کام نہیں۔ اقبالؔ نے اس دشوار مرحلے کو ضرور طے کیا تھا۔ اُمتِ عربیہ کو خطاب کرتے ہوئے وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہتا

ہے، اور کس دلاویزی سے کہتا ہے

علم و حکمت ریزۂ از خوانِ کیست | آیہ فاصبحتم اندر شانِ کیست
از دمِ سیراب آں امی لقب | لالہ رستِ از ریگِ صحرائے عرب
حریت پروردۂ آغوش اوست | یعنی امروزِ امم از دوشِ اوست
اوے در پیکرِ آدم نہار | اونقاب از خلعتِ آدم کشاد

(ملتِ عربیہ سے خطاب کرتے ہوئے اقبالؔ انہی سے پوچھتے ہیں۔ تم جو اپنے علم و فضل کے لحاظ سے ساری دنیا میں مشہور ہوئے، یہ کہاں سے آئے اور یہ کس کی نگاہِ کیمیا اثر کا فیضان تھا۔ کیا تم وہ نہیں ہو جو کل تک ایک دوسرے کا گلا کاٹتے تھے۔ مگر ایک صبح تم جاگے تو ایک دوسرے کے دشمن نہیں بلکہ بھائی تھے۔ آخر یہ سب کچھ کیسے ہوا! بات یہ ہے کہ نبیؐ اُمی رُوحی فداہ کی عیسیٰ نفسی کا ہی یہ اعجاز تھا کہ عرب کی تپتی ہوئی ریت سے رنگارنگ پھول کھلے۔ وہ ذاتِ پاک جس کی آغوشِ شفقت میں حریت اور آزادی پروان چڑھی۔ تمام اُمتوں کا حال حضورؐ کے ماضی سے تابناک ہے۔ آپ نے آدم کے جسم میں دل رکھا اور آدم کی حقیقی شکل وصورت سے نقاب اٹھایا۔)

اقبالؔ سے پہلے نعت خوانی کا کمال صرف اتنا تھا کہ حضورؐ کے ذاتی اوصاف اور محاسن کا ذکر کیا جاتا اور کچھ عرضداشتیں کی جاتیں اور بس۔ اقبالؔ نے حالیؔ سے متاثر ہو کر نعت کا رخ بدل دیا اور کوشش یہ کی کہ پورے خلوص، ذوق اور شوق سے سیرتِ رسولؐ کی جھلک دیکھی جا سکے۔ 'اسرار و رموز' میں اگرچہ ہر جگہ یہ اشارے موجود ہیں، لیکن یہ براہِ راست نعت ملاحظہ فرمایئے جس میں توصیف بھی ہے، تعریف بھی ہے اور ایک حسین التجا بھی۔

سبت معشوقے نہاں اندر دلت | چشم اگر داری بیا بنمایمت
دل ز عشق او توانا مے شود | خاک ہمدوشِ ثریا مے شود
خاکِ نجد از فیض او چالاک شد | آمد اندر وجد و در افلاک شد
دردل مسلم مقامِ مصطفیٰ است | آبروئے ماز نامِ مصطفیٰ است
طور موجے از غبارِ خانہ اش | کعبہ را بیت الحرم کاشانہ اش
بوریا ممنونِ خوابِ راحتش | تاج کسریٰ زیر پائے امتش
در شبستان حرا خلوت گزید | قوم و آئین و حکومت آفرید
از کلیدِ دیں در دنیا کشاد | ہمچو او بطن اُمِ مادر نہ زاد
در نگاہِ او یکے بالا و پست | با غلام خویش بر یک خوان نشست

(اگر تو دیکھے تو تیرے دل میں ایک محبوب موجود ہے۔ کاش تمہارے پاس آنکھیں ہوتیں۔ میں تمہیں تمہارے دل میں بیٹھے ہوئے محبوب کے دیدار سے سیراب کرتا۔ وہ محبوب تو وہ ہے جس کے عشق سے دل توانا ہوتا ہے اور مٹی ثریا سے ہمکلام ہوتی ہے۔ نجد، جو مجنون اور لیلیٰ کے عشق کی داستان کی سرزمین ہے اس محبوب کے فیض سے دوبارہ زندہ ہوا، وجد میں آیا، اور آسمان کا ہم شان ہوا۔ اس محبوب کا نامِ نامی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہے جو ہر مومن کے دل کا مکین ہے۔ جس کا نام ہمارے لئے آبرو کا باعث ہے۔ ان کے کاشانۂ عالی سے دھول اڑی تو طوُر بنی۔ ان کا کاشانۂ عالی بیت اللہ کا کعبہ ہے۔ وہ ذاتِ والا صفات جس نے راتوں کی نیند چھوڑ دی اور نتیجہ یہ ہوا کہ جس قوم کی طرف وہ مبعوث ہو کر آئے تھے وہ تختِ کسریٰ کی وارث بنی، حرا کے غار میں آپ کی گوشہ نشینی کا فیض تھا کہ قوم، آئین اور حکومت کی بنیاد پڑ گئی۔ حضورؐ نے دین و دنیا کی اقوام کو معتدل فرمایا

اور دین کی کنجی سے دنیا کا دروازہ کھولا۔ رہبانیت کے تابوت کی قبر میں کیل کیل ٹھونک دی۔ اونچ نیچ ختم کی۔ رنگ و نسل اور آقا و غلام کی تمیز اُڑا دی اور اپنے غلام کے ساتھ بیٹھ کر ایک ہی دستر خوان پر کھانا کھانے بیٹھے۔)

حضورؐ کی سیرت کے یہ روشن واقعات بیان کرنے کے بعد ایک دلاویز التجا بھی کی ہے۔ دیکھئے کیا انداز ہیں۔

در مصافے پیش آن گردوں سریر | دختر سردار طے آمد اسیر
پائے در زنجیر وہم بے پردہ بود | گردن از شرم و حیا خم کردہ بود
دخترک راچوں نبیؐ بے پردہ دید | چادر خود پیش روئے او کشید
ما ازاں خاتونِ طۓ عریاں تریم | پیش اقوامِ جہاں بے چار ریم
روزِ محشر اعتبارِ ماست رُو | ہم بدنیا پردہ دار ماست رُو

(ایک جنگ میں اِس شہنشاہِ آسمان جاہ کے پاس حاتم طائی کی بیٹی قید ہو کر آئی۔ حضورؐ نے اسے زنجیروں میں جکڑا دیکھا اور بے پردہ بھی تھی۔ شانِ نبوتؐ نے یہ گوارا نہ کیا اور آپ نے اپنی ردائے مبارک سے سر ڈھک لیا۔ آج حضورؐ کی امت حاتم طائی کی بیٹی سے بھی زیادہ بے پردہ ہو گئی ہے، اور اقوامِ عالم ننگی اور عریاں ہو گئی ہے۔ قیامت میں بھی ہمارا اعتبار حضورؐ ہی کے وجود ذی جود سے ہے اور دنیا میں قائم ہے تو آپ کے ہی کے طفیل)۔ اس لطیف التجا کے بعد پھر اسوۂ حسنہ کا ذکر ہے اور فرماتے ہیں۔

آنکہ بر اعدا در رحمت کشاد | مکہ را پیغام لا تثریب داد
امتیازاتِ نسب را پاک سوخت | آتش او این خس و خاشاک سوخت

حضورؐ نے اپنے جانی دشمنوں کے ساتھ بھی مروّت اور شفقت کا سلوک

فرمایا، جب آپ مکہ میں ایک جنگ سے تشریف لائے تو وہ سب لوگ جنہوں نے آپؐ کو ایذائیں پہنچائی تھیں، جنہوں نے آپ کو وطن سے ہجرت پر مجبور کیا تھا، مغلوب ہو کر پیش کئے گئے۔ حضورؐ نے ان سب کو مخاطب ہو کر فرمایا۔ ماذا تظنو نی ۔ کہو آج تم کیا توقع رکھتے ہو اور میرے متعلق کہا گمان رکھتے ہو۔ وہ سب یک زبان ہو کر بولے، اخ کریم ۔ آپ تو ہمارے فیاض بھائی ہیں اور ہمارے فیاض بھائی کے بیٹے، حضورؐ نے فرمایا:

'......علیکم الیوم اذھبو ا فانتم الطلقاءُ'۔ تم سے کوئی باز پرس نہ ہوگی، جاؤ میں نے تم کو معاف فرما دیا۔

مکہ کی سب سے بڑی شکایت حضورؐ سے یہی تھی کہ انہوں نے قریش کے نسلی خبط کا جنازہ نکال دیا...... 'نوحۂ ابو جہل' کے عنوان سے جو دلفریب نظم ہے اس میں ابو جہل کی زبانی حضورؐ ...... بلوایا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ابو جہل یہ ساری باتیں اپنے خداؤں کے سامنے شکایتاً بیان کر رہا ہے۔

سینۂ ما از محمدؐ داغ داغ   از دم او کعبہ را گل شدُ چراغ
اسوداں با احمراں آمیختند   آبروئے دود مانے ریختند

معاذ اللہ، ابو جہل کا یہ خیال ہے کہ چونکہ محمد رسول اللہؐ نے گوروں کالوں کو ایک صف میں بٹھا دیا۔ اقبالؔ کے فن کی چابک دستی یہ ہے کہ سب سے بڑے دشمنِ اسلام کی زبان سے اسلام دلاویز پہلوؤں کا اعتراف کراتا ہے۔ یہ نعت کا نیا انداز اور مدح کی بالکل نئی تکنیک ہے، جو کوئی نہیں جانتا، اس لئے کہ اقبالؔ علومِ قدیم وجدید پر بخوبی حاوی ہے۔

اقبالؔ رسالت کی اہمیت اور صاحبِ رسالت کی عظمت بیان کرتے

ہوئے فرماتے ہیں کہ محمدؐ تو ایمان نہ ہوتا، ایمان نہ ہوتا تو توحید کی تعلیم عام نہ ہوئی ہوتی۔

...... حرخم کئی تحقیق اگر   بنگری با دیدۂ صدیقؓ اگر
قوت قلب و جگر گر دو نبیؐ   از خدا محبوب نز گر دو نبیؐ

(یعنی میری بات پر اگر تم غور کرو اور مقامِ رسالت کو پہنچاننے کیلئے صدیقِ اکبرؓ کا قلب و جگر تلاش کرو تو نبی تمہاری روح کا سہارا بنے گا اور خدا سے بھی زیادہ پیارا ہوگا)

اقبال نے اس مضمون کو آگے جا کر اپنی دوسری کتابوں خاص کر ارمغانِ حجاز میں اور بھی پھیلا دیا ہے۔ ان کے سامنے قرآن حکیم کا یہ ارشاد قل ان کنتم تحبون الله فاتبعونی یحبکم الله" ہمیشہ رہا اسی لئے حبِ رسول اور اطاعتِ رسولؐ کو انہوں نے حبِ ایزدی اور اطاعتِ ایزدی سے زیادہ ضروری جانا۔ اس لئے خدانخواستہ توحید کا مقام گھٹانا مقصود نہ تھا۔ نہ نبی کا درجہ خدا سے بڑھانا مطلوب تھا۔ بلکہ اقبال کا استدلال یہ ہے کہ توحید کو سمجھا نہیں جا سکتا جب تک مقامِ رسالت سمجھ میں نہ آئے۔ خدائے بزرگ برتر کی اطاعت ہو ہی نہیں سکتی جب تک رسولؐ کی اطاعت مکمل نہ ہو۔ حبِ ایزدی کی بنیاد حُبِ نبیؐ ہے، اور جب تک نبیؐ خدائے بزرگ سے بھی زیادہ محبوب نہ ہو عشقِ الٰہی کا دروازہ کھل نہیں سکتا۔ اقبال کا خیال ہے کہ عبد و معبود کا باہمی تعلق اگرچہ زبردست ہے۔ اس کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ عبد نہ معبود کے صحیح مقام کو پہچان سکتا ہے نہ خود معبود ہی کا درجہ حاصل کر سکتا ہے۔ اس لئے کہ عبدِ مطلق اور عبدِ خاص محمد رسول اللہؐ کے برابر اور کوئی نہ ہو سکا۔ اس کے باوجود وہ اپنی کوتاہی کا اعتراف یہ

کہہ فرماتے ہیں۔

الٰہی تو پاک ہے۔ میں نے تیری عبادت کا حق ادا نہیں کیا۔ اقبالؔ کہتے ہیں جب رسولِ برحق ایسا عبد خاص بھی خدائے برحق کی عبادت کا حق ادا نہ کر سکے تو اور کون ہے جو اس کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ اسی لئے وہ چاہتے ہیں کہ انسان کے سامنے رسالت کا مقام ہی رہے۔ اس کی پرواز صرف مقامِ رسول کو سمجھنے تک ہی مصروف رہے۔ یہی خدا شناسی ہوگی۔ یہی ارشاد ہوا ہے اس مصرع میں ۔

از خدا محبوب تر گردو نبیؐ

'ارمغان حجاز' میں فرمایا

مسلماں را ہمیں عرفان و ادراک　　　که از خود فاش بیند سِر لولاک

خدا اندر قیاس ما نگنجد　　　شناس ادرا که گوید ما عرفناک

(مسلمان کا عرفان و ادراک بس صرف اتنا ہے کہ وہ مقامِ رسالت کو پہچانے، اس لئے کہ خدائے بزرگ کی جلالت وعظمت ہمارے چھوٹے سے قیاس کی سرحدوں میں سما نہیں سکتی۔ اب اس کا حل یہی ہے کہ اس ذاتِ بابرکات کو سمجھا جائے جس نے عبادت کے تمام حقوق ادا کرنے کے بعد اپنے عجز کا اعلان کیا اور فرمایا:

سبحانک ماعبدناک حق عبادتک ۔ اسی ارمغان حجاز میں ایک اور جگہ کہتے ہیں ۔

بگوئے تو گداز یک نوا بس　　　مرا ایں ابتدا ایں انتہا بس

خراب جراتِ آں زید پاکم　　　خدا را گفت مارا مصطفیٰ بس

(یا رسول اللہؐ۔ آپ کے کوچے میں مجھے ایک آہ کرنے کا گداز حاصل

ہو جائے، میرے لئے یہی ابتداء...... انتہا کافی ہے۔ میں تو اس مقدس دیوانے کی جرأت کا عاشق ہوں جس نے خدا سے کہا کہ ہمیں محمد مصطفیٰؐ کافی ہیں اور کسی کی ضرورت نہیں)۔

ہمارا قیاس، ہماری عقل اور ہمارا تخیّل خدائے بزرگ کی عظمت وجلالت کا احاطہ نہیں کر سکتی، اس کے...... ہم توحید پرست ہیں۔ خدا کے قائل ہیں، اس کو معبودِ مطلق جانتے ہیں، کیوں؟ اس کا جواب بھی اقبالؔ سے سنئے ۔

دراں دریا کہ او را ساحلے نیست　　دلیلِ عاشقاں غیر از دلے نیست
تو فرمودیٔ رہ بطحا گرفتیم　　وگرنہ جز تو مارا منزلے نیست

(ایک ناپیدا کنار سمندر میں عاشق کی رہنمائی، دل کے سوا اور کوئی نہیں کرتا۔ یا رسول اللہ آپ نے...... تو ہم کعبہ کی طرف جھکتے ہیں۔ ہماری منزلِ مقصود تو آپ کی ذاتِ گرامی کے سوا اور کوئی ہے ہی نہیں)۔........... فیضانِ رسالت کا یہ عالم ہے ۔

ز نورِ تو برافروزم نگہ را　　کہ بینم اندرونِ مہر و مہہ را
چو میگویم مسلمانم بلرزم　　کہ دانم مشکلات لا الہٰ را

(آپ ہی کا فیضانِ نظر ہے کہ میری نظر اس قدر تیز ہے کہ میں چاند سورج کے آر پار دیکھ سکتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ لا الہٰ کہنا دشوار ہے، مسلمان ہونا کتنا مشکل ہے، اس تصور سے ہی کانپ جاتا ہوں)۔

ایک بات کو صاف کرنا ضروری ہے کہ محمدؐ رسول اللہ روحی فداہ کے متعلق ہر مسلمان کا اعتقاد ہے۔

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

قدرتاً اقبالؔ بھی اس عقیدے پر قائم تھے، مگر ان میں اور عام مسلمانوں میں فرق یہ ہے کہ عام مسلمان اِسے اعتقاداً مانتے ہیں۔ اقبالؔ اس عقیدے پر تحقیقاً قائم تھے۔ اس سے پہلے کہہ چکا ہوں کہ انہوں نے کافی غور و خوض کے بعد عالمِ انسانی کی نجات کیلئے ایک نمونے کو اپنے سامنے رکھا تھا اور یہ نمونہ حضرت خیر البشرؐ کی ذاتِ بابرکات تھی۔ اسوۂ رسولؐ کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ہی اقبالؔ نے تسلیم کیا تھا کہ:

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

مثلاً اقبالؔ کے سامنے غلامیٔ انسانیت کی سب سے بڑی توہین اور سب سے بڑی لعنت ہے۔ غلامی چاہے انفرادی ہو یا اجتماعی، سیاسی ہو یا اقتصادی، روحانی ہو یا ذہنی، ناقابلِ برداشت ہے۔ اقبالؔ کو اُسوۂ رسول کا مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ حضورؐ کی تعلیم ہر نوع کی غلامی کیلئے موت کا پیغام ہے۔ وہ ملوکیت کو غلامی کا جنم داتا سمجھتے ہیں، اس لئے ملوکیت کے ساتھ انہیں شدید عداوت ہے۔ اسوۂ رسولؐ میں انہیں ملوکیت کا تصوّر کہیں نہیں ملتا اور اس کا سر حضورؐ کے سامنے جھک جاتا ہے ؎

هنوز اندر جہاں آدم غلام است — نظامش خام کارش نا تمام است

غلام فقر آں گیتی پناہم — کہ در دینش ملوکیت حرام است

اسی طرح وہ جہانِ شوق کو تکمیل انسانیت کا اعلیٰ درجہ تصوّر کرتے ہیں۔ عشق کا تصوّر بھی اقبالؔ نے بدل دیا ہے۔ اس کے عام اور پِٹے ہوئے معنوں سے ہٹ کر انہوں نے کسی مردِ کامل کی تقلید کامل کا نام عشق رکھا ہے۔ عشق ایک نصب العین ہے جس کے حصول کیلئے انسان کسی مصلحت کا قائل نہیں رہتا۔ کسی جسمانی آزار سے نہیں گھبراتا اور مشکلات کے ہجوم میں بھی کوہِ وقار کی طرح ڈٹا

رہتا ہے۔ حضورؐ کی سیرت سے اقبال کو معلوم ہوا ہے کہ یہ صفت اگر تمام وکمال کہیں پائی جاتی ہے تو وہی دربار ہے۔

محبت از نگاہش پائیدار است　　سلوکش عشق و مستی را عیار است

مقامش عبدہ، آمد۔ ولیکن　　جہانِ شوق را پروردگار است

حضور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات کے ساتھ مسلمانوں کو جو عقیدت ہے، اس کی نظیر اور کہیں نہیں ملتی۔ حضورؐ کی تعلیمات میں اکثر اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ غلبہ حبِ رسولؐ کے جذبے سے سرشار ہو کر مسلمان کہیں افراط و تفریط میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ قرآن میں بھی بار بار ارشاد ہوا ہے کہ آپ ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ میں تمہاری ہی طرح کا ایک بشر ہوں۔ میرے اختیار میں کچھ نہیں۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ میرے ساتھ اور تمہارے ساتھ کیا معاملہ کیا جائیگا۔ میں تو صرف ایک نبی ہوں اور تمہارے سامنے میں وہی بات رکھتا ہوں جس کا مجھے حکم دیا گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود مسلمانوں کے دلوں میں حضورِ پرنور کی عقیدت اتنی بے پناہ ہے کہ بعض دفعہ لوگ ان قطعی ارشادات کی روح کے منافی کام کرتے ہیں۔ یہ غلبۂ حبِ رسول ہے اور اس کا ہونا ضروری بھی ہے۔

مسلمانوں میں ایک متنازعہ مسئلہ حیاتِ نبویؐ کا بھی ہے۔ سخت قسم کے توحید پرست یقین رکھتے ہیں کہ حضور کے اس عالمِ فانی سے نقل کرنے کے بعد ان سے خطاب کرنا یا انہیں زندہ سمجھنا خدا کا شریک ٹھہرانا ہے۔ لیکن علاّمہ اقبال اس مسلک کے قائل نہیں ہیں۔ وہ حضورؐ کے حیاتِ ظاہری کے اختتام کو ان کی موت نہیں سمجھتے وہ حضورؐ کو زندہ جاوید سمجھتے ہیں اور صاف صاف الفاظ میں کہتے ہیں۔

یا خدا در پردہ گویم با تو گویم آشکار　　یا رسول اللہ او پنہاں و تو پیدائے من

نعتوں میں جہاں جہاں اقبال نے حضور سے التجائیں کی ہیں، وہاں کہیں یہ بات اشارتاً بھی نہیں ملتی کہ ان کے دل میں حیاتِ نبوی کے متعلق ذرا سا بھی شک ہے۔ ایک نعت میں اقبال نے اپنی صحت کے بارے میں التجا کی ہے۔ اس کے چند شعر ملاحظہ فرمائیے:

آہ ازاں دردے کہ در جان وتن است　　　گوشہ چشم تو داروئے من است

در نسازد با دواء جانِ زار　　　تلخ بویش بر مشامم ناگوار

کار ایں بیمار نتواں بردپیش　　　من چو طفلاں نالماز در روئے خویش

تلخئے اور افزائم از شکر　　　خندہ ہا در لب بروزد چارہ گر

چوں بصیری ہے از تو مے خواہم کشود

تا یمن باز آید آن روزے کہ بود

فرماتے ہیں۔ یارسول اللہ میرے جان وتن میں جو کرب آفرین دور ہے اُس کا علاج آپ کی توجہ کے سوا اور کچھ نہیں۔ دواؤں کے ساتھ میری برابری نہیں، ان کی کڑواہٹ اور بدبُو سے میری جان پر بن آئی ہے۔ بیماری نے مجھے بچوں کی طرح بے صبر اور ندیدہ بنا دیا ہے۔ دواؤں کی کڑواہٹ کو دور کرنے کیلئے اس کے ساتھ شکر ملاتا ہوں تو میرا طبیب بھی میری ان طفلانہ حرکتوں کو دیکھ کر اپنی مسکراہٹ ضبط کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یارسول اللہ! میرے ساتھ وہی عنایت فرمائیے جو آپ نے بصیری کے ساتھ فرمائی تھی۔ میں پھر وہ دن دیکھ سکوں جو گذر چکے ہیں۔

ان اشعار کے مطالعہ کے بعد صاف صاف یہ بات نظر آتی ہے کہ اقبال رسولِ مقبول کو حی وقیوم سمجھتے ہیں۔ یہ بھی اعتقاد رکھتے ہیں کہ حضور کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اختیار حاصل ہے کہ آپ مُردہ کو زندہ کریں۔ خاک کو کیمیا بنا دیں۔

مکھی کو شاہباز کی پرواز بخشیں کبوترکے تنِ نازک میں شاہین پیدا کریں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبالؔ کی نعتوں میں التجاؤں کا انداز مناجات کا سا ہے اور وہ اس حد تک ہو گئے ہیں کہ مولانا فریدالدین عطارؒ فرماتے ہیں ۔

حمد بے حد مر خدائے پاک را   آنکہ ایماں داد مشت خاک را

اقبالؔ عطارؒ کے اس شعر میں ترمیم کرتے ہیں اور فرماتے ہیں۔

حمد بے حد مرا رسولِ پاک را   آنکہ ایماں داد مشتِ خاک را

بالکل منطقی انداز سے سوچا جائے تو اقبالؔ کا نظریہ غلط نہیں، کیونکہ ایمان کی دولت سے عالمِ انسانیت کو اگر باخبر کیا ہے تو وہ رسول نے ہی کیا ہے۔ ایمان عرفان کا سرچشمہ ہے لیکن اس سرچشمے کی طرف راہبری کرنے والا بھی تو ہو۔ اس کی تصدیق قرآن حکیم کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ بندوں سے پوچھیں گے۔ الم یاتکم نذیر ۔ کیا تمہارے پاس میری طرف سے ڈرانے والا نہیں آیا؟ یہی ڈرانے والا اور خوشخبری سنانے والا ایمان کی طرف راہ دکھانے والا ہے، اور اس لحاظ سے یہ کہنا بالکل بجا اور موزوں ہے۔ اللہ جل شانہٗ اگر براہ راست اپنے بندوں کے دلوں کو نورِ ایمان سے منور فرمانے کا ارادہ رکھتے تو نبیوں ، رسولوں ، رہنماؤں اور اوتاروں کے وقتاً فوقتاً آنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ جو لوگ اقبال کو جذبۂ رسول میں خالی سمجھتے ہیں ان کیلئے شاید یہ دلیل شافی ہو سکتی ہے اور اسی معنی کو زیادہ وضاحت کے ساتھ اس دل پذیر شعر میں ظاہر کیا گیا ہے۔

مے تو رانی منکرِ یزداں شدن   منکرِ شان نبیؐ نتواں شدن

اقبالؔ کی نعتوں کا اندازہ روایتی نعت خوانی سے بالکل جدا ہوا ہے۔

انہوں نے نعتوں میں سیرتِ رسول کا خاکہ پیش کر کے ایک تبلیغی کام سرانجام دیا ہے۔ یہ وصف اقبالؔ کو اس لئے حاصل ہے کہ وہ خالص مُلّا نہ تھے۔ عہدِ حاضر کے علوم پر کماحقہ حاوی تھے۔ اسلامی روایات و علوم کے دلدادہ اور ذاتِ نبویؐ کے والہ و شیفتہ تھے۔ قدیم و جدید کے اس امتزاج نے اقبالؔ کو اپنا ایک خاص مقام عطا کیا ہے۔ قدسیؔ نے رسول اکرمؐ کے متعلق فرمایا تھا۔

بمقامے کہ رسیدی نہ رسد ہیچ نبی

اقبالؔ کے بارے میں بھی یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ نعت کی صنف کو انہوں نے جو نیا رنگ اور جو معنی بخشے وہ اس کے پہلے کے نعت خوانوں کے وہم میں بھی نہ آسکتے تھے۔ اس رنگ میں وہ لاثانی ہیں۔ ان کا مقام اپنا ہے اور کوئی اس مقام کو چھین نہیں سکتا۔ زمانے کی گردش کے ساتھ ساتھ شاید اور لوگ بھی پیدا ہوں، مگر تقدم اور اوّلیت کا شرف اقبالؔ ہی کو حاصل رہے گا۔

اس مقالے کو ختم کرنے سے پہلے ارمغانِ حجاز کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس کتاب میں جو اقبالؔ کی آخری تصنیف ہے، اقبال نے ایک حصّہ حضورِ رسالتؐ کے عنوان سے معنون کیا ہے۔ اس حصے کی ابتداء میں اقبالؔ نے عزت بخاری کا یہ شعر لکھا ہے ؂

ادب گاہے است زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید اینجا

حضورِ رسالتؐ ایک مسلسل مضمون پر مشتمل ہے۔ اگرچہ یہ ایک مسلسل نظم کی صورت میں نہیں۔ مضمون یہ ہے کہ ایک عاشقِ رسول، دیارِ حبیب کا سفر کرتا ہے، وہاں پہنچتا ہے اور پھر اپنے دل کی بھڑاس نکالتا ہے۔ تمنائیں عرض کرتا

ہے۔اس سفر پر روانہ ہونے سے پہلے عاشق کے دل کی کیفیات کیا تھی، خود سفر میں دل کا کیا حال تھا، اور پھر جب حضورؐ رسالت میں باریابی ہوئیتو جذبات کے تلاطم کا کیا اندازہ تھا۔ یہ سب کیفیتیں ایک ایسے دلاویز نغمے کی صورت اختیار کرتی ہیں جو دل کے ساتھ پیوست ہوجاتا ہے۔ آنکھیں نمناک، دل سوز اور جگر خون ہوکر رہ جاتا ہے۔ سفر پر روانہ ہونے سے پہلے کی کیفیت کا ایک منظر دیکھئے۔

بہ ایں پیری رہ یثرب گرفتم　　نواخوانِ از سرودِ عاشقانہ

چوآن مرغے کہ در صحرا سرِ شام　　کشاید پر بفکرِ آشیانہ

(بڑھاپے میں عاشقانہ گیت گاتے گاتے یثرب کی طرف روانہ ہورہا ہوں، اس پرندے کی طرح سارا دن صحراؤں میں گذار کر شام کے وقت اپنے آشیانے کی طرف جانے کیلیئے پَر تولنے لگتا ہے)۔ اور پھر عین سفر کی ایک دلاویز صورت بھی ملاحظہ فرمائیے۔

سحر باناقہ گفتم نرم تر رو　　کہ راکب خستہ و بیمار وپیر است

قدم مستانہ زد چندانکہ گوئی　　بپایش ریگِ ایں صحرا جریر است

(میں نے اونٹنی سے کہا کہ تیرا سوار تھکا ہوا، بیمار اور بوڑھا ہے۔ ذرا آہستہ چل۔ میرا یہ کہنا تھا کہ جھوم اٹھی اور پہلے سے بھی زیادہ تیز چلنے لگی، جیسے صحرا کی ریت نہ تھی اس کے قدموں کے نیچے ریشم کا فرش تھا)۔ اس کا سبب؟ وہ بھی سنئے۔

مہار اے سارباں اورنشاید　　کہ جان او چو جانِ من بصیر است

من از موجِ خرامش مے شناسم　　چومن اندر طلسم دل اسیر است

میں نے اس کے بعد ساربان سے کہا کہ اونٹنی کو اپنے حال پر چھوڑ دو، اس کی مہار نہ پکڑو، اونٹنی بے قابو ہوئی جاتی ہے۔ میں اس کا راز پا گیا ہوں۔ یہ بھی

دیارِ حبیب پر پہنچنے کیلئے میری ہی طرح نا صبور ہے۔ یہ غریب بھی میری ہی طرح دل کے ہاتھوں مجبور ہے۔

نیم اشک است در چشمِ سیاہش   دلم سوز وزآہِ صبح گاہش
ہماں مے کو ضمیرم رابرافروخت   پیاپے ریزد از موجِ نگاہش

(کیا تم نہیں دیکھتے اس کی آنکھیں غمناک ہیں، کیا تم نہیں سنتے یہ آہ و فریاد کر رہی ہے۔ ارے یہ تو وہی شراب ہے جس نے میرے ضمیر کو تابناک کیا ہے اور جواَب اِس اونٹنی کی موجِ نگاہ سے برابر ٹپک رہی ہے)۔

آیئے اب ذرا اس صحرا کی بھی ایک جھلک دیکھیں جس کی شامیں صبحوں سے زیادہ آئینہ فام ہیں، جس میں مدینے کا مسافر سفر کر رہا ہے، اور دل کے دروازے کھول رہا ہے۔

چہ خوش صحرا کہ در دے کاروانہا   درودے خواند ومحمل براند
نہ ریگِ گرم او آور سجودے   جبیں راسوز تا داغے بماند

سبحان اللہ کیا صحرا ہے۔ کاروان کے کاروان جارہے ہیں، درود پڑھتے ہیں اور اونٹوں کو ہانکتے ہیں۔ آؤ اِس صحرا میں گرم گرم ریت پر ایک سجدہ کریں، تا کہ ماتھا جل جائے اور اس پر یادگار کے طور پر ایک داغ باقی رہ جائے۔

تفصیل میں جانے کی گنجائش نہیں اس لئے بہت کم نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔ صحرا کا سفر ختم کرنے کے بعد آخر نوبت دربارِ نبویؐ میں حاضر ہونے کی آتی ہے۔ اس وقت جذبات کا کیا عالم ہوگا، اس کا احاطہ ہم جیسے لوگوں کے بس کی بات نہیں، مگر اقبالؔ ایسے چابک دست کیلئے ذرا بھی مشکل نہیں۔ دیکھئے اور اپنے ذوقِ لطیف کی بالیدگی کا سامان کیجئے۔

بیا اے ہم نفس باہم بنالیم   من و تو کشتہ شانِ جمالیم
درحرفے بر مراد دل بگوئم   بپائے خواجہ چشماں را بمالیم



حکیماں را بہا کمتر نہادند   بناداں جلوۂ مستانہ دادند
چہ خوش بختے چہ خرم روزگارے   درسلطان بدرویشے کشاند



جہان چار سو اندر برِ من   ہوائے لامکاں اندر سرِ من
چو بگد ازیں بام بلندے   چوگرد افتاد پرواز از پرِ من



دریں وادی زمانی جاودانی   زخاکش بے صوررویدمعانی
حکیماں باکلیماں دوش بادوش   کہ اینجاکس نگوید لن ترانی

(اے ہم نفس آ۔مل کر آہ وزاری کریں، ہم دونوں ایک ہی شمعِ رسالتؐ کے پروانے ہیں۔آج موقعہ ہے کہ دل کی بات زبان پر لائیں اور حضورؐ روحی فداہ کے پائے مقدس کے نیچے اپنی آنکھیں بچھادیں۔یہ......کی دین ہے۔یہاں حکمت ودانائی کی کوئی قیمت نہیں، البتہ جنونِ عشق کی بڑی قیمت ہے۔حکیم اپنی حکمت سے خم وپیچ سلجھا رہا ہے، اور مجھ ایسا ناداں جلوۂ دوست کی دولت بے پایاں سے بہرہ اندوز ہورہا ہے۔کیا......وقت کی سعادت کا کوئی جواب ہے کہ جب ایک سلطان کا دروازہ کھل جائے، اور ایک فقیر کم مایہ کو باریابی کی دولت حاصل ہوجائے، یہ تو وہ ہے جب سارا جہان چارسو میرے آغوش میں ہے کہ لامکان کی ہوا میرے سر میں آئی ہے۔میری پرواز اتنی اونچی ہے کہ خود طاقتِ

پرواز بھی میرے پروں سے گر پڑی ہے۔ یہ وہ وادی ہے جو زمان ومکان کے حدود سے باہر ہے۔ اس کی مٹی سے معانی پیدا ہوتے ہیں جن کی کوئی صورت نہیں۔ یہاں دانا نادان میں کوئی امتیاز نہیں۔ یہاں رحمتِ عام کا یہ عالم ہے کہ آج تک لن ترانی کا جواب کسی کو نہ ملا۔ جو ہے، دیدار کی دولتِ سرمدی سے فیضیاب ہو کر جاتا ہے۔)

اس کے بعد التجاؤں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ قبل اس کے کہ میں چند نمونے پیش کروں، یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اقبالؒ کی التجائیں بہت کم ایسی ہیں جن میں محض اپنی ذات کی فلاح مقصود ہو۔ اقبالؒ جب بارگاہِ رسالت میں معروضات پیش کرتے ہیں تو ان کے سامنے سارا عالمِ انسانیت ہوتا ہے۔ اقبال کا پختہ عقیدہ ہے کہ محمد عربیؐ کے پیغامِ میں دنیا کی نجات ہے، کیونکہ اسلام امن وصلح اور آشتی کا پیغام ہے۔ اسی لئے وہ پیغامِ محمدؐ کو عام کرتے ہیں۔ وہ دیانتداری سمجھتے ہیں کہ محمدؐ کے پیغام میں رِستے ہوئے ناسور کا علاج ہے۔ قوموں کی باہمی بے اعتمادی، افراد کی بے راہ روی، خانہ جنگی اور آپا دھاپی، خون خرابہ اور دھینگا مشتی کو ہمیشہ کیلئے ختم کرنا ہو تو محمدؐ کے پیغام پر خلوص دل سے عمل کیا جائے۔ اس بات کو ذہن میں رکھئے اور یہ چند التجائیں، ان کا خلوص اور ان کا انداز ملاحظہ فرمائیے۔

هنوز ایں چرخ نیلی کج خرام است ۔۔۔ هنوز ایں کارواں دور از مقام است
زکار بے نظامِ خور چہ گویم ۔۔۔ تو میدانی کہ ملت بے امام است



ملوکیت سراپا شیشہ بازی است ۔۔۔ ازو ایمن نہ رومی نے حجازی است
حضورؐ تو غم یاراں بگویم ۔۔۔ بہ امیدی کہ وقتِ دلنوازی است



جبیں را پیشِ غیر اللہ سودیم چو گبراں در حضورؒ اوسرودیم
ننالم از کسے می نالم از خویش کہ ماشایانِ شان تو نبودیم



مسلماناں بخویشاں درستیزند بجز نقش دوئی بر دل نریزند
بنالندار کسے خشتے بگیرد ازاں مسجد کہ خود ازدوے گریزند



سبوئے خانقاہاں خالی ازمے کند مکتب رہِ طے کردہ راطے
زبزم شاعراں افسردہ رفتم نواہا مردہ بیروں افتدازنے



مراتنہائی آہ و فغاں بہ سوئے یثرب سفر بے کارواں بہ
کجا مکتب کجا میخانۂ شوق تو خود فرما مرا ایں بہ کہ آن بہ



بہ آں رازے کہ گفتم پے نبردند ز شاخ نخل نے خرما نخوردن
من اے میرامم داداز تو خواہم مرا یاراں غزل خوانے شمردند



تو گفتی از حیاتِ جاوداں گوئی بگوش مردۂ اسرار جاں گوئی
ولے گویند ایں حق ناشناساں کہ تاریخِ وفاتِ ایں وآں گوئی



زخم از دردِ پنہاں زعفرانی تراود خون بچشم ارغوانی

سخن اندر گلوئی نے گرہ بست　　　تو احوالِ مرا نا گفتہ دانی



مے از مے خانۂ مغرب چشیدم　　　بجانِ من کہ دردِ سر خریدم
نشستم بانکویانِ فرنگی　　　ازاں بے سوز تر روزے ندیدم

التجاؤں کا یہ سلسلہ بے حد طویل ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ان التجاؤں میں جہاں ملوکیت سے نجات کی درخواست ہے۔ عالمِ انسانیت کی بدنظمی کی شکایت ہے۔ انسان کے غیر اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا رونا ہے۔ آدمی کے ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریباں ہونے کی دردناک داستان ہے۔ وہاں یہ اشارہ بھی صاف اور واضح ہے کہ وہی مسلمان جو اگر کسی غیر مسلم کو مسجد کی ایک اینٹ چراتے دیکھتا ہے تو فساد کرتا ہے، خود سجدے کی نعمت سے محروم ہے اور مسجد کی عظمت سے نابلد۔ خانقاہوں میں بے سوز صوفی بیٹھے ہیں۔ ملا تحصیلِ حاصل کرا رہے ہیں۔ شاعر موت اور افسردگی کے راگ الاپ رہے ہیں، اور حضورِ رسالت میں التجا ہے کہ کوئی ایسا انقلاب آئے، ایک ایسی گردش رونما ہو کہ یہ ساری باتیں جائیں اور انسان پھر ایک مرتبہ اسی رتبے پر فائز ہو جائے جو اُس کے لئے روزِ آفرینش مقدر ہو چکا تھا۔ اب التجاؤں میں آفاقیت اور ہمہ گیری ہے۔ اقبال دربارِ رسالت سے اپنے لئے ضرور شرحِ صدر اور کشود مانگتے ہیں۔ اپنے درد کا مداوا طلب کرتے ہیں، مگر وہ اس دربار کی عظمت سے واقف ہیں، اسی لئے ان کی التجائیں بھی چھوٹی نہیں، ان کی حاجات بھی گھریلو قسم کی نہیں۔ وہ غم کو ایک لازوال دولت سمجھتے ہیں، مگر نمک، تیل اور لکڑی کے غم کو وہ شایانِ دل نہیں سمجھتے۔ وہ جب اپنی ذات کیلئے حضورِ رسالت سے کچھ مانگتے ہیں تو وہ یہ چیز مانگتے ہیں۔

ہمیں یک آرزو دارم کہ جاوید زعشق تو بگیرد رنگ و بوئے

یا رسول اللہؐ! میری التجا قبول فرمایئے۔ جاوید کو اپنے عشق میں گرفتار کردیئیے۔ جاوید کو مخاطب کر کے اقبال نے ہمیشہ نژادنو یعنی نئی پود سے خطاب کیا ہے، اس لئے اگر وہ جاوید کیلئے عشقِ رسولؐ کی گرفتاری چاہتے ہیں تو وہ نژادِنو کیلئے یہ دعا کرتے ہیں۔ یہ التجا بھی ذاتی ہونے کے باوجود آفاق گیر ہے۔

اقبال نے سیاسی، مجلسی، اقتصادی، معاشرتی غرض تمام موضوعوں پر لکھا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ ان کے فکر کا محور محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ والا صفات ہے۔ گھوم پھر کر وہ اسی موضوع پر آتے ہیں۔ 'ابلیس کی مجلس شوریٰ' ہو یا 'خضرِ راہ'، 'زبورِ عجم' کی غزلیں ہوں یا 'بالِ جبریل' کی مسجد قرطبہ۔ رسولِ کریمؐ کی ذات کبھی ان کی نگاہ سے اوجھل نہ ہوئی۔ اس لئے کہ

یا رسول اللہ او پنہاں و تو پیدائے من

اقبال کے لوح دل پر کنندہ تھا۔ اور وہ نفطاً و نعتاً اس عقیدے کے قائل تھے۔ جس کا وہ مختلف انداز سے اظہار کر چکے ہیں۔

می توانی منکر یزداں شدن منکرِ از شانِ نبیؐ نتواں شدن

..................☆☆☆..................

حضرت میر نازک نیازی قادریؒ

سلطان زین العابدین کا عہد حکومت نہ صرف اس لحاظ سے کشمیر کا عہد زریں کہلاتا ہے کہ ان کے زمانے میں کشمیر صنعت وحرفت کا گہوارہ بنا بلکہ ملک میں طویل بدامنی کے بعد امن وآشتی کا دور دورہ ہونے لگا۔ اس اعتبار سے بھی یہ عہد سنہرا عہد ہے کہ کشمیر میں علم وفضل، خدا شناسی، بصیرت ومعرفت کا آفتابِ عالم تاب روشن ہوا۔ سلطان نے دیگر ممالک خاص کر چین اور روسی ترکستان سے رابطہ قائم کر کے وہاں کے علماء وفضلاء کو دعوت دے کر کشمیر میں آباد کیا۔ ان ہی بزرگواروں میں سے ایک صاحب تاریخ کے اَوراق پر ستارۂ صبح کی طرح درخشان ہیں اور ان کا نامی میر محمد علی محمد بخاری تھا۔ سلطان بڈشاہ نے ان کو ان کے علم وفضل اور معاملہ فہمی کی بناء پر ملکِ کشمیر کے نظامِ عدل کا سربراہ بنادیا تھا اور وہ قاضی القضاۃ کے عہدۂ جلیلہ پر مامور تھے۔ میر محمد علی بخاری کا خاندان کشمیر میں پھولا پھلا اور ملک کا شعبۂ عدل پشت در پشت اس خاندان کے چارج میں رہا۔ اس خاندان کے بارے میں بجا طور پر کہا جاسکتا ہے۔

ایں سلسلۂ علمائے ناب است
ایں خانہ تمام آفتاب است

اس خاندان کے مشہور و معروف بزرگ قاضی موسیٰ شہید بھی ہیں جن کے حالات تاریخ میں تفصیل کے ساتھ منضبط ہیں اور اسی خاندان کے چشم و چراغ حضرت میر نازک نیازی قادریؒ ہیں جو اپنے علم و فضل کے علاوہ زہد و تقویٰ، معرفتِ الٰہی اور عشقِ سرمدی کے متوالے تھے اور تمام تاریخ نویسوں کا متفقہ فیصلہ ہے کہ کشمیر میں لاتعداد اولیاء، اصفیاء علماء اور بزرگانِ دین ہیں مگر تقویٰ اور پرہیز گاری کے معاملے میں حضرت میر نازک نیازی قادریؒ کا کوئی ثانی نہیں۔ میر علیہ رحمہ کا شجرہ نسب یوں ہے۔

میر نازک نیازی قادری بن میر حاجی محمد قاضی بن میر کمال الدین بن میر سکندر بن میر اسحاق بن میر علی بخاری بڈشاہی رحمۃ اللہ علیہ۔

میر علیہ الرحمۃ کی تاریخ ولادت کے بارے میں کو ثیقہ روایت نہیں، البتہ اتنا معلوم ہے کہ ان کے والد میر حاجی محمد قاضی حضرت محبوب العالم سلطان العارفین شیخ حمزہ کشمیریؒ کے ہم عصر تھے۔ ان کی کئی اولادیں ہوئیں تھیں مگر خوردسالی میں ہی اللہ کو پیارہ ہوگئیں تھیں۔ میر نازک جب تولد ہوئے تو ان کے والد انہیں حضرت محبوب العالم شیخ حمزہ کشمیریؒ کی خدمت میں لائے اور ان سے عرض کی کہ اس سے پہلے جو اولادیں ہوئیں وہ سنِ بلوغ پر پہنچنے سے قبل ہی اس دنیا سے کوچ کر گئیں اس لئے اس نومولد کو آپ کی خدمتِ بابرکت میں لایا ہوں اور اسے آپ کی نذر کرتا ہوں۔ مولانا بہاؤ الدین متو اپنی کتاب 'سلطانی' میں یہ واقعہ اس طرح درج کرتے ہیں۔

چوں تولد جناب پر شدند   در و دیوار از منیس شدند

بدرر خشندۂ علم برزد   بلکہ خورشید معرفت سرزد

پدر از مہر ردبرش آورد بسوئے شیخ حمزہ سلطان برد
کیں سپر کردہ ام نیاز شما اے تو محمود واین نیاز شما

(ترجمہ: جب حضرت میر نازکؒ پیدا ہوئے تو ان کے نورِ معرفت سے در و دیوار منور ہو گئے۔ ایسا لگا کہ جیسے چمکتا چاند ظاہر ہوا بلکہ ایک خورشیدِ معرفت طلوع ہوا۔ باپ نے اسے گود میں اٹھایا اور کہا کہ اس بچے کو آپ کی خدمت میں بطورِ نذر و نیاز لایا ہوں۔ آپ اگر سلطان محمود ہیں تو یہ بچہ آپ کا ایاز بن کر رہے گا۔)

اسی اعتبار سے میر علیہ رحمہ کو میر نازک نیازی بھی کہتے ہیں۔ کچھ دیر یہ بچہ حضرت سلطانؒ کے سامنے رہا۔ اتنے میں باپ نے دیکھا کہ حضرت سلطان العارفینؒ کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں اور وہ سمجھے کہ شاید یہ بچہ بھی زیادہ دیر تک زندہ رہنے والا نہیں۔ حضرت سلطان العارفینؒ باپ کے شکوک سے آگاہ ہو گئے۔ انہوں نے فرمایا کہ یہ بچہ عالمِ روحانی میں اتنا بلند مقام ہے کہ مجھے خوشی ہوئی کہ یہ میرا مرید ہوگا۔ مگر جناب غوثِ صمدانی، محبوبِ سبحانی سیّد عبدالقادر جیلانیؒ نے مداخلت فرمائی اور کہا کہ ہم اسے اپنے سلسلے میں لے رہے ہیں۔ مولانا بہاؤالدین فرماتے ہیں ؎

ایں پسر کہ ہما سپردہ تست از پئے حق نثار کردۂ تست
ماچو دیدیم نور قربت او شاد گشتیم و داد فرحت او
بہ ردا یک برشوکت وشانش دست بگرفتہ شاہ جیلانشؒ
لطف حق چوں برد نظر کردم از سر مہر دیدہ تر کردم

(ترجمہ: حضرت سلطان العارفینؒ نے فرمایا کہ اس بچے کو تم نے ہمارے حوالے کیا اور نذر کے طور پر ہمیں بخشا۔ ہم نے اس کے روحانی کمالات دیکھے

اور ہمارا دل خوش ہو گیا کہ ایسا مرید بھی ہمارے زمرے میں ہے لیکن اس بچے کو پورے اعزاز کے ساتھ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے اپنے لئے پسند فرمایا اور اس کی دستگیری کی، یہی وجہ ہے کہ میری آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ یہ بچہ تو ایک ناپید کنار سمندر ہے۔ روحانی میدان میں شیر اور معرفت کی فضاء کا شہباز ہے۔ تمہاری یہ نیاز خاندانِ رسالت میں مقبول ہو گئی۔)

حضرت سلطان العارفینؒ نے اس بچے کو سنِ شعور تک پہنچنے کے بعد اپنے خلیفہ خاص حضرت بابا داؤد خاکیؒ کے حوالے کیا اور انہیں ہدایت کی کہ وہ عبوری طور پر اس کی تربیّت کریں کیونکہ ان کا اصلی مرشد حضرت غوثِ پاکؒ کی ہدایت پر باہر سے آئے گا اور یہ سب اپنے وقت پر ہوگا۔

حضرت بابا داؤد خاکیؒ، حضرت میرؒ کی تربیت کرتے رہے اور کچھ عرصے کے بعد کشمیر میں جناب حضرت میر اسماعیل شامیؒ کا ورودِ مسعود ہوا۔ وہ حضرت بابا داؤد خاکی کے ہاں فروکش ہوئے اور دونوں بزرگ ایک دوسرے سے اکتسابِ فیض کرتے رہے۔ حضرت میر اسماعیل شامیؒ مامور تھے کہ وہ کشمیر میں سلسلۂ عالیہ قادریہ کو ترویج دیں۔ اس لئے انہوں نے حضرت بابا داؤد خاکیؒ سے ایک جوانِ صالح کی طلب کی، جسے وہ تربیّت دے سکیں۔ کہتے ہیں کہ حضرت بابا داؤد خاکیؒ نے اپنے فرزند پیش کئے، مگر حضرت شامیؒ نے فرمایا کہ ان میں یہ صلاحیت نہیں۔ آخرالامر حضرت خاکی نے میر نازک نیازیؒ کو پیش کیا جو فوراً منظور ہوئے۔ مولانا بہاؤالدین متوفرماتے ہیں۔

خواست سیدؒ ز شیخؒ فرزندے　　که ہرد تربیت کند چندے
شیخ فرزند ہائے کوک خویش　　برد ہریک جدا جدا درپیش

گفت اینہا چودک اند بسے　　نیست آوان تربیت بے

طالب گرمرید تو باشد　　مستفید درشید تو باشد

حکم فرما پیش من آید　　سرزگنج نہفتہ بکشاید

شیخ فرمود میر نازکؒ را

کہ توئی لایق ایں نیزک را

ان اشعار کا مفہوم وہی ہے جواُوپر کی سطور میں بیان کیا گیا ہے۔اس طرح حضرت میر نازکؒ قادری سلسلے میں حضرت میر اسماعیل شامیؒ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے اور مجاز بنے اور کشمیر میں قادری سلسلے کو عروج ہوا۔ یہ امتیاز حضرت میر نازک قادریؒ کو ہے کہ وہ اس ملک میں قادری سلسلے کے بانی ہوئے۔ چنانچہ مولانا بہاؤالدین متوفرماتے ہیں کہ میر اسماعیل شامیؒ نے حضرت میرؒ سے کہا کہ یہ دولت جو تجھے حاصل ہوئے ہے، حضرت غوث الاعظمؒ کے ارشاد سے ہوئی ہے اور پھر

مہراز یں لطف وزیں کرامت ہا　　از خدا خواست استقامت ہا

طالبان را بخود صلادر داد　　بخدا راہ از صفیا در داد

فرقہ در برز مہر رافت کرد　　جاسر مسند خلافت کرد

محاوری نقش زد بروئے نگین　　میر نازکؒ غلام محی الدینؒ

(ترجمہ: ان عنایتوں اور کرامتوں سے انہوں نے خدا سے راہِ حق پر چلنے کیلئے استقامت کی۔ دعا کی جو قبول ہوئی اور طالبانِ حق جوق در جوق ان کے چشمہ مُغفرت سے سیراب ہونے لگے۔ آپ کی انگوٹھی میں جو نگینہ تھا اس پر میر نازک غلام محی الدین کندہ تھا۔

میں نے اس سے پہلے کہا ہے کہ کشمیر میں زاہدانِ مرتاض، عابدانِ شب

زندہ دار اور مقربان بارگاہ کی کمی نہیں۔ مگر تمام مورخوں کا اتفاق ہے کہ تقویٰ اور پرہیز گاری میں جناب میرؒ بے نظیر ہیں۔ آپ کا مزارِ پُر انوار اور آپ کی خانقاہ محلّہ کادی کدل میں آج بھی مرجعِ خلایق ہے۔ تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ ان دنوں نالہ مار پر ایک پل تعمیر ہو رہا تھا جس کا نام کادی کدل رہے۔ حضرت میرؒ اس تعمیر کو اکثر دیکھتے۔ ایک روز دیکھا کہ ایک عورت زار و قطار رو رہی ہے۔ سببّ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ پل بنانے والے ٹھیکیدار نے اس کے کچھ پتھر اٹھا لئے ہیں اور انہیں پل کی تعمیر میں لگا رہا ہے۔ ٹھیکیدار بارسوخ آدمی تھا۔ اس نے عورت کی ایک نہ سنی اور حضرت میرؒ نے فیصلہ کیا کہ اس پل کو عبور و مرور کیلئے کبھی استعمال نہیں کریں گے، کہ اس پل میں غصب شدہ مال لگایا گیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اب نہ وہ نالہ مار ہے جس کا وجود ایک زمانے میں شہر کے حُسن کو دوبالا کرتا تھا اور نہ وہ کادی کدل جس کو زمین دوز کر کے ایشیائے کے اس وینس کو برباد کر کے رکھ دیا گیا ہے اور وہ دن بھی دور نہیں جب ڈل کا وجود ختم ہو جائے گا۔ جنگلات کا صفایا ہوگا اور یہ جنتِ اراضی ایک ریگستان میں بدل جائے گی۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔

حضرت میر نازک قادریؒ کے تقویٰ کی مورخوں نے کئی مثالیں دی ہیں۔ فرماتے ہیں کہ حضرتؒ اس وقت تک کوئی بھی تحفہ قبول نہیں فرماتے جب تک اس کی ملت و حرمت اور اس کے ماخذ کے بارے میں دریافت نہ کرتے۔ تحفہ لانے والے سے پوچھتے تمہارا کوئی شریک تو نہیں؟ اگر ہے تو کیا اس کی اجازت حاصل ہے۔ کیا اس پر سرکاری ٹیکس ادا کیا گیا ہے؟ اگر ذرا بھی شبہ ہوتا تو تحفہ لینے سے انکار فرماتے۔ غلام محی الدین سرائے بلی اپنی کتاب تحایف الابرار میں فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ حکامِ وقت میں سے ایک صاحب حضرت میرؒ سے ملنے آئے۔ آپ نے

اسے اس وقت تک اندر آنے کی اجازت نہ دی جب تک خانقاہ کے سارے بورے اُٹھوانہ لئے۔ اندر آ کر حاکمِ وقت نے کچھ روپیہ بطورِ نذر پیش کیا۔ آپؒ نے حاکم کی موجودگی ہی میں وہ ساری رقم غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کر ڈالی۔ حضرت شاہ نعمت اللہ قادریؒ سلسلہ قادریہ کے ایک بلند مرتبت بزرگ ہیں، وہ کچھ عرصے کے لئے کشمیر آئے اور چھتہ بل میں مقیم رہے یہاں بہت سے لوگوں نے ان کو مدعو کیا اور آپؒ نے بلا تحقیق وہ دعوتیں قبول کیں اور نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کو اپنے کمال میں زوال کے آثار نظر آنے لگے، بہت گھبرائے اور لوگوں سے استفسار کیا کہ کیا اس شہر میں قادری سلسلے کے کوئی بزرگ ہیں؟ لوگوں نے حضرت میر نازکؒ نیاز کا نام بتا دیا اور آپ نے ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارادہ ظاہر کیا۔ حضرت میرؒ کو کشف کے ذریعے معلوم ہوا کہ انہوں نے مٹھی بھر چاول اپنی اہلیہ کو دیا اور کہا کہ ایک مہمان آرہے ہیں...... حضرت شاہ نعمت اللہ قادریؒ تین روز تک حضرت میر نازک قادریؒ کے مہمان رہے اور حضرت شاہ نعمت اللہ قادریؒ نے دیکھا کہ وہ نہ صرف اپنا کھویا ہوا کمال حاصل کر سکے بلکہ ان کے روحانی مدارج میں ہر روز ترقی ہوتی گئی۔ دل میں خیال آیا کہ اب یہیں پڑا رہوں گا۔ حضرت میرؒ نے چوتھے روز صبح مٹھی بھر چاول ان کے سپرد کئے اور فرمایا کہ مہمان کو تین دن تک ٹھہرانا سنت نبویؐ ہے۔ یہاں پڑے رہنے کے خیال سے باز آؤ کیوں کہ۔

دُگرا اے میر نازکؒ جو خونِ جگر است

بہر کے مفت میسر نتواند شد

یعنی میر نازک جَو کا 'دُگرا' جگر کا خون ہے اور ہر کسی کو آسانی سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ ساتھ ہی انہیں کھانے پینے کے معاملے میں احتیاط برتنے کی تلقین

کرتے ہوئے کہا کہ اب جائیے اور پھر دوبارہ نہ آئیے۔ کچھ عرصے کے بعد شاہ نعمت اللہ قادریؒ پھر حاضر ہونے کیلئے بے قرار ہوئے اور انہوں نے کہلا بھیجا۔

مادرِ فراق تو سوختیم

یعنی ہم آپ کے فراق میں جل رہے ہیں۔ حضرت امیرؒ نے اسی کاغذ کی پشت پر لکھا۔

ما سوختیم، خاکستر شدیم و برباد رفتیم

یعنی ہم تو پہلے ہی جل کر خاکستر ہو گئے ہیں اور یہ راکھ اڑ کر برباد ہو گئی ہے۔ اب کس سے ملنا چاہتے ہو؟

مولانا بہاؤ الدین متو نے بابا داؤد مشکواتیؒ کی کتاب ''اسرار الابرار'' سے نقل کیا ہے کہ جامع مسجد سرینگر میں ایک عجیب الخلقت پرندہ مینار مسجد پر نمودار ہوا جو شکل وصورت اور قد وقامت کے لحاظ سے باز کے برابر تھا۔ اس کا سر اور پاؤں سفید تھے اور وہ مسجد کے چاروں میناروں پر طواف کرتا رہا۔ لوگ اسے پتھر مارتے مگر نہ وہ اس سے متاثر ہوتا اور نہ خوف زدہ۔ دو ہفتے تک یہی عالم رہا۔ لوگ یہ ماجرا لے کر حضرت میر نازک قادریؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے تھوڑے سے غور وفکر کے بعد کہا۔ جاؤ اس سے کہو، 'ہم نے تمہارا پیغام سنا۔'' جوں ہی اس پرندے نے یہ پیغام سنا، وہ اڑ گیا اور چند روز کے بعد حضرت میر نازک قادریؒ کا انتقال ہوا۔'

آپؒ کے انتقال کے کئی سال بعد یہی پرندہ پھر نمودار ہوا اور اس سال کشمیر میں وبائے ہیضہ سے بے شمار لوگ ہلاک ہو گئے۔ پھر کئی سال بعد پھر نمودار ہوا تو کشمیر قحط کی لپیٹ میں آ گیا اور ہزاروں لوگ لقمۂ اجل بن گئے۔ یہ واقعہ تحفۃ الابرار، تاریخ اعظمی اور تاریخ کی دیگر کتابوں میں درج ہے۔

حضرت مولانا بہاؤ الدین متوؒ نے اپنی کتاب 'سلطانی' میں حضرت میر نازک قادریؒ کے کمالات کا تذکرہ یوں فرمایا ہے ۔

قدوہ برگزیدان آلہ زہدو محرمان درگہ شاہ
شاہباز تراوق ملکوت خازن گنج خانہ لاہوت
مسند آرائے ملک درویشی راہ پیمائے فقر دل ریشی
از ازل اونہادہ در تفرید تا ابد مست بادۂ توحید
نکشادہ بغیر سنت دم برسول خداؐ قدم بقدم
میر نازکؒ بحر معنیٰ بود بلکہ زاں بحر دریکتا بود
جداو بہ اوسر چواز بخارا زد سرچو خورشید آشکارا زد

(ترجمہ: اللہ کے چنے لوگوں کا پیشوا، اللہ تعالیٰ کے رازوں کے محرم بزرگوں کا خلاصہ، ملکوت کے پردوں میں اڑنے والے شاہباز اور لاہوت کے خزانے کا خزانچی، درویشی کے مُلک کا مسند نشین اور فقر دل ریشی کی منزلیں طے کرنے والا۔ ازل سے ابد تک تفرید اور توحید کیلئے متوالا...... وہ بزرگوار جس کی ہر سانس سنتِ رسولؐ کے مطابق تھی اور جو قدم قدم حضور رسالتمآب ؐ کا تابع تھا۔ اس کا نام نامی میر نازک ہے جو معنویت کا سمندر تھا۔ بلکہ معنویت کے سمندر میں لاثانی اور بیش بہا موتی تھا۔ ان کے جدِ پاک (میر علی محمد بخاری) بخارا سے آئے اور یہاں آفتابِ عالم تاب بن کر چمکے)

کتاب 'تحفۃ الابرار' میں لکھا ہے:

''شایق و مورخان دیگر مثل شیخ داؤد خاکی رحمتہ اللہ علیہ و صاحب خوارق السالکین و بہاؤ الدین متو، در کتابِ غوثیہ سیادت حضرت سیو سیادت بنی اعمام

ایشان مے نگارند۔"

یعنی شایق اور دوسرے مورخ مثلاً بابا داوٗد خاکیؒ صاحب خوارق السالکین اور بہاوٗ الدین متو اپنی کتاب میں حضرت میر اور ان کے بنی اعمام کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ سیّد تھے۔ اسی کتاب میں حضرت میر سید یعقوب کا تذکرہ ان الفاظ میں ہے:

'از سادات عالی درجات صاحب حالات و مقامات سودہ۔ چنانچہ صاحب خوارق السالکین در ذکر ایشاں ی می نگارد کہ قدوۂ آفاق زبدہ عشاق مرشد و محبوب حضرت سید یعقوب موزادہ میر نازکؒ نیازی قادری از ارادتمندان شیخ داوٗد خاکی بود۔"

ان میر سید یعقوب کا مزار پُر انوار سونہ وار میں مرجع خاص و عام ہے۔

حضرت میر نازک قادریؒ ۹ رذی الحجہ ۱۰۲۲ھ کو اس دارِ فانی سے دار البقاء کی طرف روانہ ہوئے۔ تقیاً تقیاً سے سالِ وصال حاصل ہو جاتا ہے۔ آپ کا مزارِ پرُ انوار اور آپ کی خانقاہ کادی کدل میں مرجعِ عوام ہے۔ عمرِ شریف کے بارے میں کوئی شہادت نہیں ملتی کیونکہ تاریخ ولادت معلوم نہیں۔ مگر آپ چوں کہ خود حضرت سلطان العارفینؒ کے زیرِ تربیت رہے ہیں اور ان کے انتقال کے بعد حضرت بابا داوٗد خاکیؒ ان کی دیکھ بھال کرتے رہے۔ حضرت بابا داوٗد خاکیؒ کا وصل ۹۹۴ھ میں ہوا، اس وقت وہ حضرت اسماعیل ثانیؒ کے حوالے ہو گئے تھے اور قیاس کہتا ہے کہ ان کی عمر اس وقت ۲۵، ۳۰ برس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس طرح اندازاً پچاس اور پچپن کے درمیان ہوگی۔

ان سطور کا لکھنے والا حضرت میر نازک قادریؒ کی گیارہویں پشت میں ہے۔ اور "بدنام کنندہ نکونامے چند" بنا ہوا ہے

☆☆☆

میر غلام رسول نازکی

اَورنگ زیب عالمگیر

ہندوستان کا یہ جلیل القدر شہنشاہ مدتِ دراز سے متنازعہ فیہ شخصیّت کا مالک ہے۔اورنگ زیب کے ماننے والے اسے غیر معمولی رُوحانی اور وجدانی طاقتوں کا مالک سمجھتے ہیں اوران کی وہی عزت کرتے ہیں جو عظیم المرتبت اولیاء اور اتقیاء کے ساتھ مخصوص ہے۔اس کے مقابلے میں وہ لوگ جواَورنگ زیب کو اچھا نہیں سمجھتے ،اس کی ذات کو تمام عیوب ونقائص کا مجموعہ خیال کرتے ہیں اوران کے خیال میں اورنگ زیب نہایت تنگ نظر اور برخود غلط قسم کا انسان تھا۔اورنگ زیب کی سیرت وکردار کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص مظلوم ہے۔جو لوگ اسے روحانی پیشوا اور مقتدا سمجھتے ہیں، وہ بھی عالم ہیں اور جو اُسے ایک سخت گیر اور متعصب مسلمان سمجھتے ہیں۔ وہ بھی ظالم ہیں۔ اورنگ زیب ایک بہادر جرنیل، زبردست سیاست دان اوراعلیٰ درجے کی انتظامی قابلیت کا بادشاہ تھا۔ جس کی نظر سے ممالکِ محروسہ کی چھوٹی سی چھوٹی چیز بھی پوشیدہ نہ تھی۔اس کی نجی زندگی بھی مجموعہ اضداد تھی ۔ جہاں اس نے اپنے معزز ومحترم باپ کو معزول کرکے نظر بند کیا اور بھائیوں کو ہلاکت کا جام پلایا، وہاں وہ بڑا فیاض، خدادوست

اور خطا پوش بھی تھا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اتنی بڑی سلطنت کو چلانے کیلئے جس فردِ واحد کو اللہ نے منتخب فرمایا تھا، وہ جہانبانی اور بندہ پروری کے تمام آداب سے واقف تھا۔ اورنگ زیب کی سیاسی بصیرت اور دُور اندیشی کے واقعات کو ہم آج بھی پڑھتے ہیں تو ماننا پڑتا ہے کہ عصرِ حاضر کے فرمان روایاں بھی اگر اِسی بصیرت اور عاقبت اندیشی سے کام لیں تو بڑی بڑی مصیبتیں دور ہو سکتی ہیں۔ ذیل میں اس قسم کے چند واقعات درج ہیں:۔

مرنے سے پہلے اورنگ زیب نے بارہ وصیتیں کیں۔ وصیت ا یہ ہے:۔

"با سادات لازم والسعاداتِ بارہہ بموجب آیہ، وآت ذوالقربیٰ حقہٗ عمل باید نمود، دراحترام ورعایت فروگذاشت بناہد کرد۔ ازیں راہ کہ بجوب آیۂ کریمہ قل لا اسئلکم علیہ اجر الا المودۃ فی القربیٰ۔ محبت امیر جماعت اجر نبوت است۔ ہرگز مقصد نباہد بود کہ متمر دنیا وآخرت است لیکن بادسادات بارہہ کمال احتیاط باہد نمود۔ در محبت ماضی قصور نباہد کرد۔ وبحسب ظاہر مرتبہ ایں ہا نباہد افزود کہ شریک غالب بلکہ طالب ملک افروز۔ اگر اندک استر خائے عناں شود، ندامت خواہد شد......"

(یعنی سادات بارہہ کے ساتھ اچھا سلوک کرنا چاہئے۔ کیونکہ وہ شاہی خاندان کے قریبی رشتہ دار ہیں۔ ان کا احترام کرنا چاہئے اور تمام مناسب سہولتیں عطا کرنی چاہیں۔ یہ لوگ رسولؐ کی اولاد ہیں اور حکمِ الٰہی کے مطابق ان لوگوں کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا نبوّت کا اجر ہے جو مسلمانوں پر واجب ہے۔ دلوں میں بھی ان کی محبت سے دنیا وآخرت کی نجات مل سکتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ان لوگوں سے بڑی ہوشیاری اور احتیاط سے نمٹ لینا چاہئے۔ ان کو زیادہ بڑے

عہدوں پر فائز کرنا خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔ کیونکہ یہ شریکِ غالب ہی نہیں بلکہ سلطنت کے جویا بھی ہیں، ذراسی کمزوری سے ان کی شرارتیں بڑھ جائیں گی اور نتیجہ ندامت ہوگا)۔

اب ذراان ساداتِ عالی درجات کے کارنامے بھی ملاحظہ فرمائیے۔

سیّد حسین اور سیّد علی، سید عبداللہ بارہہ کے دو صاجبزادے تھے۔ عالم گیر کے زمانے میں یہ دونوں بھائی خانی اور دوسرے مناصب پر سرفراز تھے۔ اورنگ زیب جس زمانے میں مرہٹوں کی سرکوبی میں مصروف تھا، ان دونوں بھائیوں نے بڑی جان فشانی اور شجاعت سے دشمن کا مقابلہ کرکے بادشاہ کا قرب حاصل کیا۔ سیّد حسین دکھن میں اعلیٰ عہدوں پر تعینات تھے اور سیّد علی، شاہ زادہ معزّالدین کے ساتھ ملتان میں مقیم تھے۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد معظم شاہ بادشاہ ہوئے۔ وہ کابل سے واپس آرہے تھے تو راستے میں سیّد علی ان سے جاملے۔ کیونکہ وہ شاہزادہ معزّالدین کے ساتھ نباہ نہ کرسکے تھے۔ معظم شاہ نے ان کے منصب میں ترقی دے کر اسے اپنے ساتھ لے آنے اور طبل وعلم کا اعزاز عطا کیا۔ پایۂ تخت میں انہیں فوج کا بخشی مقرر کیا۔ معظم شاہ اور اعظم شاہ میں لڑائی ہوئی تو ان شہ زادوں نے معظم شاہ کی حمایت میں تلوار اٹھائی اور بادشاہ نے دونوں کی قدر افزائی فرمائی۔ سید حسین پہلے اجمیر اور پھر الہٰ آباد کے گورنر ہوئے۔ سید علی بہار کے صوبہ دار ہوکر دادِ فرمانروائی کی داد دیتے رہے۔ مغل شاہزادوں میں اقتدار کی ہوس زوروں پر تھی۔ جہاندار شاہ کے سقوط کے بعد تخت معلق کے متعلق پھر رسہ کشی میں کامیاب ہوگئے۔ خان نصر جنگ اور ان کے والد دستور معظم، جو عہدِ عالم گیری کے ممتاز اربابِ سلطنت تھے، ان ہی دو بھائیوں کے ہاتھوں خوار و

ذلیل ہوکر قتل ہوئے۔ اس کے بعد ان سیّد زادوں کی دراز دستیاں بڑھتی گئیں۔ تختِ سلطنت پر ایک بادشاہ آتا اور دوسرا جاتا رہا اور ان سب کے عزل ونصب میں ہاتھ ان ہی سیّد زادوں کا تھا۔ جس کو چاہتے، بادشاہ بناتے، جس کو چاہتے، اٹھا کر پھینک دیتے۔ جب ان کی سرگرمیاں بہت تیز ہوئیں تو میر حیدر خان نے سید علی کو قتل کرادیا۔ سید عبداللہ خان نے جنگ کی شکست کھائی اور قید خانے میں مرا۔ سلطنتِ مغلیہ کے زوال میں جتنا ہاتھ ان سیّدوں کا ہے، اتنا کسی کا نہیں۔ عالم گیر اس راز سے واقف تھا اور وصایا میں واشگاف الفاظ میں کہا تھا کہ ان کی دل جوئی، عزت واحترام اور مالی مدد ضرور کرنی چاہیے مگر امورِ سلطنت میں ان کو دخل اندازی کرنے کی ہرگز اجازت نہ دینی چاہیے۔ اس لئے کہ یہ لوگ جاہ پسند اور طبعاً فتنہ پرور ہیں۔

وصایا سے پہلے کا ایک اور واقعہ بھی ہے۔ ذوالفقار خان بہادر نصرت جنگ نے (جو بعد میں ان ہی سادات کے ہاتھ تباہ وبرباد اور آخر میں قتل ہوئے) اورنگ زیب کو لکھا کہ ان دونوں بھائیوں نے مرہٹوں کے ساتھ جنگ میں بڑی جان فشانی کی ہے اس لئے انہیں کچھ نقد معاونت کے علاوہ اعلیٰ مناصب بھی دیئے جائیں۔ بادشاہ نے لکھا:

''نقد معاونت کے سلسلے میں آپ کی تجویز بروقت اور برمحل ہے۔ سادات رفیع الدرجات کے ساتھ محبت رکھنا عینِ عرفان ہے اور ان کے ساتھ دشمنی جہنم کے عذاب کا باعث اور اللہ تعالیٰ کے قہر کا سبب بنتی ہے۔ لیکن ان کو اعلیٰ منصبوں پر فائز کرنے کی تجویز کو تسلیم کرلینا مشکل ہے۔ امورِ سلطنت کی باگ ڈور سادات بارہہ کے ہاتھ میں دینے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے بدانجام کو دعوت دے رہا

ہے۔ میں ان لوگوں کو جانتا ہوں۔ ان کی تھوڑی سی قدر افزائی کرو تو دماغ بگڑ جاتا ہے اور انقلاب پیدا کرنے کی فکر میں لگ جاتے ہیں۔ اس لئے ایسا کام نہ کرنا چاہیئے جس کا انجام پشیمانی کا باعث ہوا۔"

آدمی اورنگ زیب کی سیاسی بصیرت کو دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے۔ سیادت کے اعتبار سے وہ ان کی قدر کرتا ہے۔ ان کی ضرورتیں پوری کرتا ہے۔ انہیں عزت و آبرو سے رہنے کے اسباب تلاش کرتا ہے۔ مگر سیاسی امور میں پاس تک پھٹکنے نہیں دیتا۔ کیونکہ ان سے فساد کی بو آتی ہے۔ وصیت میں بھی اس کا صریحی ذکر کرتا ہے۔ بعد میں آنے والے اس پر عمل نہیں کرتے اور روزِ بد دیکھ لیتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کی نظر، عقاب کی نظر تھی اور وہ مردم شناسی میں لاثانی تھا۔ اس سے پہلے تذکرہ ہوا ہے کہ سیّد علی، شاہزادہ معز الدین کے ساتھ تھے۔ ان کی آپس میں نہ بنی۔ بادشاہ کو معلوم ہوا تو یہ حکم نافذ فرمایا:

"حسن علی خان با فرزند زادہ بہادر محمد معز الدین برہم زدگی نمود و بے اجازت برخاستہ آمد۔ چنانچہ شاہزادہ گلہ' او نوشتہ، کمی منصب باید کرد و جاگیر ضبط نمود، تا دیگراں را عبرت شود۔"

یعنی "حسن علی خان نے فرزند زادہ محمد معز الدین کے ساتھ بدتمیزی کی ہے اور بلا اجازت وہاں سے اٹھ کر چلا آیا ہے۔ شاہزادے نے شکایت کی ہے کہ حسَن علی خان کا عہدہ گھٹا دیا جائے اور جاگیر ضبط کر دی جائے تا کہ اوروں کو عبرت ہو۔"

سرکاری امور کو چلانے کیلئے ڈسپلن (نظم وضبط) کی کتنی ضرورت ہے، اس کا اندازہ انتظامیہ چلانے والوں کو ہے اور پھر بتایئے ڈسپلن کی اس سے زیادہ کوئی اور مثال ہو سکتی ہے۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد معظم شاہ، بادشاہ ہوا تو

سب سے پہلے اسی سید علی کو اپنے ہمراہ لے آیا اور اسے بہت بڑے منصب پر فائز کر کے جہاں ایک طرف اپنے عظیم باپ کی نافرمانی کی وہاں سلطنتِ مغلیہ کے مستقل زوال کی سنگِ بنیاد بھی ڈال دی۔

چین اور ہندوستان میں ابتداء بڑے گہرے تعلقات تھے اور ''ہندی چینی بھائی بھائی'' کے نعروں سے فضا معمور رہتی تھی۔ ادھر یہ ہورہا تھا، ادھر چین اپنے ممالک کی سرحدوں میں اضافے کی سوچ رہا تھا اور ہندوستانی زعماء کو اپنی دوستی کا یقین دلاتے ہوئے اقصائے چین میں سڑکوں کی تعمیر میں مصروف تھا۔ ہندوستان کو جب پتہ لگا کہ چین نے ہندوستان کے ہزاروں مربع میل علاقے پر قبضہ جمالیا تھا۔ یہ صورتِ حال سخت فکر انگیز تھی اور سارے ملک میں اس کا زبردست ردعمل ہوا۔ جواہر لال نہرو کو اپنی ناکامی کے احساس نے شرمندہ کردیا اور آخر کار پارلیمنٹ میں اعلان کرنا ہی پڑا کہ چین نے شواس گھات کر کے ہمارے ہزاروں مربع میل پر قبضہ کرلیا ہے۔ مگر ساتھ ہی اپنی خفت مٹانے کیلئے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ وہ ریگستانی علاقہ ہے اور اس سے گھاس کا ایک تنکا بھی نہیں اُگتا۔ اس پر پارلیمنٹ کے ایک ذہین ممبر شری مہابیر تیاگی اٹھ کھڑے ہوئے، اپنے سر سے ٹوپی اٹھائی اور سارے ایوان کو اپنے سر کی طرف متوجہ کرتے ہوئے بولے...... صاحبان! میرے سر پر بالوں کا ایک تنکا بھی نہیں اگتا۔ میں گنجا ہوں۔ کیا میں اوروں کو اجازت دوں کہ وہ آئیں اور میرے سر پر قبضہ جمالیں...... یہ واقعہ مجھے اورنگ زیب کے اس خط سے یاد آیا۔ خط کی شان نزول یہ ہے کہ امیر خان صوبے دار کابل نے عرضداشت میں لکھا تھا کہ تھانے دار ایران، ہندوستانی سرحد پر ہندوستانی علاقے سے صرف دو کوس زمین مانگتا ہے تا کہ وہ اس پر اپنی چوکی قائم کر سکے۔ اس

کے عوض وہ ہندوستان کو ہر سال سو عربی گھوڑے دیتا رہے گا۔ حکم ہوا:

''تھانہ دار ایران را بہ آب ورنگ آوردن وصوبہ داری خود را بے آبرو ساختن کار عقلا نیست۔ لیکن...... طمع راستہ حرف است ہر سہ تہی۔ دو کردہ ایں طرف رخصت دادن چہ معنی کہ دو قدم رخصت نیست۔ مسئلہ فقہی در ہمہ مذہب سنداست کہ اجرا بر صنعا ئرعین کبا یراست۔ عجب است ازاں خانہ زاد مزاج داں کہ از سن ہفت سنگی در حضور تربیت شدہ از تدبیر ایرانیاں غافل است خود تصور کند کہ برائے ایں کار سہل کہ دو کردہ ایں طرف نشانیدن تھانہ باشد۔ چگونہ بصد اسپ عراقی کہ قیمت آں عمدہ شود راضی شدہ اند؟ ہماں مثل است:

سرانگشت گیرد بفکر شکست۔ بیک بار حرکت نماید بدست

تو از فکر دشمن بہ غفلت مباش ہمیشہ رخ تیرہ اش راخروش

مثل مشہور است کہ عقل و دولت قرین یک دگراند۔ ہر کہ را عقل نیست دولت نیست۔ عوام کالانجام فہمیدہ اند کہ ہر کہ دولت مند باشد البتہ باید عاقل باشد وایں غلط است۔ معنی آنست کہ ہر کہ عقل راندار داو پایدار نیست۔ طول کلام دریں مقام آہن سرد کوفتن وجامہ کہنہ دوختن است۔''

یعنی ایران کے تھانے دار کو عزت بخشنا اور اپنی صوبہ داری کو بے آبرو کرنا داناؤں کا کام نہیں۔ ہم نے طمع کی وجہ سے ایسا نہیں لکھا ہے اور طمع کے تینوں حروف خالی یعنی بے نقطہ ہیں۔ دو کوس ادھر آنے کی اجازت تو کیا ہوگی، دو قدم آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ تمام مذاہب میں فقہ کا مسئلہ یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے گناہوں پر مداومت کرنا گناہِ کبیر (بڑا گناہ) بن جاتا ہے۔ تم سات سال کی عمر سے ہمارے ہاں پلے بڑھے اور تربیت پاتے رہے۔ ہمارے مزاج سے

واقف ہو اور تعجب ہے کہ ایرانیوں کی تیاری سے بے نیاز بیٹھے ہو۔ ذرا سوچا ہوتا کہ دو کوس ہمارے علاقے میں آنے کا مطلب کیا ہے اور ایرانی اس بظاہر معمولی سی رعایت کیلئے ہر سال سو عربی یا عراقی گھوڑے دینے پر رضامند کیوں ہیں؟ افسوس ہے! مثال برابر وہی ہے کہ دشمن سب سے پہلے انگلی کا سرا پکڑتا ہے تاکہ سارے ہاتھ پر قبضہ کر سکے۔ مشہور مثال ہے کہ دولت اور عقل ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔ جس کے پاس عقل نہیں، دولت نہیں۔ جاہل عوام سمجھتے ہیں کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو دولت مند ہوگا وہ خواہ مخواہ دانا بھی ہوگا۔ مگر اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس کے پاس عقل نہیں، دولت اس کے پاس زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتی! زیادہ لکھنا تو ٹھنڈے لوہے کو کوٹنا اور پھٹے ہوئے کپڑے کو دوبارہ سی لینے کے مترادف ہے۔"

کارِ جہانبانی کرنے والوں اور انتظامیہ امور چلانے والوں کیلئے اس فرمان سے زیادہ وقیع میرے خیال میں کوئی بائبل نہیں ہو سکتی۔ میرا بس چلتا تو میں اورنگ زیب کے اس فرمان کو جلی حروف میں لکھوا کر، اور ہندوستان کی تمام زبانوں میں ترجمہ کروا کر ہندوستان کی پارلیمنٹ میں نمایاں مقامات پر آویزاں کروالیتا۔ مگر کیا کیا جائے، یہ حرفِ حق اورنگ زیب کی زبان سے نکلا ہے جس کے نام سے ہندوستان کی اکثریت بدک اٹھتی ہے اور نہ معلوم اسے کون کون سے خطابات دیتی ہے کہ وہ ہندو کش تھا۔ لوگوں کو جبراً مسلمان بناتا تھا۔ تنگ نظر تھا، فرقہ پرست تھا، مُلّا تھا اور کیا نہ تھا...... ذرا اس کا جائزہ ہم آنے والے صفحات میں لیں......

ایڈمنسٹریشن میں لوگوں کی دخل در معقولات ایک ایسی وباء ہے جس کا سامنا ہم گذشتہ پچاس برس سے کر رہے ہیں۔ کوئی کام خاطر خواہ نہیں ہوتا، اس لئے کہ اربابِ فرض کام کرنے نہیں دیتے۔ لوگوں کیلئے کام تلاش کئے جاتے

ہیں۔اگلے وقتوں میں کاموں کیلئے لوگوں کو تلاش کیا جاتا تھا، اورنگ زیب کا ایک واقعہ ہے۔ایک صاحب سید سعد اللہ، جو بہت بڑے عالم ہونے کے علاوہ سالک، صوفی اور حد درجہ کے خدا دوست بزرگ تھے۔اورنگ زیب کو ان کا بڑا پاس تھا۔یہاں تک کہ بادشاہ کی خلوت خاص میں سوائے سید سعد اللہ کے اور کسی کو باریابی نہ تھی۔ایک دفعہ ان ہی سید صاحب نے ایک افسر کی تبدیلی اور ایک آدمی کی تعیناتی کیلئے سفارشی خط لکھا۔سید صاحب کو تو کوئی جواب نہ دیا، البتہ اپنے مشیر اعلیٰ کو لکھا:

"سید سعد اللہ مکرر خطوط ہما فرستادہ، اظہار چیز ہاے بسیار نمودہ کہ سوانح نگار سورت بندر را تغیر باید کرد۔وخلف حکیم اشرف متوفی خدمت دار الشفاء نمودہ بہ اضافہ یومیہ قوت دل بخشید۔باید نوشت کہ بعد ازیں در مقدمات اہل خدمات دخل نمودہ باشد۔"

مطلب یہ کہ سید سعد اللہ نے ان ہی دنوں ہمارے نام بہت سے خط لکھے ہیں۔اور بہت سی خواہشات کا اظہار کیا ہے۔ان میں یہ بھی ہے کہ سوانح نگار سورت بندر گاہ کو تبدیل کیا جائے اور حکیم اشرف مرحوم کی جگہ ان کے بیٹے کو شفاخانے کا انچارج بنادیا جائے اور ان کے الاؤنس میں اضافہ کر دیا ئے۔سید سعد اللہ کو لکھ دیا جائے کہ وہ آج کے بعد سرکاری اہل کاروں کے معاملے میں دخل نہ دیا کریں!"

سبحان اللہ! کیا دوٹوک جواب ہے۔ایک طرف عالم یہ ہے کہ بادشاہ ان کے علم اور تقویٰ کی بناء پر ان کی جوتیاں بھی سیدھی کرتے ہیں اور وہ جب چاہیں باریابی حاصل کر سکتے ہیں۔خلوت خانہ خاص میں بھی ان کی آمد پر کوئی پابندی

نہیں اور دوسری طرف حالت یہ کہ وہ دو اہل کاروں کی سفارش کرتے ہیں تو ان کے دانت توڑ دیئے جاتے ہیں اور ایسا جواب دیا جاتا ہے کہ وہ ہمیشہ کیلئے خاموش ہو جاتے ہیں۔ جمہوریت کے فوائد جو بھی ہوں، مگر یہ کیا کم نقصان ہے کہ حلقہ پریذیڈنٹوں کی دخل در معقولات نے سارے ملک کے انتظامیہ کو درہم برہم کر کے رکھ دیا ہے۔ نا اہلوں کے پو بارہ ہیں اور مستحق دھکے کھاتے پھرتے ہیں۔ انصاف کے ترازو میں بَل پڑ گئے ہیں اور ہر وہ شخص دندناتا پھرتا ہے جسے تھوڑا سا اثر ورسوخ حاصل ہے۔ اورنگ زیب کے سامنے بارسوخ اگر کوئی شخص تھا تو صرف سید سعد اللہ تھا۔ اس کی جو حالت اس جواب سے ہوئی ہوگی، اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں!

اپنے بیٹے کام بخش سے اورنگ زیب سخت محبت کرتے تھے۔ ایک جنگ میں وہ حریف سے جاملا کیونکہ انہوں نے اسے بادشاہ بننے کا خواب دکھایا۔ آخر ناکام ہوا اور بادشاہ کے سامنے حاضر کر دیا گیا۔ تمام ذاتی محبت کو بالائے طاق رکھ کر اُسے قید کر دیا۔ کچھ دیر کے بعد کام بخش کے پاس کچھ اوراد و وظائف لکھ بھیجے اور فرمایا، ان کا ورد کیا کرو۔ اس کے پڑھنے سے زندان سے رہائی ملتی ہے۔ ایک مصاحب نے عرض کی کہ رہائی تو عالم پناہ کے ہاتھ میں ہے۔ فرمایا۔ نہیں میرے دل کے ہاتھ میں ہے اور وہ کام بخش کی طرف سے صاف نہیں ہے۔ اَوراد و وظائف کا فائدہ یہی ہوگا کہ ہمارا دل اس کی طرف سے صاف ہوگا۔ ایک اور خط میں لکھا:

''بہدایت اللہ خان زرّیں راقم گویند کہ این رباعی کہ بہ بادشاہزادہ کام بخش مرحمت می شود، بہ خط خود نویسند۔

آتش بہ دو دست خویش در خرمن خویش

من خود زدہ ام چہ نالم از دشمن خویش

کس دشمن من نیست منم دشمن خویش

اے وائے من و دست من و دامن خویش!

(ہدایت اللہ خان زرّیں رقم سے کہیں کہ وہ اپنے قلم سے یہ رباعی اس بیاض میں لکھے جو شاہزادہ کام بخش کیلئے ہے۔ رباعی کا مفہوم یہ ہے۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے کھلیان میں آگ لگادی۔ دشمن کا کیا گلہ کروں۔ یہ کام تو میں نے خود کیا ہے۔ میرا کوئی دشمن نہیں۔ میں خود اپنا دشمن ہوں۔ افسوس میرے حال پر، میرے ہاتھوں پر اور میرے دامن پر)

اس سے پہلے دوسرے بیٹے شاہزادہ محمد سلطان نے شاہ شجاع کے ساتھ سازوباز کی تھی۔ شجاع کی شکست کے بعد شاہزادہ قید ہوا اور وہیں مر گیا۔ مرتے وقت اس کی عمر صرف تیس سال تھی۔

عالم گیری دربار کے امرائیں سے خان فیروز جنگ، بادشاہ کا سب سے زیادہ چہیتا تھا۔ میر شہاب الدین نام تھا اور محض اپنی قابلیت کی بناء پر بادشاہ کا خاص الخاص آدمی بنا تھا۔ فیروز جنگ پر طاعون کا حملہ ہوا۔ جان تو بچ گئی مگر سماعت اور بصارت کھو بیٹھے۔ طبیبوں نے انگور کھانے سے منع کیا تھا۔ بادشاہ کو فیروز جنگ سے والہانہ محبت تھی۔ اس حال میں ان کی عیادت کرنا چاہتے تھے مگر نہ کر سکے۔ لکھا:

''می خواستم برائے عیادت آن دولت خواہ خود بیالم، اما بچہ رود کدام نظر مشاہدہ نمائیم۔ لہٰذا سعادت خان را نیابتہً فرستادیم، تا بچشم ما بیند و اظہار ما فی الضمیر کند۔ از میوہ ہائے سوزیں آنچہ اینجا بہم می رسد انگور است، اما اطبائے یونان

برائے آن عمدہ مخلصان مزاج داں مضر می گویند۔ لہٰذا بر خود ہم تا گوار کردیم۔ انشاء اللہ تقدس بعد صحت کامل وشفائے عاجل یک جامی خوربم......"

یعنی ہم خود عیادت کیلئے آنا چاہتے تھے مگر کس منہ اور کس نظر سے آپ کا حال دیکھیں۔ لہٰذا اپنی طرف سے سعادت خان کو بھیج رہا ہوں جو ہماری آنکھ سے دیکھے گا اور ہمارے دل کی بات بتادے گا۔ آج کل یہاں صرف انگور ملتا ہے۔ طبیبوں نے اسے آپ کیلئے مضر کہا ہے۔ اس لئے ہم نے بھی اس کا استعمال چھوڑ دیا ہے۔ انشاء اللہ آپ تندرست ہو جائیں گے تو اکٹھے کھائیں گے!"

اس واقعہ سے بادشاہ کے اس تعلقِ خاطر کا اندازہ ہوتا ہے جو انہیں فیروز جنگ کے ساتھ تھا۔ اسی فیروز جنگ کے متعلق وقائع نگار نے اطلاع دی کہ انہوں نے ایک شخص مسمی محمد عاقل کو رہزنی کے جرم کی پاداش میں قتل کرادیا۔ فوراً حکم ہوا......

"عمدۃ الملک مدار المہام بہ فیروز جنگ بے افرنگ نبویسد کہ بر قتل کہ عبارت از ہدم بنیاں الٰہی دست، بغیر از حجت شرعی اقدام نمودہ، وائے براں روز کہ وارث بہم رسد و دیت نہ کند ایں نحیف را بغیر از حکم قصاص چہ چارہ کہ ترحم در حدود ممنوع بنص کلام اللہ است......"

(عمدۃ الملک مدار المہام، کم عقل فیروز جنگ کو لکھے۔ اس نے قتل کر کے اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی تعمیر کو منہدم کر دیا ہے جس کیلئے اس کے پاس کوئی شرعی جواز نہیں۔ وہ دن بڑا افسوس ناک ہوگا جب مقتول کا وارث آجائے۔ خون بہا لینے سے انکار کرے گا۔ اس بندۂ عاجز کیلئے کوئی چارہ نہ ہوگا کہ فیروز جنگ کے خلاف قصاص کا حکم نافذ کردے کیونکہ بے جا رحم، احکامِ الٰہی کے بالکل خلاف ہے۔"

اندازہ فرمایئے خان فیروز جنگ کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔ اس کے تو

ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے ہوں گے!

شہزادہ محمد اعظم نے دربار میں ایک دن کوئی چیز طلب کی۔ درخواست نامنظور ہوئی۔ شاہزادہ کی سخت توہین ہوئی اور اٹھ کر ناراضگی کے عالم میں جانے لگے۔ جاتے جاتے پاؤں شاہی مسند پر پڑا۔ دربار میں آنا بند کر دیا گیا۔ کچھ مدت کے بعد شاہ سلیم اللہ نے سفارش کی اور کہا کہ شہزادہ سے بھول ہوئی ہے۔ اس سے درگذر فرمایا جائے۔ درخواست پر یہ شعر لکھا:

؎ از ساحل نجات بہ بحر فنا فتاد
از حد خود کسے کہ قدم پیشتر گداست

(جس شخص نے اپنی حدود سے تجاوز کر کے ایک قدم بھی آگے بڑھایا، وہ ساحل نجات سے الگ ہو کر فنا کے سمندر میں غرق ہوا)

یہ تھی تادیب اور یہ تھا نظم وضبط کا عالم۔ اور اس میں اپنے پرائے ہندو مسلمان خویش وغیرہ، کسی کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ اور یہی چیز ایک مضبوط اور اعلیٰ انتظامیہ کیلئے بے حد ضروری ہے۔

اس سے یہ خیال نہ کیجئے کہ اورنگ زیب صرف تادیب ہی تادیب تھا۔ تادیب کے ساتھ ساتھ وہ اپنی نوازشوں اور کرم فرمائیوں میں بھی بے نظیر تھا۔ جہاں کسی نے کوئی اچھا کام کیا، فوراً نہ صرف یہ کہ اس کا اعتراف کیا بلکہ اچھا کام کرنے والے کی حوصلہ افزائی بھی کی...... مدارالمہام کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"آں فدوی از نصرت جنگ پرسیدہ بطلبد کہ نگین زمرد بہ اومرحمت مے شود لیکن بہ تمام خطاب وفا نمی کند، اگر بگوید نصرت جنگ فقط کندہ آید۔ ومنقش کردہ عنایت کنیم۔"

(نصرت جنگ کو بلا کر اس سے پوچھ لیجئے کہ ہم اسے ایک زمرد کا نگینہ دینا چاہتے ہیں۔ لیکن اس پر ان کے سارے القاب سمانہیں سکتے۔ اگر وہ چاہیں تو صرف نصرت جنگ کندہ کروا کے ان کے پاس بھیج دیا جائے گا۔ ساتھ ہی یہ شعر بھی لکھا ہے۔

دانی کہ برنگین سلیمان چہ نقش بود
خطے بزر نوشتہ کہ این نیز بگرزد

(جانتے ہو سلیمانؑ کی انگوٹھی کے نگینے پر کیا لکھا تھا؟ سونے کے حروف میں لکھا تھا کہ یہ بھی نہیں رہے گا!)

فیروز جنگ کا ذکر اس سے پہلے ہوا ہے۔ ان ہی کے نام ایک لطیف خط یہ ہے

خان فیروز جنگ یک رنگ من
الحمد اللہ دوریٔ قلب نیست
گر دریمنی بامنی پیش منی
درپیش منی بے منی در یمنی

(خدا کا شکر ہے کہ آنکھوں سے دور ہو کر بھی دل سے دور نہیں ہو۔ یمن میں بھی رہو، میرا خیال ساتھ رہے تو میرے پاس ہو۔ میرے پاس بھی رہو، میرا خیال ساتھ نہ ہو، تو یہاں نہیں، یمن میں ہو)

اپنے بیٹے کو لکھتے ہیں:

''آنچہ معلوم می شود، مصطفیٰ قلی بیگ دیوان خاص آن فرزند کارہا بجز رسی انجام می دہد۔ غنیمت است، اضافہ منصب وفائی اگر بنو یسند دادہ آید۔ آدم خوب مثل طلائے بے غش است''

(معلوم ہوتا ہے آپ کا دیوان خاص مصطفیٰ قلی بیگ کام بڑی ہوشیاری اور سوجھ بوجھ سے انجام دے رہا ہے۔ غنیمت ہے اگر آپ تجویز کریں تو اس کا عہدہ اور خطاب بڑھا دیا جا سکتا ہے۔ اچھا آدمی کھرے سونے کی طرح نایاب ہے!)

وقائع نگار نے لکھا کہ ایک امیر، میر حبیب اللہ نے سرکاری خزانے کا سارا روپیہ خرچ کر ڈالا ہے اور اس کے افسر عنایت اللہ خان نے میر حبیب اللہ سے سخت باز پرس کی ہے۔ میر نے اقرار جرم بھی کیا ہے اور اب عنایت اللہ خان نے زبردست سرکاری افسر اس کے پیچھے لگا دیئے ہیں کہ خرد برد کیا ہوا روپیہ وصول کریں۔ مگر میر حبیب اللہ کے پاس کچھ نہیں۔ عنایت اللہ خان کے نام یہ حکم صادر ہوا:

''زر وصل شدہ را باز سعی چرا باید کرد؟ قبل ازیں از سوانح برہان پور مکرر بعرض رسیدہ بود کہ سید مسطور ہر چہ بہم میرساند بہ ارباب استحقاق و مصارف خیر صرف می کند۔ ہرگاہ از مال ایں عاصی غرق معاصی ہم بہ نیابت بمصرف خیر رسیدہ باشد، اعادہ بے فائدہ است......''

(ہاتھ سے گئے ہوئے مال کو واپس لانے کی کوشش کیوں کی جائے۔ ہمیں اس سے پہلے برہان پور کے سوانح نگار نے لکھا ہے کہ میر حبیب اللہ کو جو کچھ ملتا ہے وہ محتاجوں کو دیتا ہے اور نیکی کی راہ میں خرچ کرتا ہے۔ اس گنہگار کے مال سے بھی اگر اس نے نیابتہً نیکی کی راہوں میں خرچ کیا ہو، تو اس کا واپس وصول کرنا بے فائدہ ہے!)

ان مثالوں سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ سخت گیر اورنگ زیب انسان دوست بھی تھا اور جہاں کسی مظلوم کو دیکھتا تو ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگتا۔ اپنے فرمانوں اور خطوں میں اورنگ زیب نے اس بات پر سخت تاکید کی ہے کہ خلق اللہ کو تکلیف نہ ہو۔ عوام پر ظلم نہ ہونے دیا جائے۔ بدامنی نہ ہونے پائے

اور ہر شخص اطمینان اور سُکھ کے ساتھ زندگی بسر کر سکے۔ اس کا اعتقاد تھا کہ اگر سارے ملک میں ایک انسان کے ساتھ بھی زیادتی یا ظلم ہو تو وہ اپنے معبود کے سامنے جوابدہ ہوگا۔ اس میں مسلمان، غیر مسلمان کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ اورنگ زیب کے ساتھ سب سے بڑا ظلم یہی ہوا ہے کہ وہ بڑا تنگ نظر مسلمان تھا۔ واقعات اس الزام کی تائید نہیں کرتے!

ایک امیر نے ترقی کی درخواست دی۔ ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ میرے مقابلے میں ایرانی امیر زیادہ بڑے عہدوں پر فائز ہیں۔ حالانکہ وہ بدمذہب ہیں۔ جواب ارشاد ہوا:

"آنچہ از قدم خدمت خود نوشتہ بیان واقع است، بقدر مقدور قدردانی بہ عمل می آید۔ وآنچہ از بد مذہب ایرانیاں نوشتہ امور دنیا را با مذہب چہ نسبت وکارہائے مذہب را بہ تعصب چہ دخل؟ لکم دینکم ولی دین۔ اگر ہمیں قاعدہ مقرر بودے بایست کہ جمیع راجہ ہا وتبعہ آن ہا را استاصیل مے کردیم، اختیار غیر قابلاں نزد عقلا مذموم است......"

(تم نے اپنی خدمات کا جو تذکرہ کیا ہے، وہ واقعات پر مبنی ہے۔ حتی الامکان ان خدمات کا صلہ دیا جائے گا۔ ایرانیوں کی بَدمذہبی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، وہ حماقت ہے۔ دُنیوی کاروباری چلانے کو کسی کے مذہب سے کیا سروکار؟ مذہب کو تعصب کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ قرآن کا ارشادہ ہے، تمہارا دین تم کو مبارک ہو۔ اگر یہی اصول کارفرما ہوتا تو سارے ہندوستان میں جتنے راجے مہاراجے اور ان کی اہالی موالی، جو برسرِ اقتدار ہیں، ہمارے ہاتھوں سے ختم کردیئے گئے ہوتے۔ نا قابلوں اور نااہلوں کو بڑے بڑے امور تفویض کرنا

داناؤں کے پاس بہت مذموم فعل ہے۔)

میرے خیال میں یہ منشور ہے جس کے ہوتے ہوئے کسی کو یہ کہنے کی جرأت نہ ہونی چاہئے کہ اورنگ زیب تنگ نظر اور متعصب برخود غلط قسم کا انسان تھا۔ جو شخص ابہام کے بغیر اعلان کرتا ہے کہ کاروبار سلطنت کو چلانے کے سلسلے میں مذہب کو کیا سروکار اور محض مذہب کی وجہ سے نااہلوں کو ذمہ دار عہدوں پر فائز کرنا مذموم فعل ہے، اسے متعصب اور تنگ نظر کہنا نہ صرف بہت بڑا ظلم بلکہ زیادتی ہے!

ایک اور امیر نے مرتے وقت عرض کیا کہ میرا مذہب وہی ہے جو آپ کا ہے۔ اس پر اورنگ زیب مسکرا دیئے اور فرمایا...... "بچوں کی بہبود کی وجہ سے ایسا کہنے پر مجبور ہو گئے ہو۔ پھر فرمایا...... مارا مذہب کسے چہ کار؟ عیسیٰ بدین خود، موسیٰ، بدین خود......" ان اظہاروں کے بعد بدستور اورنگ زیب کی تنگ نظر کی رٹ لگانا بجائے خود تنگ نظری نہیں، تو کیا ہے!

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہو سکتا ہے اورنگ زیب نے سیاسی مصلحت کی وجہ سے ایسا کیا ہو اور عملاً وہ تنگ نظری کا ہی قائل رہا ہو...... تاریخ بتلاتی ہے کہ ایسا نہیں۔ تاریخ میں کم وبیش سَوا سو نام ایسے ہندو امیروں، راجاؤں اور ہزاری منصب داروں کے ہیں جو صاحبِ طبل وعلم تھے اور کچھ فرمان ایسے بھی اصلی حالت میں موجود ہیں جہاں اورنگ زیب نے ہندوؤں کے عبادت خانوں کیلئے زمینیں اور جائیدادیں وقف کی تھیں...... ان حقائق کی موجودگی میں یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ اورنگ زیب کو بدنام کرنے کی سوچی سمجھی سکیم انگریزوں نے کہاں بنائی تھی اور اس کو آلہ کار بنا کر ہندوؤں اور مسلمانوں کے دلوں میں بغض وعداوت کا وہ بیج بویا جس نے انگریزوں کو ڈیڑھ سو سال تک حکمرانی کا موقعہ دیا۔ اور جب

یہاں سے چلے گئے تو ملک کے دو حصے کر کے گئے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ جو نقصان انگریزوں نے کیا ہے اس کی تلافی کیلئے گزشتہ نصف صدی میں کچھ نہ کیا گیا۔ لیکن امید ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جھوٹ اور بہتان بازی کی دُھند ہٹ جائے گی اور حقائق کا روشن چہرہ نمودار ہوگا۔

اورنگ زیب ذاتی طور پر بڑا بہادر، راست باز، خدا ترس، منصف مزاج اور خطا پوش تھا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہر کام میں بادشاہ کو یہ خیال رہتا تھا کہ کہیں وہ خدا کے غضب کا شکار نہ ہونے پائے۔ اپنے اہل کاروں، امیروں اور وزیروں کو بار بار یاد دلاتے رہے کہ وہ اللہ کی گرفت سے ڈرتے رہیں اور عوام کو تکالیف اور مصائب کا سامنا نہ کرنے دیں! اپنے مدار المہام کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"آن فدوی (دستور معظم اسد خان) بخان جہاں بہادر بنویسد کہ سوداگران اسپان وغیرہ اسغاثہ می نمایند۔ خبر صحیح است الظم ظلمات یوم القیٰم. چہ رو منظور نہ داشت؟ یاد موت کہ قریب تر از شہ رگ اوست چرا گذشت از سخط الٰہی و غضب پادشاہی تبرسد و آنہارا رضامند کند۔"

(دستور معظم خان جہاں بہادر کو لکھے کہ گھوڑوں کے سوداگر اور دوسرے لوگ فریاد کر رہے ہیں۔ ظلم کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ وہ قیامت کے دن اندھیرے کی صورت میں سامنے آئے گا۔ اس صورتِ حال کو خان جہاں نے کیوں پسند کیا؟ موت کو اس نے کیسے بھلا دیا جو اس کی شہ رگ سے زیادہ نزدیک ہے۔ اسے چاہیئے کہ خدا کے قہر اور بادشاہ کے غضب سے ڈرے اور ان فریادیوں کو خوش کرے)۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

"......این عاصی خدا ہود کہ مرتکب ہیچ گناہ معصیتے خاصتہً ظلمے نہ شود۔ اما از انجا کہ ملک بے سیاست نمی ماند در یاست بے سیاست راست نمی آید۔ بعضے جاہا احکام موافق آن وقت بغلبۂ نفس بے اختیار صادر می شود۔ الحمد اللہ کہ نیت خود بخیر است شاید کہ نگیرد۔"

(یہ گناہ گار تو یہ چاہتا ہے کہ اس سے کوئی گناہ، نافرمانی اور خاص کر ظلم سرزد نہ ہو۔ لیکن چونکہ ملک سیاست کے بغیر پائیدار نہیں اور حکومت سیاست کے بغیر سازگار نہیں۔ کبھی کبھی نفس کے غلبے میں آ کر کچھ ناگوار احکام بھی دینے پڑتے ہیں۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ اس میں نیّت نیک ہوتی ہے۔ شاید اللہ تعالیٰ اپنی گرفت میں نہ لے لیں۔)

اورنگ زیب ایسے مردم شناس کو معلوم تھا کہ اس کے جانشینوں کی ذہنی استعداد کتنی ہے اور وہ جانتا ہے کہ وہ کاروبارِ سلطنت کو چلانے کے بالکل نا اہل ہیں اور بار بار کہتا رہا کہ میرے بعد سب سے بڑا المیہ جو ہونے والا ہے وہ یہ کہ خون خرابہ ہوگا۔ اور بندگانِ خدا کا خونِ ناحق ہوگا جو بہت بڑا ظلم ہے۔ اپنے بیٹے کو لکھتا ہے کہ فاضل خان علاء الملک نے میرا زایچہ بنایا تھا اور اس کے مطابق تمام باتیں ٹھیک ہوتی رہیں۔ اس کے مطابق میرے بعد جو بادشاہ ہوگا اس کے اوصاف یہ ہیں:

"بے خبرے، تنگ نفسے، معدوم الضررے کہ کلماتش ہمہ ناتمام و تدبیرش ہمہ خام باشد۔ برائے بعضے این قدر شادابے کہ قریب نہ غرق باشد و برائے برخے ایں ہمہ خشکی کہ بیم زوال باشد بعمل خواہد آورد۔"

(ایک بے خبر، تنگ نفس اور بے ضرر بادشاہ جس کی ساری باتیں ادھوری

اور ساری تدبیریں کچّی ہوں گی۔ کچھ لوگوں پر اتنا فیاض کہ بخشش کے دریا میں ڈوب جائیں اور کچھ لوگوں کیلئے اتنا ممسک کہ وہ زوال سے دوچار ہو جائیں)

اور پھر لکھتا ہے......

''ایں ہمہ صفات حمیدہ و حالات پسندیدہ در ذات شمار دریافت می شود۔ اگر چہ وزیرے لایق کہ در عمل ما پیش آمدہ است بہم رسانیدہ ایم، متعاقب خواہم فرستاد لیکن چہ فائدہ؟ کہ چہار رکن سلطنت یعنے اولاد اربعہ ہرگز بے چارہ را بحال خود نخواہند گذاشت کہ کارے بکند۔''

(یہ اعلیٰ صفات اور پسندیدہ خصائل آپ کی ذاتِ گرامی میں جمع ہیں۔ اگر چہ ہم نے اپنے تجربے سے ایک لائق وزیر کو پالیا ہے اور جلد ہی اسے آپ کے پاس بھیج رہے ہیں لیکن اس کا فائدہ کیا ہے۔ سلطنت کے چار ارکان یعنے چار بیٹے اس غریب کو اپنے حال پر چھوڑ کر کوئی کام تھوڑے ہی کرنے دیں گے!)

ظلم اور فساد اور خونریزی کو روکنے کے اسباب پر سیرِ حاصل بحثیں کرتے ہوئے اپنے بیٹے کو ایک جگہ لکھتا ہے کہ مجھے آج ہی نظر آرہا ہے کہ میرے مرنے کے بعد کونسا ہنگامہ بپا ہونے والا ہے۔ پھر دعا کرتا ہے:

''ایزد مقلب القلوب توفیق حفاظت خلق اللہ کہ ودایع بدایع خالق اند نصیب کناد۔''

(دلوں کو برے کاموں سے پھیرنے والا خدائے بزرگ تم لوگوں کو خلق اللہ کی حفاظت کی توفیق عطا فرمائے کیونکہ عام لوگ تمہارے ہاتھوں میں اللہ کی امانت ہیں)۔ کون ایسے بادشاہ کو ظالم، جابر اور تنگ نظر کہہ سکتا ہے؟

اس موضوع پر اورنگ زیب کا یہ خط پیش کر کے اس کو ختم کر رہا ہوں۔ خط

اپنے بیٹے کو لکھا ہے اور کہتا ہے:

"ایک روز میں میاں عبداللطیف قدس سرہٗ الشریف کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوا۔ اثنائے گفتگو میں، میں نے کچھ گاؤں بطور جاگیر خانقاہ کے مصارف کیلئے پیش کئے۔ فرمایا:

شاہ ماراده دہد منت نہد

رازق مارزق بے منت دہد

بادشاہ گاؤں عطا کرتا ہے تو احسان جتاتا ہے۔ میرے رزاق رزق بے منت عطا کرتا ہے۔ میں نے عرض کیا، بالکل بجا ہے لیکن ان گاؤں کی پیش کش مِنّت کے ارادے سے نہیں بلکہ اپنے صلاح وفلاح اور خیرِ دارین کیلئے کررہا ہوں۔ فرمایا اگر یہ نیّت ہے تو محنت کش کسانوں کو زمینوں کی پیداوار کا اکثر حصہ دے دیا جائے اور کچھ حصہ بطورِ مال گذاری وصول کر کے متوکل گوشہ نشینوں کے معاش کیلئے وقف کردیا جائے۔ مظلوموں کی دادرسی کی جائے تا کہ کس کا حق تلف نہ ہو۔ طاقت ور کمزوروں کے دباؤ میں نہ آئیں۔ صلاح و فلاح اور خیرِ دارین خود بخود حاصل ہوگا..... فرمائیے اِن باتوں سے کہیں بھی آپ کو تنگ نظری اور فرقہ پرستی کی بُو آتی ہے؟

تصورِ آخرت ایک سچّے مسلمان کے عقیدے کی بنیاد ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اورنگ زیب تصورِ آخرت سے ایک لمحے کیلئے بھی غافل نہیں رہا ہے۔ اپنے بیٹے کو لکھتے ہیں کہ چمار کونڈہ سے قادر آباد تک کا راستہ پر خطر ہوگیا ہے اور لٹیروں نے مسافروں کی زندگی حرام کردی ہے۔ پھر کہتے ہیں:

"از احوال بدروز جزا چرا علم ندارید۔ فکر مآل فی الحال باید کرد۔ الدنیا

مزرعة الاآخرۃ۔ ظالمے از عالمے درحق خود فاتحہ خیر خواست جواب یافت دربارۂ ستم گاراں خبردار مظلوماں دعائے خیر اثر ندارد۔''

(آپ روزِ جزا کے حالِ بد سے کیوں بے خبر ہیں۔ انجام کی فکر تو آج ہی کرنی چاہیئے۔ دنیا آخرت کی کھیتی ہے جو یہاں بوؤ گے، وہاں کاٹو گے۔ ایک ظالم نے ایک عالم سے دُعائے خیر کی درخواست کی۔ عالم نے کہا۔ ظالموں کے حق میں کوئی دُعا قبول نہیں ہوتی جب تک وہ مظلوموں کی فریادرسی نہ کریں۔)

ایک اور خط بالکل اسی قسم کا ہے۔ مدارالمہام کے نام لکھتے ہیں:

''بہ فرزند عزیز بہادر ما بنویسد کہ دنیا رفت و آخرت آمدنی شد چیزے کہ یادگار خواہد ماند بکار خواہد آمد و ہمراہ بغار گور خواہد رفت ہمیں امور خیر کہ باقیاتِ صالحات است، امروز خود را از فردائے رفتگاں باید دانست و عاقل آنست کہ حال را کہ بین الماضی والا استقبال است غنیمت داند وامر خیر دہ صلاح آنچہ تواند بعمل آرد، حال را رفتہ و آیندہ را شدہ پندارد۔''

(فرزندِ عزیز کو لکھتے ہیں کہ دنیا جارہی ہے اور آخرت کا سامنا ہونے والا ہے۔ جو چیز یادگار رہے گی، وہی کام آئے گی۔ نیکی اور مفادِ عامہ کے جتنے باقی رہنے والے کام ہیں وہی قبر کی تاریکی ساتھ آئیں گے۔ تمہارا 'آج' اوروں کا 'آنے والا کل' ہے۔ دانا وہ ہے 'جو حال کو' جو ماضی اور مستقبل کے درمیان ہے، غنیمت سمجھے اور جتنے بھی نیکی کے کام ہیں، عمل میں لائے. اور ایسا کرتے وقت زمانۂ حال کو ماضی اور مستقبل کو بھی ماضی ہی سمجھ لے (کیونکہ وقت پر کسی کا اعتبار نہیں) تصوّرِ آخرت انسانی کردار کی درستی کیلئے ایک ہی تیرِ بہدف نسخہ ہے۔ یہ عقیدہ راسخ ہوجائے تو انسان اپنے ہر قول و فعل، ہر حرکت اور ہر حال میں محتاط

رہتا ہے اور استحضار موت کے ذریعہ ہر دم کو آخری دم اور ہر سانس کو آخری سمجھتے ہوئے اپنی اصلاح میں محو رہتا ہے۔ اورنگ زیب کے تمام خطوط، تمام فرامین اور خود اس کے روزانہ لائحہ عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں چیزیں یعنی استحضار موت اور تصوّرِ آخرت اس کی زندگی کے دو اہم عناصر رہے ہیں۔ قوتِ عمل اور قوتِ ارادی میں یہ شخص بے مثال ہے۔ ۹۱ سال کی عمر میں اس کی وفات ہوئی۔ اس وقت تک برابر اس کا پاؤں رکاب میں تھا۔ منشی محمد کاظم بن محمد امین نے اپنی کتاب 'عالم گیر نامہ' میں لکھا ہے کہ یہ شخص عجیب و غریب تھا۔ تخت نشینی کے بعد کلام اللہ کو حفظ کیا۔ بادشاہ کے چہرے سے کبھی یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ مسرور ہیں، یا فکرمند، ہر حال میں چہرے پر ایک سی کیفیت رہتی تھی۔ ساری عمر اس کی زبان سے ایک دفعہ بھی کوئی نازیبا لفظ نہیں نکلا۔ شراب، زنا، لہو و لعب سے کوسوں دور تھا۔ ہفتے میں دو راتیں شب بیدار رہتا تھا۔ ان تمام باتوں کے باوجود صرف زاہدِ خشک نہ تھا اپنے پوتے شہزادہ محمد بیدار بخت کو ایک خط لکھا۔ اس کی شان نزول یہ ہے کہ شہزادہ کی شادی ایک سیّدزادی سے ہوئی تھی۔ ایک دن میاں بیوی میں کسی بات پر تو تو میں میں ہوئی اور شہزادہ نے سیّدزادی سے کہا کہ ایک پاجی کی لڑکی کو شہزادوں کے ساتھ بدتمیزی نہیں کرنی چاہیئے۔ واقعہ نویس نے یہ واقعہ بھی لکھ بھیجا اور اورنگ زیب نے یہ حسین قطعہ اپنے پوتے کو لکھا:

صبح دم مرغِ چمن با گلِ نو خاستہ گفت
ناز کم کن کہ دریں باغ بسے چوں تو شگفت
گل بخندید کہ از راست نرنجم لیکن
ہیچ عاشق سخن تلخ بہ معشوق نگفت

"بہ آں نور الابصار واضح باد کہ در ایام جوانی کہ بہ اصلاح پواج مصاحبان شما جوانی دیوانی گویند مارا ہم دراں ایام تعلق با شخصے کہ نہایت تبحر داشت بہم رسیدہ بود۔ تا حیات محبت اور ابانجام رسانیدیم۔ دگاہے آزردہ نکردیم، دیگر آنکہ با سادات لفظ پاجی گفتن مجح پاجی گری است۔ کسے اگر سید را پاجی بگوید البتہ پاجی نخواہد شد۔ اگر از نوشتہ محل دار و ناظر رضا مندی آں سیدہ نہ شود بہ عتاب بلکہ بہ عذاب گرفتار خواہد شد۔"

(چمن میں بلبل نے صبح کے وقت پھول سے کہا۔ اتنا نہ اِترا تجھ ایسے ہزاروں پھول اس باغ میں کھلتے آئے ہیں اور اب بھی ہیں۔ پھول ہنس دیا اور کہا۔ بات تو نے سچی کہی ہے اور سچی بات سے خفا نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن یہ بھی تو ہے کہ کسی عاشق نے آج تک اپنے معشوق کے ساتھ تلخ کلامی نہیں کی ہے۔)

آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ آپ کے پاجی مصاحبوں کی اصطلاح میں جوانی دیوانی کا عالم ہم پر بھی تھا، اور اسی زمانے میں ہم بھی ایک محبوب پر فریفتہ تھے۔ جب وہ زندہ رہی، ہم نے اس کے ساتھ محبت کے روابط قائم رکھے اور کبھی اس کا دل نہ دکھایا۔ دوسری بات یہ ہے کہ جو شخص سیّد کیلئے پاجی کا استعمال کرتا ہے وہ خود پاجی پنا دکھاتا ہے۔ سیّد، سیّد ہی رہے گا، پاجی نہیں بنے گا۔ اگر محلدار اور ناظر ہمارے پاس یہ رپورٹ نہیں بھیجے گا کہ آپ نے اس سیّد زادی کا دل خوش کیا ہے تو عتاب بلکہ عذاب میں گرفتار ہونے کا امکان ہے!

سخت گیر، زبردست اور خشک اورنگ زیب کے پہلو میں بھی آخر دل تھا۔

خدائے جمیل کا سچا بندہ پرستارِ جمال نہ ہوگا تو اور کون ہوگا!

..............☆☆☆..............

نعتیہ غزل

تزئینِ کائنات رسُولِ خدا کی ذات
تنویرِ شش جہات رسُولِ خدا کی ذات
مجموعۂ صفات رسُولِ خُدا کی ذات
عرفانِ عینِ ذات رسولِ خُدا کی ذات
وہ چال ڈھال جیسے کہ شاداب ڈال ڈال
سرسبز پات پات 'رسُولِ خُدا کی ذات
جہلِ خرد کی شورِ زمین چُھپا ہُوا
سرچشمۂ حیات رسُولِ خُدا کی ذات
مایوسیوں کی تیرہ و تاریک رات میں
قندیلِ التفات ' رسُولِ خُدا کی ذات
ہے عارضِ صبیحِ محمّد طلوعِ مہر
صبحِ شبِ برات' رسُولِ خُدا کی ذات
اک روسیاہ طالب سرمایۂ نجات
سرمایۂ نجات ' رسُولِ خداکی ذات



نعت

اندیشۂ عذاب، نہ کھٹکا حِساب کا
فیضان ہے جنابِ رِسالت مآبؐ کا

مایوسیوں میں تھام لیا دامن آپؐ کا
محرومیوں میں نام لیا آنجنابؐ کا

اس دَور کو عَطا ہوا بوبکرؓ کا خلُوص
بو ذرؓ کا فقر صِدق و صَفا بو ترابؓ کا

جب سے بنا غلام غلامانِ مصطفیٰؐ
ذرّے کو اعتبار مِلا آفتاب کا

بس ایک بار اے مرے یوسفِ جمال آ
مخمل ہے فرشِ راہ، زلیخا کے خواب کا



دین میرا شوقِ پابوسِ رسولِ ہاشمیؐ
عِشق میرا رقصِ طاؤسِ رسولِ ہاشمیؐ

میری عِزت خواجۂ یثربؐ کی عزّت پر نثار
میرا مذہب حفظِ ناموسِ رسولِ ہاشمیؐ



نعتیہ غزل

تابندہ تر ہے خاک مری مہر و ماہ سے
وابستہ ہوں جنابِ رِسالت پناہ سے

منسُوب جَب سے ہُوں مَدنی کجکلاہؐ سے
ڈرتا نہیں ہُوں میں کسی عالم پناہ سے

مرتا رہا تغافلِ پیہم سے باربار
جیتا رہا ترے کرم گاہ گاہ سے

میری حیات ایک مسلسل ثواب ہے
اس کو نِکھارتا ہوں مسلسلِ گناہ سے

میری نگاہ گردِ کدورت سے پاک ہے
آجاؤ میرے دل میں اسی شاہراہ سے

اِک لمحہ جیسے رُک سی گئی نبضِ کائنات
ٹکرا گئی نگاہ کسی کی نِگاہ سے



میرا قرآن مصحفِ روئے رسولِ ہاشمیؐ
حوضِ کوثر خوئے دِلجوئے رسولِ ہاشمیؐ
میرا فردوس بریں کوئے رسولِ ہاشمیؐ
شاخِ طُوبےٰ عکسِ گیسوئے رسولِ ہاشمیؐ



رہرو راہِ محبت ہے ابھی منزل سے دور
منزلِ مقصود ہے آنکھوں سے اوجھل، دل سے دور

ایک آندھی سے تہ و بالا ہوئے ہیں ریگ زار
محملِ لیلیٰ ہے خالی، قیس ہے محمل سے دور

یاالٰہی ہو تمہارے آسماں والوں کی خیر
آدمِ خاکی نہیں ہے اب مہِ کامل سے دور

رات ہیبت ناک، طوفانِ حوادث یم بہ یم
ناخدا کے ہاتھ شل ہیں، ناو ہے ساحل سے دور

کون کہہ سکتا تھا، ایسا وقت بھی آجائے گا
تم میری صحبت سے ناخوش، میں تیری محفل سے دور





ضبطِ فغاں نہیں ہے مرے دسترس کی بات
جی بھر کے رولوں، یہ بھی نہیں میرے بس کی بات

آدم بوصف خاک نژادی ہے روبہ عرش
ثابت ہوئی ہے آج یہ صد ہا برس کی بات

سنتا ہے کون اہل سے حدیثِ دل
اہلِ ہوس کو بھاتی ہے اہلِ ہوس کی بات

وہ انہماک تھا کہ میں کچھ بھی نہ سُن سَکا
صحنِ چمن کا حال، نہ کنجِ قفس کی بات

دل نے کبھی خرد کی امامت نہ کی قبول
غنچے کو ناپسند ہوئی خار و خس کی بات

اِس دَور کا مذاق ہی بگڑا ہوا سا ہے
گویا کوئی دلیل ہے ہر بوالہوس کی بات

مایوسیوں میں تیرا تبسّم تھا دلنواز
جیسے کسی طبیبِ مسیحا نفس کی بات

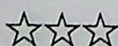




آج پھر چھیڑی ہے تم نے میرے ارمانوں کی بات
کاوشِ زخمِ جگر کے تازہ افسانوں کی بات
اِک ادائے خاص سے ہم نے کہی تُم نے سنی
کون سنتا ہے جہاں میں ورنہ دیوانوں کی بات
زادۂ صحنِ چمن پَروردۂ آغوشِ گُل
ہم بَیابان میں بھی کہہ دیں گے گُلستانوں کی بات
تم نے میرا اور پھر میں تراشابُت تیرا
اس طرح کعبے سے چل نکلی ہے بُت خانوں کی بات
شمع جلتی ہی رہی، آنسو بہاتی ہی رہی
صبح تک چلتی رہی محفِل میں پَروانوں کی بات



فلسفے نے اسے بنا ڈالا
کِتنا پیچیدہ کِس قدر مشکل
چار لفظوں میں ہے دو روزہ حیات
یادِ ماضی، فریبِ مستقبل





اِس دَور میں بھی آج کرامات ہوگئی
جب اُن سے چلتے چلتے ملاقات ہوگئی

تیری نِگاہ قبلۂ حاجات ہوگئی
بدلی ذرا تو مرگِ مفاجات ہوگئی

بے خوابیوں کے بعد ملا قبر کا سکون
اَچھا ہوا ، تلافی مافات ہوگئی

خوابِ عدَم سے جاگنے والوں کی بے بسی
آنکھیں ہی مَل رہے تھے کہ پھر رات ہوگئی



راستے میں ایک بستی ہے، وہاں کعبہ بھی ہے
میں نے دیکھا تھا مدینے کی طرف جاتے ہوئے
جن کی ہمت پست ہوتی ہے، وہ رُکتے ہیں وہیں
وہ بھی جاتے ہیں مگر، جاتے ہیں ستاتے ہوئے





دِل سکوں محسوس کرتا ہے کئی سالوں کے بعد
زندگی معمول پر آئی ہے ہڑتالوں کے بعد

قبر کی پہلی ہی شب کِتنی نشاط انگیز تھی
خوب اطمینان تھا دنیا کے جنجالوں کے بعد

اِس زمانے کے رئیسوں کی معارف پروری
شاعروں پر بھی کرم ہوتا ہے، قوّالوں کے بعد

ہر کلی میں حُسن، ہر گلشن حسین، ہَر گُل جمیل
اس چمن کا حال کیا ہوگا، چمن والوں کے بعد

میرے کُل اعمال نامے سے فرشتوں کو ملیں
ایک دو خرمستیاں، دس بیس پڑتالوں کے بعد





جبینِ ناز کو آلودۂ مَلال نہ کر
میں بے اَدب ہوں، میری بات کا خیال نہ کر
مچل نہ جائے کہیں یہ دلِ فراق پسند
خداکے واسطے آرائشِ جمال نہ کر
فراق نے اسے بخشی ہے زندگی کی تڑپ
دلِ سِتم زدہ کو خُوگرِ وصا ل نہ کر
خدا بھی تجھ سے جو پوچھے تری رضا کیا ہے
قلندری کا تقاضا ہے عرضِ حال نہ کر
ترا مقام مقامِ رضا سے آگے ہے
خودی نہ بیچ طفیلی نہ بن ، سوال نہ کر
زمانہ ایک مسلسل عمل ہے لامحدود
بلا سبَب اُسے پا بندِ ماہ وسال نہ کر



فریاد بن کے قید ضمیرِ جرس میں ہوں
تہمت لگی ہے مجھ پہ کہ میں اپنے بس میں ہوں
اِک بیکراں فضا میں اُڑا چاہتا ہے دِل
صَدیاں گذر گئی ہیں،میں اب تک قفس میں ہوں





دوڑ تھی اپنی اک زمانے تک
میکدے سے نگار خانے تک

خواب تھا یا طِلسم کا عالم
تیرے آنے سے تیرے جانے تک

سو مِراحِل سے دِل گذرتا ہے
شعر کہنے سے گنگنانے تک

طائر سدرہ ہو کہ مرغِ اسیر
کون پہنچا آشیانے تک

میکدے میں مجھے نظر آیا
راستہ تیرے آستانے تک

ہم سمجھتے ہیں اِس زمانے کو
ہم جو پہنچے ہیں اِس زمانے تک

دل کا دھونا ہے رات بھر رونا
صبحِ صادق کے مُسکرانے تک

بُوند دَریا میں جاگری ڈوبی
میں بھی زندہ ہوں تجھ کو پانے تک





گو عمر کٹی مایوسی میں، دِل غم سے مکدّر ہو نہ سکا
ایمان میں تزلزل آ نہ سکا، دامانِ وفا تَر ہو نہ سکا

ہَر چند کہ طوفانوں سے لڑا، سیلاب سے اُلجھا، یم میں پَلا
پیغمبرِ طوفانِ نوحؑ، مگر اشکوں میں شناور ہو نہ سکا

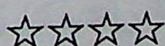
از بسکہ چمن زاروں میں پَلا، صحرا میں اُگا، جنگل میں بڑھا
اُس قد کے برابر سَر و سہی، شمشاد صنوبر ہو نہ سَکا

بُجھ بُجھ کے جَلا، جل جل کے بُجھا، جی جی کے مَرا، مر مر کے جیا
خورشیدِ منوّر پھر بھی مگر، اس بُت کے برابر ہو نہ سکا

جِس قُرب پہ نُوری نازاں ہیں وہ قُرب ہمیں بھی حاصِل تھا
ہم قُرب کو لیکر کیا کرتے جب غم ہی میسّر ہو نہ سَکا

ہَر چند کہ تیری دُنیا میں مجبور ہیں ہم، مختار ہے تُو
جو ہم نے زمیں پر کر ڈالا وہ تجھ سے فلک پَر ہو نہ سکا

کشمیر کا رہنے والا ہوں، اُردوئے معلّی لِکھتا ہوں
اِس دیس میں مجھ سا کوئی بھی اُردو کا سخنور ہو نہ سَکا





ایماں بقدرِ طولِ امل بیچتا ہوں میں
لیکن ضمیر پہلے پہل بیچتا ہوں میں

تصویرِ قدس بن کے مریدوں کی بھیڑ میں
مصحف کو رکھ کے زیرِ بغل بیچتا ہوں میں

اپنی سیاہ فرد عمل لے کر ہاتھ میں
پیغمبرؐ خدا کا عمل بیچتا ہوں میں

آماجگاہِ حُسنِ ازل ہے مرا وجود
آماجگاہ حُسنِ ازل بیچتا ہوں میں

زندان کے بام و دَر کی حفاظت کے واسطے
نقش و نِگارِ تاج محل بیچتا ہو ں میں

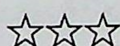
ہر شے بکاؤ ہے میرے بازارِ فکر میں
ہر شے بغیر لیت و لعل بیچتا ہوں میں

مُلّا، قرآن فروش، مجاہد وطن فروش
میں کس شمار میں ہوں، غزل بیچتا ہوں میں

میں جانتا ہوں کیا ہے خریدار کا مزاج
زہر اَب میں ملا کے عسل بیچتا ہوں میں

گاہک ہیں میرے برہمن و ملّا و محتسِب
کِس نے کہا کہ جنس و غل بیچتا ہوں میں

توحید میرے زورِ بیَاں سے مُستفید
خلوت میں جا کے لات و ہبُل بیچتا ہوں میں



آپ کے دَر کی خاک کا ذرّہ
سرمۂ دیدۂ اُولوالابصار
آپؐ کا نام روح کا آرام
آپؐ کی ذات مرکزِ ادوار





آج حد دَرجہ اُداسی ہے، مرا ساتھ نہ چھوڑ
اِلتجا ایک ذراسی ہے، مرا ساتھ نہ چھوڑ
آج کی رات بَھیانک ہے مرے ساتھ رہو
اور قیامت بھی بَپاسی ہے مرا ساتھ نہ چھوڑ
آج اس شہر پہ نازل ہے خداؤں کا عتاب
تو بھی اس شہر کا باسی ہے، مرا ساتھ نہ چھوڑ
آسماں بَر سرِ پیکار ہے نظریں نہ چُرا
یہ زمیں خوں کی پیاسی ہے، مرا ساتھ نہ چھوڑ
میں اکیلا ہوں سمندر کا تلاطُم ہے محیط
رات اِک کالی بلاسی ہے، مرا ساتھ نہ چھوڑ
کربلا آج بھی ہے دیکھ اِدھر خونِ حسینؓ
وہ محمدؐ کا کہ نواسہ ہے، مرا ساتھ نہ چھوڑ





اداشناس بن، یہاں قیاس کا محل نہیں
جنوں اساسِ عقل ہے، دِماغ کا خلل نہیں

خدا دِلوں سے دور ہے، مہیب و ناصبور ہے
یہ مولوی کا فلسفہ نوشتۂ ازل نہیں

جہانِ سوز و ساز میں نہ پوچھ لذّتِ فراق
وِصال گو لذیز ہے، فِراق کا بَدل نہیں

غرورِ حسن ناروا کہ حُسنِ بے ثبات ہے
خلافِ طبع ہو تو ہو، یہ بات بے محل نہیں

رات دہشت ناک، طوفانِ حوادِث یم بہ یم
فِطرتِ بے باک کو اندیشۂ ساحِل نہیں

میں شریک محفلِ احباب ہو سکتا نہیں
زینتِ محفلِ اگر وہ رونقِ محفلِ نہیں

موردِ لعنت کیا ہے تو نے کیوں اِبلیس کو
وہ تو آدم کی طرح ظالم نہیں، جاہل نہیں





ساقی کی مست آنکھیں خم خانہ زندگی کا
چشمِ سیہ کی گردش پیمانہ زندگی کا

جل کر ہوئی ہے مٹی ، محفلِ میں شمعِ محفل
پَر وانہ لے کے نِکلا ' پَر وانہ زندگی کا

افکارِ زِندگی کا شیرازہ منتشر ہے
اَب تک ہے نامکّمل افسانہ زِندگی کا

دُو دِن کی زندگانی ، سو سال کے اِرادے
دیوانہ ہوگیا ہے دیوانہ زِندگی کا



سحر کا وقت ہے بیدار ہے دلِ آگاہ
نزولِ رحمتِ پروردگار پر ہے نگاہ
درودخواں ہے گل و خار و یاسمین و گیاہ
کلی کلی کی زباں پَر ہے یا رسول اللہؐ





محبوب کے ہونٹوں پر سیلابِ تبسُم ہے
یا نور کے دَریا کی موجوں میں تلاطم ہے

اَب خُوب گذرتی ہے، انجام خُدا جانے
ہَر سانس میں نغمہ ہے، ہَر لَے میں ترنّم ہے

دِل ڈٹ کے مُقابل ہے آلام مَصائب سے
گویا کہ چٹانوں سے لہروں کا تصادم ہے

دنیائے محبت کی ہر چیز نرالی ہے
خاموش اِشاروں پر بنیادِ تکلّم ہے

جَب جنّتِ ارضی میں آرام نہیں مِلتا
پھر خلدِ بریں کیا ہے، واعظ کا توہّم ہے





اَب کِس کو یقیں آئے، جو چیز ہے، فانی ہے
پیغامِ محبت ہے اور اُن کی زبانی ہے

دو روز کے جینے میں بَرسُوں کی جگر کاری
ناکام جوانی کی یہ رام کہانی ہے

اِک بار مجھے گھوُرا اُس مَستِ ترنُّم نے
اُس دِن سے طبیعت میں دَریا کی روانی ہے

واعظ! نہ ستا مجھ کو، مجبور نہ کر مجھکو
تھوڑی سی میں پی لوں گا، تم سمجھو کہ پانی ہے

لے دے کے مِرے بس میں اِک درد بھرا دل تھا
محفوظ اسے رکھنا، یہ میری نِشانی ہے





بَدن مرتعش رُوح میں سنسنی ہے
اجل کے فرشتو! یہی جان کنی ہے
مجھے بے طلب زندگی دینے والے
یہ احسان تیرا نہیں، دُشمنی ہے
یَہاں چارہ گر سوچتا ہے مَداوا
وہاں دَردو دَرماں میں باہم ٹھنی ہے
بگڑتی ہے بَن بَن کے قِسمت ہماری
نہ کل تک بنے گی نہ اَب تک بنی ہے
وہاں زاہدِ خشک کو کیا ملے گا؟
سزاوارِ رحمتِ تو تر دامنی ہے
مجھے تم سے یارب شکایت یہی ہے
یَہاں فقر کے بھیس میں رہزنی ہے
کہاں میں کہاں نغمۂ زِندگانی
مِرے رُوپ میں جلوہ فرما غنیؔ ہے





اس شوخ کو کیا دیکھا آنکھوں میں سمٹ آئی
شیراز کی شادابی، کشمیر کی رعنائی

رہ رہ کے مِرے دِل میں اک درد سا اٹھتا ہے
آ اَپنے لبوں سے دے پیغامِ مسیحائی

ہَر شے کی حضوری میں جھکوادِیا سَر میرا
اے ذوقِ جبیں سائی! اَے لذّتِ رُسوائی

شرمندہ ٔ الفت ہوں' سودائے محبت ہوں
دامن میں چُھپا مجھ کو' اے گوشہ تنہائی

سوکھا ہوا سبزہ ہُوں گلزارِ محبت کا
کب سایہ فگنِ ہو گا وہ سَروِ دِلآرائی

☆☆☆



مرا حال تو جانتا ہے کیا ہی کہ میں تھک گیا ہوں بہت تھک گیا ہوں
کرم کر مرے حال پر یا الٰہی، کہ میں تھک گیا ہوں بہت تھک گیا ہوں

اَب اُکتا گیا ہوں، اَب اُکتا گیا ہوں، بڑی دیر سے دیکھتا آرہا ہوں
یہ دِن کا اُجالا، یہ شب کی سیاہی، کہ میں تھک گیا ہوں بہت تھک گیا ہوں

یہ دنیا تیری خوبصورت ہے لیکن وفاؤں سے عاری، جفاؤں سے بھاری
ہراک شے مسافر ہراِک چیز راہی، کہ میں تھک گیا ہوں بہت تھک گیا ہوں

یہی ایک نغمہ ہے سَب کے لبوں پر یہی راگ گاتی ہے مخلوقِ عالم
ترے چاند تارے ترے مرغ و ماہی، کہ میں تھک گیا ہوں بہت تھک گیا ہوں

مری روح کو کرب ڈستا ہے مجھکو، تری اِک نظر کا طلب گار ہوں میں
نہ دنیا کی دولت نہ عالم پناہی، کہ میں تھک گیا ہوں بہت تھک گیا ہوں

نہ اَب نیم شب کی دُعاؤں میں رِقّت، نہ ذوقِ حضوری نہ احساس دُوری
نہ اَب لذّتِ نالہ صبحگاہی، کہ میں تھک گیا ہوں بہت تھک گیا ہوں

مجھے اس اذیت سے آزاد کردے نیا ولولہ دے، نئی زندگی دے
نئی زِندگی کی نئی سر براہی، کہ میں تھک گیا ہوں بہت تھک گیا ہوں

ہزارُوں برس کی مسافت کو میں نے فقط چند لمحوں میں طے کرلیا ہے
مرا ہر رُواں دے رہا ہے گواہی، کہ میں تھک گیا ہوں بہت تھک گیا ہوں





آپ کی ہم سے ملاقات' خدا خیر کرے
کیا بدلنے لگے حالات' خدا خیر کرے

ایک تشویش سی لاحق ہے بڑی مدت سے
دل نہیں موردِ آفات' خدا خیر کرے

عِشق والوں سے نہیں نام کے دیوانوں سے
کھا گئے اہلِ خرد مات' خدا خیر کرے

ابنِ آدم کو وَراثت میں مِلی ہے شاید
یہ فسادات کی سوغات' خدا خیر کرے

کون سا گوشہ ہے دَھرتی کا جہاں آج نہیں
رقص میں مرگِ مفاجات' خدا خیر کرے

پھر وہی غل، وہی ہنگامہ' وہی دِن ہوگا
پھر بسر ہونے لگی رات' خدا خیر کرے

جِن کو معلوم نہیں بندہ نوازی کیا ہے
بن گئے قبلۂ حاجات' خدا خیر کرے

گوشۂ فقر میں بیٹھا ہوں' نہ آقا نہ غلام
ہو رہی ہے بسر اوقات' خدا خیر کرے

☆☆☆



پھر ہوئی ہے مشک افشاں زلفِ لیلائے بہار
اس تعلّق سے دلِ مجنوں ہے شیدائے بہار

ہر چمن میں حسن، گل میں حسن، خار و خس میں حسن
حسن کی فرمانروائی ہے تقاضائے بہار

ہر دَم جاں بخش ہے صحنِ گلستان میں مسیح
ہر گلی کا نور پنہاں طورِ سینائے بہار

نغمۂ فردوس ہے یا صوت دُرّاج و ہزار
حُور کی تصویر ہے یا روئے زیبائے بہار

بن کے فردوس نظر آتی ہے سب کے سامنے
وہ صنوبر قد، سمن اندام سلمائے بہار

جس نے اس جانِ بہاراں کو کبھی دیکھا نہ ہو
کیا سمجھ سکتا ہے کیا شے ہے تمنّائے بہار

زلفِ خوشبو کی مہک سے پھر مہک اٹھا چمن
چہرۂ زیبا سے چمکا ماہ سیمائے بہار

گلبدن، گل پیر ہن ، گلشن شمائل، گلعذار
دیکھ اسکو دیکھنا ہے گر سَراپائے بہار

عرش سے ہے فرش تک سیلاب رنگ و نور کا
دل میں نغموں کا تلاطم سَر میں سودائے بہار





گل بداماں، گل بکف، گل پیرہن کب آئیگا
وہ سَر اپا رونقِ صحنِ چمن کب آئے گا

انجمن کی انجمن سونی پڑی ہے ہر طرف
سوچتا ہوں وہ فروغِ انجمن کب آئے گا

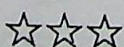
ہم مصّور بھی ہیں، شاعر بھی ہیں، دانشور بھی ہیں
کوئی بتلادو ہمیں جینے کا فن کب آئے گا

زِندگانی ہے قصیدہ یا رجز یا مرثیہ
دوستو! اِس میں غزل کا بانکپن کب آئیگا

بن رہا ہے تانا بانا اِک نئی تہذیب کا
اِس میں حُسن صورتِ گنگ و جمن کب آئیگا

آدمی کرنے لگے گا اِحترامِ آدمی
ہاتھ یہ سرمایۂ عہدِ کہن کب آئے گا

جب اَنا الحق کہنے والے لوگ ہی رخصت ہوئے
پھر زباں پر قصۂ دار و رسن کب آئے گا





موت کا جب نام سنتے ہیں تو ڈر جاتے ہیں لوگ
تم نے دیکھا، ہم نے دیکھا پھر بھی مَر جاتے ہیں لوگ

اَب تو دِن گھٹنے لگا، سائے بھی لمبے ہو گئے
ہم بھی گھر جائیں گے اپنے اپنے گھر جاتے ہیں لوگ

کوئی افسانہ سُنا الفاظ کا جادو جگا
کام کی باتیں نہ کر اِس سے بِپھر جاتے ہیں لوگ

ایک جانِ ناتواں اور اتنے سارے مَرحلے
اِتنے سارے مرحلوں سے بھی، گذر جاتے ہیں لوگ

سرزمینِ دِل بھی ہوتی کاش جولاں گاہِ عشق
زہرہ و مریخ پَر یوں تو اُتر جاتے ہیں لوگ

حق سے ناوابستگی کے باوجود اِس شہر میں
کیوں انا الحق کہتے اور بے موت مَر جاتے ہیں لوگ



میں تمہیں اپنا بناؤں کِس طرح
مِل سکیں گے دھوپ چھاؤں کِسطرح

آپ کہتے ہیں کہ کر ترکِ وفا
خوب ہے لیکن نبھاؤں کس طرح



کشمیر

ہر لحظہ نیا طور ، نئی برقِ تجلی
اللہ کرے تجھکو عطا دیدۂ بینا

ہے جلوۂ گل جلوۂ انوارِ الٰہی
یہ وادیٔ کشمیر ہے یا وادیٔ سینا

یہ برف یہ کُہسار یہ وادی یہ مناظر
چاندی کی انگوٹھی میں زمُرد کا نگینہ

اَرژنگ کی گُلرنگ بہاروں کا مرقع
یہ مانی و بہزاد کی صنعت کا خزینہ





زندگی کے قمار خانے میں
کون جیتا ہے کون ہارا ہے؟

موت دیتی ہے کشمکش سے نجات
موت مجبور کا سہارا ہے

اس دہکتے عِذار پَر آنسو
شفقِ شام میں سِتارا ہے

اُن کی چوکھٹ مِری جبینِ نیاز
اِس تجارت میں کیا خسارا ہے

جِتنے چاہو مجھے کچو کے دو
دِل نہیں دوست ! سنگِ خارا ہے





یہ لالۂ گلفام ہے یا جامِ لبالب
یہ نرگسِ مخمور ہے یا ساغر و مینا
یہ برگِ گُل ولالہ پہ شبنم ہے کہ جس سے
حُوروں کی جبیں پر ہے ندامت کا پسینہ
شاعر کے حسیں خواب کی تعبیر ہے کشمیر
پُرکار مصوّر کے تخیّل کی حسینہ
اے نورِ نظر! دیکھ کہ منظورِ نظر ہے
پھاگن کا مہینہ ہو کہ ساون کا مہینہ
اے زاہدِ بَد ذوق اِسی خاک میں مرجا
اس خاک میں مرنا بھی ہے، فردوس میں جینا
وہ گوہرِ نایاب ہیں اِس خاک میں جن سے
کم مایہ و ناچیز ہے کسریٰ کا دفینہ
خاموش پُر ستار ہوں میں حُسنِ ازل کا
اے جنبشِ لب! دل کا اُلٹتا ہے سفینہ



اِستفسار

کیا اب بھی یاد ہے تمہیں وہ خوشگوار شام
پورب سے ہولے ہولے جو اُبھرا مہِ تمام

دونوں تھے ہم خموش، خُدا جانے کتنی دُور
تھا باغ کی روش عنادل کا اژدہام

ساراجہاں خموش، زمین آسماں خموش
طائر مثالِ تمکنت آشیاں خموش

رنگیں کلی خموش ، گُلِ بوستاں خموش
گلچیں اِدھر خموش، اُدھر باغباں خموش

ناگاہ تونے میری طرف کی نگاہِ ناز
میں نے بصد نیاز جُھکا یا سرِ نیاز

گو تھی لبوں پہ مُہرِ خموشی لگی ہوئی
آنکھوں نے بے نقاب کئے دو دِلوں کے راز



قطعات

تجھے خبر نہیں عالی مقام ہوں میں بھی
مثیلِ خضر علیہ السلام ہوں میں بھی
جہانِ لوح و قلم میرے زیرِ فرماں ہے
محمدؐ عربی کا غلام ہوں میں بھی



سحر کا وقت ہے بیدار ہے دل آگاہ
نزولِ رحمتِ پروردگار پر ہے نگاہ
درود خواں ہے گل و خار و یاسمین و گیاہ
کلی کلی کی زباں پر ہے یا رسول اللہؐ



گفتگو کل ہو رہی تھی بلبل و شہباز میں
دے دیا بلبل نے شاہیں کی تعلّی کا جواب
ہے بظاہر تلخ لیکن یہ حقیقت ہے جناب
زندگی ہے سینکڑوں تاروں کی مرگِ آفتاب



اک زمانہ تھا کہ دِل ہوتا تھا مقصودِ حیات
دِل کی چالوں کو کیا پھر عقل کے شاطر نے مات
ابتداء میں عقل تھی ہَر ہر قدم پر کامیاب
اب ''شکم'' ہی رہ گیا لے دے کے اسکی کائنات



سیرت و نعت ہے قرآنِ شریف
خالقِ کائنات کی تصنیف
ایک جذبِ دروں کا ہے اظہار
کیا لکھے نعت ایک عبدِ ضعیف



ایک ناچیز کو شرف بخشا
ایک ذرّے کو آفتاب کیا
اس زمانے میں نعت لکھنے پر
آپ نے میرا انتخاب کیا



حیف ہے گرسگانِ دنیا کا
خوف کھاؤں 'ادب سے بچھ جاؤں
آپ کے در کو چھوڑ کر آقا
کیسے در در کی ٹھوکریں کھاؤں



مال، اولاد، جاں فدائے رسول
وقف کر جسم و جاں رگ و ریشہ
مشغلہ جان کر نہ لکھ نعتیں
حبطِ اعمال کا ہے اندیشہ



پال رکھے ہیں دل کے معبد میں
آرزوؤں کے نسر ولات و منات
سب ہوا ہوس میں گذری ہے
اک متاعِ گراں بہا تھی حیات



خشک سالی کا دیو منہ کھولے
اُژدہا بن کے ڈسنے والا ہے
میرا وجدان کہہ رہا ہے مجھے
ابرِ رحمت برسنے والا ہے



پھر چمن میں بہار آئے گی
پھر گلوں پر نِکھار آئے گا
پھر رسولِ خدا کا فیضِ نظر
بن کے ابرِ بہار آئے گا



گونج اُٹھے گا نغمۂ توحید
پھر یقین و عمل کی ہوگی جیت
سُن لے پھر لاالٰہ الاّ اللہ
ہار جائے گا کفر کا عفریت



زحمتِ انتظار تلخ سہی
کتنا شیریں ہے انتظارِ حبیب
دل میں اِک آگ سی دہکتی ہے
یاد آتا ہے جب دیارِ حبیب



جب میں جینے کی بات کرتا ہوں
میں قرینے کی بات کرتا ہوں
بات جینے کی اور قرینے کی
میں مدینے کی بات کرتا ہوں



لوگ کہتے ہیں جنّتِ کشمیر
حسُن کے تاج کا نگینہ ہے
یہ میرے جسم کا وطن ہے مگر
میرے دل کا وطن مدینہ ہے



رفعتِ شان، سیّدِ لولاک
برتر از فہم و سرحدِ ادراک
سرمۂ چشمِ اولیاء کرام
اے دیارِ حبیب تیری خاک



اُن پہ صلوات کاروبارِ فقیر
اُن کی خیرات ' اقتدارِ فقیر
اُن کی اِک بات ' اعتبارِ فقیر
عرضِ حالات روزگارِ فقیر



جب سے میرا شعور جاگا ہے
آپ میرے بدن میں رہتے ہیں
ذکر میں ' فکر میں ' خیالوں میں
رُوح میں 'جان و تن میں رہتے ہیں



اک زمانے سے میرا دعویٰ ہے
ہوں غلامِ محمدؐ عربیؐ
آپ تصدیق اس کی فرمالیں
اللہ اللہ میری خوش لقبی



ایک خاکی فلک نشیں ہوگا
ٹھیکرا قیمتی نگیں ہوگا
نظرِ کیمیا اثر کی قسم
آپ چاہیں تو کیا نہیں ہوگا



سرداریٔ زمزمہ ہے میرا وجود
ہر نفس تارِ نغمہ داؤدؑ
دیکھ میری نماز میرا سجُود
مصطفےٰؐ پر درُود، لاکھ درُود



حُوریانِ فلک، جماد و نبات
خلقِ کائنات خُود دِن رات
آپؐ کی ذات پر بروئے قرآن
بھیجتے ہیں دُرود کی سوغات



کرم وجود مصطفےٰؐ کا وجود
لافنا لازوال، لامحدود
اس کو پابندِ صبح و شام نہ کر
فرضِ دائم ہے مصطفےٰؐ پر درود



رحمتِ حق مُدام آئے گی
صُبح آئے گی شام آئے گی
جوڑ کر رکھ درُود کی دولت
آخری وقت کام آئے گی



آج وقتِ سحر سے رہ رہ کر
یاد آتی ہے بارگاہِ رسُولؐ
جیسے میرے نصیب جاگے ہُوں
جیسے میری دُعا ہوئی ہو قبُول



پھول کِھلتے ہیں خار زارُوں میں
جب میں ذکرِ رسُول کرتا ہوں
دین و دُنیا کی نعمتیں پاکر
نقد قیمت وصُول کرتا ہوں



فطرتُ اللہ ادائے جمیل
شاہکارِ فنِ خُدائے جلیل
تاجدارِ حرم دُعائے خلیل
اِک نگاہِ کرم شفائے علیل



فاتحِ وسعتِ زمان و مکاں
مصدرِ جُودْ منبعِ عرفاں
انبیا و رسل میں والا شان
سیّدِ کانَ خُلقُہ القرآن



دل عموماً اُداس رہتا ہے
وقفِ حرمان و یاس رہتا ہے
چھوڑ جاتے ہیں ساتھ سَب ساتھی
ایک غم ہے جو پاس رہتا ہے



غلط خیال ہے جن کا خیال ہے فطرت
ظلوم و جاہل و باطِل نواز ہوتی ہے
خُدا کے قہر سے بچتا نہیں کوئی لیکن
حرام زادے کی رسّی دَراز ہوتی ہے



ترے دل میں ایمانِ کامِل نہیں
عجب کی اگر ہوگیا مضطرب
نہ سمجھا ہے یَجْعَلْ لَہٗ مَخْرَجاً
وَ یَرْزُقہ مِنْ حَیْثُ لا یَحْتَسِب



اِک سُہانی چاندنی رات اور مانسبل کی جھیل
حُسن کی چُپ چاپ دُنیا خُلد کا عکسِ جمیل
دُور تا حدِّ نظر سرسوں کے کھیتوں کی قطار
آرزو کا سِلسِلہ لا اِنتہا ، فرصت قلیل



ہر صبح ایک تازہ قیا مت کی ہے نمود
ہر شام تیرہ بخت برنگِ دل حسود
یہ روز و شب یہ شام و پگاہ اور یہ ماہ و سال
اب تک میں جی رہا ہوں حوادث کے باوجود

(انگلستان میں)

نظر افروز بہار افرنگ
باغ میں دَشت میں ہر رنگ کا پھول
اِن میں خوشبو کی کہیں بُو بھی نہیں
رنگ ہی رنگ ہے افرنگ کا پھول



اُف زمستان دیار مغرب کا
وَقِنا ربَّنا عذابَ النَّار
اللہ اللہ بہارِ انگلستان
باادب باملاحظہ ہوشیار



اس سے پہلے میں نے دیکھا ہی نہ تھا یہ رنگ روپ
تختہ ہائے لالہ و گل اور اِنگلستان کی دُھوپ
یہ بَہارِ جانفزا یہ لالہ و گل کا نِکھار
بلبل و قمری صَف اور صَف قطار اندر قطار



اگر تو شاعری وہ شاعری ہے
کہ بس الفاظ کی جادوگری ہے
ہم ایسی شاعری سے باز آئے
کہ اصلِ شاعری پیغمبری ہے



کوئی کہتا ہے اسکو جاودانی
کوئی کہتا ہے فانی ہے جوانی
نہ آگا اس کا مِلتا ہے نہ پیچھا
بڑی اُلجھی ہوئی ہے یہ کہانی



خدا ہے تو ترا رتبہ ہے عالی
نہیں تیرے جَہاں میں پائمالی
تری ساری خدائی میں بھی لیکن
نہیں میرے لئے آسودہ حالی



غلط ہے تو نے کچھ واپس لیا تھا!
مجھے میری خودی نے ڈس لیا تھا
ترے فردوس کو ٹھکرا کے یارب!
یہ پھندا میں نے خود ہی کس لیا تھا



ہر طرف جلوہ نُما شانِ خداوندی ہے
شبِ تاریک ہے انوار کی دربندی ہے
چادرِ ظلمتِ شب میں ہے عروسِ مہتاب
سرخیِ رنگِ شفق اسکی حنا بندی ہے



عدو کی خندہ روئی میں خباثت اسکے باطن کی
بنولے کی طرح روئی کے گالے میں نہاں نکلی
مجھے دھوکہ رہا نازک بدن میں دل بھی نازک ہے
مگر پوشیدہ اس دیبائے چینی میں چٹان نکلی



خیالِ یار جب خاموش راتوں میں ستاتا ہے
دلِ مجبُور روتا ہے، کلیجہ منہ کو آتا ہے
ابھی معصومِ الفت ہو تم اِن باتوں کو کیا جانو
محبّت کیا بناتی ہے، زمانہ کیا سِکھاتا ہے



یہ کثرتِ اطفال کی اُفتاد غضب ہے!

☆ میر غلام رسول نازکیؔ

یہ کثرتِ اولاد کی روداد غضب ہے
اولاد ہی اولاد، یہ بیداد غضب ہے

دِن رات وہی شکوہٴ زن، گریہٴ اطفال
پھر شام و سحر نالہ فریاد غضب ہے

افسردہ پژمردہ دِل ریش و کمر خم
یہ کثرتِ اطفال کی افتاد غضب ہے

یاجوج کی پلٹن ہے کہ ماجوج کی سینا
شمشیر بکف لشکرِ شداد غضب ہے

تھے ایک زمانے میں سبکدوش سہی قد
اب بوجھ سے خم سے قدِ شمشاد غضب ہے

اولاد کی کثرت ہو نجابت کی علامت
یہ فہم، یہ تاویل اِرشاد غضب ہے

اولاد ہو ہر چند اپاہج ہو کہ معذور
یہ عقیل ہے یا قہر خدا داد غضب ہے

بھوکے بھی ہیں، ننگے بھی ہیں، بے علم و ہنر بھی
صحت بھی ہے برباد سی برباد غضب ہے

اس دَور میں ہر صاحبِ اَولاد کی خاطر
اے دوست یہ فرمودہٴ استاد غضب ہے

توڑا کمرِ شاخ کو کثرت نے ثمر کی
اے ذوق گرانباریٴ اولاد غضب ہے

☆☆☆

(میر غلام رسول نازکی کی یہ نظم آج سے قریب بیس سال قبل روزنامہ "سرینگر ٹائمز" میں اشاعت پذیر ہو چکی ہے اور اِس کا تراشا پروفیسر محمد اسد اللہ وانی نے شیرازہ کو بطورِ خاص عنایت فرمایا ہے۔)

☆☆☆

stand in the immediate presence of the infinite who shines out as from the deep of the soul'. Kashmiris have stood the test of this inner light even in the darkest days of their history, simply because their mystics have guided their psyche on the right track.

******

And this is exactly what has been preached by our Sufi poets like Ahmad Batwari, Sochhi Kral and Shams Faqir. They have been telling us that Sufism is a universal religion because it does not believe in rituals.

The people of Kashmir have been living up to these teachers and that is why, even in this material age, we have common shrines, common names and common heritage in Kashmir. One of our folklores sung by our women on the occasion of festivities like Id is *'Adam had two sons, one was cremated and the other buried'*. Nevertheless, there is a long chain of poets who synthesized the two schools so harmoniously so as to provide a new amalgam of indigenous mysticism – Khawaja Habibullah Nowsheri, Shah Qalander, Rahim Sahib, Roopa Bawani and, finally, the 'prince of the mystical poets' Shams Faqir (1843-1904) who kept the torch illuminated – with the result that even in the modern materialistic age we have Master Zinda Kaul, Ahad Zargar and Samd Mir, whose contributions to mystical lore and thought have proved creative enough to derive applause from all critics of the subject.

In conclusion, it will be pertinent to refer to what Plotinus wrote centuries back:

"There are great highways which connect to the exalted abode of the actual ad the particular, where we

In Kashmir, unfortunately, the Brahmanic cult of race superiority did not die out in some sections even after the continuous efforts by the Kashmir mystics to eradicate it. Hence, in the course of time, all the shrines of saints became dens of parasitical Murawalis, Babas and Pirs, pestering visitors and hoodwinking the folk. That is why it appears almost impossible to convince a foreigner of our spiritual heritage in the mystic domain, unless he finds respite enough to study our mystic literature, produced in the Sanskrit, Persian and Kashmiri languages. The tradition of religious tolerance, Catholic outlook, indifference to the dictates of dirty politics and a sense of fraternity – all engendered by our mystics – was continuously carried further by the saint-poets of the Kashmiri language with one difference – the Hindu mystics such as Sirikanth, Sahab Kaul and Permanand, derived their symbols and allusions from the Hindu scriptures, whereas the Muslim mystics such as Momin Sahib, Haqqani and Assad Paray based their diction on the Persian interpretation of the mystical vision. It will not be out of place to quote the definition of Yoga. It says:

The practice of Yoga does not require a person to renounce his hearth and home and to fly away but it requires him to do his duties.

SUFISM – A UNIVERSAL RELIGION

of love carried to every obscure village by Sheikh Nuruddin Rishi and his followers.

The lover is he who burns with love
Whose self doth shine like gold
When man's heart lights up with flames of love
Then shall he reach the infinite

Side by side with this movement, the mystics of Kubravi and Suhrawardy orders, represented by Syed Ali Hamadani and Sheikh Hamza Makhdoom Kashmiri, guided the metaphysical impulses and mundane affairs of the Kashmiris with one major difference with the Rishis. These preferred to renounce worldly joys whereas the later two orders coordinated the human conduct on such a path where Sattan had no say; where, in the words of Shah Hamadan, we could ejaculate: 'O Lord, despite our Gnosticism, we have not recognized You, for even when we are illuminated with mystic light, He, as infinite being, cannot be grasped by the finite human consciousness'. The Naqsh-bandi and Qadri orders represented by Khawaja Khawand Mehmood and Mir Nazuk Qadri respectively, also added their quota to the mystic culture of Kashmir, and it will be too long a study to summarise, even in a sketchy form, how the saints and scholars of these orders moulded not only the psychic trends, but the very mode of life 'in times of joy and sorrow'.

FUSION OF VEDANTA AND SUFISM

When the mystic lore was flowering in various countries under the Islamic rule, non-Arab concepts such as Aryan pantheism, Buddhist self-abnegation, Christian asceticism and Zoroastrian polarity of light and darkness were so imperceptibly creeping in, synthesized and developed in Muslim mysticism, that it would be next to impossible to rift its Arab and non-Arab elements when Hazrat Bulbul Shah and Mir Syed Ali Hamadani came to preach Islam in Kashmir.

It was a strange coincidence of events that Lal Ded (1335) had begun the mystical muse on indigenous traditions exactly when the first group of Muslim missionary mystics reached Kashmir. According to the majority of historians – the latest two being Pandit J. L. Kaul and A. K. Rehbar – Lalla was strongly influenced by Islam and in consequence proved to be the precursor of that culture and her Vaakh (from the Sanskrit word walkaya) poetry in Kashmiri is replete with the mystic vision. It was, however, not the abstruse philosophical truths or even the discipline of Kundalim and NalaBindu Yoga that made her a poet-saint of the people. It was rather the sincerity of faith, the stamp of intensity of her mystic experience and the authenticity of her poetic expression – revealed by an energy of idiom and homely tolerance, compassion and brotherhood of all – that m ade her so. The common folk were as it bewitched with the message

Prophet's companions, were the first trainees in the mystic discipline initiated by Islam. Some historians further say that the puritanical theocracy of the four orthodox Caliphs was, in effect, the manifestation of the basic principle of mysticism – piery – that has remained the pivot of all the fourteen mystic schools of Islam. When the Calliphate was changed into Umayyed Kingdom, the reaction against this political trickery and, subsequently, the moral lapses of the Abbaside feudalism, accelerated the 'search for the Real'. A host of pious puritanical Muslims such as Taus Yemani, Maroof-e-Karkhi, Ibn-e-Musabbib and Malik Ibn Dinar revolted against the 'wordliness' of the rulers and the ignorance of the masses. From amongst the galaxy of 'divines', Hasn-e-Basri is credited to have attempted the first systematic approach to the intuitional school of mysticism, though Ibn-e-Hashim of Damascus is reported to be the first mystic who was actually called a Sufi. In the course of time, the ardent devotion of Ibrahim Adham, the divine love of Rabiaa Basriya, the Gnosticism of Junaid and Dhunn Noon and the self-annihilation theory of Bayazid and Hallaj, enriched the mystic trends till their climax in Ibn-e-Arabi's theoretical compendium Futuhat-e-Makiya, the symbolical exposition in Maulana Rumi's Mathnavi and Mirza Akmal-ud-Din's Bahrul Irfan (this last one being written in Kashmir).

Mir Ghulam Rasool Naziki

Mysticism in Kashmir

Mystic discipline has proved to be the bedrock of all spiritual orders in almost every theistic school of thought and Kashmir, with its glorious contribution to meditative thinking had, long before the advent of Islam, passed through the 'Trika' monism and Buddhistic Catholicism to attain maturity and potency in spiritual evolution. Muslim mysticism, from the fourteenth century to this day, saturated this trend with new vigour and verve and coherent direction and purpose, with the result that the collective behaviour of the Kashmiris was moulded on a distinct pattern down from Lal Ded to this day – a unique phenomenon having very few parallels in the history of Asian nations.

The historians of Muslim mysticism have traced its origin from the very life of Prophet Mohammad (Peace Be Upon Him), and it is an established fact that the Ashab-e-Suffia, a group from amongst the

Abdullah to Srinagar. He later joined newly set up Radio Kashmir along with Qaiser Qalander. He was transferred to Jaipur when Sheikh Abdullah Govt was dismissed. Later, he teturned to the valley after serving the term in Jaipur.

Nazki Sahib can be counted among the doeyn of literateurs in Kashmir in Urdu and Kashmiri. The little hamlet of Mador, Bandipore, has produced two gaint literary figures, namely , the author of Tarikh-i-Hassan , considered as a source book on Kashmir's history and Mir Ghulam Rasool Nazki. Alas, last year 1997 when I visited his house (official residence of Justice Bilal Nazki) on Idul Zuha he had gone to Sidhra to see the progress of the new house constructed by Farooq Nazki. I felt sad and later came to know that he had moved to Srinagar. I wondered whether I would be able to see him because of his ripe age. He will always be remebered by students whom he taught with love and dedication and friends alike. He has carved a niche for himself in the literary field of Kashmir.

*****

Latif, a noted literary journal of Lahore and Adabi Duniya, Delhi. He got now formal recognition in the literary circles.

His occasional visits to Lahore, in connection with his examinations, brought him in close contact with Sir Mohammad Iqbal.

The noted poet composed a verse and behold Nazki Sahib, extremporarily compsed the following verse:

Sham-i- gham Rooshni mein,
Dekh Aiya Shama Hayat,
Zindgi Aik Khamosh see
Qandeel hai TARAY Bagair,

This verse won for him the appreciation of Dr. Sir Mohammad Iqbal.

At Baramulla and Srinagar he came in contact with Chaudhury Khushi Mohammad (noted for his poem "Jogi") Hafeez Jallandhari, Brij Mohan Datariya Kaifi, Pt. Dina Nath Mast , Mr Qamar Din Qamar and many other local poets. This widened the literary circle of Nazki.

At Bandipor, Sheikh Ghulam Ali Bulbal Kashmiri of Aijar village was one of his literary students. He later joined the army during the course of World War II and opted for Pakistan Army in 1947. Mr. Ansari of Delina was also among his intimate literary friends.

It was in November 1947 when I along with late Mohammd Yusuf Dar, Ex Health Secretary visited Bandipore, as the political commanders of J&K Militia, that we requested Sadiq Sahib to make use of his talents in the Cultural Front. He subsequently was summoned by the emergency administration of Sheikh

Lal Mirza and Pt. Lakhman Raina, the noted head masters of those days.

It was in this school when Khawaja Ghulam Saidein, the Director of Education in Maharaja Hari Singh's regime, it officially visited the school and felt highly impressed by the corrections Nazki had effected in the student's home work copy books. It was he, who transferred him from the native village to Srinagar and Nazki came in close contact with the Director of Education. Impressed by him the Director later promoted him to the post of Assistant-Inspector of schools on the basis of his outstanding merit.

Being one of his privileged students both in the school and as private tutor, he took pains to inculcate literary aptitude among the students who were under his charge. His scholarship and erudition endeared him to the students. Master Najam Din, Master Abdul Qadeer and Master Ram Chand Raina were his colleagues in the school. It was here in the idyllic and picturesque village of Bandipore over looking the famous Wullar Lake, he composed his first collection of poems on Tragabal, and other natural spots. It also included his poem "Aik Andhi Ladki Ki Dua."

His literary stature began to grow taller by publishing his poems in "Alabarq" then edited by Mr. MA Sabir, "Hamdard" weekly Kesi, edited by Pt. Kashyap Bandhu , the daily Khidmat, edited by Late Maulana Mohammad Saced Kashmiri Masudi and the weekly Rahbar edited by Dina Nath Mast Kashmiri. This encouraged him to write more poems and these were published in Lahore newspaper, The Daily Zamindar edited by Maulana Zafar Ali Khan, Adab-i-

T.N.MOZA

Ghulam Rasool Nazki
....As I knew him

Reading about the demise of Mir Ghulam Rasool Nazki , I go back down the memory lane to the years when I was the student of Government Middle School, Bandipur.Those days schools in the state were few and far between. He was on the staff of this school and had started his teaching career.
Hailing from the small village of Mador, Bandipore, he was a self-taught man. His revered father had imparted him early education. In due course of time he passed Maulvi Fazil (high profeciency degree in Arabic) and later acquired Munshi Fazal (high proficiency degree in Persians.

Nazki Sahib was a born talented scholar and would engage himself in continuous and untiring reading of books to broaden his knowledge. This spurned him to acquire another high proficiency degree in Urdu, Adib Fazal, from Punjab University, Lahore. He worked on a paltry sum of a few rupees per month in the school, under Pt. Dina Nath Dhar, Pt. Sat

Those who have tried their hand at translating poetry know with what difficulties the way is beset. Essentially poetry is untranslatable. At the most you can translate the sense, the idea contained in a verse but poetry, to be sure, is not the idea but the inevitable, the only, expression of the idea. Poetry is authentic when the words it uses are irreplaceable. If they are irreplaceable, how can they be translated in another language, which is different in its genesis, its provenance and its evolution? Translation of a poem, when successful, is a new poem. Edward Fitzgeral's Omar Khayyam is genuine poetry because he translates Omar khayyam in a way that new poems are born although the fact remains that these new poems would not be there if Omar Khayyam were not there. Ayaz Rasool Nazk has justifiably taken liberties with the original in order to make the translation, as far as possible reflective of the original. Those who can read the poet in Kashmiri will naturally be averse to exchanging the original for the copyThose who do not know Kashmiri will get a fair idea of the charm and subtlety of the original from these translations. In fact such translations can never claim perfection. Edward Fitzgerald worked all his life on the translation of Omar Khayyam's Rubaiyat and issued several editions of them with significant revisions in each edition. Ayaz RAsool Nazki's translations may also require such review and revision in order to get closer to the original. But even in the present form, they are a treat to read. I consider it my good fortune to be associated with this work and heartily thank Dy. Ayaz Rasool Nazki for this.

is true of all poetry. In its ultimate origin poetry is a gift, which some have and some do not have and the complex psychological-cum- suprapsychological process called inspiration is ever at work alongside deliberate workmanship in the production of poetry. Nazki has the gift and the inspiration as well as the skilful artist's knack of turning raw ore to gold.

Such a poetic temperament can successfully handle any form of poetry -but Nazki has a mysterious and irresistible pull towards short lyrics, particularly the quatrain, where the canvas is apparently limited and less demanding and yet the poet's powers of capturing the quintessence of experience and distilling it in verse of high poetic intensity are tested to the extreme. you seize an idea, a fleeting emotion, a maturing experience, and turning it over and over in your mind, find a suitable verbal mould for it. Did the great Omar Khayyam work at his matchlessly profound quatrains like this? Since the quatrain suits Nazki's genius most, he turns to it again and again and achieves his best poetic successes in this genre.

The present work is a comprehensive selection and translation of Nazki's Kashmiri quatrains by his illustrious son Dr. Ayaz Rasool Nazki. It is a fitting tribute of a son to his father. The fact that Ayaz has made his selections from his father's quatrains only indicates his inherent critical acumen, for it is in this genre that Nazki has excelled most although he has handled all other forms of poetry quite competently. Most of these selections and translations were made in the poet's lifetime and were seen and approved by him. What a pity he did not live to see them in print!

Then I disown and renounce such poetry.
As genuine poetry is prophecy and
Communication of message.

Thus in Naqzki's view, poetry is a gift as well as craftsmanship; it is felicity of expression, and it ought not to be purposeless. Nazki's own poetry is an apt illustration of this definition of poetry. Masterly ease and felicity of expression is its hall-mark but it always brings lots of wisdom in its lap. A healthy social consciousness and sensitive response and comment on life's goings-on inform all his poetry. He subjects even the bitterest realities of life to the terms of poetry and thus at least succeeds in blunting their edge if not getting the better of them altogether. Certainly poetry, apart from its other uses, is an effective psychological weapon to fight the sorrows and sufferings of life. Nietzsche remarked about Keat's odes that they were the poet's resistance to death that faced him in the form of the fatal disease of tuberculosis. It will be highly rewarding to look at Omar Khayyam's quatrains, Shakespearr's sonnets and Ghalib's poetry (with its integral and in-built humour) from this point of view.

The most dominant impression that one gets from Nazki's poetry is that he has complete mastery over expression. He was the commander of the words and they ever obeyed his will. This is not to underplay the role of conscious artistry in his poetry. In one of his quatrains he complains that his readers would enjoy with abandon the lucidity and spontaneity of a quatrain of his without realizing how much sweat and labour has gone into the making of this lucidity and spontaneity. This points to a fundamental fact, which

How does Nazki himself look upon poetry and what sort of a poet he is? Here is the translation of two Kashmiri prose extracts and an Urdu quatrain of the poet, which, to my mind, sum up his definition of poetry.

I do not compose my quatrains intentionally. Some emotion is stirred somehow, an idea is born and, generally, the fourth hemistich occurs first to which I add the remaining there hemistiches for which I have to make an effort.(Preface to Awaz-e- Dost).

God has gifted man with a mind, which is ever at work all day and night. Whether one is awake or asleep mind keeps on working and assimilating experiences. If some one has the capability of effectively expressing these experiences in language he may be able to write poetry, which has a natural appeal to the reader. The ideas which poetry expresses are not always new but the way of expression is new and original and fascinates the reader. (Preface to Kaawe-Yenewol)

اگر تو شاعری وہ شاعری ہے
کہ بس الفاظ کی جادوگری ہے
ہم ایسی شاعری سے باز آئے
کہ اصل شاعری پیغمبری ہے

If that poetry is regarded as genuine poetry
which is nothing but jugglery of words,

his ever-vigilant regard for healthy convention amidst his exposure to all that was modern.

خیرہ نہ کرسکا مجھے جلوہ دانش فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

How could the glitter of Western Knowledge dazzle my eyes?
The antinomy of my eyes is the dust of Madina and Najaf

Nazki wanted to bequeath these qualities to his chidren as well and was fairly satisfied that, as far as thinkning and belief was concerned, they were his true heirs. Such a personality naturally found its most spontaneous outlet in Munajat (whisperings with the Ultimate Reality) and Naa't(song offerings to the Prophet)

Originally, Ṇaẓki wrote his poetry in Urdu and Persian and hardly ever thought of composing in Kashmiri. In 1954, however, as a part of his official duties, he had to participate in Kashmiri poetic symposia where, as he painfully records, he was treated to all sorts of nonsense in the name of poetry. This prompted him to compose himself in Kashmiri. In this way began a glorious chapter in the history of Kashmiri poetry. Nazki enriched Kashmiri poetry in general but made a distinct contribution to the genre of the quatrain so that one can justifiably call him, in this particular respect, the Omar Khayyam of Kashmiri poetry.

history. Nazki was broken and shattered but conversation revived him a little and we left him with the usual pleasant impression.

Nazki possessed a colourful and magnetic personality. He had been born in a typically traditional ambience characterized by scholarship and mystical ways of thinking and living. He received his early education in Persian and Arabic classics from his father followed by a brief period at school which came to an abrupt end as he was froced by economic compulsions to take up a school teachers job.Thereafter he educated himself in an enviable maner so that Khwaja Ghuam -us-= Saidain picked him up as his literary Assistant and editor of his magazine, Taleem-i- Jadid. Later Nazki became a remarkable broadcaster. Thus he began his life in a highly conventional atmosphere but was exposed, with the passage of time, to new developments in modern knowledge and civilization. The result was that he grew up to be an excellant combination of the best in the old and the new. He was aware of the insights of the new knowledge but remaiend firmly committed to a set of wholesome values sanctified by tradition, values which Kashmir has nurtured in its lap for the past so many centureis□à socio-religious values ultimately rooted in a mystical vision about life and universe. Nazki's commitment to these values received its life and strenght from an overmastering passion, his profound love for the prophet (PUH a love which transcended reason and had its source deep down in the instinct. This is what saved his faith and kept alive

of the leading poets of Kashmir, offering a small honorarium for participation in the symposium. Most of the poets accepted the invitation in the usual manner. However, the responses included a strange and singular letter. " I gladly and gratefully accept the invitation", said the author. "But I decline to accept any honorarium from an organzation dedicated to social work". The letter-writer was Mir Ghulam Rasool Nazki. Our first contact led to a sweet and lasting relationship. We now met frequently in symposia, in literary conferences and particularly the periodical session of Iqbal Academy.Significant memories relating to Nazki are associated with all these meetings but the limits of this brief foreword do not allow me to continue with this ever-so-interesting account. In 1980's Nazki developed some heart ailment. I went to see him with Prof. Rehman Rahi and Dr. Bashir Ahmad Nahvi at his Kathi-Darwaza residence. He was cheerful and scintillating as ever. In the course of the conversation I told him that he had been kind enough to gift to me copies of all his works except Nimrud Nama. He said that Nmrud Nama had been published many years ago and that he had no copies to spare except an old copy, which he gave to me, before I left, with the inscription:

بگیر ایں ہمہ سر مایہ بہار از من

(Receive from me this whole wealth of springtide.)

I met Nazki last at his residence near the Sher-e-Kashmir Park. Kashmir was going through blood and fire, through an agony that it had never known in its

endless chain of longings:
The limited lease of life.

My enthusiastic response to the verses then was largely instinctive. Much later was I to realise how they captured beauty and made it a mirror of life's endless longings.

In 1960's I was a college student trying to find my own way out, with, unfortunately or perhaps fortunately, little guidance available to me. Ever on the look-out for something good to read, I laid my hands on every thing that came my way. Among my exciting finds of these days were Shakespeare, Wordsworth, Tolstoy, Bernard Shaw, Will Durant, Gandhi's autobiography, Radakrishnan's writings and Nehru's Discovery of India and Glimpses of World History. Iqbal had been an early love. Among the newspapers published from Kashmir then, the late Shamim Ahmad Shamim's weekly, Ayeenah, was my favourite reading to which I also contributed once a while. One day some one gave me a copy of a new weekly "Al Ghufran" edited by Nazki and his son Bilal (now a high court judge). It's chaste and meticulous use of Urdu language (a rare commodity in Kashmiri journalism) thrilled me and I immediately wrote a letter of appreciation to the editor which appeared in the next issue of the paper. Al Ghufran did not live long but left back lasting impressions with its readers. I had to wait for long years before I could get an opportunity of personal contact with Nazki. It came around 1980 or 1981. I was a University Lecturer then. An organization devoted to social work asked me to arrange a poetic symposium. I sent invitations to most

Prof. G. R. Malik

Echo..... A Son's Tribute

Translation of a Selection of Kashmiri Rubaaiya-e-Nazki

As I begin this foreword memories associated with Mir Ghulam Rasool Nazki crowd in upon my mind-sweet, poignant, heart-warming memories. I was a student of 8th standard when I first knew his name through his poem about the Manasbal lake which formed a part of our Urdu course, Chasma-i-Faiz. The poem went straight to my heart to remain indelibly imprinted there:

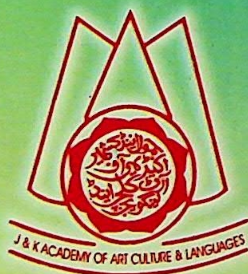
اک سہانی چاندنی رات اور یہ مانسبل کی جھیل
حُسن کی چپ چاپ دنیا خلد کا عکس جمیل
دورِ تا حد نظر سرسوں کے کھیتوں کی قطار
آرزو کی سلسلہ لا انتہا ، فرصت قلیل

A charming moonlit night and the lake of Manasbal; the mute world of beauty exquisitely mirroring paradise, the widening landscape, lines on lines of mustard fields... the

{URDU}

SHEERAZA

Mir Gh. Rasool Nazki Number



Editor:
M.Ashraf Tak

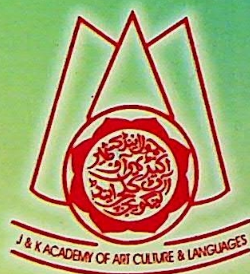
Published by
J&K ACADEMY OF ART, CULTURE & LANGUAGES
Srinagar/Jammu

Printed at JK Offset Printers, 315 Jama Masjid Delhi 110006

{URDU}

SHEERAZA

Mir Gh. Rasool Nazki Number



Editor:
M.Ashraf Tak

Published by
J&K ACADEMY OF ART, CULTURE & LANGUAGES
Srinagar/Jammu

Printed at JK Offset Printers, 315 Jama Masjid Delhi 110006

B Ahmad